ایچ اقبال کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاہکار کہانیاں)



(3)

ایچ اقبال کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاہکار کہانیاں)



(3)

آتش بغاوت
اچھوتی محبت
آخری مرحلہ
بعد از گناہ
پدم

آتشِ بغاوت

ایچ اقبال

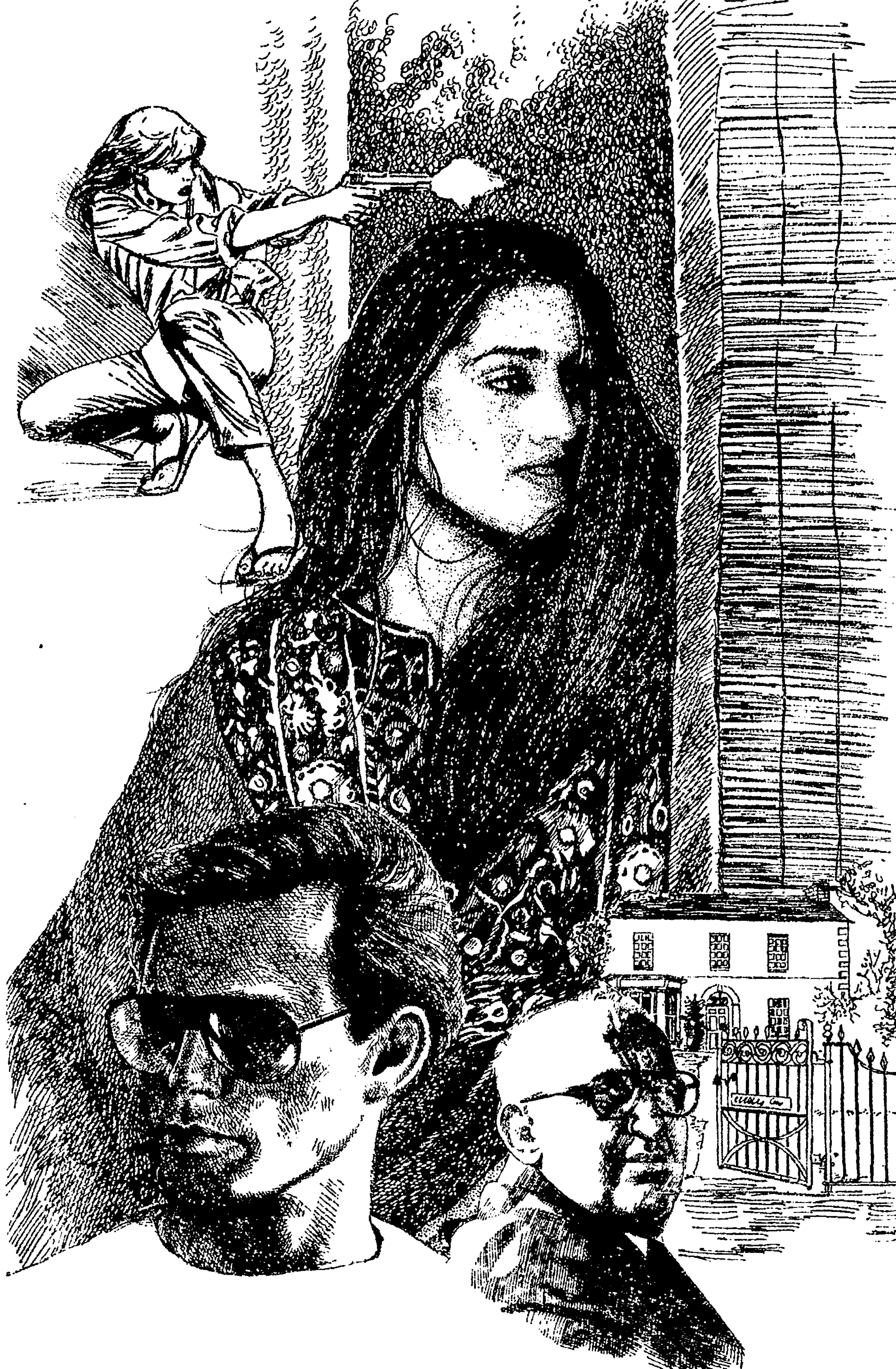
ہر طرف رواں دواں ظلمتوں کے کارواں
حادثے قدم قدم راستے دھواں دھواں
مشعلیں بجھا گئیں روز و شب کی آندھیاں
پھر بھی اے مسافرو تم رہو رواں دواں

صلاحیت بالکل آگ کی طرح ہوتی ہے... آگ اگر بے وقوفوں کے ہاتھ لگ جائے تو اردگرد کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے... یہ ذہانت ہی ہے جو اسے قابو میں رکھتی ہے... اور آگ ہی کیوں... ذہانت تو حسن کو بھی اس طرح گرفت میں کرلیتی ہے جس طرح کوئی ہوشیار شہسوار تندخو گھوڑے پر غالب آجاتا ہے... کارزارِ سیاست میں بھڑکتی آگ کے شعلوں کا احوال جو ہر دم ہر نفس کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھے... اقتدار کے ایوانوں میں چلتی پھرتی کہانی کے اسرار ورموز... جہاں سازشوں کے ساتھ ساتھ محبتوں کے کھلاڑی اپنی بازی دل و جاں سے کھیل رہے تھے... انجام سے بے خبر ایک کھلی جنگ کی تباہ کاریاں...

آتشِ بغاوت میں گھری ایک نازک اندام حسینہ کے آہنی ارادوں کی داستانِ حیات

اُس رات صدارتی محل پر غیر معمولی سکوت طاری تھا۔ ایک کمرے میں ملک کا صدر حیات بیگ ایک خفیہ ایجنسی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی سے میٹنگ کر رہا تھا۔ گفتگو بہت مدّھم لہجے میں ہو رہی تھی۔ نصف گھنٹے کی میٹنگ کے بعد چنگیزی رخصت ہوا۔ حیات بیگ اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ اس کی بیوی روبینہ حیات بستر پر لیٹی کسی سوچ میں گم تھی۔ چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جب حیات بیگ لیٹا تو روبینہ حیات نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ حیات بیگ نے اس کی طرف بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اس کی نظریں چھت پر جم گئیں۔ چہرے پر فکرمندی اور پریشانی کے آثار بہت واضح تھے۔

اِدھر قصرِ صدارت کا یہ حال تھا اور دوسری طرف ملک کے سیاسی حلقوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کے اثرات ٹی وی چینلز پر بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ کیونکہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اس لیے جو ٹاک شوز ہو چکے تھے، وہ دوبارہ نشر ہونے لگے تھے۔ تقریباً سبھی کا موضوع ایک ہی تھا۔ وزیرِ تعلیم پشمینہ حیات نے نہ صرف وزارت سے استعفا دے دیا تھا بلکہ اپنی ایم این اے کی رکنیت ختم کرنے کے ساتھ ساتھ حکمراں سیاسی جماعت سے بھی علیحدگی اختیار کرلی تھی۔



کسی بھی ایم این اے یا کسی بھی وزیر کا استعفا اتنی ہلچل نہیں مچاتا لیکن پشمینہ حیات صدرِ مملکت حیات بیگ کی اٹھائیس سالہ بیٹی تھی۔

ایک سال سے سیاسی جماعتوں اور ٹی وی چینلز کے رپورٹرز کی طرف سے صدرِ مملکت پر مالی بے ضابطگیوں کے جو الزامات لگ رہے تھے، تمام وزرا کی جانب سے انہیں رد کیا جارہا تھا اور اس معاملے میں پشمینہ حیات سب سے پیش پیش تھی کیونکہ الزامات کا کوئی ٹھوس ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا لیکن گزشتہ ماہ جب صدر حیات کا ''اسکینڈل'' اس طرح سامنے آیا تھا کہ ایک ٹی وی چینل کے اینکر نے اس کی وڈیو بھی اپنی ویب سائٹ پر ڈال دی تھی۔ اس کے بعد تو صدر حیات کے خلاف بلا کا شور مچ گیا تھا اور معمول کے مطابق کئی وزرا اپنے صدر کا دفاع کرتے ہوئے اس وڈیو کو جعلی قرار دیتے رہے تھے لیکن اس کے بعد پشمینہ نے مکمل خاموشی اختیار کرلی تھی جس نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بہت سے ٹاک شوز کے اینکر پرسنز نے اس سے رابطے کی کوششیں کی تھیں لیکن کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ اس کا وہ موبائل نمبر بند تھا جس پر میڈیا کے لوگ اس سے رابطہ کیا کرتے تھے۔

لیکن یہ کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ پشمینہ کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھائے گی۔

کیا پشمینہ نے ''اسکینڈل'' پر یقین کرلیا تھا اور اسی باعث یہ قدم اٹھایا تھا؟

ٹاک شوز میں اسی سوال پر مباحث ہوتے رہے تھے اور مختلف النوع قیاس آرائیاں ہورہی تھیں۔ ان میں ایک قیاس آرائی یہ بھی تھی کہ پشمینہ این پی پی (نیشنل پالیٹکس پارٹی) میں شامل ہوسکتی ہے۔

اس قیاس آرائی کا ایک سبب بھی تھا۔ خاصے دن پہلے دبے دبے الفاظ میں یہ سرگوشیاں ہوئی تھیں کہ پشمینہ کا این پی پی کے سربراہ دانش یزدانی سے کچھ تعلق ہے لیکن کچھ ہی دن میں ان سرگرشیوں نے دم توڑ دیا تھا کیونکہ انتہائی کوششوں کے باوجود کوئی رپورٹر ''دانش پشمینہ ملاقات'' کی کوئی مستند خبر یا تصویر نہیں لاسکا تھا۔

ان سرگوشیوں کا سبب صرف یہ تھا کہ پشمینہ اور دانش نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ساتھ ہی تعلیم حاصل کی تھی۔

تین سال قبل دانش یزدانی نے ایک سیاسی پارٹی بنائی تھی جو پہلے ایک سال میں تو ذرا بھی اہمیت حاصل نہیں کرسکی تھی لیکن پھر دو ایک ایشوز پر اس نے ایسا زبردست کام کیا تھا کہ پھر وہ ابھرتی ہی چلی گئی اور اب چند نمایاں سیاسی جماعتوں میں سے ایک تھی۔

☆☆☆

قصرِ صدارت پر جو سکوت رات کو چھایا رہا تھا وہی دوسری صبح ناشتے کی میز پر تھا۔ میز پر صدر حیات، اس کی بیوی روبینہ حیات، صدر کا بڑا بیٹا آفتاب حیات، اس کی بیوی قدسیہ آفتاب اور پشمینہ حیات، پانچوں ہی تھے۔ پشمینہ کسی کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے ناشتا کررہی تھی۔ باقی افراد کبھی کبھی اس پر اچٹتی سی نظر ڈال رہے تھے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ان کے ہاں ناشتے کی میز پر ایسا سکوت طاری ہو۔

ان میں سے کوئی قدرے جلدی ناشتا کرلیتا تھا تو اس وقت تک میز سے نہیں اٹھتا تھا جب تک صدر حیات ناشتا نہ کرلے۔ اس دن پشمینہ نے معمول سے کم ناشتا کیا لیکن حسبِ معمول بیٹھی رہی، البتہ اس کی نظریں بدستور جھکی رہیں۔

''کیوں پشمینہ؟'' قدسیہ آفتاب بولی۔ ''آج تم نے بہت کم ناشتا......''

''تمہیں اس کی فکر کیوں ہوئی؟'' آفتاب حیات نے اپنی بیوی سے سخت لہجے میں کہا اور جن نظروں سے پشمینہ کی طرف دیکھا، ان میں غصہ تھا۔

پشمینہ بدستور خاموش اور میز کے ایک گل دان پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

صدر حیات نے ان تینوں ہی پر اچٹتی سی نظریں ڈالیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پریشانی اس کے چہرے پر بدستور رہی۔

صدر حیات کی بیوی روبینہ نے اپنے بیٹے کی طرف کچھ ناراض نگاہوں سے دیکھا، پھر پشمینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم ناشتے میں دو مرتبہ چائے پینے کی عادی ہو بیٹی! آج ایک ہی پیالی پی!''

''جی ممی!'' پشمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آج جی کچھ ٹھیک نہیں۔''

آفتاب اتنی جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ اپنی بیوی کی طرح ماں کو بھی ٹوک سکتا۔

صدر حیات اس وقت بھی خاموشی اختیار کیے رہا تھا۔ آخر اس نے بھی ناشتا ختم کرلیا مگر اس سے پہلے کہ سب لوگ ناشتے کی میز سے اٹھتے، صدر حیات نے پشمینہ کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے ابھی...... ناشتے کی میز پر آتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ آج شام تم کوئی پریس کانفرنس کر رہی ہو؟''

''جی ڈیڈی!''

''اور یہیں...... قصرِ صدارت میں؟''

''جی۔''

ان باتوں کی وجہ سے باقی تینوں افراد بھی بیٹھے رہ گئے اور توجہ سے باپ بیٹی کی باتیں سننے لگے۔

''کیا کہنا چاہتی ہو، پریس کانفرنس میں؟''

''میں معذرت چاہتی ہوں ڈیڈی! یہ میں ابھی نہیں بتا سکتی۔''

اب صدر حیات کے چہرے سے غصہ ظاہر ہوا۔ ''تو پھر یہ پریس کانفرنس یہاں نہیں ہوگی۔''

''بہتر ہے۔'' پشمینہ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''میں کچھ اور بندوبست کرلیتی ہوں۔''

''لیکن پریس کلب میں نہیں۔'' صدر حیات نے زور دے کر کہا۔ ''تمہیں اس ملک کے صدر کی بیٹی کے وقار کا خیال رکھنا ہوگا۔''

پشمینہ نے صدر حیات کی طرف دیکھا۔ ایسا بھی معلوم ہوا کہ وہ کوئی جواب دیتے دیتے رکی ہو۔ وہ قدرے توقف سے بولی۔ ''بہتر بہتر! میں کوئی اور بندوبست کرلوں گی۔ یہ اور عرض کر دوں کہ میں اب وہ سیکیورٹی نہیں لوں گی جو سرکاری طور پر مجھے دی جاتی رہی ہے۔ کسی قسم کا پروٹوکول بھی نہیں۔''

صدر حیات اس طرح ایک جھٹکے سے اٹھا جیسے غصہ آگیا ہو، پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

باقی افراد بھی میز سے اٹھے۔

آفتاب غصے سے بولا۔ ''تم نے ڈیڈی سے بدتمیزی کی ہے پشمینہ!''

''میرا خیال ہے کہ میرا ایک لفظ بھی تہذیب سے گرا ہوا نہیں تھا بھائی جان!'' پشمینہ نے جواب دیا۔ ''میں ایک بہت عام سا محاورہ استعمال کروں گی کہ میں نے چنے دے کر نہیں پڑھا ہے۔ میرے علم ہی کی بنیاد پر مجھے وزارتِ تعلیم ملی تھی۔ میں میرٹ پر وزیر تعلیم تھی اور تعلیم، تہذیب سکھاتی ہے۔ میں تہذیب سے گری ہوئی کوئی بات کر ہی نہیں سکتی۔''

اب آفتاب بھی غصے کے عالم میں دروازے کی طرف مڑ گیا۔ قدسیہ کو اس کے پیچھے جانا ہی تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔

روبینہ حیات نے پشمینہ کے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں بولی۔ ''مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟''

''کیا ممی؟''

''کیا کرنے جا رہی ہو؟''

''میں آپ سے بھی معذرت چاہوں گی ممی! میں ابھی کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ در و دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں اور قصرِ صدارت کے در و دیوار تو کان ہی نہیں آنکھیں بھی رکھتے ہیں۔ شاید کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں خفیہ کیمرے لگے نہ ہوں۔'' پشمینہ کے لہجے میں تلخی آگئی۔ ''صدرِ مملکت نے سارے ملک میں ہی نہیں، اپنے گھر میں بھی جاسوسی کا نظام کچا نہیں رکھا ہے۔''

روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی اور پشمینہ کے کندھے پر سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

☆☆☆

ملک کے سیاسی ماحول میں سنسنی اس بات سے بھی بڑھی تھی کہ پشمینہ آج پریس کانفرنس کرے گی، پھر اس سنسنی میں مزید اضافہ ہوا جب یہ بات سامنے آئی کہ پریس کانفرنس اب قصرِ صدارت کے بجائے دانش یزدانی کے گھر پر ہوگی۔

حالات میں تیزی سے آتی ہوئی ان تبدیلیوں نے عوام کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ٹی وی چینلز نے اس پر خصوصی شو کر ڈالے۔ دو چینلز نے تو یہ اعلان بھی کر دیا کہ ان کے خصوصی شو، پشمینہ کی پریس کانفرنس کے ایک گھنٹے بعد تک مسلسل جاری رہیں گے اور عوام کو ایک ایک پل کی رپورٹ ملتی رہے گی۔

میڈیا کے لوگوں کو قصرِ صدارت اور دانش منزل کے آس پاس دیکھا جانے لگا۔ کئی ٹی وی چینلز کی گاڑیاں بھی دونوں مقامات کے نزدیک موجود تھیں۔

ٹی وی شوز میں کہا جانے لگا کہ کچھ عرصے قبل پشمینہ اور دانش یزدانی کے تعلقات کی نسبت سے جو خبر اُڑی تھی، وہ آخر درست ثابت ہوگئی۔ اس کے علاوہ یہ تجزیہ بھی کیا جانے لگا کہ پشمینہ پریس کانفرنس میں دانش یزدانی کی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کرسکتی ہے۔

پریس کانفرنس کا وقت پانچ بجے دیا گیا تھا۔ میڈیا کے لوگوں نے اس سے پہلے ہی وہاں جمع ہونا شروع کر دیا۔ جگہ وہی تھی جہاں دانش یزدانی پریس کانفرنس کیا کرتا تھا۔

وہاں ٹی وی کیمرے بھی سیٹ کیے جارہے تھے۔ دانش یزدانی نے صحافیوں کے لیے چائے اور کافی کا بندوبست بھی کیا تھا جو وہ اپنی پریس کانفرنسز میں بھی کیا کرتا تھا۔ کیونکہ ہلکی ہلکی سردی ہونے لگی تھی اس لیے ٹھنڈے مشروبات کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

اخبارات اور ٹی وی چینلز کے رپورٹرز پشمینہ سے رابطے میں تو ناکام رہے ہی تھے، اب ان کا رابطہ دانش یزدانی سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے موبائل نمبرز بھی بند مل رہے تھے اور وہ خود بھی اپنے گھر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی نسبت سے ٹی وی چینلز پر صرف یہ خبر آئی تھی کہ اس کی پارٹی کے سرکردہ لوگ بھی اس وقت اس کے گھر میں موجود تھے اور کسی معاملے میں ان کی مشاورت جاری تھی۔

ساڑھے چار بجے پارٹی کے کچھ اور لوگوں کی کاریں بھی وہاں پہنچیں۔ ٹی وی اسکرینز پر انہیں بھی کاروں سے اترتے دکھایا گیا تھا۔ میڈیا کے لوگوں نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی تھی اور ان پر سوالات برسائے تھے لیکن وہ بھی مسکراتے اور ''نو کمنٹس'' کہتے ہوئے دانش منزل میں چلے گئے تھے۔

چار بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے جب دانش یزدانی کو باہر آتے دیکھا گیا۔ اس کی شخصیت وجیہہ اور پُروقار تھی۔ وہ ملک کے ایک بہت بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا اس لیے دانش منزل کوئی چھوٹی موٹی عمارت نہیں تھی۔ اس کا احاطہ بھی اتنا بڑا تھا کہ باہر سے آنے والی کاروں کو بھی پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد عمارت تک پہنچنے میں دو منٹ تو لگ ہی جاتے تھے۔

دانش یزدانی باہر نکلتے ہی برآمدے کے سامنے کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھا۔ میڈیا کے لوگوں نے اسے گھیر لیا جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر اپنی کار تک نہیں بڑھ سکا۔

اس پر سوالات کی بوچھاڑ بھی ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا۔ ''پریس کانفرنس کا وقت قریب ہے، اس وقت آپ کہاں جارہے ہیں؟''

''میں کہیں دور نہیں جارہا ہوں۔'' دانش یزدانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس پھاٹک کے باہر تک۔''

''کیا کسی اہم شخصیت کا استقبال کرنا ہے؟''

''کوئی بڑی شخصیت آرہی ہے؟''

اس نوع کے کئی سوالات بہت سے صحافیوں نے کر ڈالے جس کا جواب دانش یزدانی نے اثبات میں دیا۔

ٹی وی چینلز سے یہ خبر ''بریکنگ نیوز'' کے طور پر نشر کی گئی اور جو دو ٹی وی چینل مستقل ''خصوصی شو'' جاری رکھے ہوئے تھے، ان پر موجود تجزیہ کار اندازہ لگانے سے بھی قاصر دکھائی دیے کہ ایسی اہم شخصیت کس کی ہوسکتی ہے جس کا استقبال کرنے کے لیے خود دانش یزدانی باہر آیا تھا۔

تجزیہ کاروں کے خیال کے مطابق وہ اہم شخصیت پشمینہ کی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ قصرِ صدارت پر مامور رپورٹرز میں سے کسی نے بھی اب تک یہ خبر نہیں دی تھی کہ پشمینہ کی کار قصرِ صدارت سے روانہ ہو رہی ہے یا روانہ ہو چکی ہے۔

دانش یزدانی کی کار پھاٹک کے باہر نکل کر رک گئی۔ اس کی کار کے پیچھے پیچھے سیکیورٹی گارڈز کی ایک کار بھی تھی اور پھاٹک کے باہر سیکیورٹی گارڈز کی دو گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔

دانش یزدانی کو پھاٹک پر آکر رکے ہوئے آدھا منٹ گزرا ہوگا کہ ایک چمکتی ہوئی سیاہ رنگ کی کار وہاں آکر رکی۔ دانش یزدانی اپنی کار سے اتر کر اس کار کی طرف بڑھا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے تین چار سیکیورٹی گارڈز تو تھے ہی لیکن میڈیا کے لوگ بھی تھے۔

کار کا پچھلا دروازہ کھول کر جو شخصیت باہر آئی، اسے دیکھ کر دانش یزدانی کے علاوہ سبھی ہکابکا رہ گئے۔

وہ پشمینہ تھی، پشمینہ حیات!

کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھول کر ڈیبرا باہر آئی جو شرٹ اور جینز میں ملبوس تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک وینٹی بیگ تھا۔ لوگ اس سے ناواقف نہیں تھے۔ اسے ہمیشہ پشمینہ کے ساتھ دیکھا جاتا رہا تھا۔ پشمینہ اسے اپنی دوست کہتی تھی۔

ٹی وی چینلز پر پھر ہلچل مچی۔ پشمینہ نے میڈیا کو دھوکا دے دیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص کار کے بجائے اس سیاہ کار میں قصرِ صدارت سے نکلی تھی۔ کار کے شیشے بھی سیاہ تھے۔ وہاں موجود میڈیا کے لوگوں نے اس کار پر توجہ نہیں دی ہوگی کیونکہ اور بھی کاریں قصرِ صدارت میں آجا رہی تھیں۔

اس پر بھی حیرت کا اظہار کیا گیا کہ پشمینہ پروٹوکول کے بغیر وہاں پہنچی تھی۔ اس کار کے آگے پیچھے دوسری کوئی کار نہیں تھی۔

وہ دانش یزدانی سے مصافحہ اور دو ایک باتیں کر کے پھر کار میں جا بیٹھی۔ اخباری صحافیوں کے کیمروں کی فلیش گنز تو بار بار چمکتی رہی تھیں لیکن کسی صحافی کو پشمینہ سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

اس کے بعد کئی کاروں کا قافلہ پھاٹک میں داخل

ہوا۔ آگے کی کار میں دانش یزدانی کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ اس کے بعد پشمینہ کی اور اس کے پیچھے دانش یزدانی کی کار تھی۔ اس کی کار کے پیچھے سیکیورٹی گارڈز کی دو گاڑیاں تھیں۔

عمارت کے برآمدے کے سامنے پہنچ کر گاڑیاں رکیں۔ دانش یزدانی بڑی سرعت کے ساتھ اپنی کار سے اتر کر پشمینہ کی کار کے قریب پہنچا تھا۔ اسی وقت پشمینہ اور ڈیبرا کار سے اتری تھیں۔

اس وقت میڈیا کے لوگوں نے انہیں گھیر ہی لیا۔ دانش یزدانی انہیں ٹالنے والے جوابات دیتا رہا۔ پشمینہ نے صرف ایک بات کہہ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ''مجھے جو کچھ کہنا ہے، وہ میں کانفرنس میں کہوں گی اور وہیں آپ لوگوں کو اپنے سوالوں کے جواب بھی مل جائیں گے۔ اس سے پہلے ایک جملہ بھی نہیں۔''

سوالات کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا لیکن پشمینہ کے ہونٹ نہیں کھلے۔ پشمینہ اس وقت بہت گمبھیر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دانش یزدانی اور ڈیبرا کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی عمارت کے اندر چلی گئی تھی۔ اس نے فوری طور پر اس ہال کا رخ نہیں کیا تھا جہاں اسے پریس کانفرنس کرنی تھی۔

اعلان کیا گیا کہ پریس کانفرنس پندرہ منٹ کی تاخیر سے شروع ہوگی۔ ایک ٹی وی چینل کے خصوصی شو میں یہ باتیں شروع ہوگئیں کہ فی الحال پشمینہ اور دانش یزدانی میں پریس کانفرنس کی نسبت سے مشاورت ہو رہی ہوگی۔

دوسرے ٹی وی چینل کے خصوصی شو میں پشمینہ کے ساتھ سیکیورٹی اور پروٹوکول کا نہ ہونے کے علاوہ ڈیبرا بھی زیر بحث آ چکی تھی۔

ڈیبرا کی پیدائش اسی ملک میں ہوئی تھی۔ ڈیبرا نے تعلیم بھی پشمینہ کے ساتھ حاصل کی تھی۔ دونوں میں دوستی اتنی گہری ہوگئی تھی کہ اس نے پشمینہ ہی کے ذریعے یہاں کی شہریت حاصل کر لی تھی اور برطانیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا تھا۔ برطانیہ سے اس کا دل اچاٹ ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی ماں کے انتقال کے بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔

یہاں وہ ایک اچھے اپارٹمنٹ میں دو ملازمین کے ساتھ، گویا تنہا رہتی تھی۔ اخراجات کے لیے اس کا باپ پیسا بھیجتا رہتا تھا۔ خاصے عرصے پہلے ڈیبرا نے ایک خفیہ ایجنسی میں شمولیت کرنا چاہی تھی۔ ایجنسی کی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا لیکن کئی ماہ کی نہایت سخت تربیت کے بعد اس میں کوئی نقص نکال کر اسے ایجنسی میں نہ لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، لیکن اس کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ یہ خیال کسی کو بعد از وقت آیا تھا کہ اگر اسے خفیہ ایجنسی میں رکھا گیا تو مذہبی سیاسی جماعتیں واویلا شروع کر دیں گی کیونکہ وہ نسلاً کرسچن تھی۔

اس کے بعد ہی سے ڈیبرا کو مستقل طور پر پشمینہ کے ساتھ دیکھا جانے لگا تھا۔ لوگوں کے خیال کے مطابق پشمینہ نے اسے اپنا ذاتی باڈی گارڈ بنا لیا تھا۔ اس پر بھی مذہبی سیاسی جماعتوں کی طرف سے نکتہ چینی ہوتی رہتی تھی لیکن پشمینہ نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی۔

''وہ کرسچن ہو یا کوئی خلائی مخلوق۔'' پشمینہ کہا کرتی۔ ''وہ میری دوست ہے اور ایسی دوست جو میرے پسینے کی جگہ اپنا خون بہا سکتی ہے، تو ایسی دوست کے لیے میں کیا کچھ نہیں کروں گی۔''

☆☆☆

میڈیا کے لوگ دیکھ چکے تھے کہ پریس کانفرنس کے لیے پشمینہ کو جہاں بیٹھنا تھا وہاں صرف دو کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ اسی لیے خیال کیا جا رہا تھا کہ پشمینہ کے ساتھ صرف دانش یزدانی بیٹھے گا لیکن اس وقت سب حیران رہ گئے جب دوسری کرسی پر انہوں نے ڈیبرا کو بیٹھتے دیکھا۔

ٹھیک سوا پانچ بجے پشمینہ نے بولنا شروع کیا۔ ابتدائی رسمی کلمات کے بعد اس نے کہا۔ ''میں محسوس کر رہی ہوں کہ ڈیبرا کو میرے ساتھ بیٹھا دیکھ کر سبھی کو حیرت ہو رہی ہے۔ میں اس بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ ڈیبرا کہنے کو میری صرف دوست ہے لیکن میں اسے سگی بہن کی طرح عزیز رکھتی ہوں۔ آپ اسے ہمیشہ میرے برابر ہی دیکھیں گے۔ یہ کہنے کے بعد میں اس موضوع کی طرف آتی ہوں جس کے لیے پریس کانفرنس ضروری سمجھی گئی۔'' پشمینہ لکھے بغیر بول رہی تھی۔ ''خاصے عرصے سے صدر مملکت کے خلاف میڈیا پر جو کچھ آ رہا تھا، میں اس کا دفاع کرتی رہی ہوں جس کا سبب یہ نہیں تھا کہ صدر مملکت کے وزرا کی طرح میں ان کی خوشامد جاری رکھوں اور یہ بھی سمجھوں کہ اگر وہ صدر نہ رہے تو میری وزارت بھی جائے گی اور میں ملک میں جاری قانونی قسم کی لوٹ مار بھی نہیں کر سکوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ میڈیا پر ان وزرا کی لوٹ مار کے متعلق بھی کہا جاتا رہا لیکن آج تک میرے خلاف اگر کچھ کہا گیا ہے تو صرف یہ کہ میں بھی دیگر وزرا کی طرح صدر مملکت کی بے جا حمایت کرتی

ہوں۔ آج مجھے واشگاف الفاظ میں تسلیم کرنا ہے کہ یہ الزام بہرحال غلط نہیں تھا۔ میں واقعی بے جا حمایت کرتی رہی ہوں جو ایک فطری امر تھا۔ سبھی جانتے ہیں کہ میں ان کی صرف وزیرِتعلیم نہیں تھی، کچھ اور بھی تھی اور اب بھی ہوں۔ عین ممکن ہے کہ میری یہ غلطی جاری رہتی لیکن اب صدر مملکت کے خلاف جو اسکینڈل سامنے آیا ہے، اسے میں برداشت نہیں کرسکی جس کے نتیجے میں میرے جو اقدامات تھے، وہ آپ سب کے اور پوری قوم کے علم میں آچکے ہیں۔ عوام پر جس حکومت کی زیادتیاں بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں، میں اب اس حکومت کا حصہ بنی رہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ایک ماہ پہلے تک میں صدر مملکت کی نسبت سے جو جھوٹ بولتی رہی ہوں، اس کے لیے قوم سے معافی کی خواستگار ہوں۔ اگر ممکن ہو تو یہ سوچ کر مجھے معاف کردیا جائے کہ خونی رشتے، اور خاص طور سے ایسے قریبی رشتے انسان کو بہت کمزور کر دیتے ہیں۔'' پشمینہ کی آواز قدرے بھرا گئی۔ اس نے خاموش ہوکر سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا کر پانی کے دو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے۔

صحافیوں کے تیزی سے چلتے ہوئے قلم رک گئے اور وہ بہ نظرِ تحسین پشمینہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی طرح ٹی وی چینلز پر بیٹھے ہوئے تجزیہ کاروں کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا جو پشمینہ کے خلاف سخت الفاظ بولتے رہے تھے۔

اس دوران میں ڈیبرا کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا رہا تھا کہ وہ پشمینہ کی باتیں توجہ سے نہیں سن رہی تھی۔ اس کی نظریں مسلسل ہر طرف ''گشت'' کررہی تھیں۔ سارا ماحول اس کی آنکھوں میں سمٹا ہوا تھا۔ وہ پشمینہ کی باڈی گارڈ کی حیثیت سے پوری طرح چوکس تھی۔

پانی کا گلاس رکھ کر پشمینہ نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''میں آپ حضرات کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتی۔ مجھے صرف دو باتیں اور کہنی ہیں۔ ایک تو اب یہ قیاس آرائیاں ختم ہوجانی چاہئیں کہ میں دانش یزدانی کی پارٹی میں شامل ہورہی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دانش میرے بہت اچھے دوست ہیں لیکن ان کے پارٹی منشور کے بعض نکات سے مجھے شدید اختلاف ہے اور اختلاف کرنا یا اختلاف برداشت کرنا ہی جمہوریت کا خوب صورت پہلو ہے۔'' پشمینہ پہلی بار مسکرائی۔ ''میں اور دانش ایک دوسرے کے اندازِ فکر کا احترام کرتے ہیں۔ دانش اپنے نظریات پر مضبوطی سے قائم ہیں اور میں اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی ہوں لیکن اس کا اثر ہماری دوستی پر نہ کبھی پڑا تھا، نہ پڑا ہے، نہ پڑے گا۔ یہاں میری ایک بات ختم ہوجاتی ہے۔ اب مجھے دوسری بات کہنا ہے۔'' پشمینہ نے خاموش ہوکر پانی کا گلاس اٹھایا۔

صحافیوں کے قلم پھر رک گئے۔ اُن کی انگلیوں کو قدرے تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کچھ لمحات میسر آگئے۔

دوسری بار بھی پشمینہ نے پانی کے دو گھونٹ لیے۔ پھر چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''میری خواہش تھی، اور ہے کہ میں اپنی ایک پارٹی بناؤں لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس کے لیے میرے پاس فنڈز نہیں۔ میرے پاس اگر کچھ ہے تو وہ ایک مضبوط پارٹی بنانے کے لیے استعمال نہیں کرسکتی کیونکہ وہ میرے والد کا دیا ہوا ہے۔'' پشمینہ نے پہلی مرتبہ ''صدر مملکت'' کے بجائے ''والد'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تجزیہ نگار اب تک یہ قیاس کرتے رہے ہیں کہ میں دانش یزدانی کی پارٹی میں شامل ہونے والی ہوں۔ اب چونکہ میں نے اس بارے میں اپنا فیصلہ سنا دیا ہے تو شاید مجھے دوسری سیاسی پارٹیوں سے منتھی کرنا شروع کردیا جائے لہٰذا میں یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ ملک میں اس وقت ایک بھی پارٹی ایسی نہیں جس سے مجھے کچھ نہ کچھ اختلافات نہ ہوں۔ اسی لیے کسی اور پارٹی میں بھی میری شمولیت ممکن نہیں۔ بس! مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ آپ لوگ کچھ سوالات کرنے کے لیے بے چین ہوں گے کیونکہ پریس کانفرنس کی ریت ہی یہی ہے۔'' پشمینہ دوسری مرتبہ مسکرائی۔ ''میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ضروری نہیں ہے کہ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔''

پھر پشمینہ نے تیسری بار پانی کا گلاس اٹھایا تو سوالات کی بارش ہوگئی۔ سبھی صحافیوں نے بولنا شروع کردیا تھا۔ اچھا خاصا شور مچ گیا۔

سوالات کچھ اس قسم کے تھے۔

''آپ نے سیکیورٹی اور پروٹوکول کیوں نہیں رکھا؟''

''اگر آپ کسی طرح اپنی پارٹی بنا سکیں تو آپ کا منشور کیا ہوگا؟''

''آپ کے استعفے کا صدرِ مملکت پر کیا ردِعمل ہوا؟ آخر آپ اُن کی بیٹی ہیں!''

''آپ نے یہاں آنے کے لیے اپنی کار کیوں استعمال نہیں کی؟''

''کیا آپ اب بھی قصرِ صدارت میں رہیں گی؟''

''دانش یزدانی صاحب سے آپ کا تعلق کس قسم کا ہے؟''

''آپ تو گھر کی بھیدی ہیں میڈم! کیا آپ کچھ ایسی باتیں بتانا پسند کریں گی جو اَب تک عوام کو نہیں معلوم؟''

اسی نوعیت کے کچھ اور سوالات بھی تھے لیکن شور اتنا مچ گیا تھا کہ پشمینہ وہ سوالات سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات نمایاں ہو گئے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس قسم کی پریس کانفرنس میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہے۔

اس موقع پر ڈیبرا نے ماحول درست کرنے کے لیے بولنا شروع کیا اور بمشکل تمام ماحول کو قابو میں کر سکی۔ تب پشمینہ نے کہا۔

''آپ لوگ جانتے ہیں کہ یہ میری پہلی پریس کانفرنس ہے۔ مجھے کبھی پریس کانفرنس کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بس جب ٹی وی چینلز والے مجھے لائن پر لیتے تھے تو میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیتی تھی۔ اسی لیے مجھے اُلجھن ہو رہی ہے کہ میں فرداً فرداً سب کے سوالات سنوں اور ان کے جوابات دوں۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ میں درخواست کروں گی کہ میری بات مان لی جائے۔ آپ ایک ایک کر کے سوالات کریں، یہ ڈیبرا کی ذمے داری ہوگی کہ وہ سب سوال لکھ لیے جائیں۔ میں وہ سوالات پڑھ پڑھ کر ایک ہی بار میں سب کو جواب دے دوں گی۔''

پشمینہ کی اس تجویز پر بھی بمشکل تمام عمل ہو سکا۔ تاہم سب سوالات جمع ہو گئے۔ ڈیبرا نے برطانوی ہوتے ہوئے بھی اردو اس حد تک سیکھ لی تھی کہ وہ لکھ بھی سکتی تھی اور اہلِ زبان کی طرح بول بھی سکتی تھی۔

لگ بھگ تیس سوال جمع ہو گئے تھے۔ پشمینہ نے ان سب پر نظر ڈالنی شروع کی۔ اس کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

''بہت سے سوالات ایسے ہیں جو یکساں نوعیت کے ہیں۔ بہر حال میں کوشش کرتی ہوں کہ آپ سب کو مطمئن کر سکوں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے یہاں پارلیمانی نظام ہے اور اس وقت خودمختار سیکولر پارٹی کی حکومت ہے جس کے سربراہ صدر مملکت خود ہیں۔ آپ لوگوں کا یہ احتجاج اب تک رائگاں ہی رہا ہے کہ انہیں پارٹی کی سربراہی چھوڑ دینی چاہیے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے کیونکہ اسی صورت میں پارٹی کے ہر فرد پر ان کی گرفت مضبوط رہ سکتی ہے۔ وزیراعظم بھی ان کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔''

''یہ تو ڈکٹیٹرشپ ہو گئی!'' کہیں سے ایک آواز آئی۔

''جو کچھ بھی ہے، آپ کے سامنے ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ دانش یزدانی میرے دوست ہیں۔ یہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ میں نے سرکاری سیکیورٹی اور پروٹوکول یوں نہیں لیا کہ......'' پشمینہ کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

پے در پے دو گولیاں چلی تھیں۔ دونوں گولیاں چلنے کا درمیانی وقفہ شاید ایک سیکنڈ کا بھی نہ ہو۔ ایک گولی پشمینہ کا بایاں بازو زخمی کرتی ہوئی گزری تھی اور دوسری گولی کے نتیجے میں وہاں موجود لوگوں میں سے ایک شخص گر کر تڑپنے لگا تھا۔

پشمینہ دیکھ ہی نہیں سکی تھی کہ ڈیبرا نے کتنی پھرتی سے ریوالور نکال کر اس شخص کو نشانہ بنایا تھا جس نے پشمینہ پر گولی چلائی تھی۔

فوراً ہی بھگدڑ مچ گئی اور شور بھی گونج اٹھا۔

پشمینہ تو پل بھر کے لیے دم بخود رہ گئی تھی۔ اسے بازو پر لگنے والے زخم کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ اسے اس کیفیت سے نکالنے والی ڈیبرا تھی جس نے اسے دایاں... بازو پکڑ کر اٹھایا تھا۔ اسی وقت دانش یزدانی اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

☆☆☆

ٹی وی چینلز اس پریس کانفرنس کو براہِ راست دکھا رہے تھے اس لیے کئی کیمروں نے وہ منظر بھی فلم بند کر لیا تھا جب ڈیبرا نے ریوالور نکال کر گولی چلائی تھی۔ اس کے ریوالور کا رخ لوگوں کی طرف تھا اس لیے یہ بات تو سمجھی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ پشمینہ کا بازو جس گولی سے زخمی ہوا تھا، وہ گولی ڈیبرا کے ریوالور سے نکلی ہوگی۔ اس کی گولی یقیناً اس شخص کے لگی تھی جس نے پشمینہ کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔

کئی ٹی وی چینلز پر فوراً ہی ''بریکنگ نیوز'' کی سلائڈ چلی اور لوگوں نے اناؤنسر کی چیختی ہوئی آواز سنی۔

''پشمینہ حیات پر عین اس وقت گولی چلائی گئی ہے جب وہ صحافیوں کے سوالات کے جواب دے رہی تھیں۔''

اناؤنسر کی آواز پس منظر میں تھی۔ اسکرین پر پریس کانفرنس کے ہال کا منظر چل رہا تھا۔ دانش یزدانی اور اس کے باڈی گارڈ پشمینہ اور ڈیبرا کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہال کے اندرونی دروازے سے عمارت میں جا رہے تھے۔

اناؤنسر نے جائے واردات پر موجود اپنے چینل کے نمائندے سے رابطہ کر کے اس سے وہاں کی صورتِ حال

کے بارے میں پوچھا۔
اسکرین پر جائے واردات کے منظر میں ٹی وی کا نمائندہ بھی دکھائی دینے لگا جو کہہ رہا تھا۔ ''جی ہاں، پریس کانفرنس میں اس وقت گولیاں چلیں جب پشمینہ حیات صحافیوں کے سوالوں کا جواب دے رہی تھیں۔ فوراً ہی بھگدڑ مچ گئی تھی جو اَب رک گئی ہے۔ پشمینہ حیات اور ان کی ساتھی ڈیبرا کو دانش یزدانی اور ان کے باڈی گارڈز عمارت کے اندر لے جا چکے ہیں۔ یہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے اور اس کے قریب ہی ریوالور بھی دیکھا جاسکتا ہے۔''
کیمرے نے لاش کے ساتھ اس کے قریب ہی پڑا ہوا ریوالور بھی دکھایا۔ لاش خون میں لت پت اوندھی پڑی تھی اس لیے اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ شخص کس عمر کا ہوگا۔
ٹی وی کا نمائندہ کہہ رہا تھا۔ ''اب یہاں پولیس بھی پہنچ چکی ہے اور تیزی سے لاش کی طرف بڑھ رہی ہے۔ صحافی حضرات بہت پریشان نظر آرہے ہیں۔ انہیں اب پولیس نے یہاں روک بھی لیا ہے۔ کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے اور اب یہ دیکھیں، دانش یزدانی اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ دوبارہ ہال میں آرہے ہیں۔''
ٹی وی نے ان لوگوں کو بھی دکھایا۔
''پشمینہ حیات کے بارے میں کچھ بتائیں؟'' اناؤنسر نے کہا۔
''وہ اپنے پیروں پر چل کر اندر گئی ہیں اس لیے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کے بازو پر ہی زخم آیا ہے۔ ان کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔ میں دانش یزدانی کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ پشمینہ حیات کے بارے میں اب انہی سے پوچھا......''
نمائندے کی آواز یکا یک بند ہوگئی۔
اناؤنسر کی آواز آئی۔ ''معاف کیجیے گا۔ نمائندے سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ رابطہ دوبارہ ہو جائے اور آپ کو ایک ایک پل کی صورتِ حال سے آگاہ کیا جاتا رہے۔''
اسی وقت ٹی وی اسکرینز سے ہال کا منظر غائب ہوگیا اور چند لمحے بعد بتایا گیا کہ پولیس نے کیمرے بند کروا دیے تھے۔
ٹی وی اسکرینز پر اب صرف اناؤنسر دکھائی دے رہی تھی اور ٹی وی کا نمائندہ موبائل پر کہہ رہا تھا۔ ''دانش یزدانی سے بات نہیں ہوسکی۔ باڈی گارڈز نے ان کے قریب جانے ہی نہیں دیا۔ اب یہاں کسی کو بھی لاش کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہے۔ دانش یزدانی کو بھی لاش کے قریب نہیں جانے دیا گیا۔ اب پولیس ان سے کچھ بات کررہی ہے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر رفیقی، دانش یزدانی کا مستقل ڈاکٹر تھا جو دانش منزل ہی میں رہتا تھا اور دانش یزدانی کہیں جاتا تھا تو اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اسی نے پشمینہ کے بازو کی ڈریسنگ کی تھی۔ زخم بھی معمولی نوعیت کا آیا تھا۔ اس وقت پشمینہ دانش منزل کے جس کمرے میں تھی، وہیں اس کے ساتھ دانش یزدانی کی والدہ اور بہن بھی تھیں۔ ڈیبرا وہاں نہیں تھی۔
کمرے میں ٹی وی پر خبریں نشر ہورہی تھیں۔ ان تینوں کی توجہ ٹی وی ہی پر تھی لیکن پشمینہ کے معاملے میں بظاہر ہی ایسا تھا۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات گردش کررہے تھے۔
دانش یزدانی وہاں آیا تو ان تینوں ہی نے اس کی طرف دیکھا۔
''پولیس ڈیبرا کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔'' اس نے پشمینہ سے کہا۔ ''مجھ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اسے ان کے حوالے کردوں۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں سے جا چکی ہے لیکن انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اس کا امکان ہے کہ جلد ہی وہ دانش منزل کی تلاشی کا اجازت نامہ حاصل کرلیں۔ فی الحال تو وہ تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آرہا ہوں۔''
پشمینہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ ''ٹھیک ہے۔''
''خدا سب خیر کرے۔'' دانش کی والدہ نے متفکر لہجے میں کہا۔
بہن متفکر نظر آرہی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔
دانش یزدانی کے ساتھ پشمینہ ڈرائنگ میں پہنچی۔ وہاں دو پولیس آفیسر موجود تھے۔ ایک کانسٹیبل بیرونی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔
''میڈم!'' ایک پولیس آفیسر بولا۔ ''آپ کا زخم معمولی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔''
''جی ہاں۔'' پشمینہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
''آپ اس کی ایف آئی آر کس کے خلاف درج کروائیں گی؟''
''میں ایف آئی آر ہی درج نہیں کرانا چاہتی۔ پولیس اپنے طور پر درج کرنا چاہے تو کرلے۔''

''معاملہ کیا ہوا ہے؟''
''مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے جس کی لاش باہر پڑی ہے۔ اس نے مجھے ختم کرنا چاہا تھا لیکن ڈیبرا کی پھرتی نے میری جان بچالی۔ وہ میرے برابر میں بیٹھی تھی۔ اس کا وینیٹی بیگ اس کی گود میں تھا۔ ریوالور اسی میں تھا۔ جیسے ہی اس نے ایک شخص کو ریوالور نکالتے دیکھا، اس نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال کر اس پر گولی چلا دی۔ وہ گولی اسے غالباً عین اس وقت لگی جب وہ ٹریگر دبا چکا تھا۔ ڈیبرا کی گولی لگنے ہی کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا گیا ورنہ اس قسم کے کام جس سے بھی کروائے جاتے ہیں، وہ بڑا سچا نشانے باز ہوتا ہے۔ ڈیبرا اتنی پھرتی اس لیے دکھا سکی کہ اس کا ہاتھ کھلے ہوئے وینیٹی بیگ میں رکھے ریوالور کے دستے پر تھا۔''
''تو کیا ڈیبرا کو اس کا علم تھا کہ آپ پر کوئی گولی چلائے گا؟''
''باڈی گارڈ کو ہر قسم کی صورتِ حال کی توقع رکھنی پڑتی ہے۔''
''وہ آپ کی دوست ہے یا باڈی گارڈ؟''
''دوست بھی اور باڈی گارڈ بھی۔''
''کیا اس امکان کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے کہ وہ شخص دراصل کسی اور کو نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن ڈیبرا کی گولی لگنے کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا گیا اور وہ گولی اس کے اصل ٹارگٹ کے بجائے آپ کے بازو پر جا لگی۔''
''خوب!'' پشمینہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''پولیس کو اتنا ہی سمجھدار ہونا چاہیے۔''
''پہلی گولی ڈیبرا نے چلائی۔ یہ آپ ابھی خود بھی کہہ چکی ہیں۔ اس طرح ان پر قتل کا الزام ہوتا ہے۔ ہم اس کی گرفتاری چاہتے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟''
''اسے میں نے یہاں سے فوراً بھگا دیا تھا۔'' پشمینہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
''جی!'' پولیس آفیسر کے منہ سے نکلا۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں ہوگی۔
''ہاں۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ ایسی کوئی بات ہوسکتی ہے لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ اسے بھگا دیا جائے۔ وہ صرف کل تک روپوش رہے گی۔ کل اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کرالی جائے گی۔''
''یہ فرار تو ممکن نہیں۔ پولیس شروع ہی سے عمارت کے سامنے موجود رہی ہے۔''
''اسے عقبی دروازے سے نکالا گیا ہے۔ اس کے بجائے آپ مجھے گرفتار کرلیں۔'' پشمینہ نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کے مجرم کو بھگایا ہے میں نے، جرم میں معاونت بھی تو جرم ہے۔''
''ہمیں جو حکم ملا ہے، ہم وہی کر سکتے ہیں۔''
''کہاں سے حکم ملا ہے؟''
''بہت اوپر سے۔''
''تو آپ تعمیل کی کوشش کیجیے...... اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکی۔''
دونوں پولیس افسروں کے چہروں سے بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا۔ انہیں کتنی ہی سختی کرنے کے احکام کیوں نہ ملے ہوں، ان کے ذہن سے یہ بات بہرحال نہیں نکل سکتی تھی کہ وہ ملک کے صدر کی بیٹی سے مخاطب تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے اور پھر وہ کھڑے ہوگئے۔
''ہمیں اجازت؟'' ایک نے پشمینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
پشمینہ بولی۔ ''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، اب آپ جا سکتے ہیں۔''
ان باتوں کے دوران میں دانش یزدانی بالکل خاموش رہا تھا۔ پولیس افسروں کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ ''تم نے تو انہیں گیدڑ بنا دیا!''
''ہماری پولیس اسی قابل ہو چکی ہے۔ یہ شیر دل اس وقت بنتی ہے، جب مقابل کوئی غریب، کوئی معمولی شخص ہوتا ہے۔''
''مجھے گھیرنے کی کوشش تو کی جائے گی۔ الزام مجھ پر ہی لگے گا ڈیبرا کو فرار کرانے کا۔''
''تم فوری طور پر اپنے قانونی مشیروں سے بات کرو۔ میں اب چلتی ہوں۔ آئندہ وقت کے لیے تو سیاست دانوں، قلم کاروں اور میڈیا والوں کو بدترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جانا چاہیے۔ میرے علم کے مطابق صدر مملکت کی تیاری تو غالباً مکمل ہو چکی ہے۔ میں یہ بات صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ جو تیاری کی گئی ہے، اس پر بہت جلد عمل بھی شروع ہوگا اور لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ اب ملک پر مکمل ڈکٹیٹر شپ قائم ہو چکی ہے۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' دانش یزدانی بہت سنجیدہ نظر آیا۔ ''کیا تیاری کی ہے صدر حیات نے؟''
''کنٹری سیورز (COUNTRY SAVERS) کے نام سے ایک ادارہ بہت جلد کام شروع

کرنے والا ہے۔ اس کے اہلکاروں کے اختیارات، سمجھ لو کہ لامحدود ہوں گے۔ کسی کو بھی کوئی جواز بتائے بغیر گرفتار کیا جاسکے گا۔ اس کا سربراہ غالباً لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی کو بنایا جائے اور یہ بات تو اب خاصی مشہور ہو چکی ہے کہ وہ صرف نام کا چنگیزی نہیں، واقعی چنگیزی ہے۔''

''بہت ہی خوفناک اور تشویش کن خبر دے رہی ہو تم!'' دانش یزدانی خاصا متفکر ہو گیا۔

''اور یہ تیاری اتنی رازداری سے کی گئی ہے کہ میڈیا کے زیرک ترین رپورٹرز کو اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکی۔ مجھے اس کا علم اس لیے ہے کہ نیا اسکینڈل سامنے آنے سے پہلے صدرِ مملکت کو مجھ پر مکمل اعتماد تھا۔ میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ یہ میں صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ مطلب یہ کہ ابھی کسی اور کو نہ بتانا۔ بات کا شہرہ ہو گیا تو صدرِ مملکت یہی سمجھیں گے کہ میں نے ہی یہ سب کچھ آشکارا کیا ہے۔ میری ممی اور بھائی جان بھی اس سے واقف نہیں۔ مجھے یہ بات اس لیے بتا دی گئی کہ شاید مجھے وزارتِ تعلیم سے ہٹا کر کنٹری سیورز میں کوئی منصب دیا جاتا۔''

اب دانش یزدانی کے چہرے پر تفکر کے ساتھ ساتھ غور و فکر کے تاثرات بھی تھے۔

''اچھا!'' پشمینہ کھڑی ہوئی۔

''پولیس اور اب تمہاری ان باتوں کی وجہ سے میں سوال ہی نہیں کر سکا کہ اب رہو گی کہاں؟'' دانش بھی کھڑا ہو گیا۔

''کیا مطلب؟ ظاہر ہے کہ وہیں رہوں گی جہاں رہتی ہوں۔''

''اس واقعے کے بعد بھی؟'' دانش یزدانی نے حیرت سے کہا۔

''تمہارا اشارہ قاتلانہ حملے کی طرف ہے؟''

''یقیناً'' دانش نے زور دے کر کہا۔ ''اب تم قصرِ صدارت میں خود کو محفوظ کیسے سمجھ سکتی ہو؟''

''نہیں دانش۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ابھی وہ اس حد تک نہیں جا سکتے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کروائیں۔ اس میں کسی اور کا ہاتھ ہے۔ کھوج لگانا پڑے گا اس کا۔''

''میں تو کہوں گا کہ تم خوش فہمی کا شکار ہو رہی ہو۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ اقتدار کے لیے باپ اور بھائیوں تک کو بلکہ اولاد کو بھی نہیں بخشا گیا۔ ابھی تم کنٹری سیور نامی ادارے کی بات کر چکی ہو، ممکن ہے کہ اسے آج ہی سے فعال کیا گیا ہو۔ تم پر فائر کرنے والے کا تعلق اس ادارے سے ہو سکتا ہے۔''

''نہیں دانش! اگر اس ادارے کو فعال کیا جا چکا ہوتا تو تم اب تک گرفتار کیے جا چکے ہوتے۔ تمہاری گرفتاری کے لیے تو جواز بھی دے دیا جاتا۔''

''میرے خلاف کیا جواز بنتا؟''

''یہی کہ تم نے یہ پریس کانفرنس اپنے گھر میں اسی لیے کروائی تھی کہ مجھے بہ آسانی ختم کر سکو۔''

''تمہیں قتل کروانے کا میرے پاس کیا جواز ہو سکتا ہے؟''

''میں اب جس روپ میں سامنے آئی ہوں، اس روپ میں اگر کوئی سیاسی پارٹی بناتی ہوں تو بہت تیزی سے وہ پارٹی ملک کی سب سے مقبول سیاسی پارٹی بن جائے گی جس سے تمہاری پارٹی کی مقبولیت میں بھی کمی آئے گی۔''

دانش یزدانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ اندازہ تو مجھے ہے کہ اگر تم نے پارٹی بنائی تو وہ اس ملک کی سب سے مقبول پارٹی ہوگی جو اگلے سال ہونے والے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگی۔''

''انتخابات میں کامیابی۔'' پشمینہ ہنس پڑی۔ ''خام خیالی ہے تمہاری کہ انتخابات ہوں گے۔ صرف ریفرنڈم ہوگا اور وہ بھی کچھ اس انداز سے کہ اس میں برسرِ اقتدار پارٹی ہی کامیاب ہوگی۔ اس کا پلان تو تیار بھی کیا جا چکا ہے۔''

''او، مائی گاڈ!'' دانش یزدانی کے منہ سے نکلا، پھر اس نے کہا۔ ''پریس کانفرنس میں کسی صحافی کی یہ بات ٹھیک ہی تھی کہ گھر کی بھیدی ہو اس لیے بہت کچھ بتا سکتی ہو!''

''ٹھیک کہا تھا اس نے۔'' پشمینہ نے اب دروازے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیے تھے۔ ''لیکن جو باتیں میں تمہیں بتا رہی ہوں، پریس کانفرنس میں ہرگز نہیں کہتی۔ انہی باتوں کی روشنی میں تم اپنا مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرو۔''

دانش یزدانی نے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔

''ہاں! ایک بات پوچھنا تو بھول ہی گئی۔'' پشمینہ ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے دو باڈی گارڈ بھی ڈیبرا کے ساتھ گئے تھے۔ ڈیبرا نے انہیں کہاں سے واپس کیا تھا؟''

''میں بھی تمہیں یہ بتانا بھول گیا۔ باڈی گارڈز نے بتایا ہے کہ وہ ایک بارونق سڑک پر گاڑی سے اتر گئی تھی۔ کسی محفوظ ٹھکانے تک نہیں پہنچی تھی۔''

''اس بارے میں مت سوچو۔ وہ بہت ذہین ہے۔ اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہے۔ میں نے بھی اس سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ وہ فوری طور پر یہاں سے نکل جائے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے برآمدے تک پہنچ گئے تھے۔ سامنے ہی پشمینہ کی کار موجود تھی۔ شوفر کار کے قریب کھڑا تھا۔ پشمینہ کو دیکھ کر وہ کار کے پچھلے دروازے کے بالکل قریب ہو گیا تاکہ پشمینہ کے قریب آتے ہی اس کے لیے پچھلا دروازہ کھول سکے۔

''میں کوشش کروں گی کہ تم سے مستقل رابطہ رہے۔''

''تو تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کرو گی؟ قصرِ صدارت ہی جاؤ گی؟''

''ہاں۔''

''میرے لاشعور میں کوئی بات کھٹک رہی ہے۔ وہ کوئی دلیل ہے جو تمہیں خطرے کا یقین دلا دے اور تم قصرِ صدارت نہ جاؤ۔''

''محض خیال ہے تمہارا۔ ایسی کوئی دلیل نہیں ہو گی تمہارے دماغ میں۔'' پشمینہ نے کہا، پھر مسکرا کر بولی۔ ''اگر وہ تمہارے لاشعور سے شعور میں آجائے تو مجھے اطلاع دینا۔'' وہ بات ختم کر کے بھی مسکراتی رہی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ قاتلانہ حملے نے اسے ذرا بھی خوف زدہ نہیں کیا تھا۔

''فی الحال تمہاری باڈی گارڈ ڈیبرا بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔'' دانش نے اس وقت کہا جب شوفر نے پشمینہ کے لیے کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ''میں اپنے باڈی گارڈز کی ایک گاڑی تمہاری کار کے پیچھے بھیجوں گا۔ قصرِ صدارت سے وہ گاڑی واپس آجائے گی۔ اب تم سرکاری سیکیورٹی نہیں لینا چاہتیں تو میری ہی طرح پرائیویٹ گارڈز کا بندوبست کرو۔''

پشمینہ جواب میں کچھ کہے بغیر صرف سر ہلاتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی۔

اس وقت وہاں اس اعتبار سے سناٹا تھا کہ لاش ہال سے اٹھوانے کے بعد پولیس بھی رخصت ہو چکی تھی اور صحافی حضرات بھی جا چکے تھے۔

☆☆☆

ڈیبرا، دانش یزدانی کے گارڈز کی گاڑی سے جس جگہ اتری تھی، وہاں سے ایک چوراہے کا سگنل چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ڈیبرا یہ بھی دیکھ چکی تھی کہ سگنل کی سبز روشنی بند ہونے کے بعد زرد روشنی نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹریفک کی رفتار سست پڑی تھی اور سرخ روشنی ہوئی تو سب گاڑیاں رک چکی تھیں۔

ڈیبرا انہی گاڑیوں کے ہجوم میں داخل ہو کر باڈی گارڈز کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اسے ایک خاص قسم کی کار کی تلاش تھی۔ آخر اسے وہ کار دکھائی دے گئی۔ اس کار کی ''خصوصیت'' یہ تھی کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان کے سوا کار میں کوئی نہیں تھا۔

''پلیز! کیا آپ مجھے لفٹ دے سکتے ہیں؟''

نوجوان اسے دیکھ کر چونکا۔ وہ یقیناً اسے پہچان کر چونکا ہو گا۔ پشمینہ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے عام لوگ بھی اسے پہچانتے تھے۔

''جی...... جی ہاں، ضرور۔'' نوجوان نے جلدی سے کہا۔

ڈیبرا بہت تیزی سے دروازہ کھول کر نوجوان کے برابر میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ''دراصل اچانک میری کار خراب ہو گئی اور مجھے کہیں پہنچنے کی بہت عجلت ہے۔'' کار کا دروازہ کھولتے وقت اس نے دستانے پہن لیے تھے جو اس کے وینیٹی بیگ میں رہتے ہی تھے۔

''آپ پشمینہ حیات صاحبہ کے ساتھ تھیں نا پریس کانفرنس میں!'' نوجوان بولا۔ ''وہاں قتل ہو گیا۔ ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں لیکن مجھے ایک ضروری کام تھا اس لیے گھر سے نکل پڑا۔''

''آپ نے مجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کی ہے۔'' ڈیبرا نے دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اس کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے پسند آیا ہو۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ ایسی مسکراہٹ اور نگاہِ غلط انداز کا نوجوانوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔

''جی...... جی......'' نوجوان ریشہ خطمی ہوتا نظر آیا۔ ''آپ کو...... آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''آپ جس طرف جا رہے ہیں اسی طرف چلیے۔ اگر مجھے کہیں اور جانا ہو گا تو میں اس جگہ آپ کی گاڑی سے اتر کر کسی اور سے لفٹ لے لوں گی۔ شاید ٹیکسی ہی مل جائے۔ جہاں سے آپ کی کار میں بیٹھی ہوں، وہاں سے ٹیکسی ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''آپ میرے کام کی پروا مت کیجیے۔ میں آپ کو وہیں پہنچا دوں گا جہاں آپ کو جانا ہے۔''

ڈیبرا کو نوجوان سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اس کی نگاہِ غلط انداز نے نوجوان کو ''ڈھیر'' کر دیا تھا۔

''ابھی تو سیدھے چلتے رہیے۔'' ڈیبرا نے کہا۔

''جہاں سے کسی طرف مڑنا ہوگا، میں بتادوں گی۔''
''میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کو اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔'' نوجوان کی آواز اس مرتبہ بھرائی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً جذباتی ہو چکا ہے۔
ڈیبرا نے اسے ایک بار پھر اسی مسکراہٹ اور نگاہِ غلط انداز سے دیکھا جیسے ایک بار دیکھ چکی تھی۔ پھر فوراً ہی ایک جگہ اسے گاڑی بائیں سڑک پر موڑنے کے لیے کہا۔
ڈیبرا کو اب یقین تھا کہ نوجوان اس کے اشارے پر ناچتا رہے گا۔ اس وقت اس نے اپنا موبائل نکالا اور گریٹا میلسی کے موبائل سے رابطہ کیا۔
گریٹا میلسی کہنے کو تو اس کی ملازمہ تھی جس کی عمر پینتالیس سال سے کچھ زیادہ ہوگی لیکن ڈیبرا نے اسے کبھی ملازمہ نہیں سمجھا تھا۔ برطانیہ میں وہ اس کی گورنس تھی۔ ڈیبرا کا زیادہ وقت اس کی گود میں گزرا تھا۔ وہ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھی اور اس نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے ڈیبرا سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ جب ڈیبرا برطانیہ چھوڑ کر یہاں آئی تو گریٹا بھی اس کے ساتھ آگئی تھی۔ اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ ڈیبرا سے دور ہو جائے۔ سو ڈیبرا کے اپارٹمنٹ میں ہی رہتی تھی اور تمام گھریلو کام کی ذمے داریاں اسی نے سنبھال رکھی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد ڈیبرا اسے ''ماسی'' کہنے لگی تھی۔
''یس ڈیبو!'' دوسری طرف سے گریٹا میلسی کی آواز آئی۔ ''شکر ہے کہ تم نے مجھے فون کرلیا۔ میں ٹی وی کی خبریں سن سن کر بہت گھبرا رہی تھی۔ تم ٹھیک ہو نا؟''
''میں بالکل ٹھیک ہوں ماسی!' ڈیبرا نے انگریزی میں کہا۔ گریٹا اردو بہت کم جانتی تھی۔ 'میں جو کچھ کہوں، اس پر بہت تیزی سے عمل کرنا ہے۔ تم میرا وہ لباس نکالو جو میں بہت خاص موقعوں پر پہنتی ہوں۔'' وہ لباس ''ساڑی'' تھی لیکن اس نوجوان کے سامنے وہ ''ساڑی'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی...... اس نے ایسے الفاظ میں، جن سے نوجوان واضح طور پر بات نہ سمجھ سکے، گریٹا کو ہدایت کی کہ وہ ساڑی لے کر نکلے اور ٹیکسی کر کے وہاں سے روانہ ہو۔ اس نے ٹیکسٹائل ملز کے علاقے کی ایک سڑک کا نام بتایا جہاں گریٹا کو پہنچنا تھا۔ اس نے اس سڑک پر لگے ہوئے ایک ہورڈنگ کی بھی نشاندہی کی جہاں پہنچ کر اسے کار چھوڑ دینی تھی اور موبائل پر اس سے رابطہ کرنا تھا۔
''اس علاقے میں کیوں جارہی ہیں آپ؟'' نوجوان نے اس سے اس وقت پوچھا جب وہ موبائل بند کر چکی تھی۔
''اگر تمہیں جلدی ہے ڈیئر تو مجھے کہیں بھی اتار دو۔''
ڈیبرا نے اس مرتبہ بے تکلفی اختیار کی۔ لفظ ''ڈیئر'' نے تو نوجوان کے دماغ میں چھنا کا کردیا ہوگا۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' نوجوان نے جلدی سے کہا۔ ''بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔''
''وہاں سے میں کہیں اور جاؤں گی۔ وہاں ایک صاحبہ میرا انتظار کررہی ہوں گی۔ وہ ایک ٹیکسٹائل مل کے مالک کی بیٹی ہیں۔ تمہیں بس وہیں تک زحمت دوں گی۔''
''اچھا اچھا۔'' نوجوان نے سر ہلایا۔ ''وہ میٹنگ پوائنٹ ہے۔''
''ہاں۔'' ڈیبرا ہنسی۔ ''یہی کہہ لو۔''
''کیا آپ سے آئندہ کبھی ملاقات ہوسکتی ہے؟''
نوجوان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''صدارتی محل تو میں شاید...... میرا مطلب ہے وہاں تو آپ مجھے بلا نہیں سکتیں شاید......''
''میرا اپنا اپارٹمنٹ ہے۔ قصرِ صدارت تو میں اس وقت جاتی ہوں جب پشمینہ صاحبہ مجھے طلب کرتی ہیں۔''
''آپ اپنا موبائل نمبر دے دیں گی؟'' نوجوان کا انداز ملتجیانہ سا تھا۔
''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔''
ڈیبرا نے اسے ایک فرضی فون نمبر بتایا جو اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر اپنے موبائل میں فیڈ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی آپ کو مس کال دے دیتا ہوں۔ میرا نمبر بھی آپ کے پاس آجائے گا۔''
''نہیں، پلیز! جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھالیے۔ کوئی ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتا ہے تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔''
''ارے!'' وہ ہنسا۔ نمبر اس نے فیڈ کرلیا تھا۔ موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ ''جب آپ میری کار سے اتر کر اپنی دوست کی کار میں جائیں گی، اس وقت دے دوں گا آپ کو مس کال۔''
''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''
پھر نوجوان اس سے پریس کانفرنس کی واردات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ڈیبرا نے اسے مختصر طور پر جواب دینے کے بعد کہا۔ ''اس کے بعد ہی میں پشمینہ صاحبہ کا ایک پیام لے کر کسی سے ملنے جارہی ہوں۔''
''آپ ان کی باڈی گارڈ ہیں نا، آپ نے اس آدمی پر گولی چلائی تھی جس نے پشمینہ صاحبہ پر فائر کیا تھا۔''
ڈیبرا نے اس بات کی نفی نہیں کی کیونکہ اس کے

اندازے کے مطابق ٹی وی چینلز پر یہ بات نشر ہوجانا لازمی تھا۔

''باڈی گارڈ کی حیثیت سے مجھے یہ کرنا ہی تھا۔'' اس نے کہا۔

''آپ انگلش ہیں لیکن بہت صاف اردو بولتی ہیں۔''

ڈیبرا ہنس دی۔

انہی باتوں میں وہ سڑک آگئی جہاں ڈیبرا نے گریٹا کو بلایا تھا۔

''اب......'' ڈیبرا نے کہا۔ ''بائیں جانب کی ایک گلی چھوڑ کر دوسری گلی میں مڑنا ہے۔''

''یہ تو بڑی پتلی گلیاں ہیں۔'' نوجوان کچھ الجھ کر بولا۔

''بات نہیں سمجھو گے تم ڈیئر! کوئی وجہ ہے اس کی۔'' ڈیبرا نے کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔

یہ بڑا موثر حربہ تھا۔ اگر کوئی خوب صورت اور اجنبی لڑکی کسی نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے تو وہ شاید کسی اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوسکتا ہے۔

نوجوان نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کار اس گلی میں موڑ دی جہاں ڈیبرا جانا چاہتی تھی۔

اس گلی میں دو بہت بڑی ٹیکسٹائل ملز کی عقبی دیواریں تھیں۔ یہاں کسی کا آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود یہ گلیاں کیوں تھیں؟ ڈیبرا کو اس کا علم نہیں تھا۔ دو تین مرتبہ وہ اس سڑک سے گزر چکی تھی اس لیے یہ گلیاں بھی اس کی نظروں میں آئی تھیں۔ ان کا نظر میں آنا آج اس کے کام بھی آنے والا تھا۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی تھی، وہ سڑک پر ممکن نہیں تھا۔ اِکا دُکا گاڑیاں یا ٹرک وہاں سے گزرتے ہی رہتے تھے لیکن ان گلیوں میں سناٹا ہی رہتا تھا۔

سڑک کی بہ نسبت وہاں کچھ تاریکی بھی تھی۔ شام کے چھ ساڑھے چھ بجے کا درمیانی وقت ہو چکا تھا۔

بمشکل ایک فرلانگ آگے نکلنے کے بعد ڈیبرا نے کار رکوائی اور پھر نوجوان کے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکا تھا کہ ڈیبرا نے کب اپنے وینیٹی بیگ سے ریوالور نکالا تھا۔ وہ اس نے نال سے پکڑ کر اس کا دستہ نوجوان کی کنپٹی پر مارا تھا۔ ضرب لگتے ہی نوجوان اپنی سیٹ پر ایک طرف ڈھلک گیا۔

جس زمانے میں ڈیبرا خفیہ ایجنسی میں جانے کے لیے تربیت حاصل کر رہی تھی، اسی زمانے میں اس نے سیکھا تھا کہ کسی انسان کی کنپٹی پر کس جگہ کتنی زور سے ضرب لگا کے اسے کتنی دیر کے لیے بے ہوش کیا جاسکتا ہے۔

ڈیبرا کے اندازے کے مطابق وہ نوجوان اب آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتا تھا۔

نوجوان کو بے ہوش کرنے کے بعد ڈیبرا نے گلی میں دونوں جانب دور تک نظر دوڑائی اور پھر اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔

پھر دس منٹ گزرے تھے کہ موبائل پر گریٹا میلسی کی کال آگئی۔ اس نے اطلاع دی کہ اس نے ڈیبرا کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر ٹیکسی چھوڑ دی ہے۔

ڈیبرا نے اسے بتایا کہ وہ کس جانب کتنا چل کر اس گلی میں پہنچ سکتی ہے جہاں وہ اس وقت ایک بے ہوش نوجوان کی کار میں تھی۔ اس نے گریٹا کو کار کا نمبر اور رنگ بھی بتا دیا۔

تین چار منٹ بعد ہی گریٹا وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ وہ سب کچھ تھا جو ڈیبرا نے منگوایا تھا۔

گریٹا جب ڈیبرا کے کہنے پر دروازہ کھول کر کار میں بیٹھی تو اس نے بے ہوش نوجوان کو بھی دیکھ لیا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''سب کچھ بتا دوں گی۔ پہلے میں تیار ہو جاؤں۔'' ڈیبرا نے اس سے کہا۔

کار میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے لباس تبدیل کیا۔ ساڑی باندھنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ اپنے کٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا جو اس کے شانوں تک تھے۔ پھر اس نے گریٹا کی لائی ہوئی باسکٹ سے لمبے بالوں کی ایک وِگ نکال کر اپنے سر پر سیٹ کی۔ اس کے بعد اپنے چہرے پر گہرا میک اپ شروع کیا۔ عام حالت میں وہ میک اپ تو کیا، ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک بھی نہیں لگاتی تھی۔ سب کچھ اس نے بڑی تیزی سے کیا تھا، پھر بھی اس میں دس منٹ لگے۔ نوجوان کو بے ہوش ہوئے پچیس منٹ گزرنے کو تھے۔ پانچ منٹ بعد اسے ہوش آسکتا تھا۔

گریٹا کی مدد سے اس نے نوجوان کو پچھلی نشست کے پائیدان میں ڈال دیا اور خود بھی پچھلی نشست پر بیٹھی گھڑی دیکھتی رہی۔ اسے نوجوان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا تھا تاکہ اسے دوبارہ بے ہوش کر سکے۔ اسے تربیت کے دوران میں بتایا گیا تھا کہ کسی کو بے ہوشی کی حالت میں کنپٹی پر ضرب لگا کر دوبارہ بے ہوش کرنے سے کبھی اس کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔

ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھی گریٹا خاموشی سے

سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔ ڈیبرا کا یہ بدلا ہوا حلیہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ اس کا متعدد بار کا دیکھا ہوا تھا۔

بے ہوش نوجوان کلبلایا تو ڈیبرا نے نال کی طرف سے ریوالور پکڑ لیا پھر جیسے ہی نوجوان نے ہڑبڑا کر اٹھنا چاہا، ڈیبرا نے اس کی دوسری کنپٹی پر ضرب لگا دی۔ وہ پھر بے ہوش ہوگیا۔ ڈیبرا نے اس پر ایک چادر ڈال دی جو اسی سامان میں تھی جو اس نے گریٹا سے منگوایا تھا۔

ڈیبرا بڑی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''پچیس منٹ کے اندر اندر مجھے یہ کار چھوڑنی ہوگی۔''

کار وہ سیدھی لیے چلی گئی اور دوسری جانب کی سڑک پر پہنچ کر اس کا رخ شہر کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا۔

اب رات کا اندھیرا اتر آیا تھا اس لیے ڈیبرا کار کی ہیڈ لائٹ بھی کھول چکی تھی۔

کار کی رفتار... بڑھاتے ہوئے ڈیبرا نے گریٹا کو سب کچھ بتانا شروع کیا۔ وہ اس پر اتنا ہی اعتماد کرتی تھی جتنا خود پر۔

سب کچھ بتانے کے بعد اس نے کہا۔ ''کل تک تمہیں اکیلا ہی رہنا ہے۔ ابھی میں نہیں کہہ سکتی کہ کب آسکوں گی۔ انحصار اس بات پر ہے کہ کل مجھے ضمانت قبل از گرفتاری مل سکے گی یا نہیں۔ امید تو ہے کہ پشمینہ کی وجہ سے کل ہی یہ کام ہوجائے گا۔''

سب کچھ جاننے کے بعد گریٹا متفکر تو ہوئی لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ پندرہ منٹ بعد ہی کار ایک ایسی سڑک پر دوڑ رہی تھی جہاں ٹریفک بہت زیادہ تو نہیں لیکن کم بھی نہیں تھا۔

ڈیبرا نے کار ایک ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب روکی۔

''اب تم گھر جاؤ ماسی!...... میرا کوئی بھی فون آئے تو یہی جواب دینا کہ میں ابھی گھر نہیں آئی۔''

''اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر گریٹا کار سے اتر گئی۔

ڈیبرا نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ وہ فوراً کار حرکت میں لے آئی۔ نوجوان کو دوبارہ بے ہوش ہوئے پچیس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ڈیبرا نے کار ایک بڑی مارکیٹ کے سامنے روکی جہاں اور بھی کاریں کھڑی تھیں۔

جب وہ کار سے اتری تو اس کی آنکھوں پر بظاہر نظر کا چشمہ تھا لیکن اس میں لگے ہوئے سفید شیشے پلین تھے۔ اس وضع قطع میں اسے کوئی ڈیبرا کی حیثیت سے اس وقت تک نہیں پہچان سکتا تھا جب تک قریب آکر اسے غور سے نہ دیکھے۔ اس حلیے میں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی مغربی لڑکی ہے۔

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ڈرائیور کو وہ پتا بتا دیا جہاں اسے جانا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ٹیکسی ایک پوش علاقے کی سات منزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ اس عمارت میں اپارٹمنٹس تھے۔ دوسری منزل پر ایک اپارٹمنٹ اس نے بیس دن قبل پشمینہ ہی کے کہنے سے لیا تھا۔

''حالات کچھ ایسے ہی ہیں ڈیبرا!'' پشمینہ نے کہا تھا۔ ''ہمیں کسی وقت بھی کسی ایسی جگہ کی ضرورت پڑسکتی ہے جس کا علم ہمارے کسی جاننے والے کو نہ ہو۔''

اپارٹمنٹ خریدتے ہوئے اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور یہ اپارٹمنٹ اس نے اپنے والدین کے لیے خریدا ہے جو کچھ عرصے میں امریکا سے آنے والے ہیں۔

اس کے بعد وہ ان بیس دنوں میں دو چار بار ہی اس اپارٹمنٹ میں آئی تھی اور اسے پشمینہ کا جملہ یاد آگیا تھا کہ ''ہمیں کسی وقت بھی کسی ایسی جگہ کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''

اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ سب سے پہلے بیڈ روم کی ایک الماری کے قریب گئی۔ اسے کھولا، پھر اسی میں ایک خفیہ دراز بھی کھولی۔ اس میں سے اس نے سیٹلائٹ فون نکالا اور کسی سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے نے کہا۔ ''میں سب حالات سے آگاہ ہوں۔ تم صرف اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ ٹی وی پر میں یہ خبر سن چکا ہوں کہ پولیس تمہیں گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن تم دانش منزل سے نہیں غائب ہو چکی ہو۔ میں صرف اسی سلسلے میں زیادہ فکر مند تھا۔''

ڈیبرا نے طویل سانس لی۔ ''تو پشمینہ کا یہ خدشہ غلط نہیں تھا کہ پولیس مجھے گرفتار کرسکتی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فوراً دانش منزل سے غائب ہوجاؤں۔ اب میں ایک محفوظ جگہ پر ہوں اعلیٰ حضرت! میں نے آپ کو صرف اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ فکر مند ہوں گے۔''

''یقیناً میں فکر مند تھا۔''

ڈیبرا نے جس شخصیت کو اعلیٰ حضرت کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس سے اس کی گفتگو کئی منٹ جاری رہی۔ پھر اس نے فون بند کر کے خفیہ دراز میں رکھا اور الماری بند کر دی۔ وہ

اب بہت تھکی ہوئی تھی۔ ساڑی اور سینڈل اتارے بغیر ہی بستر پر ڈھیر ہوگئی۔

☆☆☆

پشمینہ کو رخصت کرنے کے بعد دانش یزدانی سوچ میں ڈوبا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس کی پارٹی کے سرکردہ افراد شروع ہی سے جمع تھے۔ ظاہر ہے کہ اس اجلاس کی صدارت دانش ہی کرتا۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا جانا تھا کہ پشمینہ کی نسبت سے جو واردات ہو چکی ہے، اس پر پارٹی کی طرف سے کیا ردِعمل ظاہر کیا جاتا۔ ٹی وی کی خبروں کے مطابق سیاسی پارٹیوں کی اکثریت اپنا اپنا ردِعمل دے چکی تھیں۔ قصرِ صدارت کے ترجمان نے بھی خود ٹی وی پر آ کر کہہ دیا تھا کہ پشمینہ حیات پر قاتلانہ حملہ دراصل حکومت پر حملہ ہے جس کی مکمل تفتیش کی جائے گی۔

دانش نے اپنی پارٹی کے لوگوں کو ہدایت کر دی تھی کہ مشاورت کے بغیر کوئی ردِعمل نہ دیا جائے۔ اس کے لیے یہ معاملہ اس لیے نازک تھا کہ واردات خود اس کے گھر میں ہوئی تھی۔ ٹی وی پر یہ تبصرے شروع ہو چکے تھے کہ اگر پشمینہ حیات اپنی پارٹی بنا لے تو وہ بہت جلد ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی بن جائے گی جس سے دانش یزدانی کی پارٹی کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اس طرح ڈھکے چھپے الفاظ میں شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ پشمینہ کو قتل کرنے کی سازش دانش یزدانی کی بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ اسی قسم کا ایک آدھ جملہ صدارتی محل کے ترجمان نے بھی اپنے بیان میں کہا تھا۔

اس بارے میں دانش کی پارٹی کی خاموشی کو بھی میڈیا والے پُراسرار رنگ دینے کی کوشش کر رہے تھے جن میں ان صحافیوں کا خاصا دخل تھا جو دانش کی مخالف سیاسی پارٹیوں سے ملے ہوئے تھے۔

اسی وجہ سے دانش کی پارٹی کے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا ردِعمل جلد از جلد سامنے آ جانا چاہیے لیکن اب تک کوئی فیصلہ اس لیے نہیں ہو سکا تھا کہ اس اجلاس کی صدارت کے لیے دانش کو وقت ہی نہیں مل پایا تھا، مسلسل مصروفیت رہی تھی۔

اجلاس کی صدارت کے لیے کرسی پر بیٹھتے وقت بھی دانش کسی گہری سوچ میں تھا کہ یکایک اس کے دماغ میں ایک خیال جیسے بجلی کے کوندے کی طرح آیا اور وہ فوراً کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''ابھی مجھے پھر ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ آپ لوگ ابھی کچھ دیر اور انتظار کریں۔''

دانش کی اس بات پر کچھ چہروں پر ناپسندیدگی کا تاثر ابھرا لیکن وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ پارٹی پر دانش کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

کمرے سے باہر آتے آتے دانش نے اپنی جیب سے موبائل بھی نکال لیا تھا۔ اس نے پشمینہ سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے پشمینہ کی آواز آئی۔ ''خیریت؟ اتنی جلدی تمہارا فون......''

''تم ابھی زیادہ دور تو نہیں نکلی ہوگی۔'' دانش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اتنی جلدی فون آ گیا تمہارا۔ زیادہ دور تو نہیں آئی ہوں۔''

''فوراً واپس آؤ!''

''تمہارا یہ انداز میرے لیے پریشان کن ہے۔''

''جو خیال میرے ذہن میں آیا ہے، وہ بہت زیادہ پریشان کن ہے۔ پلیز! فوراً واپس آؤ۔''

''اچھا!'' پشمینہ نے طویل سانس لی۔ ''آتی ہوں۔''

پھر اسی نے رابطہ بھی منقطع کیا تھا۔

دانش برآمدے تک بڑھتا چلا آیا اور بے چینی سے وہیں ٹہلنے لگا۔ وہاں موجود اس کے دو باڈی گارڈ چوکس ہو گئے۔

جلد ہی پشمینہ واپس آ گئی۔ دانش اسے فوراً ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

''ایک بات بتاؤ!'' اس نے پشمینہ سے کہا۔ ''تم نے ڈیبرا کو یہاں سے فوراً کیوں نکالا تھا؟''

''یہی خیال تھا کہ اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ صدرِ مملکت نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ خاص طور پر اس کی ہر وقت میرے ساتھ موجودگی انہیں بہت گراں گزرتی رہی ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ڈیبرا کو گرفتار کرا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک!'' دانش نے کہا۔ ''اور پولیس نے یہاں پہنچنے میں بالکل دیر نہیں لگائی تھی۔''

''ہاں۔'' پشمینہ الجھی ہوئی نظروں سے دانش کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اور......'' دانش بولا۔ ''پولیس والے خود بتا چکے ہیں کہ انہیں یہ حکم بہت اوپر سے ملا ہے اور تمہاری بات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس کا حکم قصرِ صدارت سے چلا ہوگا۔''

''ہوں۔''

''اور قصرِ صدارت نے اس علاقے کے ایس ایچ او سے خود رابطہ نہیں کیا ہوگا۔ بات پہلے وزارتِ داخلہ گئی ہو گی۔ وزیرِ داخلہ نے آئی جی سے کہا ہوگا۔ وہاں سے بات ہمارے علاقے کے ڈی ایس پی تک پہنچنا چاہیے اور اس کے بعد ہمارے پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او تک۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس سے تم نے نتیجہ کیا نکالا ہے؟''

''جو نتیجہ نکالا ہے، وہ بہت پہلے نکل آنا چاہیے تھا اور وہ بات تمہارے ذہن میں بھی نہیں آسکی جس کا سبب ہم دونوں کی پریشانی ہے۔ تم پر قاتلانہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ہم دونوں ہی کے دماغ منتشر ہوگئے تھے۔''

''بات آگے بڑھاؤ۔'' پشمینہ کے لہجے میں اضطراب تھا۔

دانش نے کہا۔ ''ایک صورت یہ بھی ممکن تھی کہ ڈی ایس پی علاقے کے ایس ایچ او کو بائی پاس کرتا لیکن ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہاں ڈی ایس پی نہیں، ایس ایچ او ہی آیا تھا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ قصرِ صدارت سے چلا ہوا حکم اتنی جلدی ایس ایچ او تک پہنچ سکتا ہے؟''

''اوہ!'' یکایک پشمینہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ غالباً وہ بھی اب حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

دانش بولتا رہا۔ ''اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قصرِ صدارت کو پہلے سے علم تھا کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوگا اور پہلے سے اس کا علم اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب تمہارے قتل کی ہدایات بھی پہلے سے دی جا چکی ہوں۔ یہ بھی سمجھ لیا گیا ہوگا کہ ڈیبرا بہت ہوشیار اور تیز باڈی گارڈ ہے۔ وہ قاتل کو دیکھ لے گی اور اس پر ضرور گولی چلائے گی۔ اس کا نشانہ بھی خطا نہیں ہوتا۔''

''ہوں۔'' اس مرتبہ پشمینہ کے ہونٹ بھنچ گئے پھر اس نے کہا۔ ''مجھے یہ خیال اس لیے نہیں آیا کہ میرے دل و دماغ میں باپ بیٹی کا رشتہ رچا بسا ہوا تھا۔ غالباً میں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایسا قدم اٹھانے کا تصور بھی کر سکتے ہیں۔''

''تو اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟''

''جو تم نے کہا تھا۔ اب مجھے قصرِ صدارت نہیں جانا چاہیے لیکن...... میڈیا والے سوال تو کریں گے۔ انہیں کیا جواب دوں گی۔ قصرِ صدارت چھوڑنے کا یہ جواز میں پیش نہیں کرنا چاہتی کہ ہاں مجھے جان کا خطرہ ہے۔ دوسرے یہ

بھی سوچنا ہوگا کہ میں جاؤں کہاں؟''

اس سے پہلے کہ دانش کوئی جواب دیتا، پشمینہ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل کے اسکرین پر نظر ڈالی۔

''اوہ!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''انہی کا فون ہے۔ یہ نمبر صرف گھر کے افراد تک محدود ہے۔ دوسرے لوگ یہ نمبر نہیں جانتے۔''

''سنو تو!'' دانش نے کہا۔ ''اب کیا فرمانا چاہتے ہیں وہ!''

پشمینہ نے کال ریسیو کی۔ ''جی!'' وہ مختصراً بولی۔

''اتنی بڑی بات ہو جانے کے باوجود تم نے مجھے اس کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا!'' صدر حیات کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میرے خیال میں آپ اس ملک کی سب سے باخبر ہستی ہیں اور جو بات سارے ملک کے علم میں آچکی ہو، کیسے ممکن ہے کہ آپ کو علم نہ ہو۔ میں تو یہ توقع کر رہی تھی کہ آپ مجھے فون کریں گے، میری خیریت معلوم کریں گے۔ مجھے تو ممی نے بھی فون نہیں کیا۔ خیر، ان کو تو شاید روکا گیا ہو۔''

صدر حیات نے ان باتوں کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''تم اس واقعے کے بعد فوری طور پر واپس کیوں نہیں آئیں؟ کیا یزدانی سے کچھ شرائط طے کرنے میں مصروف ہو؟'' لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''کب کر رہی ہو اس سے شادی؟''

پشمینہ کے چہرے پر قدرے غصے کی سرخی آگئی، تاہم اس نے ضبط سے کام لیا اور بولی۔ ''اگر آپ نے یہ بات باپ کی حیثیت سے کہی ہے تو میں جواب دینے کے بجائے خاموش رہوں گی۔ بیٹیاں ایسی باتوں میں لب کشائی بہت مشکل سے کر سکتی ہیں۔ کم از کم میری تربیت میری ماں نے اسی طرح کی ہے۔ اگر آپ نے یہ بات ملک کے صدر کی حیثیت سے کہی ہے تو میں عرض کروں گی کہ سر، مائی پریسیڈنٹ! حکومت کو میرے اس حد تک نجی معاملات میں پرستش کا کوئی حق نہیں۔''

پشمینہ نے ساری گفتگو دانش کو سنانے کے لیے موبائل کا اسپیکر شروع ہی میں کھول دیا تھا۔

''بدتمیز!'' صدر حیات گرجا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے ہر لفظ تہذیب کے دائرے میں رکھتے ہوئے کہا ہے۔ کوئی بدتمیزی نہیں ہوئی ہے مجھ سے۔''

''ہوں...... ہوں...... ہوں......'' دوسری طرف سے فوراً جواب نہیں آیا اور کچھ رک کر کہا گیا۔ ''وزارت اور پارلیمنٹ سے مستعفی ہونے کے بعد تم نے حکومت سے اپنا رابطہ تو ختم کر ہی لیا تھا۔ اب بدتمیزی کر کے باپ بیٹی کے رشتے کا بھی خون کر دیا۔ اب میں تمہیں قصرِ صدارت میں دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔''

''شکریہ!'' پشمینہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''آپ نے میری ایک مشکل حل کر دی۔ میں خود سوچ رہی تھی کہ اب وہاں نہ آؤں۔ صرف یہ الجھن تھی کہ میڈیا کے سامنے اس کا جواز کیا پیش کروں گی۔''

''تمہیں سوچنا ہی چاہیے کہ یہاں نہ آؤ۔ پریس کانفرنس میں تم نے میرے خلاف جو زہر اگلا ہے، اس کے بعد تم مجھ سے نظر نہیں ملا سکتیں۔''

''میں نے پریس کانفرنس میں جو کچھ بھی کہا ہے، اسے میں زہر اگلنا نہیں کہہ سکتی اور جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ اپنے والد کے لیے نہیں، اس ملک کے پریسیڈنٹ کے بارے میں کہا ہے۔''

''میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔'' صدر حیات نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اپنے رہنے کا انتظام تم آسانی سے کر سکتی ہو۔ تمہارا بینک اکاؤنٹ اتنا ہے کہ تم ایک اچھا بنگلا آسانی سے خرید سکتی ہو۔''

''اب نہیں خرید سکتی۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''آپ کے کہنے کے مطابق میں باپ بیٹی کے رشتے کا خون کر چکی ہوں اور میرے بینک میں جو بڑی رقم ہے، وہ مجھے اپنے باپ سے ملی تھی۔ اصولی طور پر اس کا ایک پیسا بھی اب مجھ پر حرام ہے۔ میری اپنی رقم صرف وہ ہے جو مجھے تنخواہ کے طور پر ملتی رہی ہے اور وہ رقم اتنی نہیں ہے کہ میں کوئی اچھا بنگلا خرید سکوں لیکن آپ کو اس بارے میں سوچنے کی تکلیف نہیں کرنی چاہیے کہ اب میں کیا کروں گی اور کہاں رہوں گی۔''

''تم غصے، جذبات اور جوش میں بولتی چلی جا رہی ہو پشمینہ!'' دانش بول پڑا۔ ''لائن بے جان ہو چکی ہے۔ دوسری طرف سے رابطہ اسی وقت منقطع کر دیا گیا تھا جب تم نے ان کا پیسا خود پر حرام قرار دیا تھا۔''

پشمینہ نے ایک طویل سانس لی۔ ریسیور میں آتی ہوئی ''بپ'' کی آواز ظاہر کر رہی تھی کہ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا لیکن شدید غصیلی، جذباتی اور جوشیلی ہونے کے باعث اس آواز کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل بند کیا۔

''بہت غصے میں لائن کاٹی ہے انہوں نے۔'' دانش بولا۔ ''اور تمہیں قصرِ صدارت سے الگ کرنے کا فیصلہ انہوں نے اس لیے کیا ہے کہ اگر وہاں رہتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو بات انہی پر آتی مگر ان کے اس فیصلے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی عقل اس وقت غصے کا ایندھن بنی ہوئی ہے۔ اس طرح انہوں نے تمہیں باقاعدہ اپنے خلاف کھڑا کرلیا ہے اور وہ بھول گئے ہیں کہ تم گھر کی بھیدی ہو۔ اب تم بہت کچھ کہہ سکتی ہو۔''

''اور میں کہوں گی۔'' پشمینہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جبکہ آنے والا وقت بہت خطرناک ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ عنقریب متحرک ہونے والا ان کا ادارہ سی ایس...... یعنی کنٹری سیور بہت خطرناک ہوگا۔ اس ادارے کی تشکیل تقریباً اسی طرز کی ہے جیسی ایران کے رضا شاہ پہلوی کی ذاتی پولیس ساوک، کی تھی۔ اس پولیس نے ایران کے عوام کو شدید دہشت زدہ کردیا تھا۔''

''میں بھی سیاست میں ہوں پشمینہ!'' دانش بولا۔ ''عالمی سیاست پر نظر میری بھی ہے۔ ساوک ہی کی وجہ سے رضا شاہ پر تباہی بھی آئی اور اب یہ سی ایس! غالباً صدر حیات نے اس طرح اپنے ایک ہولناک انجام کو دعوت دے ڈالی ہے۔''

''اب فوری مسئلہ تو یہ ہے کہ میں کہاں رہوں؟'' پشمینہ نے کہا۔

''یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے لیکن تم یہاں رہیں تو عجیب عجیب باتیں بنائی جانے لگیں گی اور جو فیصلہ ہم دونوں کر چکے ہیں، اس پر عمل درآمد، حکومت سے تمہاری علیحدگی اور آج کی واردات کے بعد دور چلا گیا ہے۔''

وہ دونوں شادی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اگر پشمینہ نے حکومت نہ چھوڑی ہوتی اور حالات اتنے سنگین نہ ہوجاتے تو شاید اسی سال وہ دونوں شادی کرلیتے لیکن اب جس سیاسی بحران کے خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی، اس کی وجہ سے دانش کے خیال کے مطابق انہیں اب اس وقت تک شادی نہیں کرنی چاہیے تھی جب تک حالات دوبارہ ٹھیک نہ ہو جائیں۔

''ہاں۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''موجودہ حالات میں وہ سب کچھ اب مناسب نہیں ہے۔ فی الحال تو مجھے اپنے قیام کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''بنگلا خریدنے کے لیے جتنے پیسوں کی بھی ضرورت پڑے گی، میں دے دوں گا۔''

''نہیں۔'' پشمینہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تو آئی لیکن فکرمندانہ سی اور اس نے کہا۔ ''فی الحال تمہارے پیسے پر میرا کوئی حق نہیں۔ تم کسی ہوٹل میں میرے لیے ایک سوئٹ بک کرادو۔''

''اب تمہیں بلٹ پروف میں بھی رہنا چاہیے۔ کار بھی بلٹ پروف ہونی چاہیے۔ پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ اس وقت تم کس کار میں ہو؟''

''ممی کی ہے۔'' پشمینہ نے جواب دیا۔ ''گویا ان کے شوہر کی۔'' وہ بے حد سنجیدہ نظر آئی۔ ''میں یہ کار واپس بھیج دوں گی۔ ممی کو فون کرکے معذرت کرلوں گی۔ انہیں سمجھا دوں گی کہ ایسا کیوں کررہی ہوں۔''

''میں ابھی ایک اجلاس کررہا ہوں۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ منتظر ہیں میرے۔ مجھے ایک گھنٹا تو لگ ہی سکتا ہے۔ اس کے بعد میں سب انتظامات کروادوں گا۔ تم اتنا وقت میری والدہ اور بہن کے ساتھ گزار لو۔''

سوچ میں ڈوبی ہوئی پشمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی نے موبائل پر آئی جی سے رابطہ قائم کیا۔

''آپ کو صدارتی محل سے احکام تو مل چکے ہوں گے!''

''کون سے احکام؟ آپ کون ہیں؟'' آفیسر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''جنرل چنگیزی۔''

''او، سر!'' آئی جی نے جلدی سے کہا۔ ''مل چکے ہیں احکام۔ مجھے بتایا جاچکا ہے کہ آج دوپہر سے سی ایس فعال ہوچکی ہے اور آپ......''

''اب میری بات سنیے!'' چنگیزی نے دبنگ لہجے میں کہتے ہوئے آئی جی کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

''جی، جی۔'' آفیسر نے جلدی سے کہا۔

''آج میڈم پشمینہ کی پریس کانفرنس میں جو کچھ ہوا ہے، اس کی تحقیقات اب سی ایس کرے گی۔ آپ کے محکمے کا اب اس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ میڈیا پر ظاہر تو کرتے رہیے کہ پولیس تحقیقات کررہی ہے لیکن تحقیقات کی نہیں جائیں گی۔''

''بہتر ہے۔''

''لاش کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو آپ کا محکمہ میڈیا

کو دے سکتا ہے اور......'' چنگیزی نے شناختی کارڈ کے محکمے کا نام لے کر بات جاری رکھی۔ ''وہاں سے آپ کو یہی رپورٹ ملے گی کہ ان کے محکمے میں اس شخص کے بارے میں کسی قسم کا ریکارڈ نہیں۔ پولیس کو اس کی جیب سے جو شناختی کارڈ ملا ہے، وہ جعلی ہے۔''

''جی بہتر۔ میں آپ کی بات ختم ہونے کا منتظر ہوں۔''

''مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔ کیوں؟''

''آپ کے لیے میرے پاس ایک اطلاع ہے جو مجھے ابھی ابھی ملی ہے۔ اس قسم کی وارداتوں کی رپورٹ عموماً مجھ تک فوراً نہیں پہنچتی لیکن نام کیونکہ ڈیبرا کا آیا تھا اس لیے مجھے فوراً اطلاع دی گئی۔''

''کیا اطلاع ہے؟'' چنگیزی نے تیزی سے پوچھا۔

''ایک نوجوان نے ڈیبرا کے خلاف ایک پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرائی ہے۔''

''کیا رپورٹ ہے؟'' چنگیزی بے تاب ہوگیا۔

اس نوجوان پر ڈیبرا کی وجہ سے جو کچھ گزری تھی، وہ اس نے پولیس اسٹیشن میں من وعن بیان کرتے ہوئے آخر میں بتایا تھا کہ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنی کار کی پچھلی سیٹ کے پائیدان میں پڑا ہوا تھا، اس کے اوپر ایک چادر پڑی ہوئی تھی اور کار ایک مشہور مارکیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔

یہی سب کچھ آئی جی نے چنگیزی کو بتادیا۔

''اس حرکت کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟'' سوچ میں پڑ جانے والا چنگیزی بڑبڑایا۔

''یہ تو ڈیبرا ہی بتا سکتی ہے یا شاید وہ عورت جس کو ڈیبرا نے فون کرکے اس سے کسی قسم کا سامان مل ایریا میں منگوایا تھا۔''

''ہوں، اچھا کیا آپ نے مجھے بتادیا۔''

''کیا ڈیبرا کی تلاش جاری رکھی جائے؟''

''یقیناً۔'' چنگیزی نے زور دے کر کہا۔ ''اس کی تلاش سی ایس نے بھی شروع کردی ہے۔ آپ نے جو رپورٹ مجھے دی ہے، اس سے بھی شاید کچھ مدد مل سکے...... خیر! اور کچھ؟''

''بس یہی بتانا ضروری سمجھا تھا میں نے۔''

چنگیزی نے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کرکے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوچکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ آئی جی نے سوتے سے اٹھ کر اس کی کال ریسیو کی ہو۔

چنگیزی جس شاندار کمرے میں بیٹھا تھا، وہ ایک سہ منزل عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ یہ نوتعمیر شدہ عمارت شہر کے وسط میں قدیم طرز کی بنی ہوئی ایک عمارت گرا کر بنائی گئی تھی اور اسے سی ایس ہیڈ کوارٹر کا نام دیا گیا تھا۔

یہاں سے چند منٹ پہلے ہی ٹی وی چینلز اور اخبارات کے لیے پریس ریلیز بھی جاری کی گئی تھی جس میں لکھا گیا تھا کہ آج ہی سے فعال ہونے والا یہ ادارہ چنگیزی کی سربراہی میں قائم کیا گیا ہے اور یہ محکمۂ پولیس کے علاوہ اور کئی اہم محکموں سے زیادہ بااختیار ہے۔ نیز یہ کہ جنرل چنگیزی صدر مملکت کے علاوہ کسی کو بھی جواب دہ نہیں ہے۔

آئی جی سے بات کرنے کے بعد چنگیزی نے محکمے کے ایک اہم آدمی کو طلب کیا اور اسے آئی جی سے ملنے والی رپورٹ سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ ''اس گلی میں جاکر بھی چھان بین کی جاسکتی ہے جہاں ڈیبرا اس نوجوان کو لے گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ وہاں اس عورت کے قدموں کے نشانات مل جائیں جسے ڈیبرا نے بلایا تھا۔''

''ممکن ہے سر کہ ان نشانات سے تحقیقات میں کچھ مدد ملے اور ہمیں معلوم ہوجائے کہ ڈیبرا کہاں روپوش ہوئی ہے۔ اس کی ملازمہ گریٹا سے جو پوچھ گچھ کی گئی تھی، اس بارے میں تو کیپٹن مخدوم نے آپ کو رپورٹ دے ہی دی ہوگی۔''

''ہاں، لیکن مجھے اس پر یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ عورت بالکل بے خبر ہے اور پریشان ہے کہ ڈیبرا نے اس سے رابطہ ہی نہیں کیا۔''

''سر! اگر اس نے غلط بیانی کی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ بلا کی عیار عورت ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مخدوم کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہوگی۔''

''تاہم اس پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ میں مخدوم کو ہدایت دے چکا ہوں۔''

چنگیزی نے اس شخص کو رخصت کردیا جس کا نام شمشاد تھا، بریگیڈیئر شمشاد۔ سی ایس میں وہ جنرل چنگیزی کے بعد سب سے زیادہ بااختیار تھا۔ اس ادارے میں خاصے لوگ وہ تھے جو فوج سے ریٹائر ہوچکے تھے لیکن چنگیزی ریٹائرڈ نہیں تھا۔ اس کا بس تبادلہ ہوا تھا۔ وہ جس خفیہ ایجنسی کا ڈائریکٹر تھا، وہاں اسی دن صدر حیات کے حکم سے کسی اور کو مامور کیا جاچکا تھا۔

چنگیزی نے دوبارہ گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ چنگیزی کو بارہ بجنے کا انتظار تھا۔ وہ

خبریں سننا چاہتا تھا۔

بارہ بجے چند اشتہارات کے بعد خبریں شروع ہوئیں۔ سب سے پہلی خبر ''سی ایس'' ہی کے بارے میں تھی۔ وہ سننے کے بعد اس نے میز پر رکھی ہوئی آرمی کیپ اٹھا کر اپنے سر پر جمائی۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس تھا۔ پھر اس نے اپنا موبائل اٹھایا۔ اب اسے اپنے گھر جانا تھا۔ اس وقت ٹی وی پر یہ خبر آرہی تھی کہ پشمینہ حیات ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئٹ میں منتقل ہو چکی تھی۔

چنگیزی کو اس خبر سے اب کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دس بجے سے کچھ پہلے ہی یہ بریکنگ نیوز سن چکا تھا کہ دانش یزدانی کے گھر سے پشمینہ قصرِ صدارت نہیں گئی تھی بلکہ شہر کے ایک سب سے مقبول ہوٹل میں منتقل ہو گئی تھی۔ دانش نے اپنے تین باڈی گارڈز بھی اس کے ساتھ کردیے تھے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد اس نے کار واپس قصرِ صدارت بھیج دی تھی۔

☆☆☆

گاڑی بھیجنے کے بعد پشمینہ نے اپنی ماں کو فون بھی کیا تھا اور معذرت کی تھی اور جواز یہ پیش کیا تھا کہ وہ کار بہرحال ان کو صدر حیات سے ملی تھی۔

جواب میں اس کی ماں روبینہ حیات نے کہا تھا۔ ''تم باپ بیٹی کی اس جنگ نے تو مجھے آدھا کردیا ہے۔'' آواز بھرا گئی۔ ''یہاں سے تمہاری علیحدگی نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی ہے۔''

''لیکن علیحدگی کا قدم میں نے نہیں اٹھایا۔''

''معلوم ہے مجھے۔ کبھی کم از کم مجھ سے تو ملنے آؤ گی نا!''

''ڈیڈی نے کہا تھا کہ اب وہ مجھے قصرِ صدارت میں دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔''

''نہ دیکھیں وہ...... اس طرف نہ آئیں جہاں تم میرے ساتھ ہو۔'' روبینہ حیات کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔ ''جب بھی تم آسکو، مجھے اطلاع دے دینا۔ میں گیٹ پر آکر خود تمہیں اندر لاؤں گی۔''

''بہتر ہے ممی۔ میں کوشش کروں گی۔ ڈیڈی کا یہ اسکینڈل سامنے آنے کے بعد تو آپ بھی کچھ خوش ہرگز نہیں ہیں۔ میں یہ جانتی ہوں۔''

''کچھ بھی ہو۔'' روبینہ کی آواز دل گرفتہ تھی۔ ''مجھے تو انہی کے ساتھ مرنا جینا ہے۔ عورت کو مساوی حقوق ملے ہیں نا۔'' اب لہجے میں نکیلا پن بھی تھا اور تلخی بھی!

''میں آپ سے پھر کسی وقت بات کروں گی۔ ابھی کوئی مجھ سے ملنے کے لیے آنے والا ہے۔'' پشمینہ نے جھوٹ بولا۔ ماں کی جذباتی کیفیت محسوس کر کے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس وقت زیادہ بات نہ کی جائے۔

وہ بستر پر لیٹ کر سوچ میں ڈوب گئی۔ ایک ماہ سے وہ مسلسل اسی فکر میں غلطاں تھی کہ ان حالات میں اسے کیا رول ادا کرنا چاہیے۔

ڈیبرا کے سلسلے میں وہ فکرمند نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ ڈیبرا نے اسی اپارٹمنٹ کا رخ کیا ہوگا جو کچھ ہی عرصے پہلے لیا گیا تھا۔ غیر معمولی حالات پیدا ہونے کی صورت میں یہ ہدایت بھی ڈیبرا کو پشمینہ ہی نے دی تھی کہ موبائل فون کے استعمال سے، جس حد تک ممکن ہو، گریز کیا جائے۔

اس وقت بھی پشمینہ کو یقین تھا کہ فوری طور پر تو نہیں لیکن ڈیبرا کے فرار اور قصرِ صدارت سے اس کی علیحدگی کی بات ہونے کے بعد صدر حیات نے تمام سیلولر کمپنیز میں موجود اپنے خاص آدمیوں کو ہدایت کردی ہوگی کہ ان دو نمبروں پر، یعنی ڈیبرا اور پشمینہ کے موبائل نمبروں پر خصوصی طور پر نظر رکھی جائے۔ ڈیبرا نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا، تو اس کی وجہ یہی تھی۔

پشمینہ کو دو ایک افراد سے رابطہ بہرحال کرنا تھا جس کے لیے اس نے ڈیبرا کو سیٹلائٹ موبائل فون کا بندوبست کرنے کی ہدایت بھی کردی تھی اور اس کے علم کے مطابق چوبیس گھنٹے پہلے ہی دو سیٹلائٹ موبائل آچکے تھے جو ڈیبرا کے باپ نے اسے سفارت خانے کے ذریعے بھجوائے تھے۔ ریٹائر ہوجانے کے باوجود اس کا اتنا اثر ورسوخ تھا کہ وہ اپنے سفارت خانے کے ذریعے بھی چھوٹے موٹے کام تو آسانی سے کرسکتا تھا۔

اس وقت ان میں سے ایک فون حال میں حاصل کردہ اپارٹمنٹ میں اور دوسرا ڈیبرا کے اس گھر میں تھا جہاں وہ گریٹا کے ساتھ رہتی تھی۔ پشمینہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ دوسرا موبائل اس سے اس وقت لے گی جب اس کی ضرورت محسوس کرے گی۔

اب ضرورت پڑی تھی تو حالات سازگار نہیں تھے تاہم اسے توقع تھی کہ ڈیبرا کسی نہ کسی طرح اس سے ملے گی ضرور اور سیٹلائٹ موبائل اس کو پہنچائے گی۔

رات گئے کسی وقت اسے نیند آگئی۔ صبح وہ ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ ہوٹل کے ریسپشن سے فون پر اسے بتایا گیا کہ حاجی اشفاق اس سے ملنے آئے ہیں۔

''کون حاجی اشفاق؟'' پشمینہ نے پوچھا۔

''مشہور بزنس مین میڈم!'' جواب ملا۔ ''ایک وولن اور ایک سلکن ٹیکسٹائل مل کے مالک۔''

''اوہ، وہ!'' پشمینہ الجھ گئی۔ حاجی اشفاق سے ملنے کا اسے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ بس یہ جانتی تھی کہ معاشرے میں حاجی اشفاق کو بہت شریف انسان اور غریبوں کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ملز میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں تمام ٹیکسٹائل ملز کے ملازموں سے زیادہ تھیں۔ اس کے باوجود پشمینہ کو یہ فیصلہ کرنے میں تذبذب تھا کہ حاجی اشفاق سے مل لینا چاہیے۔ معلوم تو ہو کہ وہ کیوں آیا ہے۔

موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال دانش یزدانی کی تھی۔

''ایک منٹ ہولڈ کیجیے۔'' پشمینہ نے ریسپشنسٹ سے کہا۔

''او کے میڈم!''

پشمینہ نے انسٹرومنٹ کے ''ہولڈ'' کا بٹن دبایا، پھر موبائل پر دانش کی کال ریسیو کی۔ ایک لحہ قبل اسے خود یہ خیال آچکا تھا کہ وہ دانش کو فون کر کے اس کو حاجی اشفاق کے بارے میں بتائے۔

''ہاں دانش!'' اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''ابھی کسی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ وہ تم سے ملنے ہوٹل پہنچ گئے ہیں۔ ان سے ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے تمہیں مجبوراً اس لیے فون کیا ہے کہ تم حالات کے باعث کسی اجنبی سے ملنے میں گریز کر سکتی ہو۔ مجبوراً کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ...... خیر، چھوڑو، پھر بات ہو گی۔''

''اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا۔ ابھی ابھی ریسیپشن سے اطلاع ملی تھی مجھے۔ میں الجھن میں تھی کہ ملوں یا نہ ملوں۔''

''مل لو۔'' دانش نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

پشمینہ نے موبائل بند کر کے فون پر ریسیپشن سے بات کی اور کہا کہ وہ ملاقات کر لے گی۔

اگرچہ سفارش دانش کی تھی پھر بھی پشمینہ نے احتیاط ضروری سمجھی اور انٹرکام کا ریسیور اٹھایا جس پر وہ قریب کے ایک کمرے میں موجود باڈی گارڈز سے بات کر سکتی تھی۔ دانش کے کہنے پر ہوٹل والوں نے یہ انتظام خصوصی طور پر اس لیے بھی کیا کہ وہاں قیام کرنے والی ملک کے صدر کی بیٹی تھی۔

کال ریسیو کرنے والے باڈی گارڈ سے پشمینہ نے کہا۔ ''ابھی ایک صاحب مجھ سے ملنے آرہے ہیں۔ میں ان سے ڈرائنگ روم میں ملوں گی۔ باہر کے دروازے پر تم میں سے کوئی ایک ان کا استقبال کرے اور ان کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آئے اور دروازہ اندر سے بند کر کے ان کے قریب ہی کھڑا رہے۔''

''بہت بہتر میڈم۔''

پشمینہ نے رابطہ منقطع کیا۔

ذرا دیر بعد ہی وہ ڈرائنگ روم میں حاجی اشفاق کے ساتھ بیٹھی تھی۔

حاجی اشفاق اپنی وضع قطع سے روایتی حاجی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہترین کپڑے کے اعلیٰ تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پر فرینچ کٹ داڑھی تھی۔ اس کی عمر پچاس پچپن کے قریب ہو سکتی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ محتاط ہیں۔'' حاجی اشفاق نے دروازے پر کھڑے باڈی گارڈ پر ایک نظر ڈال کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جواب میں پشمینہ بھی مسکرائی لیکن کچھ بولے بغیر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''کل آپ کی پریس کانفرنس میں جو سانحہ ہوا، اس پر میں اظہارِ افسوس ہی کر سکتا ہوں۔'' حاجی اشفاق نے کہا۔ ''اور جس نے وہ حرکت کی، اس کی مذمت میں ٹی وی چینلز پر بھی کر چکا ہوں۔''

''شکریہ۔''

''اب آپ کا زخم کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہی سمجھیں۔ معمولی زخم آیا تھا اسی لیے ڈریسنگ بھی معمولی ہے جو میری ساڑی کے پلو میں چھپی ہوئی ہے۔ آج رات یا کل صبح تک ڈاکٹر یہ ڈریسنگ بھی ختم کر دے گا۔''

''شکر ہے خدا کا۔'' حاجی اشفاق نے کہا۔ ''بہرحال میں آپ کا قیمتی وقت زیادہ ضائع نہیں کروں گا۔ کل آپ کی پریس کانفرنس نے لوگوں کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ دو ایک ہی طبقات ایسے ہوں گے جو آپ کی باتوں سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ آپ کو شاید تعجب ہو کہ میرے دو ہم پیشہ حضرات کل رات ساڑھے بارہ بجے میرے گھر آئے تھے۔ ہماری وہ میٹنگ آدھے گھنٹے جاری رہی۔ طے یہ پاتا رہا کہ آپ کو ہر صورت میں اپنی سیاسی پارٹی بنانی چاہیے۔ آپ نے پریس کانفرنس میں فنڈز نہ ہونے کی بات کی تھی۔ میں اور میرے وہ دونوں احباب جن سے کل رات میٹنگ ہو چکی ہے، آپ کا یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ کو جتنے

فنڈ کی ضرورت ہوگی، وہ مہیا کر دیا جائے گا، اگر آپ ہم سے قبول کروانا پسند فرمائیں۔ فی الحال میں آپ کی خدمت میں یہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک چیک نکال کر پشمینہ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ بلینک چیک ہے۔ آپ جو رقم چاہیں، اس میں بھر لیجیے گا۔ میرے وہ دونوں احباب بھی بینک چیکس مجھے دے جائیں گے۔ اس سلسلے میں یہ ذمے داری مجھے ہی سونپی گئی ہے کہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔''

''خوب!'' پشمینہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چیک پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکی تھی کہ یہ مسئلہ اتنی جلدی اور اس حد تک حل ہو سکتا ہے۔''

''آنے والے انتخابات میں آپ کی پارٹی یقیناً جیتے گی۔'' حاجی اشفاق نے کہا۔ ''میں آپ کو مستقبل میں ملک کی وزیراعظم دیکھ رہا ہوں۔''

یکایک پشمینہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے کہا۔ ''کچھ دنوں سے سننے میں آرہا ہے کہ ملک کے کئی دولت مند افراد پر کرپشن کے الزامات لگنے والے ہیں۔ متعلقہ ادارے اس کی تحقیقات کریں گے۔ فرض کریں...... اور فرض کی بات میں اس لیے کر رہی ہوں کہ مجھے یقین نہیں ہے اس پر کہ میں مستقبل میں اس ملک کی وزیراعظم بنوں گی۔ میرا ٹارگٹ بھی وہ نہیں ہے۔ میں اپنے وطن میں بس انصاف دیکھنا چاہتی ہوں، اور بالفرض آپ کا خیال درست نکلا، یعنی میں وزیراعظم بنی، اور آپ میں سے کسی پر کرپشن ثابت ہو گیا تو مجھ سے کسی فیور کی توقع اس بنیاد پر نہ رکھی جائے کہ آپ لوگوں نے میری پارٹی کو فنڈز دیے تھے۔''

''بہت دل خوش ہوا آپ کی یہ بات سن کر۔'' حاجی اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے بارے میں تو پُریقین ہوں کہ مجھ پر کرپشن ثابت ہونا تو دور کی بات ہے، مجھ پر اس کا الزام بھی نہیں لگ سکتا۔ رہی بات میرے باقی دو احباب کی، تو میں انہیں آپ کا یہ جواب پہنچا دوں گا۔''

''اور دوسری بات یہ۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''بلینک چیک میں نہیں لوں گی۔ اس پر رقم تو لکھی جائے گی جس کی میں رسید بھی دوں گی۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' حاجی اشفاق نے جلدی سے کہا۔

''ضرورت ہے۔'' پشمینہ نے زور دے کر کہا۔ ''لیکن ابھی میں رسید اس لیے نہیں دے سکتی کہ میرے پاس پارٹی کا لیٹر ہیڈ نہیں ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''بلکہ ابھی تو پارٹی ہی نہیں ہے۔ وہ اب میں جلد ہی قائم کرلوں گی۔ ذاتی لیٹر ہیڈ پر میں رسید دینا نہیں چاہتی۔ فی الحال یہ چیک آپ اپنے پاس رکھیے۔ جب ضرورت ہوگی تو......''

حاجی اشفاق نے اس کی بات کاٹی۔ ''مجھے خوشی ہوگی اگر آپ یہ چیک اپنے پاس رکھیں۔ جب پارٹی لیٹر پیڈ چھپ جائے گا تو رسید دے دیجیے گا جس کی کم از کم مجھے ضرورت نہیں، اور اگر آپ یہ چیک کسی بھی وجہ سے کیش نہ کروانا چاہیں تو پھاڑ کر پھینک دیجیے گا۔ میری خوشی کی خاطر آپ یہ اپنے پاس رکھ تو لیں۔''

''اچھا!'' پشمینہ نے طویل سانس لی۔ ''اگر بات آپ کی خوشی کی ہے تو...... ٹھیک ہے۔''

☆☆☆

ڈیبرا نے دوسرا دن بھی اپارٹمنٹ میں ہی گزارا۔ ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں نکلی۔ خورونوش اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ یہاں کم ہی آئی تھی مگر جب بھی آتی تھی، پھل وغیرہ یا کھانے پینے کی دوسری اشیا لاکر ڈیپ فریزر یا فریج میں رکھتی رہی تھی۔

اس دن وہ شام کے وقت گھر سے نکلی تو ایسی ہی وضع قطع میں تھی کہ اسے ڈیبرا کی حیثیت سے پہچاننا بہت مشکل تھا۔ اپارٹمنٹس کے پارکنگ لاٹ میں کار بھی موجود تھی اور موٹر سائیکل بھی جو انہی دنوں خریدی گئی تھیں جب اپارٹمنٹ لیا گیا تھا۔ پشمینہ نے تو صرف کار ضروری سمجھی تھی لیکن ڈیبرا نے موٹر سائیکل بھی خریدی تھی۔ وہ موٹر سائیکل بھی نہایت تیز رفتاری اور مشاقی سے چلا سکتی تھی لیکن اس وقت اس نے کار ہی سنبھالی اور اپنے اس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوگئی جہاں وہ گریٹا کے ساتھ رہتی تھی۔

کار اس نے اپارٹمنٹس کے پارکنگ لاٹ کے بجائے سڑک پر ہی ایک ایسی جگہ کھڑی کی جہاں دوسری کاریں بھی کھڑی تھیں۔ یہ ''احتیاط'' تھی اس کی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اس نے کسی قسم کا خطرہ محسوس کیا تو پارکنگ لاٹ سے کار نکال کر فرار ہونے میں دشواری ہو سکتی تھی۔ اس کا اسے یقین تھا کہ اس کے گھر کی نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ کیونکہ اس نے خبروں میں سن لیا تھا کہ سی ایس فعال ہو چکی تھی اس لیے خطرات بھی زیادہ ہو سکتے تھے۔

کار کھڑی کر کے وہ اپارٹمنٹس کی طرف بڑھی۔ اس وقت بھی اس نے بظاہر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اگر وہ اس وضع

قطع میں دن کے وقت باہر نکلتی تھی تو دھوپ کا سیاہ چشمہ لگاتی تھی۔

اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے رک کر اس نے بظاہر اطمینان سے کال بیل کا بٹن دبایا لیکن دراصل وہ پوری طرح ہوشیار تھی۔ اسے ایک منٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گریٹا نے دروازہ کھولا۔ ڈیبرا تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔ گریٹا نے بھی دروازہ بند کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ڈیبرا کو اس نے اس وضع قطع میں کئی بار دیکھا تھا۔

''رات کو ہی سی ایس والے دھکے پڑے تھے ڈیبو۔'' گریٹا بولی۔

''مجھے یقین تھا۔'' ڈیبرا نے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی سختی تو نہیں کی؟''

''میں نے انہیں اتنی معصومیت سے جواب دیے تھے کہ انہوں نے یقین کرلیا۔ اگر انہیں شبہ ہو جاتا تو ضرور سختی کرتے۔ تم نے بتا تو دیا تھا کہ جب یہ ادارہ کام شروع کرے گا تو پولیس سے زیادہ پریشانی کا سبب بنے گا لیکن میرے ساتھ انہوں نے فوری طور پر تو کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا۔''

ڈیبرا اس کا جواب سنتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بیڈ کی سائڈ کی دراز کھول کر اس میں سے ایک پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''اگر انہیں شبہ ہوگیا کسی وجہ سے تو وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ محتاط رہنا۔'' وہ پیکٹ اپنے وینیٹی بیگ میں رکھتی ہوئی واپس دروازے کی طرف بڑھی۔ ''آج میری ضمانت قبل از گرفتاری ہونی تھی۔ پشمینہ نے تو بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ ہو جائے گی اور شاید ہوگئی ہو لیکن ابھی اس سے میرا رابطہ نہیں ہوا ہے۔'' وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ''اب وہیں جا رہی ہوں۔ پشمینہ ہی سے معلوم ہو سکے گا کہ کیا ہوا۔ ضمانت ہو چکی ہوگی تو اب میں زیادہ تر اسی کے ساتھ رہوں گی۔ موجودہ حالات میں مجھے اب ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ تم اکیلے میں گھبرانا مت۔''

ڈیبرا نے جب بیرونی دروازہ کھولا تو گریٹا بولی۔ ''میں تمہارے لیے فکر مند تو رہوں گی ڈیبو!''

ڈیبرا نے کوئی جواب نہیں دیا، بس مڑ کر گریٹا کی پیشانی چومی اور اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔ اپارٹمنٹ میں وہ عجلت کا شکار ہی تھی لیکن باہر نکلتے ہی اس نے پُرسکون، مطمئن انداز اختیار کرلیا۔ اپارٹمنٹس کی عمارت سے نکل کر وہ اس طرف بڑھی جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔

یہاں آتے ہوئے اسے اندیشہ تو تھا کہ وہ کسی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے مگر ایسا ہوا نہیں۔ وہ معمول کی رفتار سے ڈرائیونگ کرتی رہی لیکن ماحول سے غافل وہ اب نہیں تھی، ماحول سے غافل رہنا اس کی فطرت ہی نہیں رہی تھی جب سے اس نے خفیہ ایجنسی میں جانے کے لیے تربیت حاصل کی تھی۔

اسی فطرت کی وجہ سے اس کو معلوم ہوگیا کہ نیلے رنگ کی ایک کار اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

یہ کہاں سے؟ وہ سوچنے لگی، گریٹا کے پاس جانے تک کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ یہ تعاقب بعد میں شروع ہوا تھا۔ اس کے گھر کی نگرانی کی جا رہی تھی لہٰذا اسے وہاں جاتے ہوئے دیکھ تو لیا گیا لیکن اسے شناخت نہیں کیا جا سکا۔ روپ بدلنے کے بعد وہ اپنی چال میں بھی تبدیلی لے آئی تھی۔ اب اس کے تعاقب کا مقصد یہ جاننا ہی ہو سکتا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے اور اس کے گھر کیوں گئی تھی۔

ڈیبرا کو یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ فی الحال اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ فی الحال وہ صرف اس کا تعاقب کرنا چاہتے تھے۔ ان کا تعلق پولیس سے بھی ہو سکتا تھا اور سی ایس سے بھی۔

تعلق کسی سے بھی ہو، اب اس کا اس طرح پشمینہ کے پاس جانا مناسب نہیں تھا کہ اس کا تعاقب جاری ہو۔ مناسب تو کیا، یہ بات خطرناک بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ کے بعد ایک بڑی ڈپارٹمنٹل مارکیٹ آنے والی تھی۔ وہیں وہ تعاقب کرنے والوں کو دھوکا دے سکتی تھی۔

مارکیٹ قریب آتے ہی اس نے کار کی رفتار بتدریج کم کرنا شروع کی۔ مارکیٹ کے سامنے کاروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اسے پارکنگ کے لیے بمشکل ہی جگہ مل سکی۔

☆☆☆

ریسپشن سے فون پر پشمینہ کو اطلاع دی گئی۔ ''کوئی خاتون زاہدہ صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

بستر پر لیٹی ہوئی پشمینہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ زاہدہ کے نام سے ڈیبرا ہی نئے لیے ہوئے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی لیکن احتیاط ضروری سمجھتے ہوئے پشمینہ نے فون پر کہا۔ ''ان سے میری بات کرائیے۔''

''جی، بہتر۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''چند لمحے بعد آواز آئی۔'' میں زاہدہ بول رہی ہوں

پشمینہ صاحبہ! میرے شوہر نے آپ کے لیے کچھ بھجوایا ہے۔''

پشمینہ نے پہچان لیا۔ وہ ڈیبرا ہی کی آواز تھی۔

''میں تو بہت بے چینی سے منتظر ہوں تمہاری۔''

ڈیبرا نے فوراً ہی ریسیور ریسپشنسٹ کو دے دیا تھا۔ پشمینہ نے اس کی آواز سنی تو کہا۔''ہاں، میں ان سے ملوں گی۔'' اس نے ریسیور رکھ دیا اور کھڑی ہو کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔

ہوٹل کی انتظامیہ پشمینہ کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ انہوں نے خصوصی طور پر یہ انتظام کیا تھا کہ اپنے دو سیکیورٹی گارڈز اس کے سوئٹ کے دروازے پر مامور کر دیے تھے۔ انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی کو بھی سوئٹ کے دروازے تک بھی نہ جانے دیا جائے جب تک انہیں ریسیپشن سے اس کی اجازت نہ مل جائے۔ ریسیپشن ہی سے ایک اور سیکیورٹی گارڈ ملاقاتی کے ساتھ آتا تھا جو وہاں مامور دونوں سیکیورٹی گارڈز کو بتاتا تھا کہ اس ملاقاتی کو پشمینہ صاحبہ کے پاس جانے دیا جائے۔

ڈیبرا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پشمینہ نے اسے اسی وضع قطع میں دیکھا جس وضع قطع میں وہ نئے اپارٹمنٹ میں آتی جاتی رہتی تھی۔

''ہوٹل والے بہت محتاط ہیں تمہارے معاملے میں۔'' ڈیبرا نے چھوٹتے ہی کہا۔''اس قسم کا بندوبست ہوٹل میں قیام کرنے والے کسی شخص کے لیے نہیں ہوا ہوگا۔''

''میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے، اس کی وجہ سے انہیں یہ فکر تو ہوگی نا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہونے کی صورت میں ہوٹل بھی بدنام ہوگا۔ خیر، یہ بتاؤ کہ تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

''پہلے میں اپنے گھر گئی تھی، یہ لینے۔'' ڈیبرا نے وینیٹی بیگ سے سیٹلائٹ موبائل فون کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا اور پشمینہ کو دیتے ہوئے بولی۔''وہاں سے چلی ہوں تو ایک کار میرے تعاقب میں تھی۔ اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ میرے گھر کی نگرانی کی جا رہی تھی اور وہ بھی اتنے قریب سے کہ مجھے اپارٹمنٹ میں آتے جاتے بھی دیکھ لیا گیا۔ بہرحال میں ان کو ڈاج دے کر نکل آئی۔'' اس نے مارکیٹ کے بارے میں بتایا جہاں کار کھڑی کر کے وہ مارکیٹ میں گئی تھی۔

''وہاں اس وقت لوگ خاصی تعداد میں ہوتے ہیں اس لیے نگرانی کرنے والوں کو چکما دینا میرے لیے مشکل نہیں ہوا۔ ان کی نظروں سے بچنے کے بعد میں مارکیٹ کے اس دروازے سے باہر نکلی جہاں عموماً ٹیکسیاں کھڑی رہتی ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ اس مارکیٹ میں آنے جانے کے چار دروازے ہیں۔ اب امکان تو یہ ہے کہ یہاں اس ہوٹل کی نگرانی بھی کی جا رہی ہوگی۔ دیکھا جا رہا ہوگا کہ تم سے ملنے کون آتا ہے۔ وہ ریسیپشن سے بھی پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔ انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں تم سے ملنے آئی ہوں۔''

''بہرحال تمہیں پہچانا تو نہیں گیا ہوگا اور فی الحال تمہاری قانونی گرفتاری کا امکان تو نہیں رہا۔ میں تمہاری ضمانت کروا چکی ہوں آج!''

''میرا خیال تھا کہ اس سلسلے میں مجھے بھی عدالت جانا ہوگا۔''

''تمہارے لیے کوئی وارنٹ تو نکلا نہیں ہے۔ دوسرے میں گئی بھی اس مجسٹریٹ کی عدالت میں جو صدر مملکت سے میرے تعلق کے باعث مجھ سے مرعوب تھا۔ بہرحال اب تمہیں ہر وقت میرے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ میرے سامنے سی ایس والے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ کریں۔ تمہیں اپنا یہ بہروپ تو ختم کرنا ہی ہو گا۔''

''وہ تو ہو جائے گا لیکن پہلے مجھے یہاں سے نکلنا چاہیے۔ واپس نئے اپارٹمنٹ جا کر یہ بہروپ ختم کر کے آؤں گی۔''

''اب یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا ڈیبرا! یہاں نگرانی کرنے والوں کو شاید علم ہو چکا ہو کہ جس وضع قطع میں انہوں نے تمہیں یہاں دیکھا ہے، اسی وضع قطع کی کوئی لڑکی یا عورت اپنا تعاقب کرنے والوں کو چکما دے چکی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو جس کا خیال مجھے آیا ہے لیکن خدشہ تو ہے نا، ایسی صورت میں تم جیسے ہی ہوٹل سے باہر نکلو گی، تمہیں روک لیا جائے گا۔ قریب سے تم کو دیکھ کر وہ تمہیں پہچان بھی لیں گے۔''

''لیکن اگر میں یہیں رکتی ہوں تو میرا یہ بہروپ کیسے ختم ہوگا؟''

''تمہارے ملبوسات قصر صدارت میں بھی تھے۔ آج ممی نے میرے کپڑوں کے چھ سوٹ کیس بھجوائے ہیں۔ ان میں تمہاری جینز وغیرہ بھی ہیں۔''

ڈیبرا نے سر ہلایا، پھر کہا۔'' گریٹا کا خیال آ گیا ہے مجھے۔ اب اس کے لیے کوئی خطرہ نہ ہو جائے۔''

''ہاں یہ اندیشہ تو ہے۔ اب یہ بات کھل ہی جائے گی

کہ اس بہروپ میں تم ہی مجھ سے ملنے آئی ہو۔ اب تم موبائل کا استعمال کرسکتی ہو۔ فوراً گریٹا کو فون کرو۔ تم دونوں کو اشاروں میں بات کرنا خوب آتا ہے۔ تم اس سے کہہ دو کہ وہ فوراً وہ اپارٹمنٹ چھوڑ کر تمہارے نئے اپارٹمنٹ چلی جائے اس کی ایک چابی اس کے پاس بھی ہے نا؟''

ڈیبرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وینیٹی بیگ سے اپنا موبائل نکالا۔

اسی وقت پشمینہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ کال چنگیزی کی تھی۔

''مبارک ہو میڈم!'' چنگیزی کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔ ''جب زاہدہ کا نام اختیار کرنے والی خاتون ہوٹل کے ریسیپشن پر آپ سے بات کر رہی تھی، اس وقت میرا ایک آدمی بھی سادہ لباس میں ریسیپشن کے قریب موجود تھا۔ اس نے ڈیبرا کو پہچان لیا۔''

پشمینہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔

چنگیزی کہتا رہا۔ ''اسی لیے مبارک باد دی ہے کہ آپ کی باڈی گارڈ آپ تک پہنچ گئی ہے اور آپ نے اس کی ضمانت بھی کرالی ہے۔''

پشمینہ نے جواب میں ایک لفظ بھی کہے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

اسی دوران میں ڈیبرا اپنے موبائل پر گریٹا کے موبائل سے رابطہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز سن کر گریٹا دروازے پر گئی اور ''آئی گلاس'' سے باہر جھانکا۔ اس کا چہرہ رنگ بدل گیا۔ باہر سی ایس کے تین اہلکار کھڑے تھے۔ ان کی شناخت اس لیے آسان تھی کہ پولیس کی طرح ان کی بھی مخصوص طرز کی وردیاں ہوتی تھیں۔ کانسٹیبل کی سطح کے اہلکاروں کی وردی ہلکے نیلے رنگ کی ہوتی تھی۔ سینے پر سی ایس کا آکٹوپس جیسا مونوگرام ہوتا تھا۔ افسران کی وردی قدرے گہرے نیلے رنگ کی ہوتی تھی۔ سینے پر آکٹوپس مونوگرام کے ساتھ تاج کی تصویر ہوتی تھی۔ منصب کے اعتبار سے تاج کی تعداد میں اضافہ ہوتا تھا۔ دو تاج والوں کی کمر کی چوڑی بیلٹ پر بھی آکٹوپس کا دھاتی نشان ہوتا تھا اور بیلٹ کے ساتھ ہی ہولسٹر میں ریوالور بھی ہوتا تھا۔ بغیر تاج یا ایک تاج والے کو ریوالور رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح بغیر تاج والا بھی ریوالور نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایک تاج والے کے ہاتھ میں صرف ڈیڑھ فٹ کا موٹا سا رول ہوتا تھا۔

گریٹا نے جن اہلکاروں کو دیکھا، ان میں سے دو کے سینے پر صرف مونوگرام تھا۔ تیسرے کے سینے پر مونوگرام کے ساتھ دو تاج تھے۔ اس کی کمر سے لٹکے ہوئے ہولسٹر میں ریوالور بھی تھا۔

گریٹا نے پُرسکون تاثر کے ساتھ دروازہ کھولا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بہرحال کچھ بڑھ گئی تھیں۔ اہلکاروں کو دیکھ کر اس نے خفیف سے تعجب کا اظہار کیا جیسے اس نے آئی گلاس سے انہیں نہ دیکھا ہو۔

''یس؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

افسر ایک ہاتھ سے گریٹا کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر آگیا۔ اس کے ساتھ دونوں اہلکار بھی تھے۔ ان میں سے ایک نے دروازہ بند کرلیا۔ اسے اس کے افسر سے یہ ہدایت پہلے ہی مل چکی ہوگی۔

''ابھی یہاں کون آیا تھا۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے؟'' افسر نے گریٹا کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

گریٹا اردو ٹوٹی پھوٹی ہی بولتی تھی لیکن دوسرے کی کہی ہوئی بات پوری طرح سمجھ لیتی تھی۔ اس نے انگریزی میں کہا کہ وہ اردو میں بات نہیں کرسکتی۔

افسر نے اپنا سوال انگریزی میں دہرایا۔

''وہ مس ڈیبرا کی کوئی دوست تھیں۔ انہی سے ملنے آئی تھیں۔'' گریٹا نے جواب دیا۔

''آج سے پہلے بھی میرا محکمہ تم سے پوچھ گچھ کرچکا ہے۔'' افسر نے کچھ غصیلی آواز میں کہا۔ ''اس وقت بھی تم نے جھوٹ بولا ہوگا اور اب پھر جھوٹ بول رہی ہو۔''

''نہیں، یقین کیجیے، وہ مس ڈیبرا کی کوئی دوست تھیں۔''

افسر کا ہاتھ بڑی تیزی سے گھوما۔ اس نے گریٹا کی عمر کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ اس کا زناٹے دار تھپڑ گریٹا کے بائیں گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ سی ایس کے اہلکار خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ گریٹا اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ باچھوں سے خون کی پتلی سی دھار بہہ نکلی تھی۔ اس نے بے بسی سے سی ایس کے اہلکاروں کی طرف دیکھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''یہ...... یہ ظلم ہے۔''

''سی ایس سے جھوٹ بولنے والوں کے ساتھ اس سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔''

''تو وہ ڈیبرا کی دوست تھی؟'' افسر طنزیہ انداز میں

بولا۔
''ہاں۔'' گریٹا کو علم نہیں تھا کہ بات کھل چکی ہے اس لیے وہ اپنی بات پر جمی رہی۔
افسر کا ہاتھ پھر اٹھا ہی تھا کہ گریٹا جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔
افسر نے اپنے ساتھ آئے ہوئے اہلکاروں سے کہا۔ ''اسے گھسیٹتے ہوئے لے چلو یہاں سے۔''
دونوں اہلکار تیزی سے گریٹا کی طرف بڑھے۔
''کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟'' گریٹا اب خوف زدہ ہوئی۔
''ہیڈ کوارٹر۔''
دونوں اہلکار نے گریٹا کو اس کے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا چاہا۔
''پلیز! گھسیٹو مت مجھے۔ میں خود چلنے کے لیے تیار ہوں۔''
اہلکاروں نے اس کا جواب نظر انداز کر دیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ گریٹا کے بازو ان کی گرفت میں تھے۔ اس لیے گریٹا کو جھٹکا لگا اور اس کے پیر پھسل گئے۔ وہ گھسٹنے لگی۔
''مجھے گھر کو لاک کرنے دو ظالمو۔'' گریٹا نے چیخ کر کہا۔
فوراً ہی عقب سے افسر نے اس کے اتنی زوردار ٹھوکر ماری کہ گریٹا کے منہ سے زور کی آہ نکل گئی۔
اپارٹمنٹ کے باہر دو چار افراد اِدھر اُدھر کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے یقیناً سی ایس کے اہلکاروں کو ڈیبرا کے گھر میں جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ انہوں نے جو یہ دیکھا کہ گریٹا کو گھسیٹ کر باہر لایا جا رہا ہے تو وہ تیزی سے کھسک لیے۔
افسر کا مقصد بھی غالباً یہی تھا کہ لوگ یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہوں اور سی ایس کے دبدبے میں اضافہ ہو۔
نیچے سی ایس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ان کی گاڑی مخصوص طرز کی تھی جو یقیناً آرڈر دے کر بنوائی اور منگوائی گئی ہوگی۔ اس پر بھی سی ایس کا بڑا سا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ چھت پر ویسی ہی گردش کرنے والی لائٹس تھیں جو ایمبولینس یا پولیس کاروں پر ہوتی ہیں۔
گریٹا کو اٹھا کر اس گاڑی میں ڈال دیا گیا۔
اِدھر اُدھر جاتے ہوئے لوگ رک کر یہ منظر دیکھنے لگے۔ خوف زدہ وہ بھی نظر آنے لگے تھے۔

گاڑی کے قریب ہی دو موٹر سائیکلیں بھی کھڑی تھیں۔ ان کی قدرے بڑی ہیڈ لائٹ پر بھی سی ایس کا مونوگرام کندہ تھا۔
جو اہلکار وہاں پہلے سے موجود تھے، انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ اوپر جا کر ڈیبرا کا اپارٹمنٹ سیل کر دیں۔
افسر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا اہلکار انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ گاڑی حرکت میں لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہوٹر بھی کھول دیا تاکہ راستے میں کوئی گاڑی سامنے نہ آئے۔
رفتار تیزی سے بڑھائی گئی تھی۔ ایک موٹر سائیکل سوار فوری طور پر راستے سے نہیں ہٹ سکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ سی ایس کی گاڑی کی زد پر آیا اور اچھل کر دور جا گرا۔ اس کا اور موٹر سائیکل کا کیا حشر ہوا؟ یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔
گاڑی اپنی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔
یہ پہلا واقعہ تھا جس سے سی ایس نے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کا آغاز کیا تھا۔

☆☆☆

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔
''کہاں چلی گئی؟'' ڈیبرا پریشانی میں بڑبڑائی۔
''شاید باتھ روم میں ہو نہا رہی ہو۔ ذرا دیر بعد فون کر لینا۔'' پشمینہ نے کہا۔
ڈیبرا موبائل بند کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، رات کو سونے سے پہلے اسے غسل کرنے کی عادت تو ہے۔''
گریٹا پر جو کچھ گزری تھی، وہ اس وقت ان دونوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔
''میں آئندہ چند دن میں اپنی پارٹی کے نام کا اعلان کرنے والی ہوں۔'' پشمینہ نے ڈیبرا کو بتایا۔ ''چند ایسے لوگ جو موجودہ سیاست سے دل برداشتہ ہو کر خاموشی سے زندگی گزارنے لگے تھے، انہوں نے آج مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ کل میٹنگ طے ہے۔ شاید پرسوں ہی پارٹی کا اعلان کر دوں۔''
''اوہ! فنڈز کے سلسلے میں کیا ہوگا؟ میں نے شاہ صاحب سے بات کی تھی۔ تم جتنا کہو گی، اتنا فنڈز مل جائے گا۔''
''شکریہ اُن کا۔ فنڈز کا بندوبست تو پارٹی کے اعلان کے دوسرے ہی دن ہو جائے گا۔ تاہم میں بھی فون کر کے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کر دوں گی۔ شاید کسی موقع پر ان کی

ضرورت پڑ ہی جائے۔“

ڈیبرا نے سیٹلائٹ فون کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔”میں نے یہ ایکٹیویٹ کر دیا ہے اور ان کا فون نمبر بھی فیڈ کر دیا ہے۔“

”گڈ۔“ پشمینہ نے سیٹلائٹ فون نکال کر دیکھا۔ ”خوب صورت ہے۔“

”میں گریٹا کے سلسلے میں پریشان ہوں پشمینہ!“

”وہ تمہاری مس کال دیکھ کر خود ہی فون کرلے گی۔ اتنا وقت لگنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔ ذرا دیر اور انتظار کرلو۔ اتنی دیر میں اپنا حلیہ بھی تبدیل کرلو۔ میں نے وارڈروب میں اپنے کپڑوں کے ساتھ تمہاری دو جینز، ایک چست پتلون اور بنیان وغیرہ بھی رکھ دی ہیں۔ چلو، میں وہ تمہیں دکھا دیتی ہوں۔“

ڈیبرا کو ساتھ لے کر پشمینہ خواب گاہ کی طرف بڑھی۔

ڈیبرا نے پوچھا۔”باڈی گارڈز دانش یزدانی ہی کے ہیں؟“

”نہیں، وہ واپس چلے گئے ہیں۔ اب ایک ایجنسی کے یہ گارڈز میرے ہی ہیں۔ بندوبست دانش نے ہی کروایا ہے۔ میرے لیے ایک بلٹ پروف جیکٹ کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ تمہارے لیے بھی ایک اور منگوا لوں گی۔ ابھی اسے فون کیے دیتی ہوں۔ تمہارے لیے بھی کل تک آجائے گی۔“

”شاہ صاحب کے کہنے پر دبئی کے ایک تاجر آپ کے لیے ایک بلٹ پروف کار بھجوا رہے ہیں۔“

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں خواب گاہ میں داخل ہو چکی تھیں اور پشمینہ نے وارڈروب کھول دی تھی۔

”یہ ہیں تمہارے کپڑے۔“ پشمینہ نے بتایا۔”تم تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔“

وہ ڈیبرا کو چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آئی اور ٹی وی کھول کر موبائل پر دانش یزدانی سے رابطہ کیا۔ اس سے ایک اور بلٹ پروف جیکٹ کے لیے کہا، پھر رابطہ منقطع کر کے ٹی وی کی طرف توجہ دی جس پر اشتہار ختم ہونے کے بعد خبریں نشر ہونے لگیں۔

ایک خبر یہ بھی آئی کہ سی ایس کی ایک تیز رفتار گاڑی کے دھکے سے ایک موٹر سائیکل سوار شدید زخمی ہوا ہے جسے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ پولیس نے اس واقعے کی ایف آئی آر درج نہیں کی۔ صاف انکار کر دیا گیا۔

”دہشت گردی شروع۔“ پشمینہ زیرِلب بڑبڑائی۔

اسی وقت بریکنگ نیوز کی سلائڈ چلی، پھر خبر آئی کہ سی ایس نے پشمینہ حیات کی دوست باڈی گارڈ ڈیبرا کے گھر پر ریڈ کیا تھا۔ ڈیبرا ان کو نہیں ملی تو وہ لوگ ڈیبرا کی معمر ملازمہ کو زبردستی اٹھا لے گئے۔ اسے بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالا گیا تھا۔ گریٹا کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ غالباً اسے زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔ اپارٹمنٹ سیل کر دیا گیا۔

پشمینہ کا جسم سنسنا گیا اور چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ ڈیبرا پر اس خبر سے قیامت گزر جائے گی۔ اس نے کبھی گریٹا کو ملازم نہیں سمجھا تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتی تھیں۔

خبر سنانے کے بعد اینکر پرسن نے اسی خبر پر تجزیہ کرنے کے لیے ایک جرنلسٹ کو لائن پر لیا۔ ان کی گفتگو شروع ہوئی ہی تھی کہ پشمینہ نے ڈیبرا کے قدموں کی آہٹ سنی۔ اس نے فوراً ٹی وی بند کر دیا۔ وہ ڈیبرا کو سمجھا بجھا کر یہ خبر اسے خود دینا چاہتی تھی۔

ڈیبرا چست پتلون اور بنیان میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

”میں ابھی پھر فون کر چکی ہوں گریٹا کو۔“ وہ بولی۔ ”اب بھی اُدھر سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔“

”بیٹھو!“ پشمینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں فوراً وہاں جانا چاہتی ہوں۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ سی ایس والے اسے پوچھ گچھ کرنے کے لیے لے گئے ہیں۔ غالباً اپنے ہیڈ کوارٹر ہی گئے ہوں گے۔“

ڈیبرا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور وہ صوفے پر گر سی پڑی۔

”میں ابھی چنگیزی سے بات کرتی ہوں۔“ پشمینہ نے کہا اور موبائل پر چنگیزی سے رابطہ قائم کرنے لگی۔

ڈیبرا بڑے غصے سے بولی۔”اگر گریٹا کو کچھ ہو گیا تو میں موقع ملنے پر چنگیزی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ گولیاں اتار دوں گی اس کے سینے میں۔“

”اس سے ایجنسی ختم نہیں ہو جائے گی۔ اس کی جگہ کوئی ہلاکو آجائے گا۔“ پشمینہ نے کہا۔”جذبات میں نہ بہو۔ ان حالات میں ہمیں بڑے تحمل سے کام کرنا ہوگا ورنہ......“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ چنگیزی سے رابطہ ہو گیا تھا۔

”فرمائیے میڈم!“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔”ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے خادم کو یاد کیا۔“

''گریٹا کہاں ہے؟'' پشمینہ نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

''جو بھی ایس سے غلط بیانی کرے گا، اسے سزا تو ملے گی میڈم!'' چنگیزی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''وہ پہلے بھی میرے آدمیوں سے غلط بیانی کر چکی تھی۔ آج بھی وہ اس بات پر اڑی رہی کہ جو اپارٹمنٹ میں آئی تھی، وہ ڈیبرا کی کوئی دوست تھی۔ اس طرح اس نے پھر جھوٹ بولا۔ یہ نہیں بتایا کہ وہ خود ڈیبرا تھی۔ ایک غلط بیانی بھی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ اس نے تو دوسری مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ سزا تو ملے گی اُسے۔''

''کس قسم کی سزا؟'' پشمینہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''دو گھنٹے بعد وہ آپ کو اسپتال میں مل جائے گی۔'' اس نے جواب دیا، پھر اسپتال کا نام بھی بتادیا۔

پشمینہ نے دانت پیستے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

ڈیبرا پریشانی کی حالت میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پشمینہ نے اسے پوری بات بتائے بغیر کہا۔ ''پوچھ گچھ کرنے کے بعد وہ دو گھنٹے بعد اسے چھوڑ دیں گے۔''

''سزا کا لفظ آیا تھا تمہاری زبان پر، وہ کیا سزا دینا چاہتے ہیں اُسے؟'' ڈیبرا ہذیانی انداز میں بولی۔

''یہ دو گھنٹے بعد ہی معلوم ہوسکے گا۔ صبر سے انتظار کرو۔ ابھی کہہ چکی ہوں کہ جذبات پر قابو رکھو۔ بہت سوچ سمجھ کر استقامت سے حالات کے مطابق اقدامات کرنے ہوں گے۔ سی ایس کو بہت عجلت میں فعال کیا گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ابھی اس میں کچھ وقت لگے گا۔ گریٹا کا معاملہ تو سمجھو کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں مستقبل قریب میں بڑے خوفناک حالات کی توقع رکھتی ہوں۔''

''تو پھر تم کو بھی......''

پشمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ نہیں ڈیبرا! اب وہ میرے معاملے میں شاید کوئی خطرناک قدم نہ اٹھائیں۔ ممی نے مجھے فون پر بتایا تھا۔ انہوں نے ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ اگر پشمینہ کو کچھ ہوا تو وہ اپنے آپ کو شوٹ کرلیں گی۔''

ڈیبرا کچھ نہیں بولی اور صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

''دو گھنٹے آرام کرلو۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''میرے بیڈ روم میں جا کر بستر پر لیٹ جاؤ۔''

''مجھے اس وقت آرام نہیں مل سکتا۔''

''لیٹو گی تو کم از کم جسم کو آرام مل جائے گا۔ جسم کو آرام ملتا ہے تو ذہن کو بھی خود بخود کچھ سکون مل جاتا ہے۔''

''مجھے آرام نہیں ملے گا۔''

''میں جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔'' پشمینہ نے کچھ بگڑ کر کہا۔

ڈیبرا نے فوری طور پر اسے گھور کر دیکھا، پھر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

پشمینہ نے موبائل پر دانش یزدانی سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''مجھے گریٹا کے بارے میں معلوم ہوچکا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔ تم نے اپنی پارٹی کا میڈیا سیل بہت مضبوط بنایا ہے۔ تم ٹی وی نہیں بھی دیکھ رہے ہو گے تو بھی اہم خبر تم تک فوراً پہنچائی جاتی ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ابھی میں نے چنگیزی کو فون کیا تھا۔'' اس نے وہ باتیں دہرادیں جو چنگیزی سے معلوم ہوئی تھیں پھر کہا۔ ''ضروری نہیں ہے کہ گریٹا کو دو گھنٹے بعد ہی وہاں پہنچایا جائے۔ پہلے بھی پہنچایا جاسکتا ہے اور چنگیزی سے میں یہ توقع نہیں کرسکتی کہ وہ مجھے اس بارے میں اطلاع دینے کے لیے فون کرے گا۔ تم اپنے کسی معتمد کو فوری طور پر وہاں بھیج دو تاکہ مجھے بروقت اطلاع مل سکے۔''

''میں اپنے اعتماد کے ایک جرنلسٹ کو وہاں بھیج دوں گا۔'' دانش نے جواب دیا۔ ''اس سے یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ دو گھنٹے کے اندر اندر اسے وہاں سے ایک اہم خبر مل سکتی ہے۔ یہ ہدایت بھی کردوں گا کہ مجھے وہ فوراً اطلاع دے۔''

''جیسا مناسب سمجھو، وہ کرو۔ دوسری بات کہ ڈیبرا کے لیے بھی میں ایک بلٹ پروف جیکٹ چاہتی ہوں۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کل صبح دس بجے سے پہلے پہنچوادوں گا، کیا تم ٹی وی کھولے ہوئے ہو؟''

''ذرا دیر کے لیے کھولا تھا تو یہ خبر ملی۔ مجھے بہت کچھ سوچنا پڑ رہا ہے اس لیے مستقل ٹی وی نہیں دیکھ رہی ہوں، کیوں؟''

''حالات بہت تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ غالباً سی ایس کا جال سارے ملک میں پھیلا دیا گیا ہے۔ دوسرے شہروں سے بھی سی ایس کی جارحیت کی خبریں آرہی ہیں۔ لوگوں کو گھروں سے اٹھایا جارہا ہے۔ خصوصاً اُن بڑے لوگوں کو جو شاہ صاحب کے پیروکار ہیں۔''

''یہ سب ہونے کا اندازہ تھا مجھے۔'' پشمینہ نے کہا۔

''بس میری توقع سے پہلے ہوگیا یہ سب کچھ۔''

''دوسری خبر سنو! شہر کے اہم مقامات پر صدر حیات

کے مجسمے لگائے جا رہے ہیں۔‘‘
’’اوہ، اس کا علم نہیں ہو سکا تھا مجھے۔ یقیناً وہ مجسمے بہت پہلے ہی تیار کروا لیے گئے ہوں گے۔ انہیں نصب کرنے کا کام اب شروع ہوا ہے۔‘‘
’’ٹی وی چینلز پر ان حالات کے بارے میں حکومت کے خلاف بہت سخت باتیں کی جا رہی ہیں۔‘‘
’’کسی وقت بھی میڈیا کو زنجیروں سے جکڑا جا سکتا ہے۔‘‘
’’تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے ایک ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ میڈیا چارٹر کے نام سے ایک آرڈی نینس جاری کیا جائے گا۔ آرڈی نینس جاری کرنے میں تاخیر جان بوجھ کر کی جا رہی ہے۔ صدر حیات کی خواہش ہے کہ دو تین روز تک ٹی وی اور اخبارات میں یہ خبریں چلتی رہیں تاکہ سی ایس کے حوالے سے ملک بھر میں خوف کی فضا پیدا ہو جائے۔‘‘
’’ہوں۔‘‘ پشمینہ نے ہونٹ بھینچ لیے، پھر کہا۔ ’’اس طرح دراصل صدر صاحب اپنی شامت کو خود دعوت دے رہے ہیں۔‘‘
’’لیکن اس سے پہلے ہمیں بھی بڑے جاں گسل حالات سے گزرنا ہوگا۔‘‘
’’مجھے خوشی ہوئی کہ تم ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو۔ اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔ جیسے ہی مجھے گریٹا کے بارے میں اطلاع ملے گی، میں تمہیں فون کر دوں گا۔‘‘
پشمینہ نے رابطہ منقطع کیا اور ڈیبرا کی حالت دیکھنے کے لیے اپنی خواب گاہ کا رخ کیا۔ یہ دیکھ کر اس نے ایک طویل سانس لی کہ ڈیبرا بستر پر لیٹنے کے بجائے وحشیانہ انداز میں ٹہل رہی تھی۔
پشمینہ اس سے مخاطب ہوئے بغیر بستر پر جا کر لیٹ گئی۔
دو گھنٹے سے پہلے ہی دانش یزدانی کا فون آ گیا۔
’’گریٹا وہاں بہت بری حالت میں پہنچی ہے۔ غالباً بے ہوش ہے۔ ابھی اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوا۔‘‘ اس نے بتایا۔
’’اچھا ٹھیک ہے۔‘‘ پشمینہ نے کہہ کر فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔
وہ ڈیبرا کے سامنے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ڈیبرا سے کہا۔ ’’میں جا رہی ہوں۔‘‘ وہ کھڑی ہو گئی۔ ’’امکان ہے کہ میں گریٹا کے بارے میں کچھ معلوم کر کے ہی لوٹوں گی۔ تم اب......‘‘
ڈیبرا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’’تمہیں فون پر بتایا گیا تھا کہ اسے دو گھنٹے بعد چھوڑ دیا جائے گا۔‘‘
’’ابھی نہیں چھوڑا گیا۔‘‘ پشمینہ نے جواب دیا۔ ’’میں اسی بارے میں معلومات حاصل کرنے جا رہی ہوں۔ پانچ باڈی گارڈ لیے ہیں میں نے، تین کو میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ دو یہاں تمہاری حفاظت کے لیے رہیں گے۔‘‘
’’میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔ کبھی وقت آئے تو دیکھنا کہ میں کتنوں پر اکیلی ہی بھاری پڑوں گی لیکن اس وقت تم جہاں بھی جا رہی ہو، مجھے بھی ساتھ لے کر چلو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔‘‘
حقیقت یہی تھی۔ پشمینہ پہلے خود جاننا چاہتی تھی کہ گریٹا کو کس حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ اس نے ڈیبرا کی طرف دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ’’اچھا چلو۔‘‘
رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا۔ پشمینہ کی کار بہت تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف رواں دواں تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر خود پشمینہ تھی۔ ڈیبرا اس کے برابر کی سیٹ پر تھی۔ دو باڈی گارڈ پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ دو باڈی گارڈ کار کے آگے پیچھے موٹر سائیکلوں پر تھے۔ ایک باڈی گارڈ کو پشمینہ نے ہوٹل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔
’’تم بتا نہیں رہی ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔‘‘ ڈیبرا نے تیسری بار کہا۔
’’اسپتال۔‘‘ اب پشمینہ نے بتا ہی دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی بتا دینا مناسب ہوگا۔ اس نے وہ جملہ بھی دہرا دیا جو اس سے دانش نے کہا تھا۔
ڈیبرا کے منہ سے بے معنی سی آواز نکلی اور پھر وہ دانت پیسنے لگی۔ کچھ لمحوں کے توقف سے بولی۔ ’’اس کا مطلب ہے گریٹا پر تشدد کیا گیا ہے۔‘‘
پشمینہ کے ذہن میں بھی یہ بات آ چکی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

گریٹا پر ایسا تشدد کیا گیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی نشان نہیں آیا تھا لیکن جسم جگہ جگہ بلیڈ سے کاٹا گیا تھا، جلتے ہوئے سگریٹ بجھائے گئے تھے۔ اس کی وہ حالت دیکھ کر ڈیبرا کا جسم غصے سے کانپنے لگا اور چہرے پر ایسی سرخی چھا

گئی تھی جیسے کسی وقت بھی جلد پھٹے گی اور چہرے پر خون ہی خون پھیل جائے گا۔

دوسرے دن جب وہ کسی حد تک بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ لوگ اس سے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ڈیبرا کس جگہ روپوش رہی تھی لیکن وہ اس کی زبان کھلوانے میں ناکام رہے تھے۔

ڈیبرا مستقل طور پر گریٹا کے پاس ہی رہنا چاہتی تھی لیکن پشمینہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس دن سیاست سے کنارہ کش ہو جانے والے کچھ لوگوں کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی۔ اس نے گریٹا کے سامنے ہی ڈیبرا کو سمجھایا۔

''میں تمہارے ساتھ دو باڈی گارڈ چھوڑ کر چلی جاؤں تو بھی تمہاری طرف سے پریشان ہی رہوں گی۔ میری عدم موجودگی میں سی ایس کے اہلکار تمہیں ضرور اٹھا لے جانے کی کوشش کریں گے۔''

''میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔''

''دو درجن افراد بھی یلغار کر سکتے ہیں۔''

''ان میں سے چھ سات کو تو میں موت کی نیند سلا دوں گی۔''

''پکڑی پھر بھی جاؤ گی۔''

''میں انہیں مار کر یہاں سے بچ کے نکل بھی جاؤں گی۔''

''اس کے بعد پھر روپوش ہونا پڑے گا اور مجھے تمہاری رفاقت حاصل نہیں رہے گی۔ کم از کم میرا ہی کچھ خیال کرو۔''

اس بات کے جواب میں ڈیبرا چپ رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بے بسی کا تاثر ابھر آیا تھا۔

''چلی جاؤ ڈیبو!'' گریٹا کی آواز میں نقاہت تھی۔ ''تمہارے یہاں رہنے سے میں جلدی ٹھیک نہیں ہو جاؤں گی۔''

ڈیبرا بے بسی کے عالم میں پشمینہ کے ساتھ واپس لوٹی۔

شام پانچ بجے ہوٹل ہی میں میٹنگ تھی۔ اس میٹنگ میں پانچ افراد آئے تھے۔ ڈیبرا کو اس میٹنگ میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

میٹنگ رات گئے تک جاری رہی۔

ٹی وی چینلز سے برابر یہ خبر نشر کی جا رہی تھی کہ پشمینہ حیات کی اس میٹنگ میں یقینی طور پر ایک نئی سیاسی پارٹی وجود میں آئے گی۔ پھر جیسے جیسے رات بھیگتی گئی، یہ خبریں بھی آنے لگیں کہ اس میٹنگ میں پارٹی کے سارے ہی امور طے کیے جا رہے ہیں۔

صحافیوں کی خاصی تعداد اور ٹی وی کیمرے ہوٹل کی لابی میں موجود تھے کیونکہ میٹنگ کے بعد پشمینہ کو پریس سے بات کرنی تھی۔

صحافی چھ بجے ہی سے جمع ہونے لگے تھے۔ انہیں ایک تھکا دینے والا انتظار کرنا پڑا۔ لابی ہی میں وہ ڈائس بنایا گیا تھا جہاں بیٹھ کر پشمینہ پریس کانفرنس کرتی۔ وہاں سات کرسیاں لگائی گئی تھیں۔

ٹی وی چینلز پر یہ خبر بھی آ چکی تھی کہ میٹنگ میں پانچ افراد ہیں۔ ان کے نام بھی دے دیے گئے تھے لیکن ڈائس پر سات کرسیاں تھیں اس لیے کہا جا رہا تھا کہ اس پریس کانفرنس میں بھی ڈیبرا، پشمینہ کے ساتھ ہوگی۔

تمام چینلز پر تجزیے بھی جاری تھے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کو بھی اس پریس کانفرنس سے دلچسپی تھی۔ وہ بھی اس پریس کانفرنس کی خبر نشر کر چکے تھے۔ ایک مغربی چینل یہ پریس کانفرنس براہِ راست بھی دکھانا چاہتا تھا چنانچہ اس کے تین کیمرے لابی میں موجود تھے۔

چینلز پر سی ایس کی بتدریج بڑھتی ہوئی زیادتیوں کی خبریں تو آ ہی رہی تھیں اور تشدد زدہ گریٹا کی تصویر بھی آ چکی تھی جو خود سی ایس نے جاری کی تھی۔ تصویر پر یہ بھی لکھا تھا۔

''سی ایس سے غلط بیانی کرنے والوں کا انجام۔''

ان سب باتوں کی وجہ سے چینلز پر یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا تھا کہ اس پریس کانفرنس کے سلسلے میں سی ایس کا کوئی ردِعمل آ سکتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال اٹھنے کا سبب تھا پشمینہ پر ہونے والا قاتلانہ حملہ جو ڈیبرا کی چلائی ہوئی گولی کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔

اب جو پریس کانفرنس ہونے والی تھی اس میں ڈائس پر بلٹ پروف شفاف شیشہ بھی لگایا گیا تھا۔

جو ٹی وی چینلز اس پریس کانفرنس کو مسلسل نہیں دکھا رہے تھے، ان پر ایک بجنے میں دس منٹ پر بریکنگ نیوز چلی کہ اب پشمینہ پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کے لیے ڈائس پر پہنچ چکی ہے۔

صحافیوں سے مخاطب ہو کر اس نے کہا کہ اس میٹنگ کی طوالت کا سبب بنیادی امور کا فوری طور پر طے ہونا تھا۔ اس میں یہ طے پایا کہ پارٹی کا نام آر ایف، یعنی ری پبلکن فورم ہوگا۔ اس کی صدارت اسد گیلانی کو اتفاق رائے سے سونپی گئی تھی۔ پارٹی فلیگ سیاہ رنگ کا ہوگا جس پر سفید

لکیروں سے فاختہ کی تصویر ہوگی جو ''امن'' کی علامت ہے۔ منشور کا اعلان چند روز میں کیا جائے گا جس کے بارے میں ابھی میٹنگز جاری رہیں گی۔ چند اور ثانوی باتوں کے بعد آخری اہم بات یہ کہی گئی کہ اگلے ہی دن ایک اور اہم کانفرنس ہوگی۔

پشمینہ کے خاموش ہونے کے بعد صحافیوں کے سوالات شروع ہوئے۔ ان میں ایک خطرناک سوال یہ تھا کہ کیا ری پبلکن فورم موجودہ حکومت یعنی جمہوریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گا؟

سوال میں لفظ ''جمہوریت'' کا اضافہ صحافی کی شرارت تھی۔

پشمینہ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ ''ری پبلکن'' کا مطلب ہی ''جمہوریت پسند'' ہے اس لیے جمہوریت کے خلاف یہ فورم کیسے کام کرسکتا ہے اور کیونکہ اس وقت ملک میں ''جمہوریت'' کے بجائے تیزی سے ''جبریت'' کا نظام نافذ ہوتا جارہا ہے لہٰذا یہ فورم اس جبر کے خلاف کام کر کے ملک میں جمہور کا نظام بحال کرنے کے لیے سرگرم ہوگا۔

پشمینہ اپنی کرسی سے اٹھی، پھر یکایک رک کر بولی۔ ''آج صدر اسد گیلانی خاموش رہے ہیں لیکن کل یہ بھی آپ لوگوں سے باتیں کریں گے اور پارٹی کے جنرل سیکریٹری بھی۔''

اس کے بعد صحافی پوچھتے رہ گئے کہ جنرل سیکریٹری کون ہوگا لیکن پشمینہ جواب دیے بغیر لابی سے چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پانچوں افراد اور ڈیبرا بھی۔

سوئٹ کے ڈرائنگ روم میں مزید نصف گھنٹے ان کی میٹنگ ہوئی۔ پھر پشمینہ نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔ ''خیال رکھیے گا۔ میرا ساتھ دے کر آپ لوگوں نے اپنے لیے خطرات کو دعوت دی ہے۔''

''ہم پانچوں اس سلسلے میں پہلے ہی میٹنگ کر چکے ہیں میڈم!'' اسد گیلانی نے کہا۔ ''ہم سینے پر لگنے والی گولیوں کا خیر مقدم کریں گے۔''

جواب میں پشمینہ نے کہا۔ ''اس سوچ کے بغیر تو یہ جبریت ختم ہو بھی نہیں سکتی۔''

ان پانچوں کے جانے کے بعد پشمینہ نے ٹی وی کھولا۔ بار بار چینل بھی تبدیل کیے۔ تقریباً ہر چینل پر اس کی پریس کانفرنس زیرِ بحث تھی۔ یہ بھی سوچا جارہا تھا کہ اس پارٹی کا جنرل سیکریٹری کون ہوگا؟

پشمینہ نے مسکرا کر ڈیبرا کی طرف دیکھا جو کسی سوچ میں گم تھی۔ وہ ابھی تک گریٹا کے صدمے سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔

پشمینہ نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''چلو اب سویا جائے۔ پونے تین بج گئے۔''

خاموشی کے ساتھ ڈیبرا بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی۔

اس دن دانش یزدانی نے پشمینہ کے لیے بلٹ پروف جیکٹ فراہم کردی تھی اور شام کو بلٹ پروف کار بھی آچکی تھی۔

دوسری صبح پشمینہ اور ڈیبرا ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پشمینہ کے لیے پے در پے کالز آنی شروع ہوگئیں۔ وہ مختلف پارٹیوں کے ایم این اے اور ایم پی اے تھے جنہوں نے اسی دن اسمبلیوں اور اپنی اپنی پارٹیوں کو استعفے بھجوا دیے تھے۔ اب وہ ری پبلکن فورم میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی پارٹیوں کے سارے کارکن تو نہیں لیکن ان کی خاصی بڑی تعداد ری پبلکن میں آنے کی خواہش مند تھی۔

''پہلے ہی دن بہت بڑی تعداد ہمارے ساتھ آرہی ہے ڈیبرا۔'' پشمینہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مجھے تو اس کی توقع تھی۔'' ڈیبرا نے کہا۔ ''تم خود نہیں کہہ رہی ہو لیکن یہ توقع تمہیں بھی ہوگی اور ٹی وی چینلز کے تجزیوں میں بھی یہ بات کہی جاتی رہی ہے۔''

پشمینہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

اسی دن ''ری پبلکن فورم'' کو رجسٹر بھی کرا لیا گیا۔ پارٹی کا ایک بڑا سا فلیگ بھی بن کر آگیا جو اس شام کی پریس کانفرنس میں ڈائس پر لگایا جانا تھا۔ عام سائز کے چھوٹے پرچموں کی ایک کثیر تعداد تیار کرنے کا آرڈر بھی دیا جاچکا تھا۔ دوپہر تک لیٹر ہیڈ بھی چھپ کر آگئے۔

مصروفیت کے باوجود پشمینہ نے کچھ وقت ڈیبرا کے لیے بھی نکالا تھا اور اس کے ساتھ گریٹا کو دیکھنے اسپتال بھی گئی تھی۔ گریٹا کو انہوں نے گزشتہ روز کی بہ نسبت بہتر پایا تھا۔

اس دوران میں بزنس مین حاجی اشفاق کی کال بھی آچکی تھی۔ وہ پشمینہ سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا لیکن مصروفیت کے باعث پشمینہ اسے چار بجے کا وقت دے سکی۔

وہ ٹھیک چار بجے آگیا کیونکہ پانچ بجے پشمینہ کی پریس کانفرنس شروع ہونی تھی۔ اس نے آتے ہی سب سے

پہلے تو ''ری پبلکن فورم'' کے قیام کی مبارک باد دی، پھر وہ بلینک چیک مانگا جو اس کی خواہش پر پشمینہ نے رکھ لیا تھا۔ چیک لے کر اس نے اس پر ری پبلکن فورم کا نام اور ایک کثیر رقم لکھی۔ پھر اپنی جیب سے دو چیک اور نکالے جو اس کے ساتھیوں نے دیے تھے۔ تینوں چیک اس نے بڑے احترام سے پشمینہ کی خدمت میں پیش کر دیے۔

وہ مجموعی رقم اتنی تھی کہ پشمینہ چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گئی۔ پھر اس نے وہ چیک ڈیبرا کو دیے اور کہا۔ ''ان کی رسید بنا دو۔''

ڈیبرا نے تین رسیدیں بنا دیں۔ پشمینہ نے اس پر دستخط کیے اور تینوں رسیدیں حاجی اشفاق کی طرف بڑھا دیں۔ ''آپ لوگوں کا بے حد شکریہ حاجی صاحب!''

''شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں پشمینہ صاحبہ!'' حاجی اشفاق نے کہا۔ ''یہ رقم آپ کو تو نہیں دی گئی۔ یہ تو جمہوریت کے نام ہے جس کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''آپ لوگوں کے جذبات قابلِ قدر ہیں۔''

''بس ایک درخواست ہے آپ سے۔ یہ بات تو خیر خبروں میں آچکی ہے کہ میں نے آپ سے ملاقات کی تھی لیکن یہ بات سامنے نہ لایئے گا کہ فنڈ آپ کو کہاں سے مہیا ہوا ہے۔''

''کل صبح یہ چیک پارٹی کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیے جائیں گے۔ بات راز میں تو نہیں رہ سکے گی، اور پھر کسی بھی وقت انکم ٹیکس کے محکمے کا سوال بھی کھڑا ہوگا۔''

''حاجی اشفاق خفیف سا مسکرایا۔ ''جوش اور جذبات میں ہمارا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں۔ خیر، دیکھا جائے گا۔'' حاجی اشفاق کھڑا ہو گیا۔ ''آپ کی پریس کانفرنس کا وقت قریب آرہا ہے۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔''

پشمینہ نے اسے رخصت کرنے کے بعد ڈیبرا سے کہا۔ ''قدرت بھی ہماری مدد پر آمادہ ہو چکی ہے۔''

''میں تمہیں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔'' ڈیبرا دو دن میں پہلی مرتبہ مسکرائی۔

☆☆☆

اس دن کی پریس کانفرنس بھی لابی ہی میں کیا جانا طے پایا تھا اور اس موقع پر زیادہ لوگوں کے لیے بڑے ڈائس کی ضرورت تھی۔ لابی کی چوڑائی کیونکہ زیادہ نہیں تھی اس لیے ڈائس لمبائی میں بنایا گیا تھا۔

اس پریس کانفرنس اور بڑے اسٹیج کے لیے ہوٹل کی انتظامیہ سے خصوصی طور پر اجازت لی گئی تھی جو انہیں خوشی سے دی دے گئی تھی لیکن انتظامیہ کے لوگ پریشان بہر حال تھے۔ اس ہوٹل میں پشمینہ حیات کا قیام ہوٹل کے لیے اعزازی بات سہی لیکن سی ایس کی وجہ سے ان کا پریشان ہونا بھی فطری امر تھا۔

پریس کانفرنس کو سیکیورٹی فراہم کرنے کے لیے سرکاری انتظامیہ سے اس دن بھی کوئی درخواست نہیں کی گئی تھی۔ پارٹی کی طرف سے صرف ایک دن کے لیے پچاس پرائیویٹ گارڈز کا انتظام کیا گیا تھا۔

صحافیوں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ ساری لابی بھر جاتی لیکن ہوٹل میں مقیم بہت سے لوگ بھی یہ کانفرنس سننے کے لیے لابی میں جمع ہونے لگے تھے۔

اس طرح تین چوتھائی لابی بھر سکتی تھی لیکن ہوا یہ کہ عوام نے بھی وہاں پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ پونے پانچ بجے تک ساری لابی بھر چکی تھی اور ہوٹل کے باہر بھی لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ وہ سب بھی ہوٹل کی لابی میں گھسنا چاہتے تھے۔ پرائیویٹ گارڈز اور ہوٹل کی انتظامیہ انہیں روکنے کی کوششوں میں ناکام ہونے لگی تو ہوٹل کے منیجر اور سیکیورٹی کے چیف نے گھبرا کر پشمینہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''یہ تمہاری مقبولیت ہے۔'' ڈیبرا نے خوشی سے لرزیدہ آواز میں پشمینہ سے کہا۔ ''تم کامیابی حاصل کر چکی ہو پشمینہ!''

خوشی پشمینہ کو بھی تھی لیکن ہجوم کو قابو کرنا بھی ضروری تھا جس کی ایک ہی تدبیر پشمینہ کی سمجھ میں آسکی۔ اس تدبیر کے مطابق بڑی عجلت میں ہوٹل کے صدر دروازے پر ایک لاؤڈ اسپیکر لگایا گیا جس کا رابطہ اس مائیکروفون سے کیا گیا جو پشمینہ حیات کے سوئٹ کے ڈرائنگ روم میں لگایا گیا تھا اور جہاں اس وقت وہ ایم پی اے اور ایم این اے بھی جمع تھے جن کی ری پبلکن میں شمولیت کا اعلان اسی پریس کانفرنس میں کیا جانا تھا۔

پشمینہ نے مائیکروفون کے ذریعے ہوٹل کے باہر لگے ہوئے ہجوم سے ایک مختصر خطاب کیا۔ ''میرے دوستو! میں پشمینہ حیات آپ سے مخاطب ہوں اور آپ سے درخواست گزار ہوں کہ ہوٹل میں داخل ہونے کی کوشش مت کیجیے...... پلیز!...... پلیز!...... میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ لابی بھر چکی ہے۔ مزید لوگوں کے داخلے سے ہڑبونگ مچ جائے گی اور میں پریس کانفرنس نہیں کر سکوں گی۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ آپ کی، آپ سب کی پشمینہ حیات آج کچھ اہم اعلانات نہ کر سکے؟...... یقیناً آپ یہ نہیں چاہیں گے۔ میں

آپ لوگوں سے یہ وعدہ کرسکتی ہوں کہ آپ باہر رہ کر بھی پریس کانفرنس کی کارروائی سن سکیں۔ اس لاؤڈ اسپیکر کو پریس کانفرنس کے ڈائس سے منسلک کر دیا جائے گا۔ میں آپ لوگوں سے دوبارہ التجا کرتی ہوں کہ اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔ میں آئندہ چند دن میں ہی ایک جلسہ کر کے آپ لوگوں سے براہِ راست مخاطب ہوں گی۔''

ہوٹل کی انتظامیہ نے اس مختصر خطاب کو ریکارڈ کرلیا تاکہ یہ وقفے وقفے سے لوگوں کو سنایا جاسکے کیونکہ مزید لوگوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ پشمینہ حیات کی پریس کانفرنس نہیں، کوئی عوامی جلسہ تھا۔

یہ سارے حالات ٹی وی چینلز سے بھی نشر کیے جارہے تھے۔ ایک ٹاک شو میں کوئی مبصر یہ بھی کہہ بیٹھا کہ اس وقت یہ سب کچھ دیکھ کر صدارتی محل میں غصے کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔

اس بات پر کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس آگ کا اثر کہیں پریس کانفرنس پر نہ پڑ جائے۔

ٹی وی پر یہ خبر دوپہر کو ہی آچکی تھی کہ سترہ ایم این اے اور ایم پی اے اپنی پارٹیوں اور اسمبلیوں سے مستعفی ہوچکے تھے۔ اس خبر کے بعد تمام تجزیہ نگاروں میں اتفاق پایا جارہا تھا کہ یہ ری پبلکن فورم میں شامل ہوجائیں گے۔

جو پریس کانفرنس پانچ بجے شروع ہونی تھی، وہ اب چھ بجے ہی شروع ہوسکتی تھی اور اس کا سبب عوام کا ہجوم ہی تھا۔

پونے چھ بجے پارٹی کے لوگوں نے ڈائس پر آنا شروع کیا تو ٹی وی چینلز پر تجزیہ کاروں کے چہرے کھل اٹھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ ہوتا نظر آرہا تھا۔ ڈائس پر آکر بیٹھنے والے وہی ایم این اے اور ایم پی اے ہی تھے۔

چھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب سامنے کی قطار کی چار کرسیوں پر وہ لوگ آبیٹھے جو ری پبلکن فورم کے ابتدائی پانچ افراد میں سے تھے۔ پھر پشمینہ حیات اور ڈیبرا آئیں۔ اب ڈیبرا کے برابر کی ایک کرسی خالی تھی۔ وہ خالی ہی تھی جب پشمینہ حیات نے بولنا شروع کیا۔

''صحافی حضرات! لابی اور ہوٹل کے باہر جمع ہونے والے میرے دوست، ٹی چینلز سے وابستہ تمام لوگ اور ساری قوم کو پشمینہ حیات کا سلام پہنچے۔''

اس بات پر وعلیکم السلام کی آوازوں کے ساتھ تالیاں بھی بجیں۔ ملک بھر میں جہاں جہاں ٹی وی دیکھا جارہا تھا، وہاں بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں جذبات اس طرح امنڈے کہ آنکھیں جھلملا گئیں۔

کسی ٹی وی نے ایک بزرگ کو دکھایا جنہوں نے ٹی وی دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی۔ ''یا اللہ! پشمینہ حیات کی حفاظت کرنا۔''

لابی میں بھی خاصے لوگ جذباتی نظر آئے۔

پشمینہ حیات نے ان لوگوں کے نام لینا شروع کیے جو اسی دن پارٹی میں شامل ہوئے تھے اور انہوں نے رکنیت کے فارم بھر دیے تھے۔

رکنیت کے فارم بھی اسی دن چھپے تھے۔

اس کے بعد پشمینہ نے کہا۔ ''اس معاملے میں بہت قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں کہ ری پبلکن فورم کا جنرل سیکریٹری کون ہوگا۔ میں نے بھی شرارتاً سوچا کہ اس بات کو آخری لمحے تک راز ہی رکھا جائے۔ میں اب اس نام کا اعلان کرنے والی ہوں۔ آپ لوگ یقیناً حیران رہ جائیں گے کیونکہ وہ نام ہے......'' وہ ذرا سا رک کر بولی۔ ''دانش یزدانی۔''

صحافیوں کے علاوہ سبھی نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ صحافی حیرت زدگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور باتیں کررہے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پہلے

ہنسنا منع ہے

ایک شہری ایک گاؤں گیا اور کسی بوڑھے شخص سے پوچھا۔ ''کیا اس گاؤں نے کوئی بڑا آدمی پیدا کیا ہے؟''

''جی نہیں۔'' بوڑھے شخص نے کہا۔

''یہاں تو سب بچے پیدا کرتے ہیں شہروں میں شاید بڑا پیدا ہوتا ہوگا؟''

☆☆☆

عورت (بھکاری سے): ''تمہیں شرم نہیں آتی راستے میں کھڑے ہوکر بھیک مانگتے ہوئے۔''

بھکاری: ''تو کیا کہیں دفتر کھول کر بھیک مانگوں؟''

☆☆☆

ایک آدمی سائیکل کی باسکٹ میں بچے کو بٹھا کر لے جارہا تھا بچہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ ایک آدمی نے کہا۔ ''بچہ رو رہا ہے اور آپ پروا کیے بغیر ہی چلے جارہے ہیں۔''

اس آدمی نے کہا۔ ''بچے کو رلایا جارہا ہے کیونکہ سائیکل میں گھنٹی نہیں ہے۔''

سجاد علی شگری کی گلگت بلتستان سے شوخی

سے موجود ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ ری پبلکن فورم کا سیکریٹری جنرل بن جائے۔

اس وقت دانش یزدانی مسکراتا ہوا ڈائس پر آیا تھا اور ڈیبرا کے برابر کی خالی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''صحافی حضرات! پشمینہ کہہ رہی تھی۔''میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ میں پریس کانفرنس چند منٹ بعد شروع کروں گی۔ پہلے آپ چند باتیں ری پبلکن کے سیکریٹری جنرل دانش یزدانی سے سن لیجیے۔''

کیونکہ یہ کوئی جلسہ نہیں تھا اس لیے وہاں روسٹرم نہیں لگایا گیا تھا۔ جو مائیکروفون پشمینہ کے سامنے رکھے تھے، وہ دانش یزدانی کے سامنے رکھ دیے گئے۔

ہوٹل کے باہر کھڑے عوام میں خاصا جوش و خروش پایا جارہا تھا اور ٹی وی چینلز پر ہلچل مچی ہوئی تھی کہ ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ ری پبلکن فورم کا سیکریٹری جنرل کیسے بن سکتا ہے؟

دانش یزدانی نے بولنا شروع کیا۔ ابتدائی رسمی کلمات کے بعد اس نے کہا۔''غالباً یہ ایک تاریخ ساز واقعہ ہے کہ میں نے چند گھنٹے قبل اپنی سیاسی پارٹی ڈزالو کر دی ہے اور ری پبلکن فورم میں آگیا ہوں۔ اس کا بنیادی سبب میری سابقہ پارٹی کا منشور ہے۔ اس میں چند باتیں ایسی تھیں جو میں دل سے نہیں چاہتا تھا لیکن پارٹی کے لوگوں کی اکثریت کیونکہ اس پر جمی ہوئی تھی اس لیے جمہوریت کا تقاضا یہی تھا کہ میں ان باتوں کو مانوں لیکن ان نکات کے نقصان دہ ہونے کا احساس مجھے پشمینہ حیات صاحبہ کی وجہ سے ہوتا رہا اور اس موقع پر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے وہ پارٹی ختم کر کے ری پبلکن فورم پر آجانا چاہیے۔ میں نے کل اپنے فیصلے سے انہیں آگاہ بھی کر دیا تھا لیکن اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ یہ مجھے سیکریٹری جنرل کی ذمے داریاں سونپ دیں گی۔ میں جب اپنی پارٹی ڈزالو کر چکا تب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے یہ بھاری ذمے داری سونپ دی گئی ہے۔''

تالیاں بجنا شروع ہوگئیں اور جب یہ شور تھما تو دانش یزدانی نے پھر بولنا شروع کیا۔''اب مجھے بس ایک بات اور کہنا ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک بہت خوب صورت بنگلا بنوایا ہے۔ دو دن ہوئے اسے ڈیکوریٹ بھی کیا جا چکا ہے۔ میں وہاں ایک آدھ دن میں .... منتقل ہونے والا تھا لیکن ابھی ..... یقین کیجیے، صرف بیس منٹ قبل میں نے کچھ فیصلہ کیا ہے۔ میں وہ بنگلا اپنی اس پارٹی کی چیئرپرسن پشمینہ حیات صاحبہ کو تحفتاً پیش کرتا ہوں۔''

پشمینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، کچھ کہنا بھی چاہا لیکن تالیوں کے بے پناہ شور کی وجہ سے فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکی اور تالیوں کا شور تھمنے کے بعد وہ جو کچھ کہتی، کہہ نہ سکی کیونکہ دو زوردار دھماکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ہوٹل کے باہر ڈھائی تین ہزار لوگوں کا مجمع تھا جس کی وجہ سے سڑک کی دونوں جانب کا ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

وہ دھماکے اسی ہجوم میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ہوئے تھے اور بھگدڑ مچ گئی تھی۔

ٹی وی چینلز کے کیمرے پریس کانفرنس کی وجہ سے وہاں موجود ہی تھے اس لیے فوراً ہی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا جانے لگا اور رپورٹرز اپنے اپنے چینل کو بتانے لگے کہ فوری طور پر وضاحت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، بس اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ دھماکے دستی بموں کے تھے۔ یقینی امر ہے کہ لوگ زخمی ہوئے ہوں گے اور خدانخواستہ کچھ ہلاکتیں بھی ہو سکتی ہیں۔

جلد ہی کیمرے ان مقامات پر بھی پہنچ گئے جہاں دستی بم پھٹے تھے۔ وہاں لوگوں کے خون آلود جسم پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی بالکل ساکت پڑا تھا۔

جائے واردات پر موجود رپورٹرز نے ہانپتی ہوئی آوازوں میں بولنا شروع کیا۔''ہلاکتیں یقینی طور پر ہوئی ہوں گی۔ اپنی مدد آپ کے تحت لوگوں نے زخمیوں کو وہاں سے اٹھا کر لے جانا شروع کر دیا ہے۔''

ایک ٹی وی چینل پر ایک مبصر کہہ رہا تھا۔''آخر وہی ہوا۔ صدارتی محل کے غصے کی آگ وہاں پہنچ ہی گئی۔''

اکثریت کو یقین تھا کہ وہ دھماکے سی ایس والوں نے کیے ہوں گے۔ انہیں اشارہ صدارتی محل سے بھی مل سکتا تھا اور یہ اقدام خود چنگیزی بھی کر سکتا تھا کیونکہ اسے بے پناہ اختیارات دیے جا چکے تھے۔

پشمینہ اپنے سوئٹ کے ڈرائنگ روم میں جا چکی تھی۔ پارٹی کے سرکردہ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ سبھی برہم نظر آرہے تھے۔ پشمینہ تو شدید غصے کے عالم میں تھی۔

سب لوگ ٹی وی بھی دیکھ رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ سبھی کا خیال تھا کہ یہ ''سرکاری حرکت'' ہے۔ پشمینہ حیات کی اس چھوٹی سی مقبولیت کو بھی برداشت نہیں کیا گیا تو آگے چل کر کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

''حکومت کے کسی بڑے سے بات تو کرنی چاہیے۔''

کسی نے پشمینہ سے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کہیں شنوائی نہیں ہوگی۔''

پشمینہ نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور پھر بلند آواز میں بولنا شروع کیا تا کہ اس کی آواز وہاں موجود سب لوگ آسانی سے سن لیں۔ ''یقین کر لیجیے کہ ملک اس وقت آمریت کے شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے۔ میں سب سے کہتی ہوں کسی اقدام میں عجلت نہ کریں، انتظار کریں۔ حالات میں جتنی تیزی سے منفی تبدیلی آئی ہے، اتنی ہی تیزی سے کوئی مثبت تبدیلی بھی آسکتی ہے۔ کیا آپ لوگ خبریں نہیں سن رہے ہیں کہ گاؤں وغیرہ میں تو اب سی ایس کے چھوٹے اہلکاروں نے لوٹ مار بھی شروع کر دی ہے اور انہیں اپنے بڑوں کی آشیر باد حاصل ہے۔ ان لوٹ مار کرنے والوں کے خلاف پولیس بھی کوئی قدم نہیں اٹھا رہی ہے۔''

''میڈم!'' ایک شخص بولا۔ ''ان حالات میں سیاسی پارٹیاں کیا کچھ کر سکیں گی؟''

''حوصلہ رکھیے، حوصلہ رکھیے! میں ایک لڑکی ہو کر علمِ بغاوت بلند کر چکی ہوں۔ کیا مردوں کو ہمت ہار جانا چاہیے...... اگر آپ لوگوں میں سے کوئی بھی ہمت ہار رہا ہے تو اسے ری پبلکن فورم چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے صرف بہادر ساتھیوں کی ضرورت ہے۔''

تمام لوگ ایک ساتھ بول اٹھے کہ وہ پشمینہ حیات کے ساتھ ہیں۔

پشمینہ نے ان سب کو مزید جوش دلانے کے لیے کہا۔ ''میں مستقبل قریب میں صدارتی محل کو شعلوں میں گھرا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ ظلم جب حد سے بڑھنے لگتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ صدر حیات کو اس کا وہ خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو اُن کے تصور میں بھی شاید نہ ہو۔''

کسی نے دبے دبے سے لہجے میں کہا۔ ''وہ آپ کے والد بھی ہیں میڈم!''

''اور یہ میری زندگی کا سب سے شرمناک پہلو ہے۔'' پشمینہ نے کہا۔

اس وقت تک دو ایک اداروں کی ایمبولینس بھی جائے واردات پر پہنچ چکی تھیں جن میں کوئی سرکاری ایمبولینس نہیں تھی۔ زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر لے جایا جا رہا تھا۔ مرنے والوں کی مجموعی تعداد اب پندرہ بتائی جا رہی تھی۔ زخمی اسی سے زیادہ تھے جن میں آٹھ کی حالت بہت خراب بتائی جا رہی تھی۔

گیارہ بجے کی خبروں میں بتایا گیا کہ چند افراد نے اس معاملے کی ایف آئی آر درج کرانی چاہی تھی لیکن انہیں مار پیٹ کر پولیس اسٹیشن سے بھگا دیا گیا۔

بارہ بجے تک شہر میں ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ صرف ان علاقوں میں کچھ شور اور آہ وزاری تھی جہاں رہنے والے پندرہ افراد ہلاک ہو چکے تھے یا ان اسپتالوں پر لوگوں کا ہجوم تھا جہاں زخمیوں کو لے جایا گیا تھا۔

بارہ بج کر دس منٹ پر چنگیزی نے خود ایک ٹی وی چینل سے رابطہ کر کے اعتراف کیا کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ سی ایس ہی نے مجبوراً کیا ہے کیونکہ پولیس ہجوم کو منتشر کرنے میں ناکام رہی تھی اور اس سڑک کا ٹریفک جام ہونے کے باعث کئی اور سڑکوں پر بھی ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

''شہری نظام کو اس طرح برباد کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دی جا سکتی۔ ایسا کرنے والے اپنی موت کے خود ذمے دار ہوں گے۔'' چنگیزی نے رعونت سے کہا تھا اور پھر خود ہی لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔

ٹی وی بارہ بجے کے بعد بھی خبریں نشر کرتے رہے۔ زیادہ زخمی ہونے والے آٹھ افراد میں سے بھی چھ افراد دم توڑ چکے تھے۔ مرنے والوں کی تعداد اب اکیس ہو چکی تھی۔

دو دستی بموں کے دھماکوں سے اتنا زیادہ جانی نقصان اس لیے ہوا کہ ہجوم کے لوگوں کے شانے سے شانہ ملا ہوا تھا۔

وہ رات ایسی نہیں تھی کہ باشعور لوگوں کو نیند آ سکتی۔ ٹی وی چینلز کی خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ ملک بھر کے اسی فیصد ٹی وی بند نہیں ہوئے تھے اور لوگ ایک ایک پل کی خبر سننا چاہتے تھے۔

پشمینہ نے اپنا دس منٹ کا ریکارڈڈ پروگرام ٹی وی چینلز سے نشر کروا دیا۔ اس میں عوام سے کہا گیا تھا کہ وہ ان حالات سے دل برداشتہ نہ ہوں اور خوف اپنے دلوں سے نکالیں۔

اس پیغام میں اس نے بہت جوشیلے فقرے ادا کیے تھے اور یہ اعلان بھی کیا تھا کہ ہلاک ہونے والوں کے سوم کے دن وہ احتجاجی ریلی لے کر قصرِ صدارت جائے گی۔ اس نے عوام سے درخواست کی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں، دل سے خوف نکال کر اس جذبے کے ساتھ ریلی میں شرکت کریں کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کے لیے قربانی بھی دے سکتے ہیں۔

''ریلی کی قیادت میں خود کروں گی اور سب سے آگے رہوں گی۔''

پشمینہ کا پیغام اس جملے پر ختم ہوا تھا۔

ری پبلکن فورم کے ارکان نے ایک ایک کر کے ہوٹل سے رخصت ہونا شروع کیا کیونکہ ان کی وجہ سے ان کے گھر والے پریشان تھے۔ دوسرے یہ بھی تھا کہ پشمینہ کے سوئٹ میں اتنے لوگوں کے رہنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

دوسرے دن دس بجے کی خبروں میں بتایا گیا کہ پشمینہ حیات ہوٹل سے اس بنگلے میں منتقل ہو گئی ہے جو دانش یزدانی نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ خبر بھی آئی کہ دوپہر کے بعد اسی بنگلے میں ری پبلکن فورم کے لوگوں کا ایک اجلاس ہوگا جس میں ریلی سے متعلق لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد یہ خبر بھی آئی کہ مشہور بزنس مین حاجی اشفاق دفتر جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے ہی تھے کہ دو موٹر سائیکل سوار ان کی کار پر گولیوں کی برسات کرتے ہوئے نکل گئے۔ حاجی اشفاق کو گیارہ گولیاں لگی تھیں اور انہوں نے کار میں ہی دم توڑ دیا تھا۔

''یہ حاجی اشفاق کے کسی کاروباری رقیب کی حرکت ہو سکتی ہے۔'' سی ایس کے ترجمان کا بیان ٹی وی چینلز پر آیا۔ ''اس کی مکمل چھان بین کی جائے گی اور قاتل زیادہ دیر تک قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکیں گے۔''

''جھوٹ، سراسر جھوٹ۔'' خبر سن کر پشمینہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''یہ قتل سی ایس ہی نے کروایا ہے۔ حاجی اشفاق کو اس کی سزا دی گئی ہے کہ اس نے ری پبلکن فورم کو فنڈ مہیا کیا تھا۔''

''اس وقت پشمینہ کے ساتھ ڈیبرا کے علاوہ دانش یزدانی بھی تھا۔

اسی وقت ایک ٹی وی چینل سے پشمینہ کے لیے کال آ گئی۔

''حاجی اشفاق کے قتل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' اینکر نے پشمینہ سے سوال کیا۔

''سی ایس کا ترجمان جھوٹ بول رہا ہے۔'' پشمینہ نے غصے سے جواب دیا۔ سامنے ٹی وی کھلا ہوا تھا۔ ڈیبرا نے جلدی سے ریموٹ اٹھا کر وہ چینل لگایا جس نے پشمینہ سے رابطہ کیا۔

اسکرین کے نصف حصے پر حاجی اشفاق کی گولیوں سے چھلنی کار دکھائی جا رہی تھی جس کے اندر سے خون بہہ کر باہر تک آ رہا تھا۔ اسکرین کے باقی نصف حصے میں اینکر پرسن دکھائی دے رہا تھا اور ایک گوشے میں پشمینہ حیات کی تصویر تھی۔

پشمینہ کہہ رہی تھی۔ ''تین کاروباری حضرات نے ری پبلکن فورم کے لیے فنڈز دیے تھے۔ انہی میں حاجی اشفاق بھی تھے۔ سی ایس نے انہیں اسی کی سزا دی ہے۔'' ثمینہ نے باقی دو افراد کے نام بھی لیے اور کہا۔ ''اب ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ملک اس وقت مکمل طور پر ڈکٹیٹرشپ کے قبضے میں ہے، لیکن میرے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ میں آخری سانس تک لڑوں گی۔''

''کیا آپ کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ آپ ریلی نکالیں گی؟'' سوال کیا گیا۔

''میں تذبذب کا شکار ہو گئی ہوں۔ شام تک میں قطعی فیصلہ سنا دوں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر عوام بھرپور انداز سے اس ریلی میں شریک ہوئے تو شاید ڈائریکٹ فائر کھول دیا جائے۔ سیکڑوں ہلاکتیں ہو سکتی ہیں۔ میں اتنے لوگوں کی زندگیوں کے زیاں کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ امکان ہے کہ مجھے کوئی دوسرا لائحہ عمل بنانا پڑے گا۔ بس! فی الحال میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''

پشمینہ نے رابطہ منقطع کر کے پارٹی کے باقی دونوں ڈونرز کو فون کیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ بہت احتیاط برتیں اور اپنے تحفظ کا زیادہ سے زیادہ بندوبست کریں۔

جواب میں ان دونوں ہی نے بڑی حوصلہ مندی کا اظہار کیا تھا۔

پشمینہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

''واقعی اس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔'' دانش یزدانی بولا۔ ''حکومت جب اتنی جارحیت پر اتر آئی ہے تو ریلی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اجلاس میں اس پر سب کی رائے لینا ضروری ہے۔ اعلان کے بعد اس سے پسپائی کے کیا کیا ردِعمل ہو سکتے ہیں، کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔''

''اعلان جب کیا گیا تھا تو صورتِ حال وہ نہیں تھی جو اب ہے۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''اس وقت ہماری پسپائی فوجی حکمتِ عملی جیسی ہوگی۔''

جواب میں دانش نے کچھ نہیں کہا۔

دو بجے پارٹی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس وقت ڈیبرا نے پشمینہ سے کہا۔ ''اجلاس میں میری شرکت تو ضروری نہیں ہے۔ میں اس دوران میں بنگلے کا جائزہ لے ڈالوں۔ کوئی ایسا گوشہ نہیں ہونا چاہیے جو تحفظ کے اعتبار سے کمزور ہو۔''

''میں نے اس کی تعمیر میں ہر بات کا خیال

رکھا ہے۔'' دانش بولا۔ ''تاہم تم بھی دیکھ لو۔ اس میں حرج تو کوئی نہیں ہے۔''

پشمینہ نے کچھ نہیں کہا۔ ڈیبرا نے اس پر ایک نظر ڈالی اور بنگلے کے اس ہال سے باہر نکل گئی جہاں اجلاس ہونا تھا۔

بنگلا خاصا بڑا تھا۔ اس کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لینے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ اس کے بعد ڈیبرا نے اوپر کی منزل کا رخ کیا جہاں نصف حصے میں بہت بڑا ٹیرس تھا۔ باقی نصف حصے کا جائزہ لینے میں ایک گھنٹا اور لگا۔ اس کے بعد ڈیبرا اس حصے کی چھت پر گئی اور چاروں طرف کا ایک چکر لگا کر واپس اس ہال میں پہنچی جہاں اس کے خیال کے مطابق اجلاس ابھی جاری ہی رہنا چاہیے تھا لیکن وہاں صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ اجلاس کے تمام شرکا بڑے اسکرین کے ٹی وی کی طرف متوجہ تھے جس پر شہر کے حالات کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا جا رہا تھا۔

اکیس جنازے چار جگہ سے اٹھے تھے اور ان کی تدفین بھی چار مختلف قبرستانوں میں ہوئی تھی۔ ہر جنازے کے ساتھ سات سات، آٹھ آٹھ ہزار افراد تھے جو تدفین کے بعد غصے کی حالت میں سرکاری املاک پر حملہ آور ہوئے تھے۔ دو پولیس اسٹیشنوں میں آگ لگائی جا چکی تھی۔ ایک گروہ سی ایس کے ہیڈ کوارٹر کی طرف بڑھا تھا جہاں اس وقت گولیاں چل رہی تھیں۔ گولیاں چلانے والے سی ایس کے اہلکار تھے۔

''دوسرے مقامات پر گولیاں نہیں چلائی گئیں۔'' دانش نے ڈیبرا کو بتایا۔ ''وہاں لاٹھی چارج، واٹر کین اور آنسو گیس کے ذریعے لوگوں کو منتشر کیا گیا تھا۔''

''سی ایس کا ہیڈ کوارٹر تو کوئی مقدس مقام ہے۔'' پشمینہ نے دانت بھینچ کر کہا۔ ''اسے بچانے کے لیے تو وہ بمباری بھی کر سکتے ہیں۔'' اس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا سا تھا۔

سبھی ٹی وی چینلز پر اس وقت شور سا مچا ہوا تھا۔ خبریں کچھ اسی انداز میں دی جا رہی تھیں جیسے قیامت برپا ہونے کی اطلاعات دی جا رہی ہوں۔

مختلف مقامات سے منتشر ہونے والے لوگ شہر میں پھیل گئے تھے۔ توڑ پھوڑ کے ساتھ لوٹ مار کا بازار بھی گرم ہو گیا تھا۔

''ایسے موقعوں پر شرپسند عناصر اور جرائم پیشہ افراد بھی شامل ہو جاتے ہیں۔'' پارٹی کا صدر اسد گیلانی بڑبڑایا۔

ٹی وی چینلز پر مختلف سیاسی لوگوں اور ہیومن رائٹس کے افراد سے بھی رابطے کیے جا رہے تھے۔ ہر شخص حکومت کی مذمت کر رہا تھا۔

کئی ٹی وی چینلز پشمینہ سے بھی رابطہ کر چکے تھے۔ پشمینہ نے عوام سے اپیل کی تھی کہ اس قسم کے اقدامات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، صرف جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ لوگ جذبات قابو میں رکھیں اور اپنے گھر لوٹ جائیں۔ انہیں جلد ہی ری پبلکن فورم کے آئندہ کا لائحہ عمل بتایا جائے گا۔''

لیکن ایسے موقعوں پر اس قسم کی اپیلیں موثر ثابت نہیں ہوتیں۔ صرف گھروں میں بیٹھے ہوئے لوگ وہ اپیلیں سنتے ہیں۔ ان اپیلوں کا ایک لفظ بھی ان لوگوں تک نہیں پہنچتا جو شہر میں ہنگامہ کرتے پھر رہے ہوں۔

''جو کچھ ہو رہا ہے، بہت برا ہو رہا ہے۔ بہت لوگ مرے ہوں گے۔'' ڈیبرا نے پشمینہ سے کہا۔ ''لیکن یہ صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ تمہاری مقبولیت یک لخت بڑھی ہے۔ کثیر تعداد ایسی ہے جو ہماری پارٹی کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے اور لوگ تمہارے نام کے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔''

''اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے۔'' پشمینہ نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''شہر کے نظم و ضبط کی خرابی کا ذمے دار بھی ہماری پارٹی کو قرار دے کر اس کا رجسٹریشن منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سی پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں۔ ڈیبرا! مجھے تعجب ہے کہ ابھی تک میڈیا چارٹر کا آرڈی ننس جاری نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد کوئی چینل، کوئی اخبار ان حالات کی خبریں نہیں دے سکے گا اور جو دے گا، اسے آرڈی ننس کے تحت بند کر دیا جائے گا۔ اخبارات کے ڈیکلریشن اور ٹی وی چینلز کے لائسنس منسوخ کر دیے جائیں گے۔''

ڈیبرا نے اثبات میں سر ہلایا، پھر پوچھا۔ ''اجلاس میں کیا طے پایا؟''

''اجلاس ابھی شروع ہی نہیں ہو سکا۔'' پشمینہ نے جواب دیا۔ ''تمہارے جاتے ہی یہ ساری خبریں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس وقت ہم سبھی کے ذہن منتشر ہو گئے ہیں۔ ایسے میں اجلاس کیا خاک ہوتا۔''

''تم فوراً مجھے بلوا لیتیں۔''

''مناسب نہیں سمجھا میں نے! اب تم جو کچھ دیکھ رہی ہو، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بڑے دردناک مناظر سامنے آ چکے ہیں۔ ان جنازوں میں اسٹوڈنٹس لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی شرکت کی تھی۔ پولیس والوں نے ان کے ساتھ بہت

بدسلوکی کی ہے۔''

ڈیبرا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

جو ہنگامے شہر میں برپا تھے، وہ اندھیرا پھیلنے کے بعد بڑی حد تک ختم ہو گئے۔ چند علاقے ایسے تھے جہاں چھوٹے چھوٹے گروہوں اور پولیس میں اب بھی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔

ایک ٹی وی چینل سے پشمینہ کے لیے سوال آیا کہ ریلی نکالنے کے سلسلے میں انہوں نے کیا حتمی فیصلہ کیا۔

رضوانہ اختر نے جواب دیا کہ جو ہنگامے شروع ہو گئے تھے، ان کی وجہ سے اجلاس ابھی شروع ہی نہیں ہو سکا۔

جو لوگ ری پبلکن فورم میں شامل ہوئے تھے، رضوانہ اختر انہی میں سے ایک تھی۔ اس نے ایم پی اے کی حیثیت سے استعفا دیا تھا۔ سیاست میں آنے سے پہلے اس نے جرنلزم میں ایم اے کیا تھا اس لیے پشمینہ نے اسے اپنی پریس سیکریٹری مقرر کر لیا تھا۔ اس نے بہت خوشی سے یہ ذمے داری قبول کر لی تھی۔ پشمینہ نے اپنے موبائل کا وہ نمبر بھی بند کر دیا تھا جو اس نے صحافیوں کے لیے مخصوص کیا تھا۔ وہ اس بات سے پریشان ہو گئی تھی کہ چوتھے پانچویں منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی چینل اس سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنا موبائل نمبر بند کرنے سے پہلے اس نے ایک ٹی وی چینل کے ذریعے رضوانہ اختر کا موبائل نمبر نشر کروا دیا تھا اس لیے اب چوتھے پانچویں منٹ پر وہی ٹی وی چینلز کو جواب دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب اجلاس شروع کیا جائے۔'' صدر اسد گیلانی نے پشمینہ سے کہا۔

پشمینہ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹی وی سے نشر ہونے والی یہ خبر سننے لگی تھی کہ اکیس افراد کا سوئم کل کے بجائے پرسوں کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ان لوگوں کا سوئم بھی جو اسی دن ہلاک ہوئے تھے۔

خبروں کے مطابق سی ایس کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد چوبیس تھی لیکن غیر مصدقہ ذرائع کے مطابق چالیس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔

''ریلی تو نہیں نکالی جا سکتی۔'' پشمینہ نے اجلاس سے پہلے ہی فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ابھی جو لوگوں کا جوش و خروش دیکھا ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ سی ایس کے اقدامات سے دہشت زدہ ہونے کے بجائے آگ بگولا ہو چکے ہیں۔ ریلی نکالی گئی تو بہت کثیر تعداد ہو گی لوگوں کی اور حکومت کا جارحانہ انداز بتا رہا ہے کہ ریلی پر گولیوں کی برسات کر دی جائے گی۔ کئی سو افراد ہلاک ہو سکتے ہیں۔ میں اتنی زندگیاں داؤ پر نہیں لگا سکتی۔''

''پھر کیا قدم اٹھایا جا سکتا ہے؟'' دانش بولا۔

''اجلاس شروع کیا جائے۔ طے کرتے ہیں کہ اب کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ سے صدر حیات کے خلاف لکھا اور بولا تو جا رہا ہے لیکن کسی بڑے فورم سے ابھی تک کوئی اعلان سامنے نہیں آیا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سلسلے میں یو این او کا ہنگامی اجلاس طلب کروایا جائے۔ امریکا میں کچھ لوگوں سے میرے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ ان کے ذریعے سے یو این او کی اہم شخصیات کو جھنجوڑا جا سکتا ہے۔ میں ان لوگوں سے ملنے کے لیے کل جلد از جلد ملنے والی کسی فلائٹ سے امریکا روانہ ہو جاؤں۔ یو این او کے علاوہ عالمی ہیومن رائٹس کمیشن کو بھی حرکت میں لانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں میں ہونے والے ایسے واقعات کی طرف مغرب بہت دیر سے توجہ دیتا ہے یا پھر اس وقت جب انہیں باقاعدہ جھنجوڑا نہ جائے۔''

دانش اس سلسلے میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے سب کی توجہ ٹی وی کی طرف مبذول کرائی جس سے شاہ صاحب کا وڈیو پیغام نشر کیا جا رہا تھا۔

پینسٹھ سالہ شاہ صاحب کہہ رہے تھے۔ ''میرے وطن میں بربریت کا جو طوفان اچانک اور بڑی تیزی سے اٹھا ہے، اس پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میرے لیے اب ناممکن ہے کہ لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے رہیں اور میں یہاں پُرامن ماحول میں سانس لیتا رہوں۔ میں آج ہی ایک گھنٹے بعد پرواز کرنے والی فلائٹ سے روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں کے صبح دس بجے میری فلائٹ اپنے وطن میں لینڈ کرے گی۔ میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اس ظلم و بربریت کا نشانہ بننے کے لیے تیار ہو چکا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ نصرت ایزدی مظلوموں کے ساتھ ہے۔'' شاہ صاحب کا پیغام اس آیت پر ختم ہوا۔

''نَصرٌ مِنَ اللّٰہِ وَفَتحٌ قَرِیب''

یہ پیغام ختم ہوتے ہی ری پبلکن فورم کے اجلاس میں اصل ایجنڈے کے بجائے اس پر گفتگو شروع ہو گئی کہ شاہ صاحب کی پرتگال سے وطن آمد ایک بہت بڑا طوفان ہو سکتی ہے۔''

بساطِ سیاست پر جمے مہروں کی اکھاڑ پچھاڑ کا سنسنی خیز کھیل مزید واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

آتشِ بغاوت

ایچ اقبال

ہر طرف رواں دواں ظلمتوں کے کارروان
حادثے قدم قدم راستے دھواں دھواں
مشعلیں بجھا گئیں روز و شب کی آندھیاں
پھر بھی اے مسافرو تم رہو رواں دواں

صلاحیت بالکل آگ کی طرح ہوتی ہے... آگ اگر بے وقوفوں کے ہاتھ لگ جائے تو اردگرد کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کرسکتی ہے... یہ ذہانت ہی ہے جو اسے قابو میں رکھتی ہے... اور آگ ہی کیوں... ذہانت تو حسن کو بھی اس طرح گرفت میں کرلیتی ہے جس طرح کوئی ہوشیار شہسوار تند خو گھوڑے پر غالب آجاتا ہے... کارزارِ سیاست میں بھڑکتی آگ کے شعلوں کا احوال جو ہر دم ہر نفس کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھے... اقتدار کے ایوانوں میں چلتی پھرتی کہانی کے اسرار ورموز... جہاں سازشوں کے ساتھ ساتھ محبتوں کے کھلاڑی اپنی بازی دل و جاں سے کھیل رہے تھے... انجام سے بے خبر ایک کھلی جنگ کی تباہ کاریاں...

آتشِ بغاوت میں گھری ایک نازک اندام حسینہ کے آہنی ارادوں کی داستانِ حیات

شاہ صاحب ایک بہت بڑے اسکالر تھے۔ ان کی سات کتابیں شائع ہو چکی تھیں جن میں ”مذاہب عالم کا تقابل“ نے بہت زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کی تھی۔ اسی میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جن پر روایات کے پرستار مولوی ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان کی مخالفت کا جواب شاہ صاحب ٹی وی چینلز کے پروگراموں میں دیا کرتے تھے جس کے باعث انتہا پسند سوچ کے حامل افراد نے انہیں دو مرتبہ قتل کرانے کی کوشش کی تھی اور ہر مرتبہ وہ بال بال بچے تھے۔ ملک میں ان کے معتقدین کی تعداد کئی لاکھ تھی اور دیگر ممالک میں بھی ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق پچاس ہزار سے زائد تھی۔

شاہ صاحب کے والد ایک بہت بڑے بزنس مین تھے۔ انہوں نے ورثے میں بہت دولت اور کئی کاروباری ادارے چھوڑے تھے جو شاہ صاحب کے حصے میں آئے تھے مگر ان کی دنیا علم وفکر کے دائرے میں مقید تھی۔ کاروبار سے رغبت انہیں برائے نام بھی نہیں تھی اس لیے انہوں نے تمام ادارے فروخت کر دیے تھے۔ انسانیت کی خدمت بھی ان کی فطرت میں شامل تھی چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑا اسپتال، ایک یونیورسٹی اور ایک فلاحی ادارہ بھی قائم کیا تھا۔

اسپتال کے تمام معاملات انہوں نے اپنے بیٹے ڈاکٹر نبیل کو سونپ دیے تھے۔ فلاحی ادارہ ان کی بیٹی اقصیٰ احمد چلاتی تھی جس میں اس کا مددگار اس کا شوہر احمد باختر ایک ایرانی نژاد تھا۔

مذہبی انتہاپسندوں کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے معتقدین کے بے حد اصرار پر وطن کو خیر آباد کہا تھا۔ پانچ سال سے وہ پرتگال میں تھے اور وہیں سے انہوں نے اپنی تصانیف و تالیفات کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

اس خودساختہ جلاوطنی کے لیے انہوں نے پرتگال کا انتخاب دو وجوہ سے کیا تھا۔ وہاں انہیں قیام کے لیے اپنے چھوٹے چچازاد بھائی کا گھر میسر تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پرتگال ایک پُرامن ملک ہے۔ ایک چھوٹا سا ملک جس کی آبادی بھی ایک کروڑ سے زیادہ نہیں۔ وہاں بھی انہوں نے ایک فلاحی ادارہ قائم کیا تھا جو مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر کام کرتا تھا۔

انہوں نے ''مذاہب عالم کا تقابل'' نامی کتاب لکھی تو تھی لیکن کسی بھی مذہب کے خلاف ایک جملہ بھی نہیں لکھا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں عیسائی دنیا میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی کتابوں کے انگریزی تراجم شائع ہو چکے تھے۔ کئی بڑے ملکوں نے انہیں شہریت دینے کی پیشکش کی تھی مگر انہوں نے پرتگال سے کہیں اور منتقل ہونے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ان پانچ سالوں میں وہ پرتگال سے باہر نکلے تھے تو صرف اسپین کی حد تک جس کی سرحد پرتگال سے ملی ہوئی ہے اور جہاں سے مسلمانوں کے ماضی کی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ وہاں شاہ صاحب کا زیادہ وقت مسجدِ قرطبہ میں گزرتا تھا۔

ان کی واپسی کی خبر نے سارے ملک میں ہلچل مچا دی۔

ایسی ہی ہلچل ری پبلکن فورم کے اجلاس میں بھی ہوئی۔

''ان کے استقبال کے لیے ایک بہت بڑی تعداد ائرپورٹ پہنچے گی۔'' صدر راشد گیلانی نے کہا۔ ''حکومت ان حالات میں ان کی آمد گوارا نہیں کرسکتی۔ لوگوں کو ائرپورٹ جانے سے روکنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔''

''ان کے معتقد دیوانے ہیں۔ وہ ہر صورت میں ائرپورٹ جانے کی کوشش کریں گے۔'' کسی نے کہا۔

''تو پھر ان پر گولیاں ضرور چلیں گی۔'' کوئی اور بولا۔

پشمینہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے ان باتوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی لیکن اس کی سوچ یقیناً اسی بارے میں ہوگی۔

دس منٹ تک بھی جب ان باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تو وہ بول پڑی۔ ''اجلاس شروع کیا جائے۔'' یہ اس نے دوسری مرتبہ کہا تھا۔

چیئرپرسن کے یہ الفاظ حکم کا درجہ رکھتے تھے۔ اجلاس میں اس پر برائے نام گفتگو ہوئی کہ ریلی نکالی جائے یا نہ نکالی جائے کیونکہ پشمینہ فیصلہ سنا چکی تھی کہ ریلی نہیں نکالی جائے گی۔ اس پر زیادہ بات ہوئی کہ پشمینہ کو نئی صورتِ حال (شاہ صاحب کی آمد) میں امریکا جانا چاہیے یا نہیں، یا یہ اقدام موخر کردیا جائے۔

یہ اجلاس ایک گھنٹے سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس میں طے پایا گیا کہ پشمینہ کی امریکا روانگی کا فیصلہ شاہ صاحب کی آمد کے بعد کے حالات کی روشنی میں کیا جائے گا، نیز ریلی نہ نکالنے کے فیصلے پر بھی اس کے بعد ہی نظرِ ثانی کی جائے گی۔

اجلاس کے دوران میں ٹی وی بند کردیا گیا تھا ورنہ یکسوئی سے گفتگو ممکن ہی نہیں تھی، البتہ ڈیبرا اور پشمینہ کی پریس سیکریٹری رضوانہ کو ایک اور کمرے میں بھیج دیا گیا تھا تاکہ اگر کوئی بہت غیر معمولی خبر آئے تو اجلاس کے دوران میں ہی پشمینہ کو اس سے آگاہ کیا جائے ورنہ اس ایک گھنٹے کی خبروں کی رپورٹ اجلاس کے بعد دی جائے۔

اجلاس کے بعد سب لوگوں کو رخصت کردیا جانا چاہیے تھا لیکن پشمینہ نے انہیں روکا۔ ''پہلے آپ سب لوگ ایک گھنٹے کی خبریں سن لیں۔ شاید کوئی ایسی خبر ہو جس پر گفتگو کرنا ضروری ہو۔''

ڈیبرا اور رضوانہ کو واپس بلایا گیا۔

رضوانہ نے ایک رپورٹ تو یہ دی کہ تمام سیاسی جماعتوں کے ایک ہنگامی اجلاس کے ساتھ ساتھ مذہبی سیاسی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس بھی شروع ہوچکا تھا اور غیر مصدقہ ذرائع کے مطابق ''دو اتحاد'' بن سکتے تھے۔ ایک سیاسی جماعتوں کا، دوسرا مذہبی سیاسی جماعتوں کا کیونکہ انہیں یقین ہوچکا تھا کہ حکومت اپنے جارحانہ اقدامات سے اس احتجاج پر قابو پالے گی جو اس وقت ہورہا تھا اور پھر جب انتخابات ہوں گے تو سیاسی جماعتوں کا اتحاد نہ ہونے کی صورت میں ری پبلکن فورم کامیاب ہوجائے گا۔

لفظ ''انتخابات'' پر پشمینہ کی ہلکی سی ہنسی میں طنز تھا۔

ٹی وی چینلز پر ان سیاسی جماعتوں کے ترجمان کہہ چکے تھے کہ اگر ری پبلکن فورم نے ریلی نکالی بھی تو ان کی جماعت اس ریلی میں شمولیت نہیں کرے گی۔

''مجھے اس کا اندازہ شروع ہی سے تھا۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے کسی سیاسی پارٹی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور ان لوگوں کو تو مجھ سے رابطہ کرنا ہی نہیں تھا۔''

رضوانہ بولی۔ ''سب سے اہم بات میں بعد میں بتا رہی ہوں کہ تاجروں، صنعت کاروں، مزدوروں اور نہ جانے کس کس کے نمائندے ٹی وی چینلز پر آ کر کہہ رہے ہیں کہ ری پبلکن فورم کو ریلی ضرور نکالنا چاہیے اور کل ہی نکالنا چاہیے کیونکہ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل جانے دیا گیا تو مستقبل میں حکومت کی جارحیت اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ اس کے مقابل نکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

اجلاس کے تمام شرکا کی نظریں فوراً پشمینہ کی طرف اٹھ گئیں۔

''ڈیبرا!'' پشمینہ بولی۔ ''ٹی وی کھولو۔''

ٹی وی کھولا گیا جو چینل کھلا، وہی یہ خبر نشر کر رہا تھا کہ ریلی کے سلسلے میں اس کے نمائندوں نے گھر گھر جا کر سروے کیا تھا۔ اسّی فیصد لوگوں کی خواہش تھی کہ ریلی ضرور نکالی جائے جس میں وہ بہر صورت شرکت کریں گے اور اگر ریلی نہ نکالی گئی تو کوئی سیاسی جماعتوں کی اس بات پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ ری پبلکن فورم کا قیام محض ایک ڈراما ہے جو صدر حیات نے خود رچایا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پشمینہ حیات کی کامیابی سے حکومت اسی کے گھر میں رہے گی، نیز یہ کہ پشمینہ دراصل صدر حیات کے اشاروں پر چل رہی ہے۔

''بہت خوب!'' پشمینہ کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔ ''یہ پروپیگنڈا ابھی شروع کر دیا گیا۔''

''یہ ابھی اسی ایک گھنٹے میں شروع کیا گیا ہے۔'' رضوانہ نے کہا۔ ''میں اب آپ کو اسی کے بارے میں بتانے والی تھی کہ آپ نے ٹی وی کھلوا لیا۔''

پشمینہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ریلی نکالنی ہی پڑے گی۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں میڈم!'' صدر اسد گیلانی نے کہا۔ ''اگر ریلی نہ نکالی گئی تو ہماری پارٹی کی یکایک بڑھنے والی مقبولیت یقیناً متاثر ہوگی۔''

''تقریباً ختم بھی ہو سکتی ہے۔'' دانش یزدانی بھی بول پڑا۔ ''لوگ یہ بات بھی، میرا خیال ہے کہ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ اگر حکومت کی جارحیت کو ابھی سے لگام دینے کی کوشش نہ کی گئی تو مستقبل میں ایسا کوئی اقدام کرنے کی صورت میں بہت زیادہ قربانیاں دینی پڑیں گی۔''

ان باتوں سے اجلاس گویا پھر شروع ہو گیا۔ فیصلہ تو یہی ہوا کہ ریلی نکالی جائے گی لیکن لائحہ عمل میں یہ تبدیلی کی گئی کہ ریلی کا رخ فوری طور پر قصرِ صدارت کی طرف نہیں بلکہ ائرپورٹ کی طرف ہوگا کہ شاہ صاحب کا استقبال کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے۔ اس کے بعد ریلی کا رخ قصرِ صدارت کی طرف کیا جائے گا تو شاہ صاحب کے معتقدین بھی اس میں شامل ہوں گے اور ریلی زیادہ طاقتور ہو جائے گی۔

آخر ٹی وی چینلز کے لیے یہ پیغام جاری کر دیا گیا کہ ریلی کل ہی نکلے گی اور اس کا آغاز صبح آٹھ بجے اس لیے ہوگا کہ تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے دس بجے تک یقینی طور پر ائرپورٹ پہنچا جاسکے...... نیز یہ کہ ریلی کی قیادت خود پشمینہ حیات کرے گی۔

اس کے بعد دس منٹ کی میٹنگ اور ہوئی جس میں چند افراد کی وہ کمیٹی تشکیل دی گئی جسے ریلی کے سلسلے میں لائحۂ عمل تیار کرنا تھا۔

دس بجنے والے تھے جب اجلاس کے شرکا اس بنگلے سے رخصت ہوئے جسے اب پشمینہ ہی کا بنگلا کہا جاسکتا تھا۔

دانش یزدانی نے یہ بنگلا اپنی پوری فیملی کے لیے بنوایا تھا اس لیے خاصا بڑا تھا جس میں اب صرف پشمینہ اور ڈیبرا کو رہنا تھا۔ ملازمین کے لیے دو سرونٹ کوارٹر تھے۔ پشمینہ اور ڈیبرا کے لیے میٹنگ کا ہال، ایک ڈرائنگ روم، دو بیڈ روم اور ایک کچن ہی کافی تھا۔ باقی کمرے خالی تھے اور جو منزل اوپر بنائی گئی تھی، وہ تو یکسر خالی تھی۔

اتنے بڑے بنگلے کو محفوظ بنانے کے لیے بیس پرائیویٹ گارڈز کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ پشمینہ نے یہ ذمّے داری ڈیبرا کو سونپی تھی کہ گارڈز کو کہاں کہاں متعین کیا جانا چاہیے۔ ڈیبرا نے سوچ سمجھ کر دن کے لیے صرف چھ گارڈز کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ باقی چودہ گارڈز کو دن میں آرام کر کے رات بھر جاگنا تھا۔ ان میں سے دو گارڈز کو رات کے وقت اوپری منزل کے ٹیرس پر ڈیوٹی دینی تھی۔ باقی بارہ گارڈز میں سے چھ بنگلے کے بیرونی اور چھ اندرونی حصے میں ڈیوٹی دیتے۔

دن بھر حالات ایسے رہے تھے کہ پشمینہ اور ڈیبرا کو دوپہر کے کھانے کا خیال آیا بھی تھا تو کھانے کو ان کا جی نہیں

چاہا تھا۔ دن بھر چائے، کافی اور بسکٹ وغیرہ ہی چلتے رہے تھے۔

اجلاس ختم ہونے کے بعد ان دونوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد ان کے تھکے ہوئے جسموں کو آرام ہی کی ضرورت تھی۔ ان دونوں کی خواب گاہیں ایسے کمروں میں تھیں جن کی درمیانی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کا مقصد یہ تھا کہ ایک کمرے میں دانش یزدانی کی خواب گاہ اور دوسرے میں لائبریری ہوتی۔ اسی دوسرے کمرے کو ڈیبرا نے خواب گاہ کے طور پر اسی دن دوپہر تک ڈیکوریٹ کروالیا تھا۔

ڈیبرا فوری طور پر اپنی خواب گاہ میں جانے کے بجائے پشمینہ ہی کی خواب گاہ میں اس کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی۔ سامنے ٹی وی کھلا ہوا تھا۔ سبھی چینلز پر اسی دن کے حوالے سے خبریں یا ٹاک شوز آرہے تھے۔

ڈیبرا بولی۔ ”دن میں کئی جگہ اجلاس ہوتے رہے ہیں لیکن صدارتی محل میں کسی اجلاس کے ہونے کی خبر نہیں آئی۔“

”ڈکٹیٹر کو مشاورت کے لیے اجلاس کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ پشمینہ نے گہری سنجیدگی سے جواباً کہا۔ ”ڈکٹیٹر خود سوچتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔“

اور اس کی یہ بات سو فیصد درست تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ریلی کی قیادت پشمینہ خود کرے گی، صدر حیات نے لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی کو طلب کر کے اس سے کہا تھا۔ ”یہ نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں سمجھا نہیں جناب صدر!“

”ریلی کی قیادت پشمینہ ہرگز نہ کر سکے۔“ صدر حیات نے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں میں صرف پندرہ منٹ گفتگو ہوئی تھی۔

☆☆☆

اسی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ رات جب اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی، سی ایس کے اہلکاروں سے بھرے ہوئے چار ٹرکوں نے پشمینہ کے بنگلے کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ اس قطار میں کیونکہ چھ بنگلے اور تھے، اس لیے وہ بھی اس حصار میں آگئے تھے۔

پھر چند ہی لمحوں بعد فضا میں دو ہیلی کاپٹر اس طرف آتے دکھائی دیے جن میں سی ایس کے کمانڈوز تھے۔

ان ہیلی کاپٹروں کی مدھم سی آواز سوتی ہوئی ڈیبرا کے کانوں میں بھی پہنچی اور وہ جاگ گئی۔ اس کی نیند ایسی ہی تھی۔ مدھم سی آواز بھی اس کی نیند میں خلل ڈال دیتی تھی۔

کوئی جہاز گزر رہا ہے، اس کے غنودہ ذہن میں آیا اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر وہ نہ صرف جاگ کر اٹھ بیٹھی بلکہ ننگے پیر ہی دوڑتی ہوئی پشمینہ کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔

گولیاں چلنے کی آوازوں نے پشمینہ کو بھی جگا دیا تھا۔ جیسے ہی ڈیبرا اس کے کمرے میں داخل ہوئی، کسی گارڈ نے دروازے پر دستک دے کر تیز آواز میں کہا۔

”ہوشیار میڈم! دو ہیلی کاپٹر ٹیرس پر اترے ہیں۔ اوپر ہمارے دونوں ساتھی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔“

پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ قریب ہی سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کے باہر کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ غالباً اطلاع دینے والا گارڈ ہی کسی کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔

اس کے فوری بعد سارا بنگلا بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ باہر ڈیوٹی دینے والے گارڈز بھی اندر گھس آئے تھے اور غالباً وہ گارڈز بھی جو دن میں ڈیوٹی دے کر سو چکے تھے۔

”یہ مجھے ہی مارنے آئے ہوں گے۔“ پشمینہ نے بیڈ کی دراز سے اپنا ریوالور نکالتے ہوئے کہا، پھر دانت پیستے ہوئے بولی۔ ”میری ماں کی بات بھی نظرانداز کر دی گئی ہے۔“

ڈیبرا نے اس کے دوسرے فقرے کا آخری آدھا حصہ شاید سنا ہی نہ ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی واپس اپنی خواب گاہ میں گئی تھی۔

بے تحاشا گولیاں چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ فائرنگ کسی نشانے پر نہیں بلکہ اندھادھند کی جارہی تھی۔

ڈیبرا جب واپس لوٹی تو بھی ننگے پیر ہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں بریٹا کا پی فور پسٹل تھا جس میں دو چھوٹی چھوٹی بیرل تھیں اور دائیں ہاتھ میں فور بیرل پسٹل جس کی لمبائی اتنی تھی کہ اسے جیب میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ اسلحہ اسی دن حاصل کیا گیا تھا۔

پشمینہ بڑی عجلت میں ساڑی باندھ چکی تھی اور ڈیبرا کو پکارنے ہی والی تھی۔

”باہر نکل کر مقابلہ تو کرنا ہوگا ان کتوں کا۔“ پشمینہ نے پھر دانت پیسے۔

اس کا ایک قدم دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ڈیبرا اس کے سامنے آگئی۔

”کیا حماقت کر رہی ہو تم! اندھادھند گولیاں چل رہی

ہیں۔ ہم اپنے ہی کسی گارڈ کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ڈیبرا نے دو بیرل کا چھوٹا ریوالور اپنی چست پتلون کی بیلٹ میں ٹھونس لیا۔ پھر اسی ہاتھ سے پشمینہ کا بازو پکڑ کر اسے تقریباً کھینچتی ہوئی بولی۔ ''ادھر آؤ۔''

''نہیں۔'' پشمینہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں بزدلوں کی طرح باتھ روم میں نہیں گھسوں گی۔''

''تم آؤ تو سہی! ہمیں چھپنا نہیں ہے۔'' ڈیبرا نے اسے پھر گھسیٹا۔ ''ہم ادھر سے بھی باہر نکل سکتے ہیں۔''

''ادھر سے!'' پشمینہ کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے لیکن پھر اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ ڈیبرا کے ساتھ باتھ روم میں داخل ہوئی۔

''وہ جو وارڈ روب ہے۔'' ڈیبرا نے بتایا۔ ''وہیں سے دوسری طرف نکلا جاسکتا ہے۔''

پشمینہ کے دماغ میں کئی سوال کلبلانے لگے تھے جو اس نے اس وقت زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سوالات بعد میں کیے جاسکتے تھے۔

''باتھ روم کو اندر سے لاک کرلینا چاہیے۔'' وہ بولی۔

''ہرگز نہیں۔'' ڈیبرا نے کہا۔

نہایت کشادہ باتھ روم میں وہ دونوں وارڈ روب تک پہنچ گئی تھیں۔ ڈیبرا نے اسے کھولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ''وہ لوگ یقیناً زیادہ تعداد میں ہوں گے۔ ہمارے بھی گارڈز شاید مارے جائیں۔ وہ تمہاری تلاش میں تمہارے کمرے میں بھی داخل ہوں گے اور باتھ روم بھی کھول کر دیکھیں گے۔ دروازہ اندر سے بند ملا تو وہ اسے توڑ ڈالیں گے۔'' ان باتوں کے دوران میں ڈیبرا نے الماری کے اندر ہاتھ ڈال کر عقب میں لگا ہوا چوبی تختہ ایک طرف سرکا دیا تھا۔ اسے سرکانے کے لیے یقیناً کسی قسم کا میکنزم ہوگا۔ تختہ ایک طرف سرکتے ہی دوسری طرف روشنی دکھائی دی تھی۔

وارڈ روب میں لٹکے ہوئے کپڑوں کے بیچ سے ڈیبرا نے پشمینہ کو دوسری طرف نکالا۔ وہ خود وارڈ روب میں رک کر اس کے پٹ بند کرنے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی پشمینہ کے قریب پہنچ گئی۔

وہاں چھ فٹ اور چار فٹ کی لمبائی چوڑائی تھی۔ ایک جانب سنگی زینے تھے۔ ڈیبرا، پشمینہ کو لیے ہوئے دبے قدموں انہی زینوں پر چڑھنے لگی جو چھت تک چلے گئے تھے۔ فرش سے چھت تک کا فاصلہ چودہ فٹ کے قریب معلوم ہوتا تھا۔ آٹھ فٹ کے بعد سنگی زینے ختم ہوگئے۔ اب وہ دونوں ایک چوڑی جگہ پر تھیں۔ ڈیبرا نے اپنا فور بیرل ریوالور ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ چھت کی طرف بڑھائے جہاں ایک لیور لگا ہوا تھا۔

''تمہیں یہ خفیہ راستے کیسے معلوم ہوئے؟'' پشمینہ سے رہا نہ گیا۔

''شش! بہت آہستہ بولو!'' ڈیبرا نے سرگوشی کی اور چھت میں لگے ہوئے لیور کو جنبش دی۔ فوراً ہی چھت میں ایک اتنا بڑا چوکور خلا پیدا ہوگیا جس سے دو آدمی اوپر جاسکتے تھے۔ اس طرف مکمل تاریکی تھی۔

خلا پیدا ہوتے ہی ڈیبرا نے اپنا فور بیرل ریوالور اٹھا کر اس طرح اوپر کردیا جیسے کسی کو نشانہ بنانا چاہتی ہو۔

''احتیاط ضروری ہے۔'' پشمینہ نے سرگوشی کی۔ ''ممکن ہے، کوئی اوپر بھی ہو۔''

ایک منٹ گزر گیا۔ کسی قسم کی آہٹ سنائی نہیں دی۔

''یہاں کھڑی ہوجاؤ۔'' ڈیبرا نے کہا۔ خلا کے بالکل نیچے بڑے بڑے چار سفید ٹائل لگے ہوئے تھے۔ وہ خود انہی ٹائلز پر کھڑی تھی۔

پشمینہ کو اس وقت اسی کے اشاروں پر چلنا تھا۔ اس نے ڈیبرا کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس وقت ڈیبرا نے کسی میکنزم کو حرکت دی۔ اور چاروں ٹائلز دھیرے دھیرے اوپر اٹھنے لگے۔

سر اس خلا سے نکلنے سے پہلے ڈیبرا کے دونوں ہاتھ اوپر نکلے تھے جس میں وہ فور بیرل ریوالور تھامے ہوئے تھی۔ اس کے بعد ان دونوں ہی کے سر اوپر نکلے۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔

ڈیبرا نے سرگوشی کی۔ ''اوپری منزل کے اس کمرے کو گھر کی خراب ہوجانے والی چیزوں کے لیے گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن فی الحال یہ بالکل خالی پڑا ہے۔''

چوکور ٹائل جیسے ہی اس کمرے کے فرش کے برابر ہوئے، ان کی حرکت رک گئی۔

''آؤ۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب قدم بڑھایا۔

پشمینہ کے اندازے کے مطابق ڈیبرا جانتی تھی کہ اسے کس طرف بڑھنا چاہیے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور آگے بڑھا ہوا تھا۔ سات آٹھ قدم چلنے کے بعد ہلکا سا کھٹکا ہوا، جیسے ریوالور کسی سخت چیز سے ٹکرایا ہو۔

''اب ٹٹول کر ہی دروازہ تلاش کرنا ہے۔'' ڈیبرا نے کہا، پھر فوراً ہی بولی۔ ''اوہ مل گیا۔''

اس نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف بھی اندھیرا

تھا۔ اس طرف چھوٹی سی راہداری تھی جس کے اختتام پر دروازے کے قریب پہنچ کر ڈیبرا نے دروازے سے کان لگا دیے۔

''دوسری طرف کوئی ہے۔'' اس نے پشمینہ کے کان کے قریب منہ لا کر اتنی دھیمی آواز میں کہا جو چھ انچ کے فاصلے سے سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ ''اس طرف ٹیرس ہے۔ ہیلی کاپٹر یہیں اتارے گئے ہیں۔''

گولیاں چلنے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں مگر ان کی شدت میں کمی آنے کا مطلب یہی تھا کہ گولیاں چلانے والوں کی تعداد کم ہو چکی تھی۔ کم ہونے والے یا تو شدید زخمی ہوں گے یا مر چکے ہوں گے۔''

''اب یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔'' ڈیبرا نے پہلے ہی کی طرح کہا۔

پشمینہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیبرا کی شاید یہ کیفیت نہ ہو۔ وہ اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی تربیت لے چکی تھی۔

دروازہ بہت ذرا سا کھولنے میں ڈیبرا نے اتنی احتیاط سے کام لیا تھا کہ سوئی کے گرنے جیسے آواز بھی نہ ہو۔ اس جھری سے اس نے باہر جھانکا۔

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مطلع ابر آلود ہے۔ تارے بھی نظر نہیں آ رہے۔ گھٹا ٹوپ تاریکی ہے۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کو بتایا۔

''پوزیشن کیا ہے؟''

''ایک ہیلی کاپٹر سائے کی طرح نظر آیا ہے۔ دروازہ تھوڑا سا اور کھولنا پڑے گا۔''

قدموں کی آہٹ ان دونوں ہی کو سنائی دے رہی تھی۔ وہاں کوئی شخص ٹہل رہا تھا۔

ڈیبرا نے دروازے کو دھیرے دھیرے کھولنا شروع کیا۔ اسے توقع تھی کہ وہاں جو بھی تھا، اسے کھلتا ہوا دروازہ اندھیرے کی وجہ سے شاید دکھائی نہ دے اور اگر دکھائی دے بھی جاتا تو ڈیبرا کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ فوری طور پر اس کے سینے میں گولیاں اتار دے۔ اگر اس سے ایک ثانیے کی بھی چوک ہوتی تو وہی شخص گولیوں کی بوچھار کر دیتا۔ وہ اب ڈیبرا کو دکھائی بھی دے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی مشین گن تھی۔

دوسرا ہیلی کاپٹر بھی ہیولے کی طرح نظر آ گیا تھا۔ اس نے پشمینہ کو بتا دیا پھر کہا۔ ''تم یہیں رکو۔''

''کیا کرنے جا رہی ہو؟'' پشمینہ مضطرب ہوئی۔

''بس یہیں سے جھانک کر دیکھتی رہو۔'' ڈیبرا نے کہا اور دروازہ اتنا کھول لیا کہ باہر نکل سکے۔ وہ فرش پر لیٹ کر سانپ کی طرح رینگتی ہوئی ٹیرس پر پہنچ گئی۔

پشمینہ نے دروازہ اس حد تک بند کر لیا کہ بس جھانکنے کی گنجائش باقی رہی۔ اس نے ڈیبرا کو دیکھنا چاہا لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ صرف ہیلی کاپٹرز اور وہاں ٹہلتے یا پہرا دیتے ہوئے شخص کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

پشمینہ کی سوچ کے مطابق ڈیبرا اس وقت ٹیرس پر جہاں بھی تھی، بہت احتیاط سے متحرک تھی۔

نیچے ہونے والی فائرنگ میں اب اور کمی آ چکی تھی۔ مرنے والوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوا تھا۔ یہ بات ممکن نہیں تھی کہ حملہ آوروں کی ہلاکتیں نہ ہوئی ہوں۔ گارڈز نے انہیں بھی معاف تو نہیں کیا ہوگا۔

یکا یک پشمینہ نے پہرا دینے والے شخص کے عقب میں ایک سایہ ابھرتے دیکھا۔ وہ یقیناً ڈیبرا تھی جو جست لگا کر اس شخص پر جا گری۔ دونوں ہی ٹیرس پر گرے تھے۔ اس کے بعد صرف ایک سایہ اٹھا جو ڈیبرا کا تھا۔ پہرا دینے والا نہیں اٹھ سکا۔ وہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا ڈیبرا نے اسے گولی چلائے بغیر ہی کسی طرح ہلاک کر دیا تھا۔

پشمینہ نے ڈیبرا کا اشارہ دیکھا۔ وہ اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ پشمینہ دروازہ کھول کر تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

ڈیبرا نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ ''آؤ'' وہ ایک ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھی۔

''کیا...... کیا؟'' پشمینہ کے منہ سے نکلا۔

''یہی سوچا تھا مجھے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ ''انہی کے ہیلی کاپٹر میں ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ مدد کے لیے پولیس یا کسی بھی سرکاری ادارے کو فون کرنا تو حماقت ہی ہوتی۔''

''تم ہیلی کاپٹر......''

''ہاں میں اڑا سکتی ہوں۔ سیکھ چکی ہوں۔'' ڈیبرا نے کہا۔

اب نیچے ہونے والی فائرنگ بند ہو چکی تھی۔

''ہمارے سب گارڈز مارے جا چکے۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کو ہیلی کاپٹر میں سوار کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہیلی کاپٹر اتنے بڑے ہیں کہ ہر ایک میں بیس پچیس تو آئے ہوں گے۔ ہمارے باڈی گارڈ چالیس پچاس کو ختم نہیں کر سکتے۔''

پشمینہ کو ہیلی کاپٹر میں سوار کرانے کے بعد ڈیبرا بھی چڑھ گئی۔ اس نے پائلٹ کی سیٹ سنبھالی تھی۔

''اب وہ ہمیں تلاش کررہے ہوں گے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کردیا تھا۔

''بہت جدید ہیلی کاپٹر ہیں۔'' ڈیبرا بڑبڑائی۔

جب ہیلی کاپٹر نے اٹھنا شروع کیا تو پشمینہ بولی۔ ''ہم جائیں گے کہاں؟''

''سوچا ہے کچھ میں نے۔'' ڈیبرا نے جواب دیتے ہوئے اپنا فور بیرل ریوالور سنبھال کر ہیلی کاپٹر سے باہر نکالا۔

ٹیرس سے فاصلہ کتنا بڑھ چکا تھا، اس بارے میں پشمینہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔

ڈیبرا کے ریوالور نے ٹیرس پر کھڑے دوسرے ہیلی کاپٹر پر گولیاں برسا دیں اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے فضا میں اڑے تھے۔ ڈیبرا نے یہ اقدام اتنے فاصلے سے کیا تھا کہ فضا میں اڑنے والے ٹکڑے اس ہیلی کاپٹر کو نقصان نہ پہنچا سکیں جس میں وہ دونوں تھیں۔

''شاباش۔'' پشمینہ نے ڈیبرا کو داد دی۔ ''اب کم از کم اس ہیلی کاپٹر سے وہ لوگ ہمارے تعاقب میں نہیں آسکتے۔''

''لیکن وہ اس کی اطلاع تو کسی کو دے دیں گے۔ کوئی اور ہیلی کاپٹر آسکتا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد اس ہیلی کاپٹر سے کہیں اُتر جائیں۔ میں اندازے سے ایک سمت بڑھ رہی ہوں۔ اگر میرا اندازہ غلط نکلا تو پھر پریشانی لاحق ہوسکتی ہے۔''

ہیلی کاپٹر فضا کی تاریکی چیرتا ہوا تیزی سے ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ ڈیبرا نے اس کی رفتار اتنی ہی تیز رکھی تھی جتنی تیزی سے اسے اڑانا ممکن تھا۔

''وہ لوگ فوری طور پر اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ ہم کس طرف جارہے ہیں۔ پہلے میں نے ہیلی کاپٹر کا رخ دوسری طرف رکھا تھا۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد رخ بالکل تبدیل کردیا ہے۔ جو ہیلی کاپٹر بھی آئے گا، وہ کچھ دیر تک بھٹکتا ہی رہے گا بلکہ کئی ہیلی کاپٹر بھیجے جائیں گے۔''

''کسی نے دیکھا ہی کیسے ہوگا کہ شروع میں ہیلی کاپٹر کا رخ کس طرف تھا؟''

''جب ہم وہاں سے اُڑے تھے تو تم نے نیچے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں میں نے بنگلوں کی قطاروں کی تین جانب تو ٹرک دیکھے تھے۔ چوتھی جانب بھی کوئی ٹرک ضرور ہوگا۔ خاصی تعداد میں آدمی بھی تھے جنھوں نے بنگلوں کی قطار اپنے گھیرے میں لے لی تھی۔ وہ ہمیں کسی طرف سے بھی بچ نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے اور یہ تو فوری طور پر ان کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں ہم ہیں۔ انہیں اس وقت اطلاع ملی ہوگی جب ہم دور نکل چکے ہوں گے۔''

''وہاں سے نکل آنے کے بعد بھی میں پریشان ہوں۔'' پشمینہ کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہورہی تھی۔

''جب تک میری سانس باقی ہے، تم پر حرف نہیں آنے دوں گی میری جان!'' اس مرتبہ ڈیبرا کا لہجہ خاصا جذباتی تھا۔

پشمینہ نے بھی جذباتی ہوکر ڈیبرا کا شانہ زور سے دبایا۔

''اس وقت تاریکی بھی ہماری مددگار ہے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کی کوئی لائٹ آن نہیں کی تھی۔

آخر اس نے ایک جگہ ہیلی کاپٹر کو نیچے اُتارنا شروع کیا۔

''ابھی ہم ایک سڑک کے اوپر سے گزرے تھے۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''کچھ گاڑیوں کی روشنیاں متحرک نظر آئی تھیں۔''

''وہ ہائی وے ہے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ ''میں نے ادھر ہی آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اندازہ درست نکلا۔ ہم ہائی وے کی ایک جانب ویران علاقے میں اُتر رہے ہیں۔ ریتیلی زمین ہے۔ ایسی جگہ ہیلی کاپٹر نہیں اتارا جاتا مگر یہ خطرہ مال لینا ہی پڑے گا۔ ممکن ہے ہیلی کاپٹر ریت میں کئی فٹ دھنس جائے۔ ٹیڑھا بھی ہوسکتا ہے۔ خود کو بہت سنبھال کر رکھنا۔ یہ میں ایک بڑا امتحان دینے جارہی ہوں۔''

اور وہ اس امتحان میں بڑی حد تک کامیاب رہی، لیکن اسے جو اندیشہ تھا، وہ بہرحال صحیح ثابت ہوا۔ ہیلی کاپٹر ریت میں دھنسا بھی تھا اور ایک جانب خاصا جھک بھی گیا تھا۔

ڈیبرا نے فوراً انجن بند کرتے ہوئے کہا۔ ''بس اب اترو جلدی۔ ممکن ہے کہ ہیلی کاپٹر اور ٹیڑھا ہوجائے۔''

وہ دونوں بہت عجلت میں اُتریں۔

''بس دوڑ پڑو۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''ہمارا رخ ہائی وے کی طرف ہے۔ ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچ کر کوئی کار روکنا ہوگی۔ میں تو بہت تیز بھاگ سکتی ہوں لیکن تم جس حد تک بھی تیز دوڑ سکو۔''

پھر ڈیبرا کو یقیناً تعجب ہوا ہوگا کیونکہ پشمینہ اس کی توقع سے زیادہ تیز دوڑ رہی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ پشمینہ اسکول کے زمانے میں دوڑ کے کئی مقابلوں میں حصہ لے چکی تھی اور ایک دوڑ میں انعام بھی حاصل کیا تھا۔

''مجھے توقع...... نہیں تھی...... کہ میں...... میں اب...... بھی اچھا خاصا...... دوڑ...... سکتی ہوں۔'' دوڑنے ہی کی وجہ سے پشمینہ ایک جملہ بھی بمشکل بول سکی تھی۔

صورتِ حال ایسی ہی تھی۔ انہیں جلد از جلد نہ صرف ہیلی کاپٹر سے دور ہونا تھا بلکہ ہائی وے پر پہنچنا بھی ضروری تھی۔

لگ بھگ چھ فرلانگ کے فاصلے تک پشمینہ یکساں رفتار سے دوڑ سکی تھی لیکن پھر اس کی رفتار کچھ کم ہوئی۔ ڈیبرا بھی ہانپنے لگی تھی لیکن پشمینہ زیادہ ہانپ گئی تھی۔ اس نے بہرحال ایک بہت آسودہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔

فضا میں دو ہیلی کاپٹر گڑگڑائے تو وہ دونوں چونکیں۔ ان کی نظریں اوپر اٹھیں۔ وہ رک بھی گئی تھیں۔

''ہیلی کاپٹر کی تلاش...... شروع ہو چکی ہے۔'' ڈیبرا بولی۔ ''مگر انہیں یہ خیال...... نہیں آئے گا...... وہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ...... ہم نے...... یہاں ہیلی کاپٹر اتارا ہوگا۔''

دونوں ہیلی کاپٹر انہیں کافی فاصلے پر دکھائی دیے تھے۔ اسی فاصلے سے وہ گزر بھی گئے۔

''وہ قریبی شہر کی طرف جا رہے ہیں۔'' ڈیبرا نے کہا۔ ''شاید انہیں...... یہ خیال ہے کہ ہم نے ادھر کا رخ کیا ہوگا...... شاید آٹھ دس ہیلی کاپٹر...... مختلف سمتوں میں...... تلاش کر رہے ہوں...... ہمیں۔'' ڈیبرا پھر بولی۔ اس نے پشمینہ کا ہاتھ پکڑ کر پھر دوڑنا شروع کر دیا۔

موسم کسی حد تک سرد تھا لیکن جب وہ دونوں ہائی وے تک پہنچیں تو پسینے میں شرابور تھیں۔ سینے دھونکنی کی طرح پھول پچک رہے تھے۔

ڈیبرا ایک چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں رکی تھی جہاں سے ہائی وے پر نظر رکھی جا سکتی۔

''دو ٹرک گزر رہے ہیں۔'' ڈیبرا نے کہا۔ ''ہمیں...... کسی کار کا...... انتظار کرنا ہوگا۔''

پشمینہ کچھ نہیں بولی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے باعث اب اس کے لیے فوری طور پر کچھ بولنا مشکل ہو گیا تھا۔

دو منٹ بعد دو کاریں اور ایک ٹرک بھی دکھائی دیا۔

''ہمیں صرف ایک کار دکھائی دے، تبھی بات بنے گی۔'' ڈیبرا بولی۔ ''ہم زیادہ لوگوں کی نظروں میں آئے تو بات نہیں بنے گی۔ اوہ...... ادھر سے ایک گاڑی اور کار ہی معلوم ہوتی ہے، آؤ۔'' ڈیبرا نے ریوالور جینز میں اڑس کر بنیان اس کے اوپر کر لی۔ فور بیرل ریوالور اپنی پشت پر چھپا لیا۔ ان دونوں نے بہت تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا تھا۔

''یہ ٹھیک کیا تم نے۔'' پشمینہ بولی۔ ''وہ جو کوئی بھی ہے، اسلحہ دیکھ کر تو گھبرا کر کار اور تیزی سے دوڑا دے گا۔''

وہ دونوں سڑک پر بالکل صحیح وقت پر پہنچیں۔ کار کی ہیڈ لائٹ ان پر پڑی۔ وہ دونوں بیچ سڑک پر کھڑی ہو گئی تھیں۔ کار کی رفتار کم ہونے لگی۔ وہ ان دونوں کے بالکل قریب آ کر رکی۔ وہ دونوں تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کے قریب پہنچیں۔ ڈرائیونگ کرنے والا پینتالیس پچاس سالہ شخص تھا۔

''کیا آپ ہمیں شہر تک پہنچا دیں گے؟'' ڈیبرا نے فوری طور پر اسلحے سے دھمکانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

ڈرائیونگ کرنے والے کی نظریں پشمینہ کے چہرے پر تھیں۔ ''آپ...... آپ...... پشمینہ...... پشمینہ حیات صاحبہ ہیں نا؟'' وہ کچھ حیران اور کچھ پریشان سا ہوا تھا۔

''جی ہاں۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''جلدی بتائیے! آپ ہمیں......''

''بیٹھیے، بیٹھیے!'' وہ جلدی سے بولا اور اس نے خود ہی کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔

''تم پیچھے بیٹھو۔'' ڈیبرا نے پشمینہ سے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کا دروازہ کھولنے لگی۔

''بس فوراً چل پڑیے۔'' ڈیبرا نے بیٹھتے ہی کہا۔

وہ کار حرکت میں لے آیا۔ ''آپ پشمینہ صاحبہ کی......''

''میں پشمینہ کی دوست ہوں اور باڈی گارڈ بھی۔'' ڈیبرا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''صبح کی ہلکی سی روشنی پھیلنے سے پہلے ہمیں شہر پہنچ جانا چاہیے۔''

''ہم قریب ہی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے، لیکن...... خبریں تو یہ ہیں کہ آپ دونوں کو کسی نامعلوم طاقت نے اغوا کر لیا ہے۔''

''یہ خبر آپ نے کہاں سنی؟'' پشمینہ بول پڑی۔

''ٹی وی پر۔''

''ٹی وی؟'' ڈیبرا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''آپ جس شہر سے آ رہے ہیں، وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ آپ نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا ہوگا۔ خبر آپ نے ٹی وی پر کیسے سن لی؟''

''میرے پاس بڑی اسکرین کا بہترین موبائل ہے۔ ابھی بند کیا تھا میں نے۔''

''اوہ!'' ڈیبرا کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

وہ اور پشمینہ ایسے حالات سے گزری تھیں کہ انہیں موبائل پر خبریں سننے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

''اس وقت عموماً پرانی خبریں سنائی جا رہی ہوتی ہیں

مگر اچانک ہنگامی طور پر لائیو پروگرام شروع ہو گئے۔ حکومت کے ترجمان کے مطابق انہیں کچھ خبریں ملی تھیں کہ کوئی نامعلوم طاقت آپ دونوں کو اغوا کرنے کی کوشش کر سکتی ہے اس لیے آپ کی حفاظت کے لیے ٹرکوں پر سوار پولیس اور سی ایس کے اہلکار آپ کے گھر پہنچے تھے اور گھر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا لیکن آپ کے اغوا کنندگان ہیلی کاپٹرز پر آئے اور آپ دونوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ وہ دو ہیلی کاپٹروں میں آئے تھے جن میں سے ایک ہیلی کاپٹر تباہ بھی ہو گیا۔"

پشمینہ اور ڈیبرا نے جلدی سے اپنے موبائل نکالے۔

"ہمیں ان سے لڑتے ہوئے بھاگ نکلنے میں آسانی ہو گئی تھی۔" ڈیبرا نے کہا۔ اس وقت اس کا فور بیرل ریوالور اس کی گود میں رکھا تھا جس سے وہ شخص پریشان نہیں ہوا۔ وہ ان دونوں کو پہچان گیا تھا لہٰذا ڈیبرا کیونکہ باڈی گارڈ تھی اس لیے اسلحہ اس کے پاس ہونا ہی چاہیے تھا۔

پشمینہ نے موبائل پر ایک ٹی وی چینل لگایا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس وقت ٹی وی اینکر حکومت کے ایک ترجمان سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"کیا وہ ہیلی کاپٹر کسی بیرونی قوت کے تھے؟" اینکر نے سوال کیا تھا۔

"یقیناً وہ کسی بیرونی قوت کے ہوں گے کیونکہ ہمارے ریڈارز کو بھی ان کے بارے میں علم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اسی قسم کے ہیلی کاپٹرز ہوں گے جن کے ذریعے اسامہ بن لادن کو مارنے کے لیے آپریشن ہوا تھا۔"

"وہی ہو سکتے ہیں۔ بلیک ہاک اسٹیلتھ جو ریڈار کی زد پر نہیں آتے۔"

"کیا امریکا......"

"ضروری نہیں ہے۔" ترجمان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹیکنالوجی چین کے پاس تو فوراً پہنچ گئی تھی لیکن اب یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ چند اور ملکوں کے پاس بھی پہنچ گئی ہے۔ ہم نے تحقیقات شروع کر دی ہیں کہ یہ کس نے کیا ہے۔"

"کسی ملک کو پشمینہ حیات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"کسی بیرونی طاقت ہی نے سازش کر کے بیٹی کو باپ کے خلاف کھڑا کیا ہے۔ کیونکہ آج کے ہنگامے میں پشمینہ حیات کو کسی قسم کا نقصان پہنچ سکتا تھا اور حقیقتاً وہ آج کی ریلی کی قیادت بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن اگر خود پیچھے ہٹتیں تو ان کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچتا اس لیے اغوا کا ڈراما کیا گیا۔ یہ ہنگامی صورت حال ختم ہوتے ہی وہ پھر سامنے آ جائیں گی۔"

"الو کا پٹھا۔" پشمینہ نے غصے میں کہتے ہوئے موبائل بند کر دیا۔

"دوسری سیاسی جماعتیں کہہ رہی ہیں۔" وہ شخص بول پڑا۔ "کہ یہ باپ بیٹی کا ڈراما ہے۔ آج کے خطرات سے بچنے کے لیے یہ باپ بیٹی کا مشترکہ ڈراما ہے۔"

پشمینہ کا موبائل بند ہوتے ہی کار والے نے کہا۔ "حکومت کے ترجمان سے یہ سوال کیا جا چکا ہے کہ بلیک ہاک اسٹیلتھ جو چھت پر تباہ ہو گیا ہے، اس تک میڈیا کو جانے سے کیوں روکا جا رہا ہے۔ اس پر کہنا یہ ہے کہ جب تک تحقیقات مکمل نہ ہو جائیں، کسی کو وہاں نہیں جانے دیا جائے گا۔"

ڈیبرا کو اچانک ایک خیال آیا۔ "پشمینہ حیات کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے؟"

"میں پہلے تو ان کے بہت خلاف تھا لیکن جب یہ حکومت سے الگ ہوئیں تو میں ان کے بیانات سے متاثر ہوا تھا۔ پھر ڈیموکریٹک فورم کے قیام کے بعد سے تو میں ان کی سیاسی شخصیت کا پرستار ہو گیا ہوں۔ مجھے کسی پروپیگنڈے پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ حکومت ہی نے اغوا کروانے یا شاید مار ڈالنے کی سازش کی ہو گی لیکن آپ دونوں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ البتہ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ دونوں یہاں، اس ویران مقام تک کیسے پہنچ گئیں؟"

"اگر آپ ان کے پرستار ہیں تو کیا آپ ہماری ایک اور مدد بھی کر سکتے ہیں؟"

"میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

"ہمیں چند گھنٹے کے لیے کہیں روپوش ہونا ہے لیکن یہ بات آپ کے علم میں بھی نہیں آنا چاہیے کہ ہمیں اس وقت کہاں جانا ہے۔"

"تو کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا جائے۔ ڈرائیونگ میں کروں گی۔ بعد میں آپ کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

"آپ کی احتیاط میں سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں پشمینہ حیات صاحبہ کی بہتری کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ان کے خلاف کیے جانے والے کسی پروپیگنڈے پر بھی یقین نہیں مجھے۔"

ڈیبرا کی باتیں پشمینہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھیں لیکن وہ خاموش ہی رہی۔

ڈیبرا کے منصوبے کے مطابق عمل ہوا۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی کار روک کر اس شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پچھلی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ ڈیبرا نے سنبھالی۔ پشمینہ کو ڈیبرا نے پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھا رہنے دیا اور اشارے سے کہہ دیا کہ وہ اس شخص پر نظر رکھے۔ وہ اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی ذرا بھی نہ سرکا سکے۔

”مجھے فخر ہے کہ میں آپ کے برابر میں بیٹھا ہوں۔“ وہ بولا۔

”میں تو آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ اس وقت میرے کام آئے۔“

ڈیبرا پھر بولی۔ ”اس بارے میں آپ کسی کو بتائیں گے بھی نہیں۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک یہ روپوشی ختم کر کے سامنے نہ آجائیں۔ بس چند گھنٹے کی بات ہے۔“

”میں اس کے بعد بھی کسی کو نہیں بتا سکتا۔ سی ایس والے مجھے اس کے لیے معاف نہیں کر سکتے کہ میں نے پشمینہ حیات صاحبہ کی مدد کی تھی۔“

پشمینہ سوچ میں ڈوبی رہی۔ وہ ڈیبرا کی پلاننگ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ ڈیبرا جو کچھ کر رہی ہے، وہ ٹھیک ہی ہوگا۔

صبح کی ہلکی ہلکی سی ہی روشنی پھیلی تھی کہ ڈیبرا نے کار ایک جگہ روکی۔ پشمینہ نے حیرت سے دیکھا کہ کار جس عمارت کے سامنے رکی تھی، وہ شاہ صاحب کے قائم کردہ فلاحی ادارے کی تھی جسے ان کی بیٹی اقصیٰ احمد اور اس کا شوہر احمد چلاتے تھے۔

”آپ ابھی پیچھے ہی بیٹھے رہیں گے۔“ ڈیبرا نے کار والے سے کہا۔ ”پشمینہ بھی یہیں رکیں گی۔ تھوڑی دیر میں، بلکہ جلد ہی ایک آدمی آئے گا جو ڈرائیونگ سنبھالے گا۔ پشمینہ اس کے بعد کار سے اتر جائیں گی۔ وہ آدمی کار لے جا کر میل دو میل کے بعد آپ کی کار سے اُتر جائے گا۔ پانچ منٹ بعد آپ اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹائیں گے تو آپ کی کار میں آپ کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔“

”یہ تاریخی واقعہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔“ کار والے نے جذباتی لہجے میں کہا۔

ڈیبرا نے اس سے کچھ نہیں کہا، بس پشمینہ کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور کار سے اُتر کر تیزی سے عمارت کی طرف بڑھی۔ ابھی وہاں بالکل سناٹا تھا۔

اقصیٰ اور اس کا شوہر اپنے بچوں کے ساتھ اسی عمارت کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ شاہ صاحب کی وجہ سے وہ دونوں ڈیبرا سے واقف بھی تھے۔ ڈیبرا وہاں پہلے بھی دو ایک بار آچکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دونوں اس سے مکمل تعاون کریں گے۔

ڈیبرا نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے مطابق سب کچھ ہو گیا۔ اقصیٰ کا ایک آدمی اس شخص کی کار لے کر چلا گیا۔

پشمینہ سے اقصیٰ پہلی مرتبہ ملی تھی اور بہت خوش نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ حیران بھی تھی۔ اس کی حیرانی اس وقت ختم ہوئی جب ڈیبرا نے اسے سارا ماجرا سنایا۔

اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی کہ اب پشمینہ کو کیا کچھ کرنا ہے۔

☆☆☆

وہ صبح سارے ملک کے لیے سنسنی خیز تھی۔ جن لوگوں نے رات کے آخری حصے کی خبریں نہیں سنی تھیں، صبح وہ بھی سارے حالات سے آگاہ ہو گئے۔ سارے ملک کا ماحول غم و غصے میں ڈوب گیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے اس بات پر یقین کیا تھا کہ یہ سب صدر حیات اور پشمینہ کا مشترکہ ڈراما ہے۔

ایک ٹی وی چینل سے دانش یزدانی کا انٹرویو صبح سات بجے نشر ہو رہا تھا۔

”ری پبلکن فورم کے تمام لوگوں نے اتفاقِ رائے سے مجھے پشمینہ حیات صاحبہ کا نائب چن لیا ہے۔“ دانش یزدانی نے کسی سوال کے جواب میں کہا تھا۔ ”ہمارے خیال کے مطابق پشمینہ حیات صاحبہ کو ہلاک نہیں کیا گیا ہوگا۔ انہیں اغوا کر کے نظر بند کرنا حکومت نے اس لیے ضروری سمجھا کہ وہ ریلی کی قیادت نہ کر سکیں۔ انہیں ہلاک کرنا صدر حیات کے لیے گھریلو طور پر مشکلات کا سبب بن سکتا ہے۔“

انٹرویو میں دانش یزدانی نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ”ریلی کی قیادت کرتے ہوئے پشمینہ حیات صاحبہ کو نقصان پہنچ سکتا تھا، بس اسی لیے انہیں اغوا کیا گیا ہے۔ اب وہ ریلی کے شرکاء کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی سے گریز نہیں کریں گے لیکن کل کے بیالیس آدمیوں کی ہلاکت نے لوگوں کو بہت زیادہ پُرجوش کر دیا ہے۔ مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق لوگوں نے ابھی سے بڑے گراؤنڈ میں جمع ہونا شروع کر دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے اسکرین کے نصف حصے میں میرا یہ انٹرویو دکھایا جا رہا ہے اور دوسرے حصے میں

پولیس اور سی ایس کے اہلکار لوگوں کو بڑے گراؤنڈ میں پہنچنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہیں واٹر کین کا استعمال ہو رہا ہے اور کہیں آنسو گیس سے کام لیا جا رہا ہے مگر لوگ کسی نہ کسی طرح گراؤنڈ میں جمع ہو رہے ہیں اور اس وقت ان کی تعداد آٹھ دس ہزار ہو چکی ہے۔ ہماری ریلی کو وہیں سے قصرِ صدارت کی طرف روانہ ہونا ہے۔ دوسری طرف شاہ صاحب کے استقبال کے لیے ان کے پیروکار ائر پورٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور انہیں بھی اسی طرح روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پہلے ہمارا بھی یہی منصوبہ تھا کہ ری پبلکن کی ریلی پہلے ائر پورٹ ہی جائے گی لیکن پشمینہ حیات صاحبہ کے اغوا کی وجہ سے ہم نے آج صبح ساڑھے پانچ بجے ایک ہنگامی اجلاس میں اپنا پروگرام تبدیل کیا ہے۔ ہم کل ہلاک کیے جانے والے افراد کی لاشیں لے کر قصرِ صدارت کی طرف جائیں گے۔ زیادہ تر لاشیں اس وقت گراؤنڈ میں پہنچائی جا چکی ہیں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ اس انٹرویو کو مختصر کریں۔ اب چونکہ پشمینہ حیات صاحبہ موجود نہیں ہیں اس لیے ان کے نائب کی حیثیت سے ریلی کی قیادت میں ہی کروں گا۔''

''بس آخری دو سوال۔'' اینکر پرسن نے کہا۔ ''اگر لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بڑے گراؤنڈ پہنچ جائیں تو ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ گراؤنڈ میں اس سے زیادہ لوگوں کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن آپ پروگرام کے شروع میں بتا چکے ہیں کہ ریلی میں دو ڈھائی لاکھ سے زیادہ لوگوں کی شرکت متوقع ہے۔''

''جی ہاں۔'' دانش یزدانی نے جواب دیا۔ ''لوگوں کے چھوٹے بڑے جلوس قصرِ صدارت کے راستے میں جمع ہو رہے ہیں۔ وہ ہماری ریلی میں شریک ہوتے چلے جائیں گے۔''

''آخری سوال یہ کہ حکومت سے ریلی کو کس حد تک نقصان پہنچ سکتا ہے؟''

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اندیشہ ہے کہ آج قوم کو بہت زیادہ قربانیاں دینی پڑیں گی۔ بس اب مجھے اجازت دیجیے۔''

''بس آخری ایک سوال اور۔'' اینکر پرسن جلدی سے بولا۔

''وہ بھی پوچھیے، جلدی۔'' دانش یزدانی نے تحمل سے کہا۔

''آپ ریلی کی قیادت کے لیے گراؤنڈ کیسے پہنچیں گے؟''

''یہ میں ابھی آپ کو نہیں بتا سکتا۔ حکومت مجھے بھی روکنے کے لیے ہر قسم کا قدم اٹھا سکتی ہے۔ ہمارے کئی افراد گرفتار بھی کیے جا چکے ہیں۔ میں اپنا لائحہ عمل خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔''

یہاں دانش یزدانی کا انٹرویو ختم ہو گیا۔ یہ انٹرویو اس کے گھر پر ہی لیا گیا تھا۔

اسی وقت ٹی وی چینلز سے یہ بریکنگ نیوز چلی کہ پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں نے دانش یزدانی کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ان لوگوں کو حکم مل چکا تھا کہ دانش یزدانی کو گھر سے نہ نکلنے دیا جائے۔

پھر دوسری خبر یہ چلی کہ میگا فون سے سی ایس کے کسی آفیسر نے اعلان کیا تھا کہ دانش یزدانی دس منٹ کے اندر اندر باہر آ کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے ورنہ قانون کے محافظوں کو اس کے گھر میں زبردستی گھسنا پڑے گا۔''

اور پھر یہی ہوا، دانش یزدانی باہر نہیں نکلا اور گیارھویں منٹ پر سی ایس اور پولیس کے اہلکار گھر کے دروازے کھڑکیاں توڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے مگر انہیں دانش یزدانی نہیں ملا۔ سب حیران تھے کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان کیونکہ پندرہ منٹ پہلے وہ اسی گھر میں بیٹھا ٹی وی کو انٹرویو دے رہا تھا۔

غالباً اس نے اپنے گھر میں بھی کچھ اس قسم کا انتظام کر لیا تھا جیسا انتظام اس بنگلے میں کیا گیا تھا جو اس نے پشمینہ حیات کو تحفے میں دے دیا تھا۔

اس کے نہ ملنے پر اس کے ماں باپ، بہن اور دوسرے کئی رشتے داروں کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ جب انہیں گرفتار کر کے باہر لایا گیا تھا، اس وقت کسی چینل کے کیمرے کو قریب نہیں آنے دیا گیا تھا۔

سارے شہر کی دکانیں اس وقت بند تھیں اور جگہ جگہ سیاہ پرچم لہرا رہے تھے۔ مختلف سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کے ہجوم پر گیس کے شیل اور واٹر کین کا استعمال کیا جا رہا تھا جس سے لوگوں کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس ہجوم نے اس دن بھی ایک پولیس اسٹیشن اور دو سرکاری عمارتوں میں آگ لگا دی تھی جسے بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں متحرک تھیں۔

جب انتالیسواں جنازہ بڑے گراؤنڈ پہنچا تو اس کے ساتھ چار ہزار افراد تھے۔ جہاں جنازے رکھے جا رہے تھے وہیں ایک کرین بھی تھی۔

جنازہ لانے والوں نے یکایک دانش یزدانی اور پشمینہ حیات کے نام لے کر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ اس وقت تابوت کے اوپر کا حصہ ایک جھٹکے سے ایک طرف گر گیا۔ اس میں کوئی لاش نہیں، دانش یزدانی تھا۔ جن لوگوں نے بھی اسے دیکھا، وہ پہلے سے زیادہ پُرجوش ہو گئے۔ دانش یزدانی کرین کے اس حصے پر کھڑا ہوا جسے کرین اوپر لے جاسکتی تھی۔ کسی پہلے سے لگائے گئے میکنزم کے ذریعے شیشوں کا ایک چوکور خول اوپر اس طرح اٹھا کہ دانش اس کے اندر ہو گیا۔ کرین اسے اوپر اٹھاتی چلی گئی اور ستر ہزار کے مجمع نے اسے دیکھ لیا۔

شیشے بلٹ پروف تھے اور اس باکس میں کئی مائک بھی لگے ہوئے تھے۔

گراؤنڈ میں کئی جگہ لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر دانش یزدانی کی آواز گونجی۔ ”بہادرو! آپ کا خادم دانش یزدانی حاضر ہو گیا ہے۔ ہمارا یہ سیلاب اب قصرِ صدارت کی طرف بڑھے گا۔ ہم دیکھیں گے کہ اس حکومت کے پاس کتنی گولیاں ہیں اور ہمارے پاس سینے کتنے ہیں۔“

اس بات پر اتنے نعرے لگے کہ سارا گراؤنڈ ایک ”شور“ بن گیا جس میں دانش یزدانی کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

جب یہ شور کچھ کم ہوا تو دانش یزدانی کی آواز پھر گونجی۔ ”ہم ہر قیمت پر آزادی کی شہزادی پشمینہ کو آزاد کرائیں گے اور......“

اس کی آواز پھر دب گئی۔ ”شہزادی پشمینہ، زندہ باد“ کے نعروں سے سارا گراؤنڈ گونج اٹھا۔

ٹی وی چینلز یہ سب کچھ براہِ راست دکھا رہے تھے۔ ہر چینل کے نیوز ریڈر تقریباً چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ سارے شہر میں قیامت کا سماں ہے۔

بہت سے چینلز پر تین تین، چار چار تجزیہ کار موجود تھے۔ دانش یزدانی کی تعریفیں ہو رہی تھیں کہ وہ نہ جانے کیسے گرفتار بھی نہیں ہوا تھا اور سی ایس کے اہلکاروں تک کو چکما دے کر بڑے گراؤنڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یہ خبر بھی نشر ہو رہی تھی کہ گراؤنڈ کو سی ایس اور پولیس کے بیس ہزار مسلح اہلکاروں نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ وہ گراؤنڈ میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والوں پر لاٹھی چارج کر رہے تھے، آنسو گیس اور واٹر کینن کا استعمال بھی ہو رہا تھا لیکن کچھ نہ کچھ لوگ گراؤنڈ میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ سوا نو بجے تک گراؤنڈ میں جمع ہونے والوں کی تعداد اسی ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔

رپورٹرز اپنے اپنے چینلز کو خبریں دے رہے تھے۔ ایک خبر کے مطابق ایک ہزار سے زائد لوگ زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکے تھے اور پچاس سے زیادہ افراد کے ہلاک ہونے کی اطلاع تھی۔

دوسری خبر کے مطابق ایک لاکھ افراد شاہ صاحب کے استقبال کے لیے ائرپورٹ پہنچ چکے تھے۔ اگر راستے بند کرنے کے لیے کنٹینرز نہ لگائے جاتے اور دوسرے ظالمانہ اقدامات نہ کیے جاتے تو وہ تعداد ڈیڑھ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہوتی یا شاید دو لاکھ ہو جاتی۔

ایک خبر یہ بھی تھی کہ صدرِ مملکت نے چیف آف آرمی اسٹاف کو قصرِ صدارت طلب کیا تھا اور نصف گھنٹے تک میٹنگ جاری رہی تھی۔ اس میٹنگ کے بارے میں حکومت یا فوج کی طرف سے کوئی پریس ریلیز جاری نہیں کی گئی تھی۔

ایک ذریعے کے مطابق کہا جا رہا تھا کہ ہجوم کے سامنے سی ایس اور پولیس کے اہلکاروں کی ناکامی کی وجہ سے صدرِ مملکت نے فوج کو حرکت میں لانا چاہا تھا مگر یہ خواہش رنگ نہیں لاسکی تھی۔ چیف آف آرمی اسٹاف نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ایک چوتھائی سے زائد کور کمانڈرز کی ہمدردی اس وقت عوام کے ساتھ تھی لہٰذا اگر باقی کمانڈرز ایکشن لینے پر تیار ہو جاتے تو فوج میں ہی خونریزی ہو جاتی۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے کے باعث چیف آف آرمی اسٹاف صدرِ مملکت کی خواہش کا احترام کرنے سے قاصر تھا۔

ٹی وی مبصرین کے خیال کے مطابق اس وقت تک کئی ہزار افراد کو ہلاک کیا جا چکا ہوتا اگر صدر حیات پر غیر ملکی ذرائع ابلاغ کا دباؤ نہ پڑ جاتا۔ یہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے صدر حیات کے خلاف کسی قدر سخت الفاظ کہے تھے اور کئی بڑے ملکوں کے سربراہوں نے بھی صدر حیات کے اقدامات پر ناخوش ہونے کا اظہار کیا تھا اور ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ اس سلسلے میں یونائٹڈ نیشن کا ہنگامی اجلاس طلب کیا جائے۔ اسی قسم کی بات عالمی ہیومن رائٹس کمیشن کی طرف سے بھی کی گئی تھی۔

انہی سب باتوں کے دباؤ کی وجہ سے صدر حیات نے جنرل چنگیزی کو ہدایت کی تھی کہ ہاتھ ذرا ”ہلکا“ رکھا جائے۔

”ہلکا ہاتھ“ ہونے ہی کی وجہ سے ہلاکتیں اب بڑھ نہیں رہی تھیں۔

پشمینہ حیات کے سلسلے میں حکومت کا یہ موقف بار بار

سامنے آرہا تھا کہ حکومت نے اغوا نہیں کیا۔
لیکن دانش یزدانی اور عوام یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔
انہی حالات میں ٹی وی ہی کے ذریعے حکومت کی یہ پیشکش سامنے آئی کہ عوام جو کچھ چاہتے ہیں، اس سلسلے میں مذاکرات کیے جا سکتے ہیں۔ عوام اپنا نمائندہ وفد قصرِ صدارت بھیجیں لیکن یہ مذاکرات اسی شرط پر ہو سکتے ہیں کہ لوگ اب بڑے گراؤنڈ کی طرف نہ بڑھیں۔ پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں کو بھی ہر قسم کے اقدامات سے روک دیا جائے گا۔
''عوام'' سے حکومت کی مراد دانش یزدانی ہی سے ہو سکتی تھی۔
ٹی وی چینلز پر تبصرے شروع ہو گئے۔ یہ سوال کیا گیا کہ کیا حکومت عوام کے خلاف کوئی خطرناک قدم اٹھانا چاہتی ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ کچھ وقت گزارا جائے؟ اس وقت میں وہ خطرناک اقدام کی تیاریاں کر لیتی۔
لوگوں کی ہلاکتوں کی وجہ سے دانش بہت دکھی ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی سوچنا پڑا کہ اس وقت پارٹی کے دوسرے لوگوں کے خیالات کیا ہوں گے۔ اس نے اس موقع پر مشاورت ضروری سمجھی۔ اس نے اشارہ کیا کہ کرین نیچے کی جائے۔ ساتھ ہی اس نے اپنا موبائل نکالا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس وقت ٹی وی چینلز سے کیا خبریں نشر ہو رہی تھیں۔
کرین جب نیچے پہنچی تو دانش نے موبائل بند کر دیا۔ وہاں پارٹی کے سرکردہ افراد موجود تھے جن میں صدر اسد گیلانی بھی تھا۔
''پہنچ گئے آپ بھی۔'' دانش اسے دیکھ کر خوش ہوا۔
''ضروری تھا کہ مشاورت میں آپ بھی ہوں۔''
ٹی وی چینلز سے مشاورت کی خبر بھی نشر ہو گئی۔
اس مشاورت میں ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا۔ جس کی وجہ مختلف تجاویز تھیں۔ دانش کوشش کر رہا تھا کہ سب ایک بات پر متفق ہو جائیں۔
اسی وقت ہجوم میں سے ایک نوجوان شخص نے دانش وغیرہ کے قریب جانا چاہا لیکن گارڈز نے اسے روک لیا۔
''میں صرف یہ پیغام دانش صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں۔'' اس شخص نے ایک لفافہ دکھایا۔ دانش وغیرہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔
''لفافہ لے لیں اس سے۔'' دانش نے کہا۔
ایک گارڈ نے لفافہ لے لیا اور قریب آ کر دانش کو دیا۔ دانش نے لفافہ چاک کر کے اس میں سے کاغذ نکالا۔ کاغذ پر ہاتھ کی جو تحریر تھی، وہ دانش کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ چونک گیا۔ پھر بھی اس نے سب سے پہلے نیچے لکھا ہوا نام دیکھا۔ وہ نام ''پشمینہ'' تھا۔
خط میں لکھا تھا۔ ''دانش ڈیئر! مجھے اغوا کرنے والے ناکام ہوئے تھے۔ میں اور ڈیبرا انہی کے ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر فرار ہو سکے۔ اب ہم دونوں ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔ ایسا بندوبست بھی ہو گیا ہے کہ میں فوراً تم تک پہنچ سکتی ہوں لیکن مجھے خاصا تیز بخار ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے بڑے یقین سے کہا ہے کہ رات تک بخار ٹوٹ جائے گا۔ میں بخار میں بھی تم تک پہنچ جاتی لیکن ضروری ہے کہ ریلی میں لوگوں کی تعداد اور بڑھ جائے۔ شاہ صاحب کے معتقدین بھی شامل ہو جائیں مگر ابھی میری شاہ صاحب سے فون پر بات ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ ابھی تک کسی ٹی وی نے بھی یہ خبر نشر نہیں کی۔ شاہ صاحب کا طیارہ کسی بڑی ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے پڑوس کے ایک ملک میں اترنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خرابی دور ہونے میں کتنا وقت لگے گا۔ اسی وجہ سے ابھی شاہ صاحب کے معتقدین ریلی میں نہیں آ سکیں گے۔ انہیں شاہ صاحب کا انتظار رہے گا اور وہ ایئرپورٹ پر ہی رکیں گے۔ یہ ایک اچھا موقع ہے کہ حکومت کی پیشکش منظور کر لی جائے۔ صدر حیات کو اگر کسی وجہ سے کچھ وقت گزارنا ہے تو اب ہمیں بھی اس کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ممکن ہے شاہ صاحب کل صبح تک آ سکیں۔ میں بھی بخار اترنے کے بعد کل آ سکوں گی۔ بخار نہ بھی اترا تو آؤں گی۔ فی الحال اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ہمیں بھی کل تک کی مہلت مل جائے تو اچھا ہے۔ ویسے سب سے مشورہ بھی کر لو، جو تم کر ہی رہے ہو۔ پشمینہ۔''
دانش کو محسوس ہوا کہ اس کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ پشمینہ کے بارے میں سوچ اس کے دماغ پر بہت دباؤ ڈالے ہوئے تھی۔
اس نے خط لفافے میں رکھ کر جیب میں ڈال لیا۔ اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ پشمینہ کے بارے میں کسی کو بتائے۔ اس کے خیال میں پشمینہ یہ بات لکھنا بھول گئی تھی کہ یہ بات پوشیدہ رکھ کر حکومت پر یہ دباؤ باقی رکھا جائے کہ اسے حکومت نے اغوا کیا ہے۔
☆☆☆
اسی وقت ٹی وی چینلز سے یہ بریکنگ نیوز چلی کہ شاہ

صاحب کا طیارہ کسی ٹیکنیکل خرابی کے باعث وقت پر نہیں آسکے گا۔ چینلز سے اس ملک کا نام بھی نشر کر دیا گیا جہاں شاہ صاحب کے طیارے نے مجبوراً لینڈ کیا تھا۔

اس خبر نے ان لوگوں کو مضطرب کر دیا جو شاہ صاحب کے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر جمع ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر ٹی وی کی اس خبر کی تصدیق کر لی۔ وہاں فیصلہ یہ کیا گیا کہ جب تک شاہ صاحب کا طیارہ نہیں آجاتا، وہ لوگ ائرپورٹ پر ہی رکیں گے۔

کچھ ہی دیر بعد ٹی وی چینلز سے یہ خبر بھی نشر ہوئی کہ دانش یزدانی نے حکومت کی پیشکش قبول کر لی ہے اور جلد ہی تین آدمیوں کا ایک وفد پارٹی کے صدر اسد گیلانی کی سربراہی میں قصرِ صدارت جائے گا۔

نتیجے میں سی ایس اور پولیس کے جارحانہ اقدامات رک گئے۔ بڑے گراؤنڈ تک پہنچنے کی کوشش کرنے والے بھی راستے میں رک گئے۔ انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ جہاں تک پہنچ گئے ہیں، وہیں رکیں گے، اپنے گھروں کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں نے جارحانہ اقدامات تو روک دیے تھے لیکن جہاں بھی ہجوم تھا، وہ اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑے رہے تھے۔

ٹی وی پر اب یہ تبصرہ شروع ہوا کہ حکومت دانش یزدانی کے وفد کو یرغمال بنا سکتی ہے لیکن زیادہ تر تجزیہ کاروں کے خیال میں حکومت ان حالات کو اس طرح مزید خراب نہیں کرے گی۔

طے پایا تھا کہ مذاکرات قصرِ صدارت میں نہیں بلکہ وزیراعظم ہاؤس میں ہوں گے۔ حکومت کی ترجمانی وزیراعظم، وزیرِ داخلہ اور صدر حیات کے دو مشیر کریں گے۔

مذاکرات کا آغاز دوپہر دو بجے ہوا۔ ری پبلکن فورم کا وفد اسی وقت وزیراعظم ہاؤس پہنچا تھا۔

حکومت اور عوام میں ایک اعتبار سے ''سیز فائر'' بھی ہو گیا تھا لیکن شہر بند ہی رہا۔ جگہ جگہ ہجوم نے پڑاؤ ڈال دیے تھے۔ عام لوگوں نے ان کے لیے دریوں اور شامیانوں کا بندوبست کر دیا تھا لیکن ہجوم اتنا تھا کہ سب لوگوں کے لیے یہ بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اپنے گھروں سے دریاں منگوانی پڑیں۔ دھوپ میں ہی سہی لیکن اس طرح وہ لیٹ بیٹھ تو سکتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ مذاکرات کے کئی دور ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی ملاقات میں سب کچھ طے نہیں ہو جاتا۔

ٹی وی چینلز پر تبصرے جاری رہے۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ صدر حیات کو اتنے شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی اور اسی لیے اس نے مصالحت کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی یا وہ کسی بہت سخت کارروائی کرنے سے پہلے اس کی تیاری کے لیے کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

مذاکرات کے بارے میں سُن گُن لینے کے لیے ٹی وی چینلز اور اخبارات کے نمائندے نہ صرف یہ کہ وزیراعظم ہاؤس کے پاس جمع تھے بلکہ سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے کہ انہیں مذاکرات کے بارے میں کوئی خبر مل جائے کہ وہ کس نہج پر چل رہے تھے۔

مذاکرات دو گھنٹے تک جاری رہے۔ اسد گیلانی اور ان کے ساتھ جانے والے دونوں افراد بڑے گراؤنڈ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ حکومت کی طرف سے یہ نہیں بتایا گیا کہ مذاکرات کن بنیادوں پر ہوئے تھے، بس یہ اعلان کیا گیا تھا کہ مذاکرات کا دوسرا دور پانچ بجے سے ہوگا۔

یہ بات ری پبلکن فورم کی طرف سے سامنے آئی کہ ان کے مطالبات یہ تھے کہ صدرِ مملکت استعفا دیں، عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے، ملک میں صدارتی نظام کے بجائے حقیقی معنوں میں پارلیمانی نظام قائم ہونا چاہیے، یہ نام نہاد پارلیمانی نظام نہیں جس میں سارے اختیارات پس پردہ سہی لیکن صدرِ مملکت کے ہاتھ میں تھے۔ نیز عبوری حکومت کو عام انتخابات کے لیے صرف ایک ماہ کی مہلت دی جائے گی اور پشمینہ حیات کو آزاد کیا جائے۔

ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ کسی ٹی وی چینل کو یہ اقدام کرنے دیا جائے کہ وہ ایک کرین کے ذریعے اپنا کیمرا اوپر لے جا سکے اور دانش یزدانی کو قریب سے دکھایا جا سکے۔

آخری مطالبہ فوراً مان لیا گیا۔ باقی معاملات پر بحث جاری رہی۔ آخر میں طے پایا تھا کہ حکومتی وفد کو یہ مینڈیٹ حاصل نہیں کہ وہ صدر کے استعفے کا مطالبہ تسلیم کر لے۔ حکومت کا یہ موقف بدستور تھا کہ پشمینہ حیات کو اس نے اغوا نہیں کروایا اس لیے آزاد بھی کیسے کر سکتی ہے۔

ری پبلکن فورم کی جانب سے کہا گیا کہ وہ اپنے کسی بھی مطالبے سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

شاہ صاحب نے ایک وڈیو پیغام بھجوایا تھا جو ٹی وی چینلز نے نشر کیا۔ اس میں شاہ صاحب نے کہا تھا کہ جب تک حکومت مطالبات تسلیم نہ کرے، لوگ اپنی اپنی جگہ پر جمے رہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ یہیں کی حکومت کے طیارے سے آ رہے تھے جس کی ٹیکنیکل خرابی ابھی تک دور

نہیں ہو سکی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ ٹیکنیکل خرابی نہیں ہوئی ہے بلکہ اسے صدر حیات کے حکم سے راستے ہی میں رکوا دیا گیا ہے۔ انہوں نے مقامی حکومت سے طیارہ چارٹرڈ کروانا چاہا تھا مگر ان لوگوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی ہے کہ ان کے ملک کے ائرپورٹ پر لوگوں کا جو ہجوم ہے، وہ کسی وقت بھی کچھ کر سکتا ہے اس لیے وہ اپنا کوئی طیارہ خطرات میں نہیں جھونک سکتے۔ نیز یہ کہ یہاں کی حکومت نے بھی انہیں لینے کے لیے دوسرا طیارہ بھیجنے سے معذرت کرتے ہوئے مختلف بہانے تراشے تھے اس لیے اب وہ کسی تیسرے ملک سے طیارہ چارٹرڈ کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ری پبلکن فورم اور حکومت کے مذاکرات کا دوسرا دور پانچ بجے شروع ہوا جس میں یہ مطالبہ بھی شامل کیا گیا کہ حکومت شاہ صاحب کو لانے کے لیے دوسرا طیارہ بھیجے۔

حکومتی وفد نے ان مذاکرات میں کہا تھا کہ صدر استعفا تو نہیں دیں گے لیکن وزیراعظم کو تمام اختیارات سونپ دیں گے اور اسی کے ذریعے عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو ایک ماہ کے اندر انتخابات کرانے کی پابند ہوگی۔ پشمینہ حیات کے سلسلے میں کہا گیا تھا کہ وہ بہت جلد اس کا ثبوت فراہم کر دے گی کہ اس اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں تھا۔

اس طرح دوسرا دور بھی ناکام رہا لیکن یہ طے پایا کہ معاملات سلجھنے کے امکانات ہیں اس لیے تیسرا دور رات کو دس بجے کیا جائے گا۔

ٹی وی چینلز پر تبصرے شروع ہو گئے۔ اس بات پر یقین کیا جانے لگا کہ حکومت کسی وجہ سے وقت گزارنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ قطعی طے ہے کہ صدر کے استعفے کا مطالبہ کسی صورت میں نہیں مانا جائے گا۔

یہ تبصرے غلط نہیں تھے۔ قصرِ صدارت میں وزیراعظم سے کہا جا رہا تھا۔ ''بس ان باتوں میں کسی طرح آج کی رات گزار دو۔ کل صبح حالات پر قابو پانے کے لیے فیصلہ کن اقدام کیا جائے گا۔''

''پریسیڈنٹ سر!'' وزیراعظم نے کہا۔ ''ابھی ابھی یہ تشویش کی خبر سننے میں آئی ہے کہ یونائیٹڈ نیشن نے کل رات ہی ہنگامی اجلاس طلب کر لیا ہے۔''

''کل رات ابھی دور ہے۔'' صدر حیات نے غصے سے کہا۔ ''میں صرف آج رات کی مہلت چاہتا ہوں۔ کیوں چنگیزی؟''

''جی ہاں سر!'' چنگیزی نے جواب دیا۔ ''آج رات معاملات سنبھالنے کی تیاری مکمل کر لی جائے گی۔''

وزیراعظم نے صدر حیات کو یقین دلایا کہ وہ مذاکرات کے تیسرے دور کا اختتام اس بات پر کرے گا کہ آخری اور فیصلہ کن مذاکرات کل صبح سات بجے ہوں گے۔

چنانچہ تیسرے دور میں اسد گیلانی کے وفد سے ڈھائی گھنٹے کی بحث کے بعد کہا گیا کہ اگر وہ لوگ اپنے کسی مطالبے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تو ملک کے حالات درست کرنے کے لیے وزیراعظم خود صدر کو مجبور کرے گا کہ وہ استعفا دے دیں اور پشمینہ کے سلسلے میں کہا گیا کہ اس بارے میں ثبوت حاصل کرنا خاصا دشوار طلب ہو رہا ہے تاہم کل صبح تک وہ ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے بعد آدھی رات کو دانش یزدانی اور اس کے ساتھیوں سے مشاورت شروع ہوئی۔

''صدر حیات کسی وجہ سے صرف وقت گزارنا چاہتا ہے۔'' دانش یزدانی نے کہا۔ ''اور ہمیں بھی اسی کی ضرورت ہے۔ مجھے ایک خاص ذریعے سے فون پر اطلاع ملی ہے کہ شاہ صاحب کچھ بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ صبح چھ بجے تک انہیں کوئی طیارہ مل جائے گا جس سے وہ ساڑھے چھ بجے تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ سارا ہجوم بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔''

وہ رات لوگ ائرپورٹ اور شہر کی سڑکوں پر گزار رہے تھے۔ انہیں کل صبح کے آخری مذاکرات کا انتظار تھا۔ یہ اطلاع انہیں بھی مل چکی تھی کہ شاہ صاحب صبح ساڑھے چھ بجے پہنچ جائیں گے۔

اس رات ملک کے بچوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جو سو سکا ہو۔ سب کی آنکھیں ٹی وی چینلز پر جمی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے کہ کل کیا ہوگا؟

سیاسی جماعتوں کے ہنگامی اجلاس مسلسل جاری تھے۔ اب وہ لوگ ''اتحاد'' بنانے سے زیادہ اس پر غور کر رہے تھے کہ اس احتجاج میں ری پبلکن فورم کے ساتھ شامل ہو جائیں کیونکہ اس کی جیت یقینی معلوم ہونے لگی ہے۔ ساتھ دینے کی صورت میں اس کا امکان تھا کہ آئندہ جو حکومت بنے، اس میں انہیں بھی کچھ حصہ مل جائے۔

صدر حیات اور جنرل چنگیزی کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس رات کیا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

رات کے تین بجے تھے جب سی ایس کے کمانڈوز کا

ایک گروپ جنرل آفتاب کے گھر کا گھیراؤ کر چکا تھا۔

جنرل آفتاب ان کور کمانڈرز میں سرفہرست تھا جن کی ہمدردیاں احتجاج کرنے والے عوام کے ساتھ تھیں اور جن کی وجہ سے چیف آف آرمی اسٹاف فوج کو عوام کے خلاف لانے سے گریزاں تھا۔

سی ایس کے کمانڈوز بے تحاشا فائرنگ کرتے، فوجی محافظوں کو ہلاک کرتے، دروازے کھڑکیاں توڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔

گھر کے دیگر افراد کے علاوہ میجر جنرل آفتاب بھی فائرنگ کی آوازوں سے جاگ گیا تھا اور اس کی بیوی بھی۔

جنرل آفتاب نے ایک ہاتھ سے ریوالور نکالا اور دوسرے ہاتھ سے موبائل فون۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ حملہ آور سی ایس کے لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ موبائل پر اس نے اپنے ہمنوا لیفٹیننٹ جنرل آغا سے رابطہ کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔

اس وقت سی ایس کے کمانڈوز اس کی خواب گاہ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جنرل آفتاب کی بیوی کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

''میرے...... میرے بچے......'' اس کی کپکپاتی روہانسی آواز جنرل آفتاب نے سنی لیکن نظرانداز کر دی۔ وہ موبائل کان سے لگائے ہوئے تھا لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اس سے جنرل آفتاب نے یہی سمجھا کہ جنرل آغا اپنا فون بند کر کے سویا تھا یا حکومت نے سیلولر کمپنیوں کے ذریعے کوئی خرابی کروا دی تھی۔

دوسری مرتبہ جنرل آفتاب نے میجر جنرل حیدر سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اسی وقت کمرے کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔

جنرل آفتاب نے اپنی یقینی موت کا چہرہ دیکھ لیا چنانچہ اس کے ریوالور نے بھی اندر آنے والوں پر اپنا ریوالور خالی کر دینا چاہا لیکن وہ دو کے بعد تیسری گولی نہ چلا سکا۔ ان گنت گولیوں نے اس کا سارا جسم چھلنی کر دیا تھا۔ حملہ آوروں نے یہی سلوک اس کی بیوی کے ساتھ بھی کیا۔ خون میں لت پت ان دونوں کے جسم ایک دوسرے پر گرے۔

گھر کے دوسرے لوگوں کو پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا جن میں جنرل آفتاب کے آٹھ سالہ بیٹے کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔

اسی قسم کے واقعات جنرل آفتاب کے تمام ساتھی کور کمانڈرز کے ساتھ بھی پیش آئے۔ ان میں سے دو کو اغوا کر

کے بھی لے جایا گیا۔ انہیں روح کو لرزا دینے والا تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے تک سی ایس کا یہ آپریشن مکمل ہو چکا تھا جس کی خبر کسی ٹی وی چینل کو نہیں مل سکی تھی اور اگر مل بھی جاتی تو وہ اسے نشر نہ کر پاتے کیونکہ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ رات کے دو بجے کوئی آرڈی نینس جاری کیا گیا تھا۔

میڈیا آرڈی نینس جس کے باعث کوئی ٹی وی چینل ملکی حالات کی خبریں دے سکتا تھا، نہ کسی چینل پر حکومت کے خلاف کوئی بات کہی جا سکتی تھی۔

تمام چینلز ملک کا ایک ادارہ چلا رہا تھا اس لیے جب چند چینلز نے اس آرڈی نینس کی ذرا بھی خلاف ورزی کی، ان کی نشریات بند کر دی گئیں۔ صبح ہونے پر ان کے لائسنس بھی منسوخ کر دیے جاتے۔ ان کے مالکان کے خلاف تادیبی کارروائی بھی ہوتی۔

اس عمل سے ری پبلکن فورم کے ذمے داران میں بھی ہلچل مچ گئی۔

''صدر حیات کوئی بہت خطرناک قدم اٹھانے والا ہے۔'' دانش یزدانی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

پارٹی کے صدر اسد گیلانی نے موبائل پر وزیر داخلہ سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ ''یہ آرڈی نینس مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔'' وزیرِ داخلہ کا جواب تھا۔ ''ان ٹی وی چینلز پر جو تبصرے اور تجزیے ہو رہے تھے، ان سے عام لوگ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو رہے ہوں گے۔ یہ آرڈی نینس ان لوگوں کو ذہنی انتشار سے بچانے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ ہمارے مذاکرات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''

ری پبلکن فورم کے لوگوں کے لیے یہ شافی جواب نہیں تھا۔

''جھوٹ بول رہا ہے وہ!'' اسد گیلانی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اگر صبح کے اخباروں میں حکومت کی خواہش کے خلاف کوئی بات ہوئی تو وہ اخبار پریس سے ہی نہیں نکلنے دیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے کسی نہ کسی بات کو جواز بنا کر سارے ہی چینل بند کر دیے جائیں۔''

''عوام کو اس کے لیے تیار کیا جانا چاہیے۔'' کسی نے کہا۔ ''غیر ملکی چینلز سننے کے لیے ڈش استعمال کی جائے۔''

یہ بات عوام خود سوچ چکے تھے اور جن کے گھروں پر ڈش بیکار پڑی ہوئی تھیں، انہیں دوبارہ ٹی وی سے مربوط کرنے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

پانچ بجے ایک غیر ملکی چینل سے یہ خبر نشر ہوگئی کہ تھوڑی دیر قبل شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تھی کہ طیارے کی ٹیکنیکل خرابی دور ہو چکی ہے لیکن شاہ صاحب نے اسی طیارے سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو انہوں نے چارٹر کیا تھا۔ پانچ بج کر پانچ منٹ پر وہ اس طیارے سے پرواز بھی کر چکے تھے۔ پرواز سے قبل ان سے ایک غیر ملکی نمائندے نے سوال کیا تھا کہ وہ اپنے ہی ملک کے طیارے سے کیوں نہیں جاتے۔

شاہ صاحب کا جواب تھا۔ ''ایک تو یہ کہ وہ طیارہ آچکا ہے جو میں نے چارٹر کیا ہے۔ دوسرے مجھے یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں نے اپنے ملک کے طیارے میں سفر کیا تو ممکن ہے، اس کا پائلٹ حکومت کے حکم سے کسی دوسرے چھوٹے موٹے ائرپورٹ پر لے جا کر اتار دے۔ جو لوگ وہاں میرے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر جمع ہو چکے ہیں، وہ کیا کریں گے۔''

غرضیکہ ائرپورٹ پر آرام کرتے ہوئے لوگ فوراً اٹھ بیٹھے اور پُرجوش نعرہ بازی شروع ہوگئی۔

شاہ صاحب کو پانچ بج کر پینتیس منٹ پر وہاں پہنچنا تھا لیکن ذرا دیر بعد ہی لوگوں نے یہ خبر سنی کہ طیارہ جیسے ہی اپنے ملک کی حدود میں داخل ہوا تھا کہ کسی جانب سے چلائے جانے والے راکٹ نے طیارے کو فضا ہی میں دھماکے سے اُڑا دیا۔

شاہ صاحب کی یقینی موت!

''یہ سی ایس کی کارروائی ہے۔'' کسی چینل نے دانش یزدانی کی آواز لوگوں تک پہنچا دی۔

اس نے مزید بہت کچھ کہا ہوگا لیکن فوراً ہی نہ صرف اس چینل کی بلکہ تمام چینلز کی نشریات بند کر دی گئیں۔

شاہ صاحب کے معتقدین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور ان کی بڑی تعداد نعرے لگاتی ہوئی بڑے گراؤنڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس وقت فوری طور پر سی ایس یا پولیس نے کوئی ایکشن نہیں لیا کیونکہ انہیں قصرِ صدارت سے اس کا حکم نہیں ملا تھا۔ حکم نہ ملنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت چیف آف آرمی اسٹاف نے صدر کا حکم ملنے پر ایک ہیلی کاپٹر میں قصرِ صدارت کا رخ ابھی کیا ہی تھا۔ ان دونوں کی ملاقات ابھی نہیں ہوئی تھی۔

جو طیارہ تباہ ہوا، وہ ایک بڑے مغربی ملک کا تھا۔ اس کے وزیرِ خارجہ نے پانچ منٹ بعد ہی اعلان کر دیا کہ ہم

اس واقعے کو اعلانِ جنگ سمجھ رہے ہیں۔

''یہ بہت خطرناک بات ہوئی ہے پریسیڈنٹ سر!'' آرمی چیف نے ملاقات ہونے پر صدر حیات سے پہلی بات یہی کی۔ ''اس طیارے کو تباہ کروا کے آپ نے ایک اور مصیبت مول لے لی ہے۔''

''یہ میں نے نہیں کروایا۔'' صدر حیات نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ خود ری پبلکن فورم والوں نے کروایا ہوگا تاکہ اس شخص کی موت سے لوگوں کا اشتعال اور بڑھ سکے۔''

آرمی چیف نے اس جواب کو جھوٹ سمجھا ہو یا نہ ہیں، مگر عوام کو یقین تھا کہ یہ سی ایس والوں کی حرکت تھی۔ ان کا غم و غصہ اب جیسے آسمان کو چھو رہا تھا۔ شہر میں پھر ایک طوفان آ گیا۔ صدر حیات کے دو تین مجسمے پہلے ہی گرائے جا چکے تھے، اب باقی مجسمے بھی گرائے جانے لگے۔ سرکاری عمارتوں اور پولیس اسٹیشنوں کو آگ لگائی جانے لگی۔

چھ بج کر کچھ منٹ پر سی ایس اور پولیس کے اہلکار بھی جوابی کارروائی شروع کر چکے تھے۔ سارے شہر میں آنسو گیس، واٹر کین کے علاوہ گولیاں بھی برسائی جانے لگیں۔

شاہ صاحب کی ہلاکت کی خبر سن کر پشمینہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ ڈیبرا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ وہ مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی شاہ صاحب کی انتہائی معتقد تھی۔

پشمینہ نے جذبات میں ڈوبی بھرائی ہوئی آواز میں موبائل فون پر دانش یزدانی سے کہا۔ ''میں ایک گھنٹے کے اندر اندر تم تک پہنچ جاؤں گی۔ اس وقت تک شاہ صاحب کے معتقدین بھی بڑی تعداد میں بڑے گراؤنڈ تک پہنچ چکے ہوں گے۔''

''مگر کیسے؟'' دانش یزدانی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان حالات میں پشمینہ اس تک کیسے پہنچ سکے گی۔ ہر طرف تو قیامت برپا ہو چکی تھی۔

لیکن پشمینہ نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ رابطہ منقطع کر کے اس نے شاہ صاحب کی بیٹی اقصیٰ سے رابطہ کیا جس نے روتے ہوئے کال ریسیو کی۔

''ہمت کرو اقصیٰ!'' پشمینہ نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ ''اب تمہیں ہی شاہ صاحب کی جگہ قیادت سنبھالنی ہوگی۔ بڑے گراؤنڈ کی طرف بڑھو، آج ہی صدر حیات کا روزِ حساب ہے۔''

''ہم اب بڑے گراؤنڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔'' اقصیٰ نے روتے ہوئے جواب دیا۔

شاید وہ بھی اسی الجھن کا شکار ہوتی جو دانش کو لاحق ہوئی تھی مگر اس وقت اس کے دل و دماغ کو باپ کی موت کے صدمے نے گھیر رکھا تھا۔

غیر ملکی ذرائع نے ایک اور خبر بھی نشر کر دی جو ان تک نہ جانے کس نے پہنچائی ہوگی۔ انہوں نے بتا دیا کہ صدر حیات کی نئی قائم کردہ ایجنسی سی ایس نے فوج کے متعدد کور کمانڈرز کو ہلاک کر دیا ہے جن کی تعداد ابھی نہیں معلوم ہو سکی اور نہ یہ معلوم ہوا ہے کہ انہیں کیوں ہلاک کیا گیا ہے۔

لیکن دانش یزدانی جانتا تھا کہ انہیں ہی ہلاک کرنے کے لیے صدر حیات نے مذاکرات کی آڑ میں وقت گزارا تھا۔

پشمینہ سے دانش کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ کچھ کور کمانڈرز کی ہمدردیاں عوام کے ساتھ تھیں اس لیے فوج کو عوام کے خلاف کھڑا کرنا صدر حیات کے لیے مشکل تھا۔ ان کور کمانڈرز کو ختم کروا کے صدر حیات نے اپنے لیے راہ ہموار کر لی تھی۔

لیکن دانش کو ابھی تک کہیں سے اطلاع نہیں ملی تھی کہ فوج عوام کے سامنے آئی ہو۔ اس کی وجہ اس کے سامنے آ بھی نہیں سکتی تھی۔

شاہ صاحب کے طیارے کی تباہی کے آدھے گھنٹے بعد ہی آرمی چیف صدر حیات کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

''پریسیڈنٹ سر! اب اگر فوج کو عوام کے خلاف کھڑا کیا گیا تو صورتِ حال بہت زیادہ خراب ہو جائے گی۔ اس طیارے کی تباہی نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس ملک کے وزیر خارجہ نے یہ اعلان کر ہی دیا تھا کہ اس واقعے کو اعلانِ جنگ سمجھا جائے گا لیکن ابھی جب میں آپ کے پاس آ رہا تھا تو اس ملک کے آرمی چیف نے مجھے فون کیا تھا۔ اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔ اس نے کہا کہ اب اگر فوج نے عوام کو کچلنا چاہا تو اس میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جائے گا کہ طیارے کو تباہ کرنے کی سازش میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ اس صورت میں وہ جلد ہی اپنی فوج بھی یہاں اتار دے گا اور اس اقدام میں اسے یو این او کی حمایت حاصل ہوگی۔ اس کے طیارے ہمارے فوجی اڈوں پر بمباری بھی شروع کر دیں گے اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ آج کے یو این او کے ہنگامی اجلاس میں یہ قرارداد بھی منظور کر لی جائے گی کہ یہاں کے عوام کی مدد کے لیے یو این او کی فوج بھی یہاں بھیج دی جائے۔ اب آپ جو حکم دیں، میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس اس کے لیے تیار

رہے گا کہ پھر ہمیں ایک بڑی طاقت سے جنگ کے لیے بھی تیار ہونا پڑے گا لیکن کیا ہم اس سے ٹکرا سکیں گے؟''

صدر حیات نے اس کی آدھی سے زیادہ باتیں غصے میں ٹہلتے ہوئے سنی تھیں۔ آرمی چیف کے خاموش ہوتے ہی وہ گرج کر بولا۔ ''یہ میرا حکم ہے کہ عوامی بغاوت کو سختی سے کچل دو۔ یہ میرا ملک ہے۔ میں یہاں جو چاہوں، کروں۔ ساری دنیا بھی میری مخالف ہو جائے گی تو میں لڑوں گا۔''

صدر حیات کی عقل اس وقت غصے کی آگ کا ایندھن بن چکی تھی۔

اس کے حکم سے آرمی چیف کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ تاہم اس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''پریسیڈنٹ سر! میں نے جو بھی یہ کہا تھا کہ آپ جو حکم دیں، وہ کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن یہ میں نے آپ کے احترام میں کہا تھا۔ میں جو حلف اٹھا چکا ہوں، اس سے انحراف نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی بقا کے لیے حلف اٹھایا تھا۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے ہی کسی اقدام کی وجہ سے یہ ملک تباہ ہو جائے۔ اور اس ملک کی عوام بے موت مارے جائیں۔''

''جنرل!'' صدر حیات بہت زور سے گرجا تھا۔ ''تم بھول رہے ہو کہ تم پر میرے کتنے احسانات ہیں۔''

''انہی کے بوجھ سے تو دبا ہوا ہوں سر!'' جنرل نے اب بھی تحمل سے جواب دیا۔ ''میں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے سے معذور ہوں تو آپ مجھے معطل کر دیجیے! میری جگہ کسی اور کو لے آیئے! اگر آپ مجھے معطل نہیں کرنا چاہیں گے تو میں خود اسی وقت استعفا دینے کے لیے تیار ہوں۔''

اس وقت ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صدر حیات اس سے فوراً استعفا مانگ لیتا لیکن غصے کی شدت اتنی ہو چکی تھی کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ بھی نہیں کر سکا جو شاید اس کے حق میں جاتا۔ اس نے غصے سے گرج کر حکم صادر کیا۔ ''تم جا سکتے ہو!''

آرمی چیف مزید کچھ کہے بغیر اٹھا اور سلام کر کے کمرے سے چلا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ ابھی تک عوام کو فوج کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، صرف سی ایس اور پولیس کے اہلکاروں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود غیر ملکی ذرائع یہ خبر نشر کر رہے تھے کہ حکومت کے خلاف اٹھنے والے طوفان میں ہزاروں افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

جن لوگوں کے گھروں پر ڈش تھی، وہ ذرائع ابلاغ کی خبریں سن رہے تھے اور فون کے ذریعے دوسرے لوگوں کو اطلاع دے رہے تھے۔ اس طرح دو خبریں ہر طرف پھیل رہی تھیں۔

دانش یزدانی نے یہ خبر بھی سنی کہ صدر حیات اور آرمی چیف کی ملاقات ہوئی تھی جس کے بعد اب آرمی چیف کی صدارت میں کور کمانڈرز کا ہنگامی اجلاس ہو رہا تھا۔

''ہم اب فوج سے بھی ٹکر لیں گے۔'' یزدانی نے جوش میں اعلان کیا۔ اسے حقیقت کا علم بہرحال نہیں تھا۔ ''ہمیں خون کے آخری قطرے تک اپنی آزادی اور جمہوریت کی بقا کی جنگ لڑنی ہے۔ فوج نے اگر مارشل لا لگایا تو ہم اس کے سامنے سینہ سپر ہوں گے۔''

اسی وقت ہجوم نے دیکھا کہ فضا میں ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا تھا۔ وہ تیزی سے کرین کے اس بلند پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں دانش یزدانی کھڑا ہوا تھا۔

ہر طرف بے چینی پھیل گئی۔ لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ حکومت نے دانش یزدانی کو ختم کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجا ہے۔

خاصے لوگوں کے پاس کلاشنکوف اور اس قسم کا دیگر اسلحہ بھی تھا جو اٹھا لیا گیا تاکہ ہیلی کاپٹر پر گولیاں برسا سکیں۔

اس وقت ضروری تھا کہ کرین، دانش یزدانی کو نیچے لے آتی۔ کرین کو اوپر لے جانے یا نیچے لانے کا میکنزم نیچے ہی تھا لیکن اس کے ذمے دار اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے تھے جب تک انہیں دانش یزدانی کا حکم نہ ملے۔ اسی لیے پارٹی کے صدر اسد گیلانی نے موبائل پر دانش سے رابطہ کرنا چاہا لیکن لائن انگیج تھی۔ اسد گیلانی نے جب نمبر ملانے کے بعد اوپر دیکھا تھا تو دانش موبائل نکال کر اپنے کان سے لگا چکا تھا۔

''یہ میں ہوں دانش، ہیلی کاپٹر میں۔'' دانش کو پشمینہ کی آواز سنائی دی تھی۔ ''میں اور ڈیبرا آ رہے ہیں۔ کسی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی۔ کہیں تم ہیلی کاپٹر پر فائرنگ نہ شروع کر دینا۔''

دانش حیران رہ گیا کہ پشمینہ کو ہیلی کاپٹر کہاں سے مل گیا، لیکن اسے اس پر غور کرنے کی مہلت حاصل نہیں تھی۔ اس نے لوگوں کو اسلحہ سنبھالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً اعلان کیا۔

''کوئی فائرنگ نہ کرے۔ کوئی فائر نہ کرے۔ ہیلی کاپٹر میں پشمینہ حیات آ رہی ہیں۔ وہ حکومت کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔''

اسے یہ ڈراما جاری رکھنا تھا کہ پشمینہ کو حکومت ہی نے

اغوا کروایا تھا۔

پشمینہ حیات کا نام سنتے ہی اسلحہ نیچے کرلیا گیا اور سارا گراؤنڈ پشمینہ حیات ''زندہ باد'' کے نعروں سے گونجنے لگا۔

☆☆☆

پشمینہ نے رات ہی کو سمجھ لیا تھا کہ شہر میں جو حالات تھے، وہ صبح تک مزید خراب ہوجاتے۔ بڑے گراؤنڈ تک پہنچنا اس کے لیے مشکل ہوجاتا۔

وہ بخار میں مبتلا ہوئی تھی تو اقصیٰ کے فلاحی ادارے کے ایک ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرکے اسے دوا دی تھی۔

اس مسئلے پر مشاورت ہوئی کہ پشمینہ بڑے گراؤنڈ تک کس طرح پہنچ سکتی ہے۔ اس وقت اقصیٰ وہیں تھی اور مشاورت میں شامل تھی۔ اسی نے ایک ائروکلب سے رابطہ کرکے پشمینہ کے لیے ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیا تھا۔

ائروکلب والے اس کے لیے فوراً تیار ہوگئے تھے۔

اس وقت سارے ملک کی یہی حالت تھی۔ سبھی صدر حیات کے خلاف ہوچکے تھے اور ان کی آخری امید پشمینہ ہی سے وابستہ تھی۔ صرف صدر کا مراعات یافتہ طبقہ ہی اس وقت عوام کے خلاف تھا۔

اقصیٰ کو ائرپورٹ جانے والی ریلی کی قیادت کے لیے جانا تھا اس لیے پشمینہ اور ڈیبرا کو لینے کے لیے اسی وقت ہیلی کاپٹر منگوالیا گیا تھا۔ ڈیبرا اور پشمینہ اسی وقت ائروکلب منتقل ہوگئی تھیں۔ پشمینہ اسی وقت منتقلی چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اس کا بخار جلد اتر گیا تو وہ فوراً ہی بڑے گراؤنڈ کی طرف روانہ ہوجائے گی لیکن صبح تک بھی اس کا بخار پوری طرح نہیں اترا تھا۔ اسے حرارت باقی رہی تھی جب اس نے شاہ صاحب کے طیارے کی تباہی کی خبر سننے کے بعد اسی حالت میں بڑے گراؤنڈ پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جس وقت اس کا ہیلی کاپٹر دانش یزدانی کی کرین کی طرف بڑھ رہا تھا، اس وقت تک ایک ہجوم نے حکومت کے اس ادارے پر قبضہ کرلیا تھا جہاں سے ٹی وی چینلز کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے تمام ٹی وی چینلز کی نشریات بحال کردی تھیں اور انہوں نے میڈیا آرڈی نینس کی پروا کیے بغیر اپنا کام شروع کردیا تھا۔ صورتِ حال ایسی بن چکی تھی کہ بہت بڑی اکثریت اپنی زندگی قربان کرنے کے لیے تیار ہوچکی تھی۔

ٹی وی چینلز نے پشمینہ اور ڈیبرا کو ہیلی کاپٹر سے کرین پر اترتے ہوئے بھی دکھایا۔ انہیں اتار کر ہیلی کاپٹر واپس چلا گیا تھا۔

اب دانش کے بجائے پشمینہ کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجنے لگی۔ اس وقت تک شاہ صاحب کے معتقدین کی بڑی تعداد بھی بڑے گراؤنڈ میں پہنچ چکی تھی۔ وہ گراؤنڈ جو ایک لاکھ آدمیوں کے لیے تھا، وہاں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ جمع ہوچکے تھے اور سڑکوں پر تو مار دھاڑ کا سلسلہ جاری ہی تھا۔

اب ایک خبر یہ بھی چل رہی تھی کہ گھروں میں بیٹھے ہوئے لوگ جن کے پاس اسلحے کا لائسنس تھا، وہ بھی اسلحہ لے کر میدان میں آگئے تھے اور جن نوجوانوں کے پاس لائسنس نہیں تھا، وہ بھی اپنے بڑوں کا اسلحہ لے کر گھروں سے نکل پڑے تھے۔ نتیجے میں اب پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں پر بھی گولیاں چل رہی تھیں۔ اس وقت تک کی اطلاع کے مطابق سی ایس کے پانچ اور پولیس کے تین اہلکار مارے جاچکے تھے جن میں سی ایس کے دو افسران بھی شامل تھے اور صدر سے اس صورتِ حال کے بارے میں بات کرنے کے لیے جنرل چنگیزی قصرِ صدارت پہنچ گیا تھا۔

''اب کوئی بہت سخت قدم اٹھانا پڑے گا پریسیڈنٹ سر!'' اس نے صدر حیات سے کہا تھا جس کی آنکھوں کی سرخی بتارہی تھی کہ وہ رات سے اب تک نہیں سویا تھا اور غصے میں بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ صدر حیات جواب میں کچھ کہتا، اس کے ملٹری سیکریٹری نے اطلاع دی کہ آرمی چیف قصرِ صدارت آنے کی اجازت چاہتا ہے۔

''آنے دو!'' صدر حیات نے اس سے کہا۔

ملٹری سیکریٹری کمرے سے رخصت ہوا تو صدر نے کہا۔ ''کور کمانڈرز کا اجلاس ہوا تھا۔ اب سارے کور کمانڈرز ہماری حمایت میں ہیں۔ جنرل صاحب پر دباؤ پڑ گیا ہوگا۔'' غصے کے باوجود صدر حیات کے ہونٹوں پر ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ آگئی۔ ''اب وہ یہ اجازت لینے آرہا ہوگا کہ سڑکوں پر کس حد تک لاشیں بچھائی جاسکتی ہیں۔''

جنرل چنگیزی نے سر ہلایا۔ وہ بھی کچھ خوش دکھائی دیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''میرے لیے اب کیا حکم ہے؟''

''تم ابھی باہر بیٹھو۔ انتظار کرو۔ پہلے میں اس سے ملاقات کرلوں۔ امکان ہے کہ اب سی ایس کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔''

''حالات کے بارے میں آپ کو تفصیلی رپورٹ دینا ہے مجھے۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ......''

''سب معلوم ہے مجھے۔'' صدر حیات نے جھنجلا کر

اس کی بات کاٹ دی۔ حالانکہ اسے حالات کا صحیح طور پر علم نہیں تھا۔ جب سے ملک کے چینلز نے نشریات شروع کی تھیں، اس نے طیش میں آکر ٹی وی ہی بند کر دیا تھا۔

جنرل چنگیزی سر ہلا کر کمرے سے نکل گیا۔

آرمی چیف کا ہیلی کاپٹر پچیس منٹ میں قصرِ صدارت پہنچ گیا اور پانچ منٹ گزرنے سے پہلے وہ صدر حیات کے سامنے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، صدر حیات بول پڑا۔ ''کسی بات کی اجازت لینے کے لیے تمہیں میرے پاس آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مجھ سے پوچھے بغیر تم ہر قدم اٹھا سکتے ہو۔ یہ بغاوت ہر صورت میں کچلنا ہے۔''

''میں یہ عرض کرنے آیا تھا سر، کہ اب فوج بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی لہٰذا......''

''کیا؟'' صدر حیات یک بہ یک بول اٹھا۔ یقیناً اس کے دماغ کو اچھا خاصا جھٹکا لگا ہوگا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اب کیا رکاوٹ ہے؟ ان کور کمانڈرز کو ختم کیا جا چکا ہے جو تمہارے راستے کی رکاوٹ تھے۔''

''لیکن اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ شاید ہی کوئی شہر بچا ہو جہاں لوگ سڑکوں پر نہ آگئے ہوں۔ کور کمانڈرز اپنی بے بسی کا اظہار کر چکے ہیں۔ طوفان بہت شدت اختیار کر چکا ہے۔ ہزاروں لاشیں بچھا دی جائیں، تب بھی طوفان اب نہیں رکے گا۔''

''تو لاکھوں لاشیں بچھا دو۔'' صدر حیات شاید پاگل ہوا جا رہا تھا۔

''میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ اب کور کمانڈرز میرا یہ حکم نہیں مانیں گے۔''

''تو پھر کیوں آئے تھے؟'' صدر حیات کا اشتعال اور بڑھا۔

''میں بس آپ کے احسانات کا کچھ لحاظ کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کا انتظام کردوں گا کہ اب آپ اپنی فیملی کے ساتھ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ کئی......''

''تم جا سکتے ہو۔'' صدر حیات جھتے سے اکھڑ گیا۔

اس کے باوجود آرمی چیف نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ ''کئی ملک ایسے ہیں جہاں آپ کو سیاسی پناہ مل سکتی ہے۔''

''میں نے کہا تھا، تم جا سکتے ہو۔'' صدر حیات نے گرج کر کہا۔

اپنی اتنی اہانت کے باعث آرمی چیف کا چہرہ سرخ ہو گیا، تاہم اس نے اب بھی تحمل کا ثبوت دیا اور اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''چنگیزی!'' صدر حیات چیخا۔

جنرل چنگیزی فوراً حاضر ہو گیا۔

''وہ احسان فراموش اپنی بے بسی کا اظہار کر کے گیا ہے۔'' صدر حیات نے اس سے کہا۔ ''لیکن مجھے امید ہے کہ تم احسان فراموشی کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔''

''حکم دیجیے سر۔'' کرنل چنگیزی نے سعادت مندی سے کہا۔

''جو اس بغاوت کا مرکز بن گیا ہے اسے تباہ کر دو۔'' صدر حیات نے کہا۔ ''تمہارے پاس ہیلی کاپٹر تو ہیں۔ بڑے گراؤنڈ پر دستی بموں کی بارش کر دو۔ وہاں جتنے ہیں سب کو ختم کر دو۔''

''میں آپ کو مکمل حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا سر! آپ نے میری بات ہی نہیں سنی۔ پشمینہ صاحبہ بھی گراؤنڈ پہنچ چکی ہیں۔''

''کیا؟'' صدر حیات چونک پڑا۔ ''یہ کیسے؟''

''یہ تو ابھی میرے علم میں نہیں آسکا۔ ابھی آپ ٹی وی... کھولیں تو دیکھیں گے کہ دانش یزدانی کے ساتھ پشمینہ صاحبہ بھی پہنچ چکی ہیں۔''

''مت کہو اسے صاحبہ!......صرف پشمینہ کہو۔ وہ اب بس ایک غدار ہے۔''

''اگر دستی بم برسائے گئے تو وہ بھی......''

''مر جانے دو اسے بھی۔'' صدر حیات نے اس کی بات کاٹی۔

اسی وقت صدر کی بیوی روبینہ حیات اندر آئی حالانکہ اسے قصرِ صدارت کے اس حصے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

''کیا تم مجھے گولی مارنے آئی ہو؟'' صدر حیات نے تیزی سے کہا۔

جنرل چنگیزی دم بخود رہ گیا تھا۔

''میں اپنے ہاتھوں سے اپنا سہاگ نہیں اجاڑ سکتی۔'' روبینہ حیات نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جب سے حالات بگڑنا شروع ہوئے ہیں، میں نے یہ ریوالور اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا تھا۔ پشمینہ کے بارے میں کوئی بری خبر سنتے ہی میں خود کو ہلاک کر دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ آج جب سے آپ جنون کی حالت میں آئے ہیں، میں یہاں ہونے والی باتوں سے بے خبر نہیں رہی ہوں۔ ابھی آپ نے جنرل چنگیزی کو حکم دیا ہے کہ وہ پشمینہ کی ہلاکت کی بھی پروانہ کرے کیونکہ وہ اب آپ کی بیٹی نہیں

رہی، صرف غدار ہے۔"

"ہاں ہاں، وہ غدار ہے۔"

"لیکن میری بیٹی وہ اب بھی ہے۔ آپ نے ابھی جنرل کو جو حکم دیا ہے، اسے واپس لیجیے...... اگر آپ وہ حکم واپس نہیں لیں گے تو میں اسی وقت خود کو گولی مارلوں گی۔ میں اپنی بچی کی ہلاکت کی خبر سننے کے لیے زندہ نہیں رہوں گی۔" روبینہ حیات کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

صدر حیات نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر ہم نے کوئی سخت قدم نہ اٹھایا تو یہ کتے ہمارے محل میں آگ لگادیں گے۔"

"آپ اپنے عوام کو کتے کہہ رہے ہیں؟"

"اور کیا کہوں؟ یہ سارے ملک کو بھنبھوڑنے پر تُل گئے ہیں۔ یہ ہمارے محل کو بھی آگ لگادیں گے۔" صدر حیات نے دہرایا۔

"تو میں کسی ہندو عورت کی طرح آپ کے ساتھ ستی ہوجاؤں گی۔" روبینہ حیات نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تم پاگل ہوگئی ہو، آخر کیا کروں میں؟"

"کچھ بھی کریں۔ میری بچی پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔"

صدر حیات نے جھٹکے سے سر گھما کر جنرل چنگیزی کی طرف دیکھا۔ "تم جاؤ جنرل۔"

"پہلے آپ جنرل سے اپنا حکم واپس لیں۔" روبینہ حیات نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔

صدر حیات دانت پیسنے لگا۔ جنرل چنگیزی کے چہرے پر بے بسی تھی۔ صدر حیات غصے کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ روبینہ حیات ریوالور کی نال بدستور اپنی کنپٹی سے لگائے ہوئے تھی۔

آخر صدر حیات نے چنگیزی کی طرف دیکھ کر روبینہ حیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ آگ میں جھلس گئیں، تب ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ تم جاؤ۔ بس اس باغی لڑکی کو چھوڑ کر جو بھی ممکن ہو، وہ کرو۔ وہ باغی ان کی بیٹی ہے۔" صدر حیات نے ایک جھٹکے سے روبینہ حیات کی طرف انگلی اٹھائی۔

گویا اس نے پنا پہلا حکم واپس لے لیا تھا جس کا صریح مطلب یہ تھا کہ ابھی اس کے پاگل ہوجانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی۔

چنگیزی جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ خود اس کا بھی یہی خیال تھا کہ ان بگڑے ہوئے حالات میں پشمینہ کو کچھ ہوا تو وہ جلتی پر تیل کا کام کرے گا، لیکن یہ اب اس کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ اس کے لیے کیا کرنا ممکن ہے۔ ابتدا میں اسے خود پر بڑا اعتماد تھا کہ وہ سب کچھ سنبھال لے گا لیکن اب اس کا وہ اعتماد چکنا چور ہوچکا تھا۔ اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اس نے حکم جاری کیا کہ قصرِ صدارت اور سی ایس کے ہیڈ کوارٹر کے گرد مشین گنیں اس طرح لگا دی جائیں کہ دو مشین گنوں کے درمیان پچاس فٹ سے زیادہ فاصلہ نہ ہو اور جب ہجوم وہاں پہنچ جائے تو مشین گنوں کے دہانے ان پر کھول دیے جائیں۔

لیکن یہ حکم جاری کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ اس نے ایک ہیلی کاپٹر بھی اپنے گھر بھیج دیا کہ وہ اس کے بیوی بچوں کو سی ایس کے ہیڈ کوارٹر لے آئے۔ وہ خود بھی ہیلی کاپٹر سے قصرِ صدارت گیا اور آیا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر کار کا استعمال ممکن ہی نہیں رہا تھا۔

دوسری طرف کور کمانڈر کا ہنگامی اجلاس پھر شروع ہوچکا تھا۔ چند کور کمانڈرز نے خیال ظاہر کیا کہ صدر حیات کو سبکدوش کر کے مارشل لا لگا دیا جائے۔

"نہیں۔" چیف آف آرمی اسٹاف نے اختلاف کیا۔ "جمہوریت ختم نہیں ہونا چاہیے۔ صدر حیات کو اب عوام کا ریلا ہی بہا لے جائے گا۔ ہمیں اب دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں کچھ اور لائحہ عمل بنانا ہوگا۔ کچھ نکات میرے دماغ میں آئے ہیں۔" اس نے یہ بھی بتایا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر فضائیہ اور بحریہ کے چیف بھی اس میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے آرہے ہیں۔

اسی وقت آرمی چیف کے لیے ایک اہم کال آئی۔ وہ اس ملک کے ڈیفنس منسٹر کی تھی جس کے طیارے کی تباہی کے سبب شاہ صاحب کی ہلاکت ہوئی تھی۔

کال ریسیو کرتے وقت آرمی چیف کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے وہ کال کور کمانڈرز کے سامنے ہی ریسیو کی تھی۔

☆☆☆

قصرِ صدارت کی طرف جانے والی ریلی کو صبح دس بجے بڑے گراؤنڈ سے روانہ ہونا تھا لیکن اس کی روانگی دو بجے سے پہلے نہ ہوسکی بلکہ دو بج کر دس منٹ ہوچکے تھے جب وہ کرین حرکت میں آئی جس کے اوپر بنے ہوئے پلیٹ فارم پر پشمینہ، ڈیبرا اور دانش کے ساتھ اسد گیلانی بھی تھا۔ اس سے زیادہ افراد اس چھوٹے سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو بھی نہیں سکتے تھے۔

روانگی سے قبل پشمینہ نے اعلان کر دیا تھا کہ پہلے کرین، گراؤنڈ سے نکلے گی، اس کے بعد وہاں جمع ہونے والے۔ لوگوں نے اس کی بات مان لی تھی۔ پشمینہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ریلی کی قیادت وہی کرے گی لیکن گراؤنڈ کے باہر جمع ہونے والوں اور اِدھر اُدھر سے آنے والے ہزاروں افراد کی وجہ سے کرین ان کے بیچ میں آ گئی۔

ایک ٹی وی چینل کی کرین اس کرین کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کرین پر موجود ٹی وی چینل کا کیمرا ہجوم کے علاوہ پشمینہ کے شیشے کا کیبن بھی قریب سے دکھا رہا تھا۔ لوگوں کے خیال کے مطابق اب وہی ان کی نجات دہندہ تھی۔

اس وقت تک شاہ صاحب کے معتقدین بھی ریلی میں شامل ہو چکے تھے اور دیگر سیاسی جماعتوں کے کارکنان بھی اس ریلی کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ غالباً ایک تاریخ ساز ریلی تھی۔ اس سے پہلے اتنی بڑی ریلی نہیں نکلی تھی۔

جو ٹی وی چینلز اپنی ''تجزیاتی نشریات'' بھی جاری رکھے ہوئے تھے، ان میں سے بعض کا کہنا تھا کہ ریلی میں دس لاکھ سے زیادہ لوگ تھے اور بعض لوگ پندرہ لاکھ سے زیادہ بتا رہے تھے۔ صحیح اندازہ لگانا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔

اس وقت سارے ملک میں ہی لوگوں کا طوفان آیا ہوا تھا اور ہر جگہ سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ فائرنگ سے سی ایس اور پولیس کے چالیس سے زیادہ اہلکار ہلاک ہو چکے تھے۔ عوام میں سے مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

خبر کے مطابق صدر حیات کے بیٹے آفتاب کی ملک بھر میں پھیلی ہوئی تمام انڈسٹریز ایک ایک کر کے سبھی نذرِ آتش کی جا چکی تھیں۔

''لیکن......'' پشمینہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''جن سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی جا رہی ہے وہ تو ہمارے ملک ہی کا نقصان ہے۔'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''جب ہجوم مشتعل ہوتا ہے تو اسے ان باتوں کا خیال نہیں رہتا۔'' دانش یزدانی نے جواب میں کہا۔

اسی وقت فضا میں چار ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے۔ پشمینہ اعلان کر چکی تھی کہ ان ہیلی کاپٹرز پر کوئی گولی نہ چلائے کیونکہ ان ہیلی کاپٹرز میں عوام کے لیے اسلحہ آ رہا ہے۔

یہ اسلحہ کہاں سے آ رہا تھا؟ یہ پشمینہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہیلی کاپٹرز پر کسی ملک کا نشان نہیں تھا۔

شہر کے چار مختلف حصوں میں ان ہیلی کاپٹرز نے پیرا شوٹ کی مدد سے بڑے بڑے تھیلے اتار دیے۔ اگر پیرا شوٹ استعمال نہ کیے جاتے تو وہ وزنی تھیلے ہجوم کے کچھ لوگوں کی ہلاکت اور زخمی ہونے کا سبب بنتے۔

ان تھیلوں میں جدید ترین اسلحہ تھا جس میں ہلکی مشین گنیں بھی شامل تھیں۔

ٹی وی چینلز انہیں ''پُراسرار ہیلی کاپٹر'' قرار دے رہے تھے۔ ان ہیلی کاپٹرز کی آمد سے خاصی دیر پہلے پشمینہ نے آرمی چیف کی کال ریسیو کی تھی۔

''محترمہ پشمینہ صاحبہ!'' اس نے کہا تھا۔ ''طیارے کی تباہی کو ہمارے ملک کی طرف سے اعلانِ جنگ قرار دیا گیا تھا۔ ابھی وہاں کے ڈیفنس منسٹر نے مجھ سے بات کی تھی۔ وہاں میٹنگ میں فیصلہ ہوا ہے کہ یو این او کے کسی فیصلے سے پہلے وہ ملک کوئی قدم نہ اٹھائے لیکن اس ملک نے یہ فیصلہ ضرور کیا ہے کہ عوام کو ہتھیار فراہم کیے جائیں۔ وہ ملک ہیلی کاپٹر میں اسلحہ بھیج رہا ہے۔ پڑوس کے ایک ملک نے اپنا ایک چھوٹا ہوائی اڈا اسے دے دیا ہے۔ ہیلی کاپٹر وہاں سے پرواز کر کے آئیں گے۔ ان پر کوئی فائر نہ کرے۔ وہ چاروں ہیلی کاپٹرز اسلحہ اتار کر جائیں گے اور مزید اسلحہ لے کر آئیں گے۔ یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ طیارے کی تباہی کے ذمّے دار صرف صدر حیات ہیں اور ان کی حکومت کا خاتمہ عوام ہی کر دیں گے لہٰذا جس حد تک بھی ممکن ہو، انہیں ہر قسم کی امداد پہنچائی جائے۔''

لیکن وہ اسلحہ فوری طور پر عوام کے کام نہ آ سکا۔ ٹی وی کی خبروں کے مطابق سی ایس اور پولیس شہر سے غائب ہو گئی تھی لیکن سی ایس کے ہیڈ کوارٹر اور قصرِ صدارت کے گرد بھاری مشین گنیں نصب کی جا رہی تھیں۔ اسی لیے یہ اندیشہ تھا کہ اگر لوگوں نے ان دونوں مقامات پر حملہ کرنا چاہا تو ہزاروں افراد مارے جا سکتے ہیں۔

''سفاکی کی انتہا ہو گئی ہے۔'' دانش نے دانت پیسے۔

''مگر لوگوں کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ اب کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔'' پارٹی کے صدر اسد گیلانی نے کہا۔ ''وہ مشین گنیں بھی اس عوامی ریلے کو ہرگز نہیں روک سکیں گی۔ خون خواہ کتنا بھی بہہ جائے۔''

ڈیرا نے پشمینہ کی طرف دیکھا جو کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور کچھ پریشان بھی معلوم ہو رہی تھی۔

''ہجوم کی وجہ سے کرین کی رفتار بہت سست ہے۔''

دانش بولا۔ ہم کل صبح سے پہلے قصرِ صدارت نہیں پہنچ سکتے البتہ ہجوم پہلے پہنچ جائے گا۔''

''قصرِ صدارت کی آتش زدگی یقینی ہے۔'' اسد گیلانی نے کہا۔

یہی بات پشمینہ کے دماغ میں بھی چکرا رہی تھی۔

''وہاں میری ماں اور بھائی بھی ہیں۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''یہ تو میں برداشت نہیں کرسکوں گی کہ وہ بھی اس آگ میں جھلس جائیں۔''

''لیکن اب اس ہجوم کو روکا نہیں جاسکتا۔'' دانش نے خیال ظاہر کیا۔

''قصرِ صدارت میں اس وقت صرف یہی دو افراد میری حمایت میں ہیں۔'' پشمینہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ ''میں اگر ان دونوں کو نہیں تو کم از کم اپنی ماں کو تو ضرور بچانا چاہوں گی۔''

''مگر کیسے میڈم!'' اسد گیلانی بولا۔

''بس یہی پریشانی تو لاحق ہے مجھے اس وقت۔''

دانش اور اسد گیلانی فکرمندی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ ڈیبرا کا چہرہ اس وقت سپاٹ نظر آرہا تھا لیکن اس کے وجود میں ہیجان برپا تھا۔ وہ پشمینہ کے جذبات تو سمجھ ہی رہی تھی لیکن اسے خود بھی روبینہ حیات سے بہت لگاؤ تھا۔

''کرین نیچے کراؤ دانش۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''اگر میں نے کچھ دیر آرام نہیں کیا تو طبیعت اور خراب ہوجائے گی۔ دوا بھی کھانا ہے۔''

دانش نے فوراً کرین نیچے کروائی۔ پلیٹ فارم سے نیچے اترنے کے بعد پشمینہ نے کہا۔ ''بس اب کرین اوپر لے جاؤ! ضروری ہے کہ ہجوم کو تم لوگ نظر آتے رہو۔''

تھرمامیٹر ہے نا تمہارے پاس؟'' دانش نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''مجھے فون پر بتادینا کہ اب کتنا ٹمپریچر ہے۔''

پشمینہ نے سر ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ڈیبرا بھی کرین کے پلیٹ فارم سے اتر آئی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ پشمینہ کو اکیلا چھوڑ دیتی۔

کرین کی گاڑی پر ایک بستر لگا کر اس کے آگے پردہ لگا دیا گیا تھا اور پشمینہ کے لیے یہ بندوبست دانش ہی نے کروایا تھا۔

ہجوم نے پشمینہ کو نیچے دیکھ کر زور زور سے نعرے لگانا شروع کردیے۔ پشمینہ ان سب کی طرف دیکھتی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی پردے کے پیچھے جاکر بستر پر لیٹ گئی۔ ڈیبرا نے فوراً دوا نکال کر اسے دی۔

پشمینہ نے دوا کھا کر اپنا موبائل نکالا اور روبینہ حیات سے رابطہ کیا۔

''کیسی طبیعت ہے پشمینہ؟'' روبینہ حیات نے بے تابی سے پوچھا۔

''ابھی حرارت تو ہے ممی، لیکن ٹھیک ہوجاؤں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔''

''تو آجاؤ کسی طرح۔'' روبینہ حیات نے جلدی سے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے یہاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

''پریسیڈنٹ صاحب کہاں ہیں؟''

''ہاں۔'' روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب تمہارا دل ہی نہیں چاہتا ہوگا کہ انہیں ڈیڈی کہو۔ وہ ملاقات کررہے ہیں۔ کسی ملک کا سفیر آیا ہے۔''

''میں محل کے اندر آپ سے نہیں مل سکتی ممی! وہاں کوئی نہ کوئی ایسا بندوبست کردیا جائے گا کہ ہماری باتیں سنی جاسکیں۔ میں آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی چاہتی ہوں۔''

''لیکن میں تو نہیں آسکتی بیٹی۔'' روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''محل کی عمارت سے باہر احاطے میں بھی نہیں آسکتیں؟''

''ہاں وہاں تو آسکتی ہوں۔ پریسیڈنٹ صاحب نے مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔'' روبینہ حیات کے لہجے میں تلخی آگئی۔ اس وقت اس نے اپنے شوہر کا نام بھی زبان پر لانے سے گریز کیا تھا۔

''میرا وہاں آنا آسان نہیں ہوگا ممی! سڑکوں پر اس وقت کار تو چل ہی نہیں سکتی۔ میں ہیلی کاپٹر پر آسکوں گی۔''

''میں دیکھ چکی ہوں۔ تم نے ایسا کوئی بندوبست کرلیا ہے۔ ہیلی کاپٹر ہی میں تم بڑے گراؤنڈ بھی پہنچی تھیں۔''

''جی۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''آپ کو ہیلی پیڈ پر آنا ہوگا۔''

قصرِ صدارت کے گرد زمین کا بہت بڑا قطعہ تھا جسے ایک نہایت بلند چاردیواری گھیرے ہوئے تھی۔ سامنے کے حصے میں باغ تھا جس کے سرے پر صدر حیات نے اپنا ہیلی پیڈ بنوایا تھا۔ وہاں اس کا ہیلی کاپٹر کھڑا رہتا تھا۔ محل کے عقب میں خاصا بڑا میدان تھا جس پر بنا ہوا ائرپورٹ اس کے ذاتی جہاز کے لیے تھا۔

''ہاں، ہاں۔'' روبینہ حیات نے کہا۔ ''ٹہلتی ہوئی اس طرف بھی نکل آؤں گی۔''

''لیکن میں دن میں نہیں، رات کے اندھیرے میں آؤں گی۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''ہیلی کاپٹر کی پرواز بھی خاصی نیچی ہوگی۔ میں کوشش کروں گی کہ مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔''

''لیکن ہیلی پیڈ پر چار محافظ تو ہوتے ہی ہیں۔ وہ تو تمہیں دیکھ لیں گے۔''

''وہ دیکھ لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اپنے آقا کو براہِ راست تو اس کی اطلاع دے نہیں سکتے۔ وہ اپنے انچارج کو اطلاع دیں گے۔ پھر وہ ملٹری سیکریٹری کو اطلاع دے گا۔ اس کے بعد وہ اطلاع شہنشاہ معظم تک پہنچے گی۔ اتنی دیر میں آپ سے مل کر میں وہاں سے واپسی کے لیے روانہ ہوچکی ہوں گی۔''

''اتنی جلدی واپس چلی جاؤ گی۔'' روبینہ حیات کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''مجبوری ہے ممی!...... زیادہ رکنا میرے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ اطلاع ملنے کے بعد آپ کے ساتھ بھی ان کا نہ جانے کیا رویہ ہو۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ریوالور اب ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ میں جب چاہوں گی، اپنی زندگی ہی ختم کرلوں گی۔''

''خدا نہ کرے۔'' پشمینہ نے جلدی سے کہا۔ ''بس آپ آج رات میرا انتظار کیجیے گا۔ زیادہ رات کو باہر نکلنا آپ کے لیے مشکل تو نہیں ہوگا؟''

''وہ شراب تو پیتے ہی ہیں، تم جانتی ہو...... آج کل زیادہ پینے لگے ہیں اور آج رات تو شاید بہت زیادہ پی جائے۔''

''کیوں؟''

''میں محسوس کررہی ہوں کہ اب وہ خاصے مایوس ہو چکے ہیں لیکن ملک سے فرار ہوکر بھی نہیں جانا چاہتے۔ میں نے آج ہی سنا تھا۔ انہوں نے بڑے غصے سے چیخ کر شاید اپنے ملٹری سیکریٹری سے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس بھی اس ملک کے حکمراں کی حیثیت سے لینا چاہتے ہیں۔'' خاموش ہوکر روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔

''یہ تو اب ہوگا۔ کل صبح تک ریلی قصرِ صدارت پہنچ جائے گی۔ مشین گنیں بھی انہیں قصرِ صدارت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکیں گی۔ اب تو میں بھی انہیں نہیں روک سکوں گی۔ اگرچہ عوام مجھے شدت سے چاہنے لگے ہیں لیکن میں انہیں اگر روکوں گی بھی تو وہ نہیں رکیں گے بلکہ اس پروپیگنڈے پر یقین کرلیں گے جو مخالف سیاسی جماعتوں نے ریلی میں شامل ہونے سے پہلے کیا تھا۔''

''مجھے بھی علم ہے اس پروپیگنڈے کا۔''

''اسی لیے میں آپ سے آج ہی مل لینا چاہتی ہوں۔ کل تو نہ جانے کیا ہو۔''

''ہاں۔'' روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں ان کے ساتھ ہی اپنی جان دوں۔''

''ملاقات ہونے پر میں آپ کو ایک ایسی ہی تدبیر بتانا چاہتی ہوں کہ آپ خود کو بچاسکیں۔''

''لیکن میں بچنا نہیں چاہتی۔'' روبینہ حیات نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے اب ان سے محبت تو نہیں رہی لیکن میں مشرقی عورت کی یہ روایت زندہ رکھوں گی کہ آخری سانس بھی شوہر کے ساتھ لوں۔''

''خیر! ابھی میں اس بحث کو طویل نہیں کرنا چاہتی۔ ملاقات پر بات ہوگی۔ اور ہاں، کیا بھابی اب بھی میری حمایت میں ہیں؟''

''ہاں، آج اس کی ایسی ہی کسی بات پر آفتاب نے اس کے منہ پر تھپڑ بھی ماردیا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں آج بات چیت بند ہے۔''

''کیا آپ بھابی کو بھی اپنے ساتھ ہیلی پیڈ پر لاسکیں گی؟ ان سے بھی مل لوں۔''

''اس کا میں وعدہ نہیں کرسکتی پشمینہ! بس کوشش کرسکتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں فون بند کررہی ہوں۔ میری دوسری کال کا انتظار کیجیے گا۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ آپ ہیلی پیڈ پر کس وقت پہنچیں۔''

''میں انتظار کروں گی۔''

پشمینہ نے فون بند کیا۔ ڈیبرا بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا ارادہ ہے پشمینہ؟''

پشمینہ نے اسے جواب نہیں دیا اور موبائل پر اقصیٰ سے رابطہ کیا۔ پہلے بھی ہیلی کاپٹر کا بندوبست اسی کے ذریعے سے ہوا تھا۔

''جی، کہیے!'' اقصیٰ کی آواز اس وقت بھی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی سی لگی تھی۔ کوئی بھی اتنی جلدی اپنے باپ کی موت فراموش نہیں کرسکتا۔

''اقصیٰ ڈیئر! تم نے ابھی تک خود کو پوری طرح نہیں سنبھالا ہے، لیکن اس حالت میں بھی تم اپنے لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے ریلی میں شامل ہو۔ میں تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں لیکن اس وقت میں نے تمہیں اپنی ہی ایک غرض سے فون کیا ہے۔''

''آپ کے لیے کوئی بھی کام کرنا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں۔''

''مجھے کہیں جانا ہے تھوڑی دیر کے لیے۔ ہیلی کاپٹر کی ضرورت پڑے گی۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ائر وکلب تو کیا، اس وقت ملک کے سارے ادارے، سارے لوگ آپ کی آنکھ کے ایک اشارے پر جان دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ہیلی کاپٹر کس وقت چاہتی ہیں؟''

''رات کو۔'' پشمینہ نے جواب دیا۔ ''ٹھیک تین بجے ہیلی کاپٹر کرین کے قریب پہنچ جائے اور مجھے، ڈیبرا کے ساتھ اٹھا لے جائے۔''

''میں ائر وکلب سے بات کیے بغیر آپ سے وعدہ کر سکتی ہوں کہ یہ ہو جائے گا۔''

''تمہارے اس یقین کے باوجود میں تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔''

''میں ابھی دس منٹ کے اندر فون کرتی ہوں آپ کو۔''

☆☆☆

شام ہونے سے پہلے پہلے شہر پر عوام کا قبضہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ سرکاری ٹی وی کے کارکنان تک عوام کے ساتھ ہو گئے تھے اور اب وہ بھی اسی قسم کے پروگرام چلا رہے تھے جیسے دوسرے چینلز پر چل رہے تھے۔ اسی طرح بجلی کے محکمے کے ارکان نے بھی بغاوت کا پرچم لہرا دیا تھا۔ انہوں نے مزید برقی روشنیوں کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ مختلف لوگوں نے مناسب فاصلوں سے لاؤڈ اسپیکر بھی اس طرح لگا دیے تھے کہ کرین کے پلیٹ فارم پر موجود ری پبلکن فورم کے لیڈرز کی تقریریں بھی ہر شخص تک آسانی سے پہنچ رہی تھیں۔

پشمینہ کی آواز گونج رہی تھی۔ ''میں عوام کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ حکومت دراصل ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف ضد ہے، وہ بھی چند گھنٹوں کی مہمان۔''

''پشمینہ حیات، زندہ باد'' کے نعرے اتنے زیادہ لگے کہ پشمینہ کو خاموش ہونا پڑا۔ جب شور خاصا کم ہوا تو وہ پھر بولی۔ ''یہ میری جیت نہیں، یہ ان شہیدوں کی جیت ہے جن کی لاشیں اسپتال پہنچ چکی ہیں۔''

اس وقت تک ایک سو بائیس افراد گولیوں کا شکار بن چکے تھے جس کے بعد نہ کہیں پولیس کا پتا تھا، نہ سی ایس کے اہلکاروں کا۔

ٹی وی چینلز مختلف خبریں پہنچا رہے تھے۔ اس دن تین ملکوں کے سفیروں نے صدر حیات سے ملاقات کی تھی لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان ملاقاتوں میں کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اسی لیے قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔

دس بجے کے قریب کرین نیچے کی گئی تاکہ جو افراد اس کے پلیٹ فارم پر تھے، کھانا کھا لیں۔

ریلی میں شریک زیادہ تر افراد اپنے گھروں سے کھانے پینے کا سامان لے کر نکلے تھے۔ جن کے ساتھ اس قسم کا سامان نہیں تھا، انہیں دوسروں نے اپنے ساتھ کھانا کھلایا تھا۔ صورتِ حال کچھ ایسی بن گئی تھی جیسے ان سب کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہو۔

کھانے کے دوران میں پشمینہ نے افسردگی سے کہا۔ ''جو لوگ ہلاک ہو چکے ہیں، ہم ان حالات میں ان کے گھر جا کر ان کو تسلی بھی نہیں دے سکتے، تعزیت بھی نہیں کر سکتے۔''

''مجبوری ہے پشمینہ؟'' دانش نے کہا۔ ''اگر کوئی راستہ بن بھی جائے تو باقی رات میں ان سب کے گھر جانا ممکن بھی نہیں ہے۔ اب تو یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکے گا جب ہمارا یہ مشن مکمل ہو جائے گا۔''

پشمینہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

باقی لیڈرز بھی افسردہ دکھائی دے رہے تھے لیکن ڈیبرا کا چہرہ ہر وقت سپاٹ ہی دکھائی دیتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے وجود میں مسلسل ایک طوفان برپا تھا۔

کھانے کے بعد پشمینہ نے کہا۔ ''مجھے یہ افسوس تو ساری زندگی رہے گا کہ میں اس ملک کے صدر کی بیٹی......''

''مت کرو یہ بات۔'' دانش نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم نے حق کے لیے ایک فیصلہ تو کر لیا لیکن یہ غیر فطری امر ہوگا کہ تمہارے دل میں اپنے باپ کے لیے ذرا بھی درد نہ ہو۔''

اس وقت پشمینہ کی آنکھیں جھلملا گئیں جس سے ظاہر ہو گیا کہ دانش کی بات غلط نہیں تھی۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کیں۔

''اب ڈھائی بج رہے ہیں دانش! تین بجے ہیلی کاپٹر آ جائے گا۔''

وہ دانش یزدانی اور اسد گیلانی، دونوں ہی کو بتا چکی تھی کہ وہ اپنی ماں سے آخری مرتبہ ملنے جارہی ہے۔

اس وقت اسد گیلانی نے تیسری مرتبہ کہا۔ ’’آپ کا قصرِ صدارت جانا مناسب نہیں ہے۔ آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہیں میڈم۔‘‘

’’اپنی ماں کی خاطر میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔ سب کچھ بہت رازداری سے ہوگا۔ میں اپنی ماں کو وقت دے چکی ہوں اور ملاقات کی جگہ کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اگر پھر بھی وہاں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو میری زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ گرفتار کریں گے۔ میری ماں میری زندگی کی ضامن بن چکی ہیں۔ میں آپ لوگوں کو بتا چکی ہوں کہ صدر صاحب اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے ہیں اور میری ماں.....‘‘

’’وہ سب آپ ہمیں بتا چکی ہیں۔‘‘ اسد گیلانی بول پڑا۔

’’لیکن یہ نہیں بتایا کہ جب دو ہیلی کاپٹر میرے گھر آئے تھے، تو ان کا ارادہ مجھے مارنے کا نہیں، صرف اغوا کرنے کا تھا۔ وہ مجھے اغوا کرکے صرف نظر بند کرنا چاہتے تھے۔‘‘

’’اور یہ وہ اب بھی کر سکتے ہیں۔‘‘ دانش بول پڑا۔

’’بالفرض ایسا ہوا تو میرے نائب کی حیثیت سے ریلی کی قیادت تم ہی کو کرنا ہے۔ اس کا اعلان ابھی سے کردو، بلکہ میں خود کرتی ہوں۔‘‘

اس نے مائک کھولا۔ لاؤڈ اسپیکر پر پشمینہ کی آواز گونجنے لگی۔ ’’میرے پُرعزم ساتھیو! آپ لوگ فتح یاب تو ہو چکے ہیں۔ اب صرف ایک رسمی کارروائی باقی ہے۔ مجھے ابھی ایک بہت ضروری کام سے کہیں جانا پڑ رہا ہے۔ دانش یزدانی کا خیال ہے کہ میں خطرہ مول لے رہی ہوں لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی اور اگر بالفرض محال کوئی گڑبڑ ہوگئی تو دانش یزدانی میرے نائب کی حیثیت سے آپ کے ساتھ ہیں۔‘‘

مجمع سے شور اٹھا کہ وہ نہ جائے۔ جب وہ شور کچھ تھما تو پشمینہ نے کہا۔ ’’میں جس کام سے جارہی ہوں، وہ بہتری کے لیے ہے۔ آپ لوگ مجھے جانے کی اجازت دیں۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں گی۔‘‘ پھر پشمینہ نے مائک بند کردیا۔

دوبارہ شور اٹھا لیکن وہ پہلے شور سے زیادہ نہیں تھا۔ پھر وہ بھی دب گیا۔ یقیناً کچھ لوگوں نے کچھ لوگوں کو سمجھایا ہوگا کہ پشمینہ حیات اگر کہیں جارہی ہیں تو ہمیں یقین کرلینا چاہیے کہ وہ ہمیں دھوکا دے کر فرار ہرگز نہیں ہورہی ہیں۔ یقیناً ان کے کہیں جانے میں کوئی بہتری ہوگی۔

جلد ہی فضا میں ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔

پشمینہ نے ایک بار پھر مائک کھولا اور کہا۔ ’’کوئی اس ہیلی کاپٹر پر فائر نہ کرے۔ اسی ہیلی کاپٹر نے مجھے اور ڈیبرا کو یہاں پہنچایا تھا اور اب مجھے لینے بھی وہی ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔‘‘ اس نے مائک پھر بند کردیا۔

ہیلی کاپٹر کرین کے اوپر آکر پلیٹ فارم سے کچھ اوپر معلق ہوگیا۔

پشمینہ نے ساتھیوں سے خدا حافظ کہا اور ڈیبرا کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سوار ہوگئی۔

نہ جانے کیوں دانش کو اس کا ’’خدا حافظ‘‘ کہنا کم از کم اس وقت اچھا نہیں لگا تھا۔

’’تم صحیح جگہ پہنچ سکو گے نا؟‘‘ پشمینہ نے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سے کہا۔

’’آپ بالکل بے فکر رہیے۔‘‘ پائلٹ نے جواب دیا۔

’’وقت کا بھی خیال رکھنا ہے۔‘‘

’’مجھے سب کچھ سمجھایا گیا ہے۔‘‘ پائلٹ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ پھر ہیلی کاپٹر روانہ ہوگیا۔

اس کے بعد پشمینہ نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

ڈیبرا خاموشی سے سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پھر جب ہیلی کاپٹر نے نیچے ہونا شروع کیا تو پشمینہ بول پڑی۔ ’’کیا ہم پہنچ گئے؟‘‘

’’بس پہنچنے والے ہیں۔ یہاں سے ہمیں کم بلندی پر اڑنا ہے۔‘‘

’’وہ تو بہتر ہے۔ وہاں جو مشین گنیں لگی ہوئی ہیں، ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہیلی کاپٹر میں جو کوئی بھی ہے، اسے صدر نے طلب کیا ہوگا۔ انہیں بس یہ الجھن ہوگی کہ انہیں اس کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی اور جب تک وہ کسی کو فون کرکے اس بارے میں پوچھیں گے، ہمارا ہیلی کاپٹر ان سے آگے نکل چکا ہوگا۔‘‘

’’خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں تو یہ سوچ کر چلا ہوں کہ آپ کی خاطر میری زندگی ختم ہوجائے تو یہ میرے لیے کوئی مہنگا سودا نہیں ہوگا۔‘‘

’’متاثر کن ہے تمہاری یہ بات لیکن فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘ پشمینہ نے کہا۔

اور اس نے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہیلی کاپٹر

صحیح وقت پر صحیح جگہ اُتر گیا۔ قریب ہی صدر حیات کا ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ چار محافظ وہاں پہرا دے رہے تھے۔ انہوں نے چونک کر دیکھا کہ روبینہ حیات اور آفتاب حیات کی بیوی قدسیہ حیات کسی طرف سے نکل کر تیزی سے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھی تھیں۔ وہ چاروں ہیلی کاپٹر کے لینڈ کرنے پر بھی اُلجھن کا شکار ہوئے ہوں گے اور اب ان دونوں خواتین کو دیکھ کر بھی ان کی اُلجھن میں اضافہ ہوا ہوگا لیکن وہ یہ ہمت نہیں کر سکتے تھے کہ صدر کی بیوی کو روک کر پوچھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

ڈیبرا اور پشمینہ تیزی کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے اُتری تھیں۔ جیسے ہی دونوں خواتین قریب پہنچیں، پشمینہ نے ماں کو گلے لگالیا۔

''بس!'' پشمینہ نے سرگوشی کی۔ ''اب آپ دونوں یہاں سے نکل چلیے۔''

''کیا؟'' روبینہ حیات چونکی۔

''میں آپ سے ملنے نہیں، آپ کو لینے آئی ہوں۔''

''ہرگز نہیں پشمینہ، ہرگز نہیں۔'' روبینہ حیات اس سے الگ ہوگئی۔ ''مجھے اپنے شوہر کے ساتھ مرنا ہے۔''

پشمینہ نے جھٹکے سے سر گھما کر ڈیبرا کی طرف دیکھا۔ یہ ایک طے شدہ اشارہ تھا۔ ڈیبرا کے ہاتھ میں فوراً ریوالور نظر آیا اور پھر اتنی تیزی سے، یکے بعد دیگرے چار گولیاں چلیں کہ چاروں ہی محافظ زمین پر گرے اور ہمیشہ کے لیے بے حس و حرکت ہو گئے۔ پشمینہ جانتی تھی کہ تیزی سے فائرنگ کرتے ہوئے بھی کوئی نشانہ خطا نہیں کرتی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' روبینہ حیات چیخی۔

''اس جہنم سے نکل چلیے ممی۔'' قدسیہ حیات تیزی سے بولی۔ ''پشمینہ نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔''

''نہیں۔'' روبینہ حیات پھر چیخی۔

''آپ چڑھیے ہیلی کاپٹر میں بھابی۔'' پشمینہ نے کہا۔ اس نے اور ڈیبرا نے روبینہ حیات کو جکڑ لیا تھا۔

''نہیں پشمینہ!'' روبینہ حیات چیخے جا رہی تھی۔ وہ بہت ہلکی پھلکی تو نہیں لیکن زیادہ صحت مند بھی نہیں تھیں۔ ڈیبرا اور پشمینہ نے اسے زمین سے اٹھایا۔

''ان کے ہاتھ پکڑیے بھابی۔'' پشمینہ نے کہا۔

پشمینہ اور ڈیبرا، روبینہ حیات کو ہیلی کاپٹر پر چڑھانے میں کامیاب ہو گئیں۔ ہیلی کاپٹر میں ان دونوں نے روبینہ حیات کو کس کر پکڑ بھی لیا تھا۔

''میں تمہیں زندگی بھر معاف نہیں کروں گی پشمینہ!''

روبینہ حیات روہانسی ہوگئی تھی۔

''میں آپ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں، خواہ آپ مجھ سے کبھی بات نہ کریں۔''

''ہرگز نہیں کروں گی۔''

یہ روبینہ حیات کا آخری جملہ تھا جو پشمینہ سن سکی۔ وہ جیسے ہی ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئی تھی، کسی جانب سے چلائی جانے والی ایک گولی اس کے سر پر لگی تھی۔ گولی چلنے سے پہلے ایک دھما کا بھی ہوا تھا اور گولی چلنے کی آواز اس میں دب گئی تھی۔

اس کے بعد پے در پے دھماکے اور پھر ایک بہت بڑا دھما کا لیکن پشمینہ وہ سب کچھ نہ سُن سکی۔ وہ اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

ان دھماکوں کی آوازیں بہت دور تک سنی گئی تھیں۔ کرین پر دانش یزدانی اور اسد گیلانی نے بھی سنی تھیں۔

دانش یزدانی تو کسی خیال سے چکرا کر گر بھی پڑتا اگر اسد گیلانی نے اسے سنبھال نہ لیا ہوتا۔

''ختم ہوگیا، سب کچھ ختم ہوگیا، میری زندگی ختم ہو گئی۔'' دانش کی آواز بمشکل نکل سکی تھی۔

''ہمیں چاہیے تھا کہ میڈم کو ہر قیمت پر روکتے۔'' اسد گیلانی نے کہا۔

دانش یزدانی کی پلکیں بھیگ چکی تھیں۔

ان دھماکوں نے ہر طرف ہلچل مچا دی تھی۔ ٹی وی چینلز چیخ رہے تھے۔

کرین جہاں تک پہنچی تھی، وہاں سے قصرِ صدارت دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہاں جو آگ بھڑکی تھی، اس کی روشنی وہاں سے بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

جو کچھ اسد گیلانی اور دانش یزدانی نے سمجھا تھا، وہ عام لوگ نہیں جانتے تھے۔ ان میں تو یہ بات سینہ بہ سینہ پھیلتی چلی جا رہی تھی کہ پشمینہ حیات جس کام سے گئی تھی، وہ کام یہی تھا کہ قصرِ صدارت کو تباہ کر دے تا کہ جب ریلی وہاں پہنچے تو وہ لوگ مشین گنوں کی گولیوں سے محفوظ رہیں۔

دانش کی حالت اتنی خراب ہوئی تھی کہ اسد گیلانی کی ہدایت پر کرین فوراً نیچے کی گئی۔ ہجوم میں سے کئی ڈاکٹر نکل کر دانش کو دیکھنے آ گئے۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' دانش نے جسے زبردستی بستر پر لٹا دیا گیا تھا، اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے دہرایا۔

اس کے باوجود ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا۔ وہ طبی سامان لے کر اس ریلی میں شامل ہوئے تھے مگر انہیں یہ گمان ہرگز نہ ہوگا کہ انہیں دانش یزدانی کو بھی دیکھنا پڑے گا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔'' ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر اعلان کیا۔ ''کوئی خطرے کی بات نہیں...... وقتی طور پر جھٹکا لگا ہے دماغ کو۔''

تاہم کسی قسم کی دو گولیاں اسے پانی سے کھلا دی گئیں۔

''کرین اوپر لے چلیے۔'' دانش نے اسد گیلانی سے کہا۔

ریلی کے جو لوگ سب سے آگے تھے اور جنہیں قصرِ صدارت دکھائی دے رہا تھا، ان کے ذریعے سے یہ بات بھی بڑی تیزی سے پھیلی کہ قصرِ صدارت کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ دھماکے قصرِ صدارت کے عقب میں ہوئے ہیں۔

یہ بات ٹی وی چینلز سے بھی نشر ہوگئی۔

تو پھر یہ دھماکے کیسے تھے؟ آگ کہاں لگی تھی؟ یہ سوال لوگوں کی زبان پر بھی تھا اور ٹی وی چینلز پر بھی اس بارے میں باتیں ہونے لگی تھیں۔

''پشمینہ تو ہیلی پیڈ پر اتری ہوگی۔'' دانش کی آواز میں خوشی کی کپکپاہٹ تھی۔ ''اور ہیلی پیڈ قصرِ صدارت کے عقب میں نہیں، سامنے کے حصے میں ہے۔''

ایم این اے کی حیثیت سے وہ دو تین مرتبہ قصرِ صدارت جاچکا تھا۔

مگر لوگوں کے لیے جو معاملہ ایک معما بنا ہوا تھا، وہ صدر حیات کے لیے معما نہیں تھا۔ وہ غصے میں ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''ہجوم کے کچھ لوگ غالباً شال کی جانب سے آئے ہوں گے۔ ان کے پاس عام اسلحہ ہی نہیں راکٹ بھی آچکے ہیں جو وہاں برسائے گئے۔ ائرپورٹ تباہ ہوگیا اور میرا جہاز آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا ہے۔ فائر بریگیڈ اسٹیشن سے کوئی نہیں آیا۔ جہاز خاک ہوجائے گا۔''

آفتاب متفکر انداز میں خاموش کھڑا تھا۔ اسی وقت دو خوف زدہ محافظ وہاں پہنچے۔

''کسے گولی ماری ہے تم نے؟'' صدر حیات نے گرج کر ان میں سے ایک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

محافظ خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہم نے ہیلی کاپٹر اس طرف اترتے دیکھ لیا تھا اس لیے بھاگتے ہوئے ادھر گئے تھے۔ بیگم صاحبہ اور چھوٹی بیگم کو اس ہیلی کاپٹر میں اغوا کیا جارہا تھا۔''

''میں نے پوچھا ہے تم نے گولی کسے ماری ہے؟'' صدر حیات پھر گرجا۔

''میں نے ہیلی کاپٹر پر گولی چلائی تھی۔'' محافظ مری مری سی آواز میں بولا۔ ''اسی وقت ہونے والے دھماکے کی آواز سے میرا ہاتھ بہک گیا۔''

''تمہارے ساتھی نے بتایا ہے کہ وہ گولی پشمینہ کے لگی ہے۔''

''لیکن میں نے تو......''

محافظ کا جملہ پورا نہیں ہوسکا۔ صدر حیات کی جیب سے نکلنے والے ریوالور کی پے در پے تین گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوگئی تھیں اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔

دوسرے محافظ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اسے یقین ہوگا کہ اب اس کی باری ہے۔

صدر حیات نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا اور دوسرے محافظ سے بولا۔ ''اس بدبخت کی لاش ہٹواؤ یہاں سے اور جو خون پھیل گیا ہے، اس کی صفائی کرواؤ۔''

دوسرا محافظ بہت تیزی سے باہر نکل گیا۔

''سب ساتھ چھوڑ گئے۔'' صدر حیات ٹہلتا ہوا بڑبڑانے لگا۔ ''تمہاری بیوی بھی چلی گئی اور وہ بھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ تم بھی چلے جاؤ کہیں۔'' صدر حیات نے آفتاب کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''لیکن میں بھی اکیلا نہیں مروں گا۔ ہزاروں کو مرنا ہوگا میرے ساتھ۔''

آفتاب خاموش کھڑا رہا۔ صدر حیات کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہوگی۔

''موت بچھا رہا ہوں میں محل میں۔'' صدر حیات کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔ ''میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ میری حکومت ختم ہو چکی ہے۔ فوج، بحریہ، فضائیہ سب احسان فراموش نکلے۔ بس ایک احسان ہے ان کا مجھ پر۔'' صدر حیات کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ ''انہوں نے ابھی میرے خلاف خود کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ دوسرے تمام ادارے بھی خودمختار ہوچکے ہیں۔ ہاں اگر پشمینہ زندہ رہ جاتی تو وہ اس کے اشاروں پر ضرور ناچتے۔''

''آپ بیٹی کی موت کا ذکر اتنی سفاکی سے کر رہے ہیں ڈیڈی۔'' آفتاب کی آواز بھرا گئی۔

''بیٹی نہیں رہی تھی وہ میری۔'' حیات بیٹے پر بگڑ گیا۔ ''باغی تھی میری، اور ہوسکتا ہے وہ مری نہ ہو۔ بس گولی چلی ہے اس پر۔ ضروری نہیں کہ وہ مر ہی گئی ہو۔''

"آپ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ڈیڈی!......آپ پشمینہ کی زندگی کے بھی خواہش مند نظر آرہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔"

"میں اس کا مخالف ہو گیا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں ہی غلطی پر تھا۔ آپ نے میرے نام سے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔ اسی کی مخالف تھی میری بہن۔" آفتاب کی آواز بھرا گئی۔

صدر حیات اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "تم بھی ساتھ چھوڑ رہے ہو میرا......ضرور چھوڑو...... کوئی بھی اب میرا نہیں رہنا چاہیے۔ یہاں سے چلے جاؤ، کسی طرح اپنی جان بچاؤ۔ میں تو نہیں جاؤں گا لیکن میرے ساتھ ان ہزاروں یا سیکڑوں باغیوں کی بھی موت ہو گی۔ سب مریں گے۔" صدر حیات نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔

آفتاب نے محسوس کیا کہ اس کا باپ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے یا کھوتا جا رہا ہے۔

"ڈائنا مائٹ بچھوا رہا ہوں میں سارے محل میں۔" صدر حیات نے قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔

آفتاب چونک گیا۔

"ہاں۔" اس مرتبہ صدر حیات کا انداز فاتحانہ سا ہو گیا۔ کچھ وفادار باقی ہیں ابھی محل میں۔ وہی کر رہے ہیں یہ کام۔ ان سے کہہ دیا ہے میں نے کہ یہ کام کر کے وہ کسی طرح محل سے نکل جائیں، اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے وہ باغیوں سے ہی جا ملیں۔ ملٹری سیکریٹری پہلے ہی چپکے سے نکل چکا ہے یہاں سے۔ میں سب سے کہوں گا کہ وہ یہاں سے نکل جائیں۔ چلو تم سے بھی ایک بار پھر کہتا ہوں کہ نکل جاؤ یہاں سے، چلے جاؤ کہیں۔ یہاں موت بچھانے کا کام چھ بجے تک مکمل ہو جائے گا۔ یہ لیور دیکھ رہے ہو؟" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "بس اسے دباؤں گا میں اور سارے ڈائنا مائٹ پھٹ جائیں گے۔ محل کے پرخچے فضا میں بکھر جائیں گے اور یہ کام میں اس وقت کروں گا جب باغی مشین گنوں کی گولیوں سے بچتے ہوئے محل میں چاروں طرف سے گھسیں گے۔ ان کی تعداد سیکڑوں میں تو ضرور ہو گی۔" صدر حیات نے پھر قہقہہ لگایا۔ "ان سب کو بھی مرنا ہو گا میرے ساتھ۔ ان کی گولیوں سے نہیں مروں گا میں۔"

آفتاب کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی اور اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ اس کا باپ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔

☆☆☆

چار بجنے والے تھے جب دانش یزدانی نے کسی کی کال ریسیو کی۔

"کیا!" وہ کچھ سُن کر چیخ پڑا تھا۔

اسد گیلانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دانش کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ بھی صاف ظاہر ہو رہی تھی جس سے وہ موبائل پکڑے ہوئے تھا۔

"کیا ہوا؟" اسد گیلانی نے جلدی سے پوچھا۔

دانش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے دوسری طرف سے آنے والی آواز سنتا رہا، پھر یک لخت اس نے سر گھما کر ایک جانب دیکھا۔ "ہاں۔" اس کی آواز میں اب بھی کپکپاہٹ تھی۔ "میں دیکھ رہا ہوں۔ ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔"

اسد گیلانی نے بھی دیکھ لیا کہ اس جانب سے ایک ہیلی کاپٹر آرہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں فوراً آرہا ہوں۔" دانش نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔

"کیا ہوا، کچھ تو معلوم ہونا چاہیے مجھے۔" اسد گیلانی پھر بولا۔ "یہ ہیلی کاپٹر......"

"مجھے لینے آرہا ہے۔" دانش نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ڈیبرا نے فون کیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ محل سے واپسی پر پشمینہ نے ہیلی کاپٹر اپنے گھر کے ٹیرس پر اتروایا تھا۔ وہ اپنی والدہ کو یہاں نہیں لانا چاہتی تھی۔ لیکن وہیں اسے اچانک سردی لگ کر بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ ہیلی کاپٹر بھیجا ہے میرے لیے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو دانش۔" اسد گیلانی نے تیزی سے کہا۔ "صرف تیز بخار کی اطلاع پر تم اتنے بدحواس نہیں ہو سکتے۔ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟"

اس وقت ہیلی کاپٹر ان کے سر پر آ چکا تھا۔

"آپ اعلان کر دیجیے گا۔" دانش نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "ضروری ہے یہ اعلان کرنا کہ پشمینہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اس لیے میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔"

ہیلی کاپٹر اب اتنا نیچے آ چکا تھا کہ دانش یزدانی اس پر سوار ہو سکتا تھا۔ اسد گیلانی کو اپنی بات کا جواب نہیں ملا اور دانش چلا گیا۔

اب مجبوری تھی۔ اسد گیلانی کو وہ اعلان کرنا ہی پڑا جو دانش یزدانی چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ریلی کے شرکاء میں بے چینی پھیل گئی۔ بہت سے لوگ ٹی وی چینلز کو فون کرنے لگے۔ ہر ایک کا سوال یہی تھا کہ پشمینہ حیات کو بخار ہو گیا ہے یا کوئی

خطرناک بات ہوئی ہے جو چھپائی جارہی ہے۔ لوگوں کو بھی وہی شبہ ہوا تھا جو اسد گیلانی کو ہوا تھا۔ لوگ صحیح بات معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو گئے تھے لیکن ٹیلی ویژن والے بھی کسی کو کیا جواب دیتے؟ وہ خود بے خبر تھے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکے کہ انہوں نے اپنے رپورٹرز کو کسی نہ کسی طرح پشمینہ حیات کے گھر بھیجا ہے اور ان کی رپورٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔

ریلی بہر حال آگے بڑھتی رہی۔ یہ تو ہوا کہ ریلی میں شریک خاصے لوگ ان اسپتالوں کی طرف چلے گئے جہاں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں اور زخمیوں کو پہنچایا گیا تھا۔ اس کے باوجود ریلی میں ایسی کمی نہیں آئی تھی جسے محسوس کیا جاسکتا۔

پانچ بجے تک اسد گیلانی خاصا پریشان ہو چکا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ پشمینہ اور دانش یزدانی سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تھا لیکن اسے دونوں ہی کے فون بند ملے تھے۔ حتیٰ کے ڈیبرا نے بھی اپنا فون بند کر رکھا تھا۔

پانچ بج کر پانچ منٹ پر اسد گیلانی کو دانش یزدانی کا فون موصول ہوا۔

''شکر ہے کہ تم نے رابطہ کیا۔ مجھے تم تینوں ہی کے موبائل بند مل رہے تھے۔''

''مجبوری تھی۔'' دانش نے جواب دیا۔ ''پے در پے گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ ٹی وی چینلز والوں نے غیر ذمّے داری کا ثبوت دیا ہے یا نہ جانے کیا ہوا ہے کہ عام لوگوں کو بھی ہمارے فون نمبر معلوم ہو گئے ہیں۔ پشمینہ کے بارے میں جاننے کے لیے لوگ بے تحاشا فون کر رہے ہیں۔'' پشمینہ کا نام لیتے ہوئے دانش کی آواز بھرّا گئی تھی۔

''کیسی ہیں اب میڈم؟'' اسد گیلانی نے جلدی سے پوچھا۔

''اچھا اب سن ہی لیجیے آپ، لیکن ہمت نہ ہار جائیے گا۔ میں پشمینہ کے بارے میں جو کچھ بھی بتاؤں گا، وہ آپ کے سوا کسی کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ ابھی تفصیل تو میں آپ کو بھی نہیں بتاؤں گا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے انہیں؟'' اسد گیلانی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''میں نے کہا نا کہ میں ابھی زیادہ کچھ آپ کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ ابھی میں نے آپ کو فون اس لیے کیا ہے کہ اب پانچ بج چکے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ریلی قصرِ صدارت تک پہنچ جائے گی۔ کوشش کیجیے کہ کسی طرح کرین ہجوم کے آگے پہنچ سکے۔ لوگوں کو قابو میں کر سکیں گے آپ؟ میرا خیال ہے کر لیں گے۔''

''کوشش کرتا ہوں لیکن......''

''میں اب یہاں سے روانہ ہو کر آپ کے پاس ہی آرہا ہوں۔ کرین کسی طرح بھی آگے نکالنے کی کوشش کیجیے...... ریلی جب وہاں پہنچے تو مجھے بھی کرین پر ہونا چاہیے۔ میں پشمینہ کی یہ بات نظر انداز نہیں کر سکتا کہ قیادت مجھے ہی کرنا ہے۔ بس اب میں بند کر رہا ہوں۔''

اسد گیلانی نے محسوس کیا کہ دانش یزدانی بولنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ بار بار ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کی آواز رندھنے لگتی تھی اور وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رہا تھا۔

اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اسد گیلانی کے دل میں آیا کہ اب وہ دانش سے رابطہ قائم کرے لیکن اسے امید نہیں تھی کہ دانش اسے حقیقت سے آگاہ کرے گا۔ دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ دانش یزدانی نے اپنا موبائل پھر بند کر دیا ہوگا۔

اسد گیلانی نے لاؤڈ اسپیکرز پر اعلان شروع کیا کہ لوگ کرین کے سامنے سے ہٹنے کی کوشش کریں تاکہ گاڑی آگے بڑھ سکے۔ یہ پشمینہ حیات صاحبہ ہی کی خواہش ہے کہ جب ریلی قصرِ صدارت کے قریب پہنچے تو کرین سب سے آگے ہو۔ وہ بخار میں ضرور مبتلا ہو گئی ہیں لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ان کا بخار نہ اترا تو بھی اس وقت کرین پر آجائیں گی حالانکہ ڈاکٹر انہیں روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ آپ لوگوں سے ان کی محبت ہے کہ وہ ہر حال میں آپ لوگوں کے قریب رہنا چاہتی ہیں۔'' اسد گیلانی مستقل جھوٹ بولتا چلا گیا تاکہ عوام کو کسی حد تک تو مطمئن کر سکے۔

عوام مطمئن ہوئے یا نہیں، اسد گیلانی کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا مگر لوگوں نے یہ کوشش ضرور کی کہ کرین کے سامنے سے ہٹنے کے لیے کوشاں ہوئے۔ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی، پھر بھی کچھ تو ہوا اور کرین کی گاڑی کے ڈرائیور کو رفتار میں کچھ اضافہ کرنے کا موقع مل گیا۔

پونے چھ بجے تھے جب دانش یزدانی ہیلی کاپٹر کے ذریعے واپس آیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

''شاید پشمینہ حیات کا نام سن کر ہی لوگوں نے ہمارے آگے بڑھنے کے لیے راستہ چھوڑنا شروع کیا ہے۔'' اسد گیلانی نے کہا۔ ''لوگ انہیں پروانہ وار چاہنے لگے ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی بری خبر سننا ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔''

دانش یزدانی نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے

موبائل پر ٹی وی چینل سے رابطہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ گھروں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس کی باتیں سن لیں۔ چینل کے اینکر پرسن نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی لیکن دانش یزدانی نے تقریباً اسی قسم کی باتیں کیں جو اسد گیلانی سے کر چکا تھا۔ بیچ میں اسد گیلانی نے اس سے موبائل چھین کر یہ ضرور کہا کہ قصر صدارت تک پہنچنے سے پہلے میڈم ہمارے ساتھ ہوں گی۔''

دانش یزدانی نے موبائل چھینے جانے کا برا نہیں مانا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بات کہنی ضروری تھی کہ پشمینہ حیات جلد ہی ان کے درمیان ہوں گی۔

''وہ ٹھیک ہیں نا؟'' اسد گیلانی نے اس سے پوچھا۔

دانش نے اس مرتبہ بھی جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''کرین کی گاڑی کی رفتار اچھی خاصی بڑھ گئی ہے۔ ہم ساڑھے چھ بجے تک آگے پہنچ جائیں گے۔''

دانش یزدانی کا خیال درست ثابت ہوا کہ ساڑھے چھ بجے تک کرین سارے ہجوم سے آگے پہنچ چکی تھی۔

اس وقت عام لوگوں نے چینلز کو فون کرنا شروع کر دیا کہ اب پشمینہ حیات ہرگز نہ آئیں۔ انہیں مشین گنوں کی زد پر نہیں آنا چاہیے۔ قربانیاں دینے کے لیے عوام تیار تھے۔

اب قصرِ صدارت دکھائی دینے لگا تھا۔

اس وقت ایک ایسا واقعہ ہوا کہ نہ صرف کرین کی گاڑی روک دینا پڑی بلکہ ہجوم بھی رکنے لگا۔

کسی جانب سے دو طیارے گرجتے ہوئے قصرِ صدارت کے قریب پہنچے تھے اور مشین گنوں پر گولیاں اور راکٹ برساتے ہوئے گزر گئے تھے۔ وہاں کوئی ائیر کرافٹ گن نہیں تھی جس سے ان طیاروں کو گرانے کی کوشش کی جاسکتی تاہم مشین گنوں سے گولیاں ضرور برسائی گئی تھیں جن سے کسی بھی طیارے کو نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن مشین گنوں پر مامور لوگوں کی اکثریت اپنے ہی خون میں تڑپ رہی تھی اور خاصی مشین گنیں بھی یا تو تباہ ہو گئی تھیں یا ادھر اُدھر لڑھکی پڑی تھیں۔

طیارے ایک چھوٹا سا چکر لگا کر پھر لوٹے۔ اس مرتبہ بقیہ مشین گنوں پر مامور لوگوں نے جان بچانے کے لیے بھاگنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی لیکن دوسرے چکر میں ان طیاروں نے باقی مشین گنوں کو بھی تباہ کر دیا اور پھر اسی طرف جانے لگے جدھر سے آئے تھے۔

''لوگوں کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا ہے۔''

''اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ کوئی خطرہ نہیں رہا۔'' اس قسم کے فقرے ہر شخص بول رہا تھا۔

''ان طیاروں پر کسی ملک کا نشان نہیں تھا۔'' اسد گیلانی نے کہا جو دوربین سے سارا منظر دیکھتا رہا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ اسی ملک کے طیارے ہوں گے جس کا طیارہ صدر حیات نے تباہ کروایا ہے۔ ائیرپورٹ اور صدر کا طیارہ تباہ کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔'' دانش یزدانی نے کہا۔ ''یو این او کے اجلاس میں تو ابھی کوئی اہم فیصلہ نہیں ہو سکا۔ ان کا دوسرا اجلاس کل ہوگا۔''

''ان لوگوں کو ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔'' اسد گیلانی نے تلخی سے کہا۔ ''جب انہیں کسی ملک کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، تبھی وہ جلدی حرکت میں آتے ہیں۔''

ریلی اب تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ٹی وی چینلز سے لوگوں کا یہ مطالبہ اب ختم ہو چکا تھا کہ پشمینہ نہ آئے کیونکہ مشین گنوں کا خطرہ ختم ہونے کے بعد اب قصرِ صدارت میں گھسنا ذرا بھی مشکل نہیں رہا تھا۔

لیکن دانش یزدانی نے اعلان کیا تھا کہ ڈاکٹروں نے پشمینہ حیات کو بستر سے اٹھنے کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔

☆☆☆

صدر حیات اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی نظریں اردگرد موجود کئی ٹی وی سیٹ کی نگرانی کر رہی تھیں۔

وہ سب ٹی وی ان کلوز سرکٹ کیمروں سے منسلک تھے جو محل کے ان حصوں میں لگائے گئے تھے جہاں سے لوگوں کا داخلہ ممکن تھا۔

سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب اسکرینوں پر لوگ شور مچاتے اور اسلحہ سنبھالے محل میں داخل ہوتے دکھائی دیے۔ ان راستوں کے علاوہ کھڑکیاں توڑ کر بھی لوگوں کا داخلہ شروع ہو چکا تھا۔

''آؤ...... آؤ...... مرنے آؤ۔'' صدر حیات بڑبڑاتا ہوا کرسی سے اٹھا اور تیزی سے برابر کے اس کمرے میں پہنچا جہاں لیور دبانے سے ڈائنامائٹ اڑائے جاسکتے تھے۔ وہ لیور کے قریب رک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

اسی وقت کمرے کا وہ دروازہ پیٹا گیا جہاں سے اندر داخل ہوا جاسکتا تھا۔

''دروازہ کھولیے ڈیڈی! میں مرتے وقت آپ کے ساتھ ہونا چاہتا ہوں۔ لوگ تو محل میں گھستے چلے آ رہے ہیں۔''

صدر حیات نے فوراً لیور نہیں دبایا تھا۔ اس کا وہ کمرا ایسی جگہ تھا جہاں پہنچنے میں لوگوں کو کچھ وقت لگتا۔ حیات چاہتا تھا کہ اتنی دیر میں زیادہ سے زیادہ لوگ محل میں داخل ہو چکے

ہوں۔

''دروازہ کھولیے، پلیز۔'' آفتاب کی آواز پھر سنائی دی۔

کچھ سوچتا ہوا حیات دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے آفتاب کو اندر آنے دیا۔ پھر خود ہی دروازہ بند کر کے مڑا تو اس نے دیکھا کہ آفتاب اس کے اور لیور کے درمیان حائل تھا۔

''میں آپ کو یہ لیور نہیں دبانے دوں گا۔'' آفتاب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''موت تو میری بھی یقینی ہے ان لوگوں کے ہاتھوں لیکن میں اب اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ بس ان بے قصور لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو مرنے نہیں دوں گا۔''

''ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔'' حیات غراتا ہوا آگے بڑھا۔

''ہرگز نہیں۔ میں یہ نہیں کرنے دوں گا آپ کو۔''

حیات نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ یہ اس کا وہ مخصوص ریوالور تھا جس پر سونے کی پتر چڑھی ہوئی تھی یا وہ سونے اور کسی دھات کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ آفتاب کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

''ہٹ جاؤ۔'' حیات پھر غرایا۔ ''ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''اگر آپ اپنے بیٹے کو گولی ماریں گے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ آپ یقینی طور پر اپنا دماغی توازن کھو چکے ہیں اور جو پاگل ہو چکا ہو، گولی اسے مار دینا چاہیے۔'' آفتاب نے خود کو تیزی سے گرا کر اس گولی سے بچایا جو حیات کے ریوالور سے نکل چکی تھی۔ وہ بال بال بچا اور ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ باپ پر گولی چلاتا، حیات نے زیادہ تیزی سے اپنا ریوالور نیچے کرتے ہوئے گولیاں داغ دیں۔ آفتاب کیونکہ لیٹ گیا تھا اور اس کا سر حیات کی طرف تھا اس لیے دونوں گولیاں اس کے سر پر لگیں اور وہ فرش پر بے حس و حرکت ہو گیا۔

''بے وقوف!'' حیات دانت پیستا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے آفتاب کی لاش کو ٹھوکر ماری اور لیور کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ لیور اس نے اب بھی نہیں دبایا۔ وہ محل میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا داخلہ چاہتا تھا۔

محل بہت بڑا تھا۔ آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔ پھر بھاگتے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔

''یہ کمرا رہ گیا ہے۔'' حیات نے دانش یزدانی کی آواز پہچانی۔ ''کھولو دروازہ، نہ کھلے تو توڑ دو۔''

دروازہ تھوڑا سا لرزا۔ اسے کھولنے کی کوشش کی گئی تھی۔

''توڑ ڈالو۔'' دانش یزدانی ہی کی آواز تھی۔

''توڑو۔'' اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' حیات نے دانت پیسے۔ اس کا ہاتھ لیور پر پہنچ چکا تھا۔

دروازے پر غالباً رائفلوں کے دستے مارے جا رہے تھے۔

''رخصت۔'' حیات نے کہا اور لیور دبا دیا۔

لیور دبایا اور سکتے میں کھڑا رہ گیا۔ کوئی ڈائنامائٹ نہیں پھٹا تھا، کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔

غصے میں حیات کے منہ سے کچھ عجیب سی آواز نکلی۔ وہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے بھی اسے دھوکا دیا تھا جن کو اس نے ڈائنامائٹ لگانے کی ہدایت کی تھی۔

''وہ بھی دھوکا دے گئے۔'' وہ دانت پیستا ہوا تیزی سے اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں سے اس نے ہلکی مشین گن اٹھائی۔

''تم مجھے زندہ نہیں پکڑ سکتے کتو!'' وہ غراتا ہوا واپس اسی کمرے میں آیا جہاں دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن اس کا ٹوٹنا آسان نہیں تھا۔ وہ خاصی مضبوطی سے بنایا گیا تھا۔

لیکن آخر کار ٹوٹے گا۔ حیات کو یقین تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اندر جتنے بھی لوگ آئیں گے، وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

پھر وہی ہوا۔ دروازہ ٹوٹ گیا۔ لوگ تیزی سے اندر آئے اور حیات نے مشین گن سے گولیوں کی برسات کر دی۔ حیات کئی افراد کو ختم کرنے میں کامیاب بھی رہا لیکن جواب میں چلائی جانے والی گولیوں نے اس کا سارا جسم چھلنی کر ڈالا۔ وہ فرش پر گرا اور اپنے ہی خون میں لت پت بے حس و حرکت ہو گیا۔

کسی نے چیخ کر کہا کہ دانش صاحب کو فوراً اسپتال پہنچاؤ۔

کوئی دوسرا چیخا۔ ''ہم اس درندے کی لاش کو سڑکوں پر گھسیٹیں گے۔''

دانش یزدانی ان لوگوں کو ہدایت کر چکا تھا کہ محل میں آگ ہرگز نہ لگائی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا تھا۔

سائرن بجاتی ہوئی کئی ایمبولینس محل کے باہر پہنچ چکی تھیں۔ مرنے والوں کی لاشیں اور زخمی ہونے والوں کو فوراً ان

میں پہنچایا گیا۔
''دانش صاحب کی حالت نازک معلوم ہو رہی ہے۔''
کسی نے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔
بہت سے لوگوں نے اس کی آواز ہی نہیں سنی۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں تھے اور حیات کی لاش کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے جا رہے تھے۔ زخمیوں اور لاشوں کو بڑی پھرتی سے اٹھا کر باہر لے جایا جا چکا تھا۔
لوگ حیات کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے نہ صرف کمرے سے نکلے بلکہ اسے محل سے بھی نکال لائے۔
ٹی وی کیمرے یہ منظر اپنے اپنے چینلز کو پہنچا رہے تھے۔ وہ مناظر ساری دنیا میں دیکھے گئے کہ حیات کی لاش سڑکوں پر گھسیٹی جا رہی تھی۔ لوگ لاش سے بھی اپنی شدید نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس پر جوتے برسائے جا رہے تھے، تھوکا جا رہا تھا، لوگ طرح طرح سے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔

☆☆☆

پشمینہ کی آنکھیں کھلیں تو وہ ایک بڑے اسپتال کے کمرے میں تھی۔ آنکھیں کھلنے پر اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اسے کچھ چہرے دکھائی دیے لیکن فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون تھے اور وہ خود کون تھی۔ اس نے بھنبھناہٹ سی سنی۔ وہ دراصل کئی افراد کے بہ یک وقت بولنے کی آوازیں تھیں۔
پھر اس کے دماغ میں مختلف مناظر کے جھماکے ہونے لگے۔ ریلی، ٹی وی چینلز کا شور، پشمینہ حیات زندہ باد، ہیلی کاپٹر، صدر حیات کا چہرہ، ماں باپ کے چہرے، بھائی اور بھاوج کے چہرے، ہلاک اور زخمی ہونے والوں کو اسپتال لے جائے جانے کے مناظر، گولیاں چلنے کی تڑاتڑ، پرواز کرتا ہوا ایک ہیلی کاپٹر، گولی چلنے کی آواز، پھر چند لمحے کی مکمل تاریکی اور پھر فوراً روشنی جس کے ساتھ ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی تو دائیں بائیں سے دو ہاتھوں نے اس کے شانوں پر دباؤ ڈالا۔
''تیزی سے مت اٹھیے!'' اس کے لیے اجنبی آواز ایک نرس کی تھی۔
پشمینہ نے اپنے آس پاس موجود افراد کو پہچان لیا۔ اس کی بھاوج قدسیہ، پارٹی کا صدر اسد گیلانی، ڈیبرا، دانش یزدانی، دو ڈاکٹر، دو نرسیں۔
''شکر ہے کہ آج کے بعد تم ہوش میں ہی رہو گی۔'' دانش یزدانی مسکراتا ہوا بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب نے یہی بتایا ہے۔''
پشمینہ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے کچھ بوجھ محسوس کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے اس ڈریسنگ کا لمس محسوس کیا جو اس کے سر پر کی گئی تھی۔ یہ اسے یاد آ چکا تھا کہ اس نے ایک گولی چلنے اور ایک دھماکے کی آواز سنی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کے آگے گہری تاریکی چھا گئی تھی۔
''تمہارے سر میں گولی لگی تھی۔'' دانش پھر بولا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ آپریشن طویل تو تھا لیکن بہت کامیاب رہا۔''
''ممی کہاں ہیں؟'' پشمینہ نے پوچھا اور خود محسوس کیا کہ اس کی آواز میں خاصی نقاہت تھی۔
''ابھی کسی کام سے گئی ہیں، آ جائیں گی۔'' قدسیہ بول پڑی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔
یکایک پشمینہ چونکی۔ ''مگر تم سب یہاں کیوں ہو؟ ریلی کی قیادت......''
''سب کچھ ہو چکا ہے۔ ہم کامیاب ہو چکے ہیں۔ تم ایک مہینا دس دن کے بعد مکمل ہوش میں آئی ہو۔''
''کیا؟'' پشمینہ حیران رہ گئی۔
''نرس! انجکشن۔'' ایک ڈاکٹر بولا۔
نرس پہلے ہی انجکشن تیار کر چکی تھی جو اس نے فوراً پشمینہ کے بازو میں لگا دیا۔
''اب آپ خود کو بالکل ٹھیک سمجھیے پشمینہ صاحبہ!'' ڈاکٹر بولا۔
دوسرا ڈاکٹر خاموش رہا تھا۔ غالباً وہ اسسٹنٹ ڈاکٹر تھا۔
''بس چند دن آرام کی ضرورت ہے۔'' پہلے ڈاکٹر نے مزید کہا۔ ''برطانوی ڈاکٹروں نے تو معجزہ کر دکھایا ورنہ زخم اتنی جلدی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔''
''برطانوی......ڈاکٹر......'' پشمینہ رک رک کر بولی۔
''جی ہاں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''آپریشن کی کامیابی کے باوجود چار دن بعد آپ کی حالت یکایک زیادہ خراب ہو گئی تھی اور ہنگامی طور پر برطانیہ سے دو بہت بڑے ڈاکٹروں کو بلایا گیا تھا۔ وہ دس گھنٹے بعد ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ کل ہی اس یقین کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوئے ہیں کہ اب ان کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ پیش گوئی بھی کر گئے تھے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مکمل طور سے ہوش میں آ جائیں گی۔''
''کیا ہو چکا ہے اس عرصے میں؟'' پشمینہ نے بے چین ہو کر دانش اور اسد گیلانی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے ہیں؟''

''خوشی کے آنسو ہیں۔'' قدسیہ نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا لیکن حقیقتاً وہ دکھی تھی۔ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے درد گھول گیا تھا۔ شوہر سے مخالفت کے باوجود وہ آفتاب سے محبت کرتی تھی۔

''تم لوگ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟'' پشمینہ پھر دانش یزدانی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''نرس!'' ڈاکٹر پھر بول پڑا۔ ''بس تم یہاں رکو...... ہماری اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

یہ اس نے صرف ایک نرس سے کہا۔ دوسری نرس دونوں ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔

دانش بولا۔ ''سر میں گولی لگنے کے بعد تم بے ہوش ہو کر ڈیبرا کی گود میں گر پڑی تھیں۔ اس وقت پائلٹ نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر فوراً اسپتال لے آیا تھا۔ وہاں سب تیار بھی تھے کیونکہ ڈیبرا نے انہیں موبائل پر اطلاع دے دی تھی۔ تمہارا آپریشن خاصا طویل تھا لیکن کامیاب رہا تھا۔ تمہیں یاد ہے کہ تم اب سے پہلے تین مرتبہ ہوش میں آ چکی ہو اور دو مرتبہ تو ہم سے دو ایک منٹ بات چیت بھی کر چکی ہو۔''

''نہیں۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔'' وہ عجیب سی بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

''مجھے ڈیبرا نے اس حادثے کے بعد فوراً اطلاع دی تھی۔ مجھے لینے کے لیے ہیلی کاپٹر بھجوا دیا تھا۔ ائرو کلب والوں نے ہم سے مکمل تعاون کیا۔ میں یہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ ڈیبرا کو پریشان اور روتے ہوئے دیکھا۔ تم اس وقت آپریشن تھیٹر میں تھیں، لیکن وہاں سے کوئی نہ کوئی کسی وجہ سے باہر نکلتا تھا تو ہمیں یہ تسلی ضرور دیتا تھا کہ آپریشن اطمینان بخش طور پر جاری ہے۔ میری حالت بہت غیر ہو گئی تھی پشمینہ! ایک طرف تمہاری فکر، دوسری طرف تمہارے مشن کی۔ تم نے قیادت کی ذمے داری مجھے سونپی تھی۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور قیادت کے لیے واپس گیا۔ ڈیبرا سے کہہ دیا تھا کہ مجھے صورتِ حال سے آگاہ رکھے۔ واپس جا کر میں نے تمہارے بارے میں حقیقت کسی کو نہیں بتائی۔''

''مجھے بھی نہیں۔'' اسد گیلانی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''خبر چھپانا ضروری تھا۔''

''آخر میں ہوا کیا؟ وہ بتاؤ!'' پشمینہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''تفصیل سے پھر کسی وقت بتاؤں گا۔'' دانش نے کہا، پھر ہچکچاتا ہوا بولا۔ ''صدر حیات...... مارے گئے۔''

پشمینہ یک لخت نہ صرف چپ ہوئی بلکہ اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ تمام تر مخالفتوں کے باوجود وہ صدر حیات کی بیٹی تو تھی۔

اس وقت قدسیہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

پشمینہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت خود اس کی آنکھیں بھی قدرے بھیگی سی تھیں۔

''آفتاب بھی زندہ نہیں رہے۔'' دانش نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''انہیں پہلے ہی گولیاں ماری جا چکی تھیں۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دو گولیاں صدر حیات کے ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ ایسا کیوں ہوا۔''

قدسیہ، پشمینہ پر جھکی اور اس کے شانے سے سر لگا کر سسکیاں لینے لگی۔ سسکیاں لیتے ہوئے اس نے کہا کہ جب اچانک پشمینہ نے اسے ہیلی کاپٹر میں بٹھایا تھا، اسی وقت وہ ساری بات سمجھ گئی تھی اور اسے یہ خیال بھی آ گیا تھا کہ شاید وہ دوبارہ اپنے شوہر کو زندہ نہ دیکھ سکے۔

پشمینہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ سب تو ہونا ہی تھا۔'' پشمینہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''مجھے شروع ہی سے اندازہ تھا۔ پھر بھی یہ خبر سن کر جھٹکا تو میرے ذہن کو بھی لگا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

''ممی کہاں گئی ہیں؟'' اس کی آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔

''ایک مہینا دس دن وہ یہیں رہی ہیں۔ بس چپ رہتی تھیں۔ صدر حیات کے بارے میں انہیں بھی علم ہو گیا تھا۔ وہ صرف تمہارے لیے یہاں رکی ہوئی تھیں لیکن یہ بھی کہتی رہی تھیں کہ وہ تم سے ناراض ہیں۔ ابھی جب تمہیں ہوش آیا تھا تو تم فوری طور پر ہم میں سے کسی کو نہیں پہچان سکی تھیں۔ اس وقت وہ بھی یہیں تھیں۔ تمہیں ہوش میں آتا دیکھ کر فوراً یہاں سے چلی گئیں۔''

''کہاں؟''

''میں نے تو چاہا تھا کہ وہ تمہارے گھر جائیں لیکن انہوں نے کچھ دن پہلے ہی ایک ہوٹل میں کمرا بک کروا لیا تھا۔ وہ وہیں گئی ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی زندگی ان کے شوہر کے ساتھ ہی ختم ہو۔''

پشمینہ چپ رہ گئی۔

''ملکی صورتِ حال اب بالکل ٹھیک ہو چکی ہے۔''

دانش یزدانی نے پشمینہ کا دھیان ہٹانے کے لیے دوسری باتیں چھیڑ دیں۔ ''آرمی چیف کو غالباً یقین تھا کہ کیا ہوگا۔ اسی لیے انہوں نے کچھ تیاریاں کرلی تھیں۔ حکومت کے خاتمے کے بعد انہوں نے اسی دن ایک فوجی کونسل قائم کردی تاکہ ملک کا نظم و نسق کسی حد تک تو سنبھالا جاسکے اور پھر تین دن بعد ہی ٹیکنوکریٹس کی حکومت بنوادی تھی۔ عبوری وزیر اعظم کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ جلد از جلد انتخاب کروائے۔ تمہیں چند دن پہلے ہوش آیا تھا تو برطانوی ڈاکٹروں نے تمہاری بے ہوشی کے بعد کہا تھا کہ اب تم ہوش میں آؤ گی تو ہوش میں ہی رہوگی۔ آرمی چیف برابر یہاں اسپتال کے ڈاکٹروں سے رابطے میں رہ کر تمہاری خیریت دریافت کرتے رہے۔ کئی مرتبہ مجھ سے بھی ملک کی سیاسی صورتِ حال پر گفتگو کی۔ کل انہی کے ایما پر عبوری وزیر اعظم نے آئندہ پندرہ دن میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان کردیا ہے۔ میں پارٹی کے کاموں سے غافل نہیں رہا تھا۔ ری پبلکن فورم نے ہر شہر سے لوگوں کو انتخاب کے لیے کھڑا کیا ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ہماری پارٹی بھاری اکثریت سے جیتے گی جو سیاسی پارٹیاں ہمارے ساتھ بعد میں شامل ہوئی تھیں، ان سے انتخابات کے معاملے میں اتحاد کرنے سے میں نے صاف انکار کردیا تھا۔''

''تم نے بھی کاغذات داخل کردیے ہیں؟'' پشمینہ نے پوچھا۔

''ہاں، اور تمہارے بھی۔''

''میرے؟'' پشمینہ حیران ہوئی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''عبوری حکومت آرمی چیف کے اشارے پر کام کررہی ہے۔ کاغذات پہلے ہی چھپوا لیے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ جب بھی تم کچھ ہوش میں آؤ، تم سے دستخط کروا لیے جائیں۔ چند دن پہلے جب تم ہوش میں آئی تھیں، اس وقت کی کوئی بات تمہیں یاد نہیں۔ میں نے اسی وقت تم سے دستخط کروا لیے تھے۔''

''اوہ!'' پشمینہ کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ اس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوا کہ اسے خوشی ہوئی تھی۔

اس دوران میں قدسیہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''کسی طرح ممی کو لاؤ دانش!'' پشمینہ کچھ توقف سے بولی۔

''نہیں آئیں گی وہ۔'' دانش نے جواب دیا۔ ''تم اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد خود ہی انہیں منانا۔''

''ہوں۔'' پشمینہ چند لمحے چپ رہی، پھر اس نے قدسیہ سے کہا۔ ''آپ اتنے دن تک کہاں رہیں؟''

''میں بھی ممی کے ساتھ یہیں رہی ہوں۔ اب میں چاہتی تھی کہ تم سے اجازت لوں۔''

''ممی کے پاس ہوٹل ہی جائیں۔ جب تک میں اسپتال میں ہوں، ان کی خبر گیری آپ ہی کو کرنی ہوگی۔''

''میں پہلے ہی یہ فیصلہ کرچکی تھی پشمینہ۔''

''تو جائیے...... ان کا دھیان رکھیے۔'' پشمینہ اداس نظر آئی۔

قدسیہ کے جانے کے بعد پشمینہ نے اسد گیلانی سے کہا۔ ''آپ بالکل چپ ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ سے کیا بات کروں۔ اگرچہ آتشِ بغاوت آپ ہی کی وجہ سے بھڑکی تھی۔ جو کچھ ہوا، اس کا اندازہ بھی آپ کو پہلے سے تھا۔ اس کے باوجود اب آپ...... میرا مطلب ہے...... نتائج سننے کے بعد آپ کا دل بوجھل تو ہوگیا ہوگا۔''

پشمینہ نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کرلیں۔

''اب تمہاری طرف سے تو اطمینان ہوگیا ہے۔'' دانش بولا۔ ''یہاں کی ہر نرس دل و جان سے تمہارا خیال رکھنا چاہتی ہے اس لیے اب مجھے اور انہیں بھی اجازت دو۔'' اس نے اسد گیلانی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں انتخابات کی بھرپور سرگرمیاں جاری رکھنی ہوں گی۔''

''ہاں۔'' پشمینہ نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ ''جب تک میں ٹھیک نہیں ہوجاتی، تمہیں شب و روز کام کرنا ہوگا۔ ہاں ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گئی۔ عوام اب تو جان گئے ہوں گے کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔''

''اس بارے میں تو فوراً ہی بتادیا گیا تھا۔ اس وقت ہر شہر، بلکہ ہر کوچے میں تمہاری صحت یابی کی دعائیں مانگی جارہی ہیں۔ سارا ملک تم سے والہانہ محبت کرنے لگا ہے۔ تم ابھی ٹی وی کھلوا لینا۔ تمہارے بارے میں پروگرام اب بھی جاری ہیں۔ اور ہاں!'' دانش نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ''تمہارا موبائل میرے پاس ہے۔'' اس نے موبائل نکال کر پشمینہ کو دیا۔ ''یہ بند رکھا تھا میں نے۔''

''اچھا کیا تھا۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''اب جائیے آپ دونوں۔'' اس نے اسد گیلانی کی طرف دیکھا۔ ''میری عدم موجودگی میں آپ دونوں پر بھاری ذمے داریاں ہیں پارٹی کی۔''

''پارٹی کے سبھی لوگ جوش و خروش سے کام کررہے ہیں۔ فون پر آپ کی خیریت بھی معلوم کرتے رہتے ہیں۔''

پشمینہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ان دونوں کو رخصت کرنے کے بعد پشمینہ نے اپنا موبائل کھولا اور روبینہ حیات سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف گھنٹی تو بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔

''کب تک ناراض رہیں گی ممی!'' اس نے زیرِلب بڑبڑا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا ٹی وی کھول دوں میڈم؟'' نرس نے پوچھا۔

پشمینہ نے اشارے سے اجازت دی۔ نرس نے ٹی وی کھولا اور ریموٹ پشمینہ کو دے دیا۔

دن کا وقت تھا اس لیے گزشتہ رات کے پروگرام ریپیٹ کیے جا رہے تھے۔ جو چینل اس وقت لگا تھا، وہ کوئی مزاحیہ پروگرام دے رہا تھا۔ پشمینہ نے چینل بدلا۔ پھر دوسرا، تیسرا، چوتھے چینل پر وہ رک گئی۔ اس پر ٹاک شو ہو رہا تھا۔ بات ری پبلکن فورم ہی کی ہو رہی تھی۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ انتخابات میں ری پبلکن پارٹی سوئپ کرے گی، اسے صرف مذہبی جماعتوں کے ووٹ نہیں ملیں گے۔

پھر یکایک پروگرام رکا اور ''بریکنگ نیوز'' کا سلائڈ آیا۔

بریکنگ نیوز یہ تھی کہ پشمینہ حیات اب مکمل ہوش میں ہیں اور چند ہی دن میں اسپتال سے ڈسچارج کر دی جائیں گی۔

پھر اس خبر پر دیگر تجزیہ کاروں کی رائے لی جانے لگی۔ وہ سبھی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

پشمینہ نے ٹی وی بند کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد اس نے پھر ٹی وی کھولا۔ اب تقریباً ہر چینل پر اسی کے بارے میں لائیو پروگرام چل رہے تھے۔ مختلف شہروں کی صورتِ حال بتائی جا رہی تھی جہاں پشمینہ حیات کی صحت یابی کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔

ایک چینل پر اس کا نمائندہ کسی بازار میں کھڑا لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ اب وہ کیا محسوس کر رہے ہیں۔

وہاں بھی لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا اور ایک صاحب نے تو جواب دینے کے بجائے ''پشمینہ حیات، وزیرِاعظم، زندہ باد'' کا نعرہ لگا دیا۔

نرس نے فوراً پشمینہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ اس وقت بھی سپاٹ تھا۔ وہ چینل بدلتی رہی۔ ہر جگہ یہی ہو رہا تھا۔ پھر یکایک وہ ایک چینل پر رکی، اس پر صدر حیات کا انجام دکھایا جا رہا تھا۔ اس کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش سڑکوں پر گھسیٹی جا رہی تھی۔

''نو......!'' پشمینہ چیخ پڑی اور پھر آنکھیں بند کر کے سسکیاں لینے لگی۔

نرس نے جلدی سے ٹی وی بند کر دیا۔

انسان کتنا بھی اصول پسند اور اصول پرست کیوں نہ ہو، خون کا اثر تو اپنا رنگ دکھا ہی دیتا ہے۔

پانچ دن بعد پشمینہ کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس دوران میں وہ ٹی وی کے ذریعے سیاسی ہنگاموں سے باخبر ہوتی رہی تھی۔ دانش اور پارٹی کے دیگر سرکردہ افراد بھی آ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہے تھے۔ دو مرتبہ اقصیٰ بھی اس سے ملنے آئی تھی۔ اس نے بہت سے لوگوں کے اصرار کے باوجود انتخابات میں کھڑے ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

''میں اپنا صرف وہی مشن جاری رکھنا چاہتی ہوں جس کی ذمے داری میرے والد نے مجھے سونپی تھی۔'' اس کا مستحکم جواب تھا۔

جب پشمینہ پارٹی کے سرکردہ افراد کے ساتھ باہر نکلی تو بے شمار لوگ وہاں جمع تھے اور پشمینہ حیات کے نعرے لگا رہے تھے۔

چند فوجی سپاہی بمشکل اسے اس کی کار تک پہنچا سکے۔ پشمینہ ان کی موجودگی پر حیران تھی۔ پھر اس وقت اس کی حیرت میں اضافہ ہوا جب اس کی کار کے آگے پیچھے بھی فوجی گاڑیاں تھیں۔

''یہ سب کیا ہے دانش؟'' وہ بول پڑی۔

کار میں اس کے ساتھ دانش بیٹھا تھا۔ ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر ڈیبرا تھی۔

''یہ آرمی چیف کا فیصلہ ہے کہ تمہیں سیکیورٹی فوج ہی کی طرف سے دی جائے گی۔''

''مگر کیوں؟ مجھے کسی سے کیا خطرہ ہے؟''

''خطرہ ہو یا نہ ہو، مستقبل میں اس ملک کی وزیرِاعظم تو تم ہی ہو۔''

''ہرگز نہیں۔'' پشمینہ نے سختی سے کہا۔ ''میں وزیرِاعظم نہیں بننا چاہتی۔''

''تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' دانش مسکرایا۔ ''تم سیاسی کمپین میں حصہ لو یا نہ لو، ووٹ تمہیں ہی ملیں گے۔ تمہارے مقابل صرف ایک مذہبی جماعت کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اسے شاید دو چار ہزار ووٹ مل جائیں۔ کامیاب تو تم ہی ہو گی۔ اسمبلی میں تم پہنچو گی اور جب

لیڈر آف دی ہاؤس کا انتخاب ہوگا تو بھی سارے ووٹ تمہیں ہی ملیں گے۔‘‘

’’یہ میں نہیں ہونے دوں گی۔ میں تو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کاغذات ہی جمع نہیں کراتی۔ میں اسمبلی سے مستعفی ہوجاؤں گی۔ لیڈر آف دی ہاؤس تم ہوگے۔ میں پارٹی کی چیئر پرسن ہی رہنا چاہتی ہوں۔ پارٹی کے منتخب ارکان میری بات ٹال نہیں سکتے۔ وہ تمہارے ہی حق میں ووٹ دیں گے۔ لیڈر آف دی ہاؤس، اس ملک کے وزیراعظم تم ہی بنو گے دانش۔‘‘

’’تم دیکھنا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہوگا۔ بے پناہ لوگ سڑکوں پر آجائیں گے اور ان کے مطالبے پر تمہیں اپنا استعفا واپس لینا ہی پڑے گا۔ تم تو آج نکلی ہو باہر۔ میں تو اتنے دن سے حالات کا مشاہدہ کررہا ہوں۔ لوگ صرف تمہیں وزیراعظم دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔‘‘

پشمینہ کوئی جواب دینے کے بجائے چونکی۔ ’’ہم کدھر جارہے ہیں؟‘‘

’’تم اب اپنے گھر ہی جاؤ گی نا...... ٹیرس پر تباہ ہونے والے ہیلی کاپٹر کا ملبا صاف کردیا گیا ہے۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ پشمینہ نے کہا۔ ’’میں پہلے ممی کے پاس جاؤں گی۔‘‘

’’او، ہاں! مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔‘‘

دانش نے جیب سے موبائل نکال کر غالباً سیکیورٹی ہی کے کسی شخص سے بات کی، پھر موبائل بند کرکے جیب میں ڈال لیا اور ڈرائیور سے کہا۔ ’’آگے جو سیکیورٹی کی دو گاڑیاں چل رہی ہیں، وہ اب اپنا رخ بدلیں گی۔ انہی کے پیچھے چلنا۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر۔‘‘ ڈرائیور نے جواب دیا۔

اس کے بعد دانش نے پشمینہ سے پھر وزیراعظم کی بات چھیڑی لیکن پشمینہ سختی سے اپنے موقف پر قائم رہی۔

’’لوگوں کا ہجوم تم سے فیصلہ بدلوالے گا۔‘‘ دانش نے اس وقت کہا جب کار ہوٹل پہنچ کر رکی۔

روبینہ حیات کا کمرا پہلی ہی منزل پر تھا۔ وہاں بھی دو سیکیورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ اس پر پشمینہ کو تعجب نہیں ہوا۔ ملک کے سابق صدر کی بیوہ کو سیکیورٹی ملنی ہی چاہیے تھی۔

قدسیہ نے انہیں بتایا کہ روبینہ حیات زیادہ وقت کمرے میں بند رہ کر گزارتی ہیں۔

’’کمرا ان کا آپ ہی کھلوایئے۔‘‘ پشمینہ نے کہا۔ ’’میری آواز سن کر شاید وہ دروازہ نہ کھولیں۔ جب ملوں گی تو انہیں منا ہی لوں گی۔ اگر انہیں مجھ سے نفرت ہوجاتی تو وہ ایک مہینا دس دن تک اسپتال میں نہ رکتیں۔‘‘

قدسیہ نے سر ہلایا۔

’’تم یہیں رکو دانش۔‘‘ پشمینہ نے کہا۔ ’’تم بھی ڈیبرا۔‘‘

وہ دونوں وہیں رک گئے۔ قدسیہ اور پشمینہ کمرے کے دروازے پر گئیں۔ قدسیہ نے دروازے پر دستک دی۔

’’کون؟ قدسیہ؟‘‘ اندر سے روبینہ حیات کی آواز آئی جو غم زدہ تھی۔

’’جی ممی! ایک بات بتانا ہے آپ کو۔‘‘

دوسری طرف قدموں کی آہٹ ہوئی جو دروازے کے قریب آکر رکی، پھر دروازہ کھلا۔ پشمینہ کو دیکھ کر روبینہ حیات چونک گئیں۔

’’ممی!‘‘ پشمینہ کی آواز میں لرزش تھی۔ ’’آپ کی بیٹی زندہ بچ گئی ہے سر میں گولی کھا کر بھی، اور آپ سے ملنے آئی ہے۔‘‘

روبینہ حیات کچھ کہے بغیر مڑ کر اپنے بستر پر جا بیٹھی۔

پشمینہ اور قدسیہ اندر داخل ہوئیں۔ پشمینہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

’’میں تمہیں معاف نہیں کرسکتی۔‘‘ روبینہ حیات نے لرزتے ہونٹوں سے کہا۔ ’’تم نے مجھے دھوکا دیا۔ تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے ملنے آرہی ہو لیکن تم مجھے ہی وہاں سے لے آئیں۔‘‘

’’تو کیا آپ کو بھی کھو دیتی؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’ممی!‘‘ پشمینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ’’باپ کے بعد میں آپ کو نہیں کھونا چاہتی لیکن آپ اپنی بیٹی کو ضرور کھودیں گی۔‘‘

روبینہ حیات اس کا مطلب ہی نہیں سمجھی ہوگی۔

پشمینہ پھر بولی۔ ’’اگر آپ نے مجھے گلے نہ لگایا تو...... ابھی تو میرے پاس ریوالور نہیں ہے لیکن گھر پر ہے، چلی جاتی ہوں میں یہاں سے...... گھنٹے بھر کے اندر آپ کو اطلاع مل جائے گی کہ آپ کی بیٹی نے خودکشی کرلی۔‘‘

جواب سنے بغیر پشمینہ تیزی سے مڑی۔ اس کی آنکھوں سے اب آنسو بہہ رہے تھے۔

’’پشمینہ!‘‘ روبینہ حیات چیخ کر اٹھی۔

پشمینہ ماں کی طرف مڑی لیکن اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھی۔ خود روبینہ حیات نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پشمینہ کی آنکھوں سے بھی آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

قدرے فاصلے پر کھڑی قدسیہ کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

اچھوتی محبت

ام اقبال

کسی کے دل میں چاہت کی ندیا دھیرے دھیرے بہتی ہے تو کہیں طوفانی لہریں اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔اس کی آنکھوں میں بھی تسخیرِ کائنات کا خواب تھا مگر کسی کو عشق میں سرِبازار رسوائی منظور نہ تھی۔ جبکہ وہ ایسی محبت کی آرزومند تھی جو ندیا کے دونوں کناروں کے مابین پانی کے مانند بہتی ہو اور چاہتی تھی کہ یہ دونوں کنارے ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جو پانی آگے بڑھ جاتا ہے کنارے اس کا ساتھ نہیں دیتے... پیچھے سے آنے والا پانی ان کی ہریالی کا سبب بنتا ہے۔زندگی کے اس فلسفے کو وہ آخری سانس تک نہ سمجھ سکی،کیونکہ وہ ایک ایسی عجیب میکانکی محبت کے حصار میں تھی جس میں جذبات کے گرداب نے اس کی آنکھوں میں دھول اور دامن میں خاک بھر دی تھی... وہ جو غفلت میں عجلت کا شکار تھی... محبت میں رقابت کو ہوا دے رہی تھی... خواہشوں کے دھوکے میں سازشوں میں پناہ تلاش کررہی تھی... معلوم نہیں اس کی جنوں خیزی میں کس کا ہاتھ تھا، معاشرتی نظام کا، جدید سہولتوں یا خیالات کی بے سمت اڑان کا... جو کچھ بھی تھا اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے... اسیری خواہشوں کی ہو یا سلاخوں کی... ذہنی تباہی کا سبب ضرور بنتی ہے... اور بالآخر بن گئی۔

[illegible]

سب جانتے تھے کہ ساحرہ احسن کی دیوانی ہے مگر ... جانے کیوں ان دنوں بے کلی کا شکار رہنے لگی تھی۔ اسی کیفیت میں کچھ دن گزر گئے۔اپنے آخری پرچے سے ایک دن قبل ساحرہ نے احسن کو بتایا۔ ”تین دن بعد میری شادی ہونے والی ہے۔“

اس کے چہرے پر بہت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔احسن اس کا منہ تکتا رہ گیا۔انداز کچھ ایسا تھا جیسے سکتہ ہوگیا ہو۔

”یہ تمہیں کیا ہوگیا احسن!“ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے ساحرہ سنجیدہ ہوگئی۔ ”یہ خبر تمہارے لیے غیر متوقع تو نہیں ہونا چاہیے تھی۔ میں نے امتحانات شروع ہونے سے پہلے تم سے جو باتیں کی تھیں،کیا وہ تمہیں یاد نہیں؟“

”یاد...... ہیں......“ احسن کی آواز بھرا گئی۔

”تو پھر اب کیا ہوا؟“

احسن جذباتی ہوگیا۔ ”ہر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن اسے موت آئے گی۔اس کے باوجود وہ ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے لیکن جب موت اچانک اس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے تو اس کی حالت غیر ہوجاتی ہے۔“

”ایسی باتیں کرکے میرا دل نہ دکھاؤ احسن......! میری شادی کہیں بھی ہو، محبت تو مجھے تم ہی سے ہے اور رہے گی۔“

”شاید یہ دنیا کی پہلی اور آخری انوکھی محبت ہوگی۔“ احسن نے افسردگی میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اگر تم تنہائی میں مجھ سے ملتے رہتے تو میں یہ شادی نہیں کرتی۔جب تک تمہیں ملازمت نہیں مل جاتی، میں انتظار کرلیتی لیکن تم اس کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے!“

”مجھے حیرت ہے کہ تم اس قسم کی باتیں اتنی بے حجابی سے کرتی کیسے ہو۔“ احسن کے لہجے میں تلخی آگئی۔

”مگر میں یہ باتیں تمہارے علاوہ کسی سے نہیں کرتی۔“ ساحرہ نے سنجیدگی سے برجستہ کہا۔ ”میں تم سے جسمانی طور پر نہ سہی لیکن ذہنی طور پر تو بہت قریب ہوں۔ چار سال کے قریب گزر چکے ہیں،ہمیں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے اور اس سارے وقت میں ہم ایک دوسرے کی محبت سے سرشار رہے ہیں۔میں تم سے ہی یہ باتیں کرسکتی ہوں۔“

”ہوں۔“ احسن نے نظریں دوسری طرف کرلیں۔

”احسن! جو باتیں میں نے پرچے شروع ہونے سے



پہلے تم سے بہت کھل کر کی تھیں، اس کے بعد تو تمہیں میرا مزاج سمجھ لینا چاہیے تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کو بہت کشادہ دلی سے تسلیم کرنا چاہیے احسن!''

''آج تو تم کچھ زیادہ ہی بالغ ہونے کا ثبوت دے رہی ہو۔'' احسن کے لہجے میں پہلے سے زیادہ تلخی تھی۔ ''زندگی کی حقیقتوں کو خوب سمجھنے لگی ہو۔''

''کیا آج طنز ہی کرتے رہو گے؟''

''جب دل پر قیامت گزر جائے تو آدمی کی زبان سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔''

''کیوں قیامت گزر رہی ہے تمہارے دل پر! کیا تم نے میری ان باتوں کو مذاق سمجھا تھا کہ شادی اور محبت، دو مختلف باتیں ہیں؟'' ساحرہ اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ''میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ محبت تو مجھے تم سے ہی رہے گی۔''

''انوکھی محبت!'' احسن نے دہرایا۔

''تم اسے کوئی بھی نام دے لو۔ میں نے جو کہا ہے، وہ حقیقت ہے۔''

''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری زندگی برباد کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔''

''ہرگز نہیں۔'' ساحرہ مسکرائی۔ ''جب تمہیں ملازمت مل جائے گی تو میں خود تمہاری شادی کراؤں گی۔ خود ڈھونڈوں گی تمہارے لیے کوئی بہت خوب صورت سی لڑکی...... میں تو خوب صورت بھی نہیں ہوں احسن!...... یہ بات شاید دنیا کی کوئی لڑکی اپنی زبان پر نہیں لا سکتی لیکن میں ہر حقیقت کو کشادہ دلی سے قبول کرتی ہوں۔''

احسن کچھ نہیں بولا۔ اس کے دل و دماغ کی کشمکش خوف ناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

ساحرہ پھر بولی۔ ''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ میں شادی کے بعد بھی تم سے ملتی رہوں گی۔ خواہ تم مجھ سے تنہائی میں ملو یا نہ ملو۔ ہاں اگر تنہائی میں ملو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں تم سے یہ بھی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے شوہر کی ملکیت نہیں بنوں گی۔''

احسن اب بھی خاموش رہا۔

''کیا اب تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے؟'' ساحرہ نے کچھ افسردگی سے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔''

احسن کے دماغ نے کچھ الفاظ اس کی زبان کی طرف دھکیل ہی دیے۔

''اچھا سنو!'' ساحرہ نے کہا اور کچھ سوچنے لگی۔

احسن کچھ نہیں بولا۔ اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم بھی تیزی سے اٹھنے لگے تھے۔ یہ وہی پارک کی فٹ پاتھ تھی جہاں وہ بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔

''میں اب بھی اس شادی سے انکار کر سکتی ہوں۔'' ساحرہ خاصے توقف کے بعد بولی۔

احسن چلتے چلتے ایک جھٹکے سے رک گیا۔ ''تو کر دو انکار!'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''مگر اس کی ایک شرط ہے۔'' ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن رکو مت، چلتے رہو! لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے ہیں۔''

یہ بات احسن نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ پھر چلنے لگا۔ اس مرتبہ اس کی رفتار سست تھی۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا شرط ہے؟''

''میری شدید خواہش ہے کہ میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تم ہو۔'' ساحرہ نے کہا۔ ''اگر ہماری ملاقاتیں تنہائی میں ہونے لگیں تو میں انکار کر لوں گی۔ جب تمہیں ملازمت مل جائے گی تو ہم شادی کر لیں گے۔''

''نہیں۔'' احسن نے تیزی سے کہا۔ ''شادی سے پہلے یہ ممکن نہیں۔''

''خود کو اس جھوٹے معاشرے سے باندھے رکھو گے!'' اس مرتبہ ساحرہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں تمہاری بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے بس اتنا کہوں گا کہ اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں تو یہ معاشرہ تلپٹ ہو کر رہ جائے۔ جنگل بن جائے گی یہ دنیا جہاں صرف جانور رہتے ہوں گے۔''

ساحرہ یہ کہتے کہتے رک گئی کہ جانور تو انسان بھی ہے۔ وہ رکی اس لیے کہ اس نے احسن کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ اس نے ''جانور'' کا لفظ لغوی معنوں میں استعمال نہیں کیا تھا۔

''جانوروں کی سی وحشت۔'' احسن پھر بولا۔ ''میں اپنے اندر نہیں سمو سکتا۔''

''میں بھی تو مجبور ہوں احسن!'' ساحرہ نے سنجیدگی سے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میرے اندر کی آگ مجھے اندر سے جلاتی چلی جا رہی ہے۔ اگر اس پر پانی نہیں پڑا تو میں جل جل کر خاک ہو جاؤں گی۔ میری دوست شیبا کو تو تم جانتے ہی ہو۔ میں اس وقت اسی کے گھر جا کے اس کے ساتھ اسٹڈی کرتی

ہوں۔ اس کے ساتھ اسٹڈی کرنا تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس طرح مجھے تم سے ملنے کا موقع آسانی سے مل جاتا ہے۔"

"یہ سب میں جانتا ہوں۔"

"ہاں۔" ساحرہ نے کہا۔ "میں یونہی رو میں بولتی چلی گئی۔ میں تمہیں شیبا کی بات بتانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال بھی یہ ہے کہ میری شادی جلد از جلد نہ ہوئی تو میری صحت برباد ہو جائے گی۔ کل تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ صحت کی وہ بربادی کسی مرض کا سبب بھی بن سکتی ہے۔"

"غلط کہا ہے شیبا نے۔" احسن پھر تیزی سے بولا۔ "یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا ہے کہ تم اس معاملے میں ابنارمل ہو، لیکن زیادہ وقت گزر جانے سے یہ ابنارملٹی کسی بیماری کا سبب نہیں بن سکتی۔"

ساحرہ اس بات کا جواب نہیں دے سکی۔ شیبا نے تو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ساحرہ نے اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جو راستے اپنا لیے تھے، وہ اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ ساحرہ اب اس معاملے میں بے بس بھی ہو چکی تھی۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر اس راستے پر دھیرے دھیرے آگے بڑھی تھی اور اب اتنا آگے جا چکی تھی کہ واپسی کا امکان نہیں رہا تھا۔ کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی لیکن احسن کو وہ یہ سب کچھ نہیں بتا سکی۔

"میں اس معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتی احسن!" ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن یہ ایک بار پھر کہوں گی کہ تم سے میری محبت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ شادی اور محبت کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں، ان سے بھی تم واقف ہو چکے ہو۔ میں اپنے شوہر کی ملکیت نہیں بنوں گی۔ اگر آج کا مرد پوری طرح آزاد ہے تو عورت کیوں نہیں!"

"عورت کی یہ آزادی اس معاشرے کو......"

"پلیز احسن!" ساحرہ نے چڑ کر کہا۔ "مجھے اس جھوٹے معاشرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تو پھر شادی کے بغیر ہی آزاد ہو جاؤ۔" احسن نے تلخی سے کہا۔

یہ ساحرہ کے لیے ایک معاشرتی مجبوری تھی لیکن وہ ضدی یہ لفظ "معاشرہ" اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔

وہ بولی۔ "شادی اس لیے ضروری ہے کہ بات لیگلائز ہو جائے۔"

"تو کیا یہ معاشرے کا خوف نہیں؟" احسن نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" ساحرہ نے کہا۔ "میں اپنے والدین کی وجہ سے، صرف والدین کی وجہ سے مجبور ہوں۔"

"لیکن مجھ سے تنہائی میں ملنے کے لیے تیار ہو۔"

"تمہاری بات اور ہے۔ معاملہ اگر کھل بھی گیا تو تم سے میری شادی ہو جائے گی۔ بات کھلنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن تمہاری جگہ کوئی اور ہوا اور بات کھل گئی اور وہ مجھ سے شادی کے لیے بھی تیار نہیں ہوا تو میرے والدین کو اس بدنامی سے شدید صدمہ پہنچے گا۔ رہی میری بات، تو میں اسے برا ہی نہیں سمجھتی اور نہ یہ بدنامی کا سبب بننا چاہیے لیکن بدبخت...... بدبخت......" وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

وہ "معاشرے" کا لفظ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔

"بدبخت۔" احسن نے تلخی سے کہا۔ "چپ کیوں ہو گئیں؟ بات پوری کرو۔ معاشرہ ہی کہنا چاہتی تھیں نا!"

"ہاں۔" ساحرہ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہ بدبخت، جھوٹا معاشرہ!"

"جس کی بنیاد......"

"بس آ گئی۔" ساحرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

وہ دونوں بس اسٹاپ پر پہنچ گئے تھے اور اتفاق سے اسی وقت بس آ کر رکی تھی۔

"میں تم سے فون پر رابطہ کروں گی۔" ساحرہ نے کہا اور بس میں سوار ہونے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئی۔

احسن گم صم کھڑا ساحرہ کو بس میں سوار ہوتے دیکھتا رہ گیا۔

بس میں بیٹھی ہوئی ساحرہ کچھ دیر افسردہ رہی۔ اسے قدرے دکھ یہ تھا کہ اس کی شادی کی خبر احسن سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔ ساحرہ سوچ رہی تھی کہ بعض مردوں کی سوچ ایسی کیوں ہوتی ہے؟ وہ محبت کے نتیجے میں اسی لڑکی سے شادی کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

اور یہ احسن؟...... ساحرہ نے بیٹھے بیٹھے منہ بناتے ہوئے سوچا، وہ تو بس "معاشرہ، معاشرہ" رٹتا رہتا ہے، پاگل!

خیر! اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا کہ وہ احسن کے لیے کوئی بہت خوب صورت لڑکی تلاش کرے گی۔ ان دونوں کی شادی کرا دے گی۔ احسن بھول جائے گا کہ محبت کے نتیجے میں شادی ضروری ہے۔

اسی قسم کی سوچ بچار کے ساتھ وہ بس سے اتر کر شیبا کے بنگلے کی طرف روانہ ہوئی۔

شیبا حسب معمول اپنے کمرے میں کتابیں لیے قالین پر بیٹھی تھی۔

ابتدائی رسمی گفتگو کے ساتھ ساحرہ نے شیبا کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنی ایک کتاب کھولی اور اگلے دن کے پرچے کے حوالے سے شیبا سے ایک سوال کیا۔

شیبا جواب دینے کے بجائے تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا جانی؟" ساحرہ ہنسی۔ "اس طرح کیوں دیکھنے لگیں......؟"

"معمول کے خلاف ہوا ہے آج۔" شیبا بولی۔ "تم تو کتابیں رکھ کر سیدھی کمپیوٹر کی طرف جایا کرتی تھیں۔"

"آج ذہن تھوڑا سا الجھا ہوا ہے۔"

"کیوں؟ اور ذہن الجھا ہوا ہے تو اسٹڈی کیا خاک کروگی۔"

"اسٹڈی شروع کروں گی تو وہ خیالات ذہن سے نکل جائیں گے۔"

"خیالات کیا ہیں؟"

"سب بتاؤں گی تمہیں! پہلے اسٹڈی کرلی جائے۔"

"اچھا!" شیبا نے طویل سانس لی۔ "جیسی تمہاری مرضی۔"

اس دن تک ساحرہ نے شیبا کو اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

شیبا نے اسٹڈی ختم کرنے سے چند منٹ پہلے کتابیں بند کردیں اور ساحرہ سے بولی۔ "کیا اب بھی تمہارا ذہن الجھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔" ساحرہ مسکرائی۔ "میں نے کہا تھا ناکہ اسٹڈی کروں گی تو وہ خیالات ذہن سے نکل جائیں گے۔"

"وہی خیالات تو جاننا چاہتی ہوں۔"

"خوش ہوجاؤ گی سن کر!"

"اگر ایسی بات ہے تو اس میں تمہارا ذہن کیوں الجھا ہوا تھا؟"

"الجھا ہوا تو احسن کی باتوں کی وجہ سے تھا۔ میں تمہیں یہ خوش خبری دینا چاہتی ہوں کہ پرسوں میری شادی ہورہی ہے۔"

"پرسوں؟" شیبا چونکی۔ "اور تم مجھے آج بتا رہی ہو؟...... بات اچانک تو طے نہیں ہوئی ہوگی۔"

"ہاں بات تو چند روز سے چل رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ معاملات جب طے پاجائیں گے، تبھی تمہیں بتاؤں گی۔ سب کچھ آج صبح فائنل ہوا ہے۔ پرسوں کی تاریخ بھی طے پاگئی ہے۔"

"اب اتنی جلدی ہوگئی احسن کو!" شیبا نے ہنس کر کہا۔ "کہاں ملازمت مل گئی اسے؟"

"ملازمت تو اسے ابھی نہیں ملی......اور بات بھی تم شاید غلط سمجھ رہی ہو۔ میری شادی احسن سے نہیں ہورہی ہے۔"

"کیا!" شیبا چونکی۔

"ہاں۔" ساحرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری شادی کہیں اور ہورہی ہے۔ اسی اطلاع پر تو احسن نے ایسی باتیں کی تھیں کہ وقتی طور پر میرا ذہن الجھ گیا تھا۔"

"وقتی طور پر؟" شیبا اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔" ساحرہ نے کہا۔ "احسن کو جھٹکا سا لگا تھا یہ سن کر۔ لیکن مجھے امید ہے کہ وہ کچھ دن میں ٹھیک ہوجائے گا۔"

شیبا کی حیرت کم نہیں ہوئی۔ "اور تم بالکل مطمئن نظر آرہی ہو۔"

"کیا مجھے مطمئن نہیں ہونا چاہیے؟ کیا تم ہی نے یہ نہیں کہا تھا کہ میری شادی جلد از جلد ہونا چاہیے؟"

"لیکن میرا خیال تھا کہ تم احسن کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروگی۔"

"اب میں بھی کیا کرتی! وہ ملازمت ملنے سے پہلے شادی کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔"

"کیا تمہیں اس سے محبت نہیں؟"

"وہ تو ہے۔"

"تو تم نے اسے سمجھایا کیوں نہیں کہ وہ ملازمت کی شرط ختم کردے؟"

"سمجھایا تھا۔ وہ مانا ہی نہیں۔"

"شادی تمہارے والدین نے طے کی ہے؟"

"ہاں۔"

"احسن کو بہت صدمہ ہوا ہوگا لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ تمہیں بہت چاہتا تھا، بلکہ اب بھی چاہتا ہوگا۔"

"میں بھی اسے چاہتی ہوں جانی!"

"پھر بھی خوشی خوشی دوسری جگہ شادی کررہی ہو؟"

ساحرہ نے طویل سانس لی۔ "تم بھی احسن کی طرح باتیں کرنے لگیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے جانی کہ میری شادی دوسری جگہ ہورہی ہے؟"

"کچھ نہیں ہوتا اس سے؟"

"کچھ بھی نہیں! میں شادی کے بعد بھی احسن سے ملتی رہوں گی۔"

"شادی تو اب اس سے نہیں کرسکو گی۔"

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت اور شادی، دو الگ الگ باتیں ہیں۔'' شیبا اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

ساحرہ پھر بولی۔ ''جس سے محبت ہو، اس سے شادی ہو جائے تو اچھا ہے لیکن اگر نہ ہو...... میرا مطلب ہے کہ شادی کسی اور سے ہو جائے تو اس میں کوئی بہت زیادہ حرج تو نہیں۔ شادی کے بعد بیوی شوہر کی، یا شوہر بیوی کی ملکیت نہیں بن جاتا۔''

''تم نے اپنے ان خیالات کا اظہار پہلے کبھی نہیں کیا۔'' شیبا دھیمی آواز میں بولی۔ اس کے چہرے سے تشویش ظاہر ہونے لگی تھی۔

''کوئی ایسی بات ہی نہیں چھڑی۔''

''احسن تمہارے ان خیالات سے متفق ہے؟''

''متفق ہی تو نہیں۔'' ساحرہ نے منہ بنایا۔ ''جب میں یہاں آئی تھی تو اسی کی باتوں کی وجہ سے الجھی ہوئی تھی۔ وہ ایسا نظر آنے لگا تھا جیسے اس کی جان پر بن گئی ہو...... لیکن...... ٹھیک کرلوں گی میں اسے۔''

شیبا نے اس کی باتوں پر شاید دھیان نہیں دیا اور پوچھا۔ ''جہاں تمہاری شادی طے کی گئی ہے، کیا اس کے لیے تمہارے والدین نے تمہیں مجبور کیا تھا؟''

''نہیں تو......''

''یعنی تم اس شادی سے انکار بھی کرسکتی تھیں؟''

''ہاں، کرسکتی تھی۔''

''اور تم نے نہیں کیا؟'' شیبا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''کیوں کرتی؟ آخر تم بھی تو یہ کہہ چکی ہو کہ میری شادی جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔'' ساحرہ نے شیبا کی بات پھر دہرائی۔

''لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم احسن کے بجائے کسی اور سے شادی کرلو۔ اب مجھے اس پر یقین نہیں آسکتا کہ تم بھی اس سے محبت کرتی تھیں۔''

''کرتی تھی نہیں، اب بھی کرتی ہوں۔''

''جھوٹ بول رہی ہو تم!'' شیبا جھنجلائے ہوئے سے انداز میں کھڑی ہوگئی اور ٹہلتے ہوئے بولی۔ ''قیامت ڈھادی ہے تم نے احسن کے دل پر...... میں کالج کا زمانہ بھولی نہیں ہوں۔ جب ہم دونوں فرسٹ ایئر میں تھے۔ احسن تھرڈ ایئر میں تھا۔ ہم کلاس فیلو نہیں تھے لیکن جب بھی کسی وقت لڑکے لڑکیاں لان میں بیٹھی ہوتی تھیں یا کینٹین میں یکجائی ہوتیں تو احسن کی نظریں تمہارے چہرے کے علاوہ کسی چہرے پر نہیں جمتی تھیں۔''

ساحرہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سمجھنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ احسن کی طرف داری کرتے ہوئے شیبا جھنجلائی کیوں تھی اور اتنی جذباتی کیوں ہو رہی تھی۔

شیبا خاموش ہونے کے بعد بھی ٹہلتی رہی۔

''جانی!'' ساحرہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہ تو بہت ممکن ہے کہ تمہیں میری باتوں سے اتفاق نہ ہو لیکن تمہیں اتنا برہم تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع پر اب گفتگو نہ کریں۔'' شیبا کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' ساحرہ اپنی کتابیں سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ معمول کے مطابق شیبا اسے چھوڑنے کے لیے برآمدے تک آئی مگر اس کے انداز میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی۔

''جانی!'' ساحرہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''کیا بہت ناراض ہوگئی ہو مجھ سے؟ کیا تمہیں میرے خیالات برے لگے ہیں یا میرا احسن سے شادی نہ ہونا؟''

''سبھی کچھ......'' شیبا نے کہا۔ ''لیکن...... میں نے ابھی کہا تھا نا......! اب یہ باتیں نہ کرو۔''

''اتنا تو بتادو! کیا اب تم مجھ سے ناراض ہوگئی ہو؟''

''ایسا بہرحال نہیں ہے کہ اب میں تم سے ملنا ہی نہ چاہوں۔'' شیبا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''شکر ہے۔'' ساحرہ نے طویل سانس لی۔ ''میرے سینے سے بوجھ اتر گیا۔ اچھا، خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

ساحرہ اس کے بنگلے سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ یہ اسے کبھی معلوم نہیں ہوسکا کہ شیبا اسے رخصت کرنے کے بعد تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی تھی اور بستر پر گر سی پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس وقت ساحرہ اس کی یہ حالت دیکھتی تو سکتے میں رہ جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ شیبا پر یہ ردعمل کیوں ہوا تھا۔ ساحرہ تو کیا، کوئی بھی شیبا کی اس حالت کا سبب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ شیبا نے اپنے دل کی یہ بات کبھی کسی کو بتائی ہی نہیں تھی کہ احسن اس کا محبوب تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ کالج ہی کے زمانے میں وہ اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ احسن اسے بے تحاشا بھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ احسن کے قریب ہونے کی کوشش میں کامیاب ہونے کے بعد اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتی، اسے یکایک محسوس ہوا کہ احسن تو ساحرہ کی طرف متوجہ تھا اور ساحرہ بھی اس کی متوالی نظر آئی تھی۔

شیبا نے یہ احساس ہونے سے پہلے اپنے اور احسن کے بارے میں بہت سے خواب دیکھ ڈالے تھے اس لیے ساحرہ اور احسن کی محبت کا علم اس کے لیے ایک صدمے سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ دو تین روز تک اتنی نڈھال رہی تھی کہ کالج بھی نہیں جا سکی تھی۔

ساحرہ اور احسن کے بارے میں کالج کے دوسرے لڑکے لڑکیوں نے بھی محسوس کر لیا تھا جس کا سبب خود احسن کا رویہ تھا۔ ساحرہ کے سامنے آنے پر احسن کو اپنی آنکھوں پر جیسے اختیار ہی نہیں رہتا تھا۔ اس کی نگاہیں ساحرہ کے چہرے پر جم کر رہ جاتی تھیں۔ اس کے برخلاف ساحرہ میں ایسا جنون نہیں تھا لیکن محبت وہ احسن ہی سے کرنے لگی تھی۔ اسی لیے شیبا نے فیصلہ کیا تھا کہ ساحرہ اور احسن کے بیچ سے ہٹ جائے۔ اس نے دھیرے دھیرے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی اور اپنے دل کو سمجھایا تھا کہ انسان کو اپنی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے ضد نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے دماغ میں اکثر یہ خیال بھی آیا کہ اب وہ بھی کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ کالج میں وہ کوشش کرنے لگی کہ احسن سے اس کا آمنا سامنا ہی نہ ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ سے اس کا قرب دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ اس بڑھتے ہوئے قرب میں شیبا کی ہی کوششوں کا دخل تھا۔ وہ کوششیں لاشعوری بھی تھیں۔ اسی لیے ایک بار چونک گئی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا اس لیے کہ ساحرہ کے قرب سے اسے تسکین ملتی تھی کیونکہ اس کا محبوب ساحرہ کو چاہتا تھا۔

گویا لیلیٰ اور سگِ لیلیٰ کا سا معاملہ تھا۔

یہ احساس ہونے کے بعد شیبا پژمردگی سے مسکرا دی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شیبا نے ساحرہ کو اپنے بہت قریب کر لیا تھا۔ ان کی ملاقاتیں کالج کے باہر بھی ہوا کرتیں۔ کالج میں سبھی نے سمجھ لیا تھا کہ ساحرہ اور شیبا بہت گہری دوست بن گئی تھیں۔

ساحرہ جب شیبا سے اپنی اور احسن کی باتیں کرتی تو اس کا انداز بڑا والہانہ ہوا کرتا تھا۔ شیبا سوچا کرتی تھی کہ شادی کے بعد ساحرہ اور احسن کا جوڑا دنیا کی نظر میں ایک مثالی جوڑا ہوگا۔ مگر اب اچانک جیسے ساری دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس کو یہ جان کر شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا کہ ساحرہ کسی اور سے شادی کر رہی تھی۔ اسے یہ خیال قطعی نہیں آیا کہ اب اس کے لیے میدان صاف ہو گیا تھا اور وہ احسن تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ احسن اس کی پذیرائی ہرگز نہیں کرے گا۔ اس کا دل چور چور ہو چکا ہوگا۔

خود شیبا جس طرح یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب کبھی شادی نہیں کرے گی، اسی طرح احسن کا فیصلہ بھی یہی ہو سکتا تھا۔ ساحرہ سے اس کی چاہت بہت شدید تھی۔ اسے بہت گہرا صدمہ ہوا ہوگا۔ خود شیبا اس صدمے کو محسوس کر رہی تھی اور وہی صدمہ اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔

ساحرہ اور احسن کی محبت کا علم ہو جانے کے بعد شیبا نے احسن کا سامنا کرنے سے گریز کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی بہت کچھ سمجھایا تھا لیکن وہ احسن کی محبت کو اپنے دل سے مکمل طور پر تو کیا، ذرا بھی نہیں نکال سکی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ احسن اسے کبھی نہیں مل سکے گا لیکن اس نے اپنی تسکین کا ایک ذریعہ نکال لیا تھا کہ کبھی کبھی احسن کی آواز سن لیا کرتی تھی۔ اسے نہ جانے کب اور کس سے احسن کا موبائل فون نمبر معلوم ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی احسن کو فون کر لیا کرتی تھی اور فون کرنے کے لیے اس نے ایک نیا نمبر استعمال کیا تھا۔ احسن دوسری طرف سے ''ہیلو، ہیلو'' کرتا رہتا اور وہ خاموشی سے اس کی آواز سنتی رہتی۔

دو تین مرتبہ کے بعد جب احسن نے اس نمبر کی کال ریسیو کرنا چھوڑ دی تو شیبا نے ایک اور نمبر استعمال کیا۔ اس کے بعد اس نے معمول ہی بنا لیا تھا کہ ایک نمبر سے بس ایک ہی مرتبہ فون کیا کرتی۔ اس طرح اس کے پاس بے شمار ''سم'' جمع ہو گئی تھیں۔

اس وقت اسے خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر اس نے اپنے آنسو خشک کر کے بیڈ کی دراز سے ایک نئی ''سم'' نکالی اور اپنا موبائل فون کھول کر اس کی پرانی ''سم'' نکالی۔ نئی ''سم'' لگا کر اس نے موبائل بند کیا اور احسن کے نمبر ملانے لگی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ احسن اس وقت کس حال میں تھا، وہ آواز سے ہی احسن کی کیفیت کا اندازہ لگا لیتی اور ایسا ہی ہوا۔

احسن نے کئی گھنٹوں کے بعد کال ریسیو کی تھی اور ''ہیلو'' کہا تھا۔

شیبا نے اس کے لہجے میں ایسی شدید مردنی پہلے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ اس کے دل پر شدید چوٹ لگی اور آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں۔ اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔ جب اس نے تکیے پر سر رکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ساحرہ!'' اس کے دل میں ایک چیخ گونجی۔ ''بہت برا کیا تو نے احسن کے ساتھ!''



احسن اپنے بستر پر نڈھال پڑا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنے موبائل کی طرف دیکھتا رہا جس پر کال آئی تھی اور جواب میں کچھ بولے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

نہ جانے کون یہ حرکت کرتا ہے، اس نے سوچتے ہوئے موبائل بستر پر ایک طرف ڈال دیا، پھر اس کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ گیا۔ وہ گم نام کال آنے سے پہلے بھی وہ ساحرہ اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب اس کا ذہن پھر اسی طرف لگ گیا۔ چند گھنٹوں میں اس کے چہرے پر ایسی زردی کھنڈ گئی تھی جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔ رات بھر اسے نیند نہیں آسکی۔ وہ بستر پر ساکت پڑا تھا لیکن اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔

صبح جب اس کی ماں عابدہ اسے جگانے آئیں تو وہ جاگ ہی رہا تھا۔ ''کیا سوئے نہیں بیٹا!'' ماں نے تشویش سے پوچھا۔

''سو گیا تھا امی جان! ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے۔'' احسن جھوٹ بولتے ہوئے بستر سے اٹھا۔

''چلو جلدی سے نہا دھو لو! میں ناشتا تیار کر رہی ہوں۔''

احسن سر ہلاتا ہوا غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ اس حالت میں اس نے نہانا مناسب نہیں سمجھا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں کنگھا پھیرا۔ پھر تھرمامیٹر نکال کر اپنا ٹمپریچر دیکھا۔ معمولی سی حرارت تھی لیکن قلبی واردات کے بوجھ کے باعث وہ زیادہ بخار محسوس کر رہا تھا۔

ناشتے کے دوران میں اس کے باپ زبیری نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کل رات سے تم الجھے الجھے سے نظر آ رہے ہو بیٹا......! رات کو کھانا بھی تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا تھا، خیریت تو ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں ابو جان!'' احسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''یوں ہی ذرا تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔''

''تھکن تو ہو گی ہی۔'' عابدہ بول پڑیں۔ ''ملازمت کے لیے جانے کہاں کہاں دھکے کھاتے پھرتے ہو۔''

''کئی بار کہہ چکا ہوں۔'' زبیری بھی بولے۔ ''ملازمت کے لیے اپنے دماغ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالو۔ جب ملنا ہو گی مل جائے گی۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں اتنی تگ ودو کی کیا ضرورت ہے۔ آج تو بیمار سے لگ رہے ہو۔ اب دو تین روز گھر سے کہیں آؤ جاؤ نہیں، بس آرام کرو۔''

''جی بہتر۔'' احسن نے کہا۔ خود اس کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکلے۔

ناشتے کے بعد زبیری اپنے دفتر چلے گئے۔ وہ انکم ٹیکس پریکٹیشنر تھے۔ دفتر ان کا ذاتی تھا۔

عابدہ، ملازمہ سے گھر کی صفائی کرانے میں مصروف ہو گئیں۔ احسن اپنے کمرے میں جا لیٹا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے اسپرین کی ایک گولی کھائی تھی۔ اس کے دماغ میں پھر ماضی کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ زندگی کے نہایت خوش گوار لمحوں کی پرچھائیاں۔ لیکن اب صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ ان پرچھائیوں کو گم ہو جانا چاہیے تھا۔ زندگی ایک اذیت ناک موڑ پر آ گئی تھی۔ اب مستقبل ان پرچھائیوں کی رفاقت میں نہیں گزارا جا سکتا تھا لیکن احسن محسوس کر رہا تھا کہ وہ زندگی بھر ان پرچھائیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لیے ان سب خیالات کے باوجود اسے نیند آ گئی۔ جب وہ جاگا تو تین بج رہے تھے۔ اس کی ماں عابدہ بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھی تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ارے!'' احسن نے اٹھنا چاہا۔

''لیٹے رہو۔'' عابدہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بخار ہے تمہیں! میں تم سے کھانے کے لیے پوچھنے آئی تھی تو تم سو رہے تھے۔ میں نے تمہاری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا۔ بخار ہی کی وجہ سے میں نے تمہیں اس خیال سے نہیں جگایا کہ شاید سونے سے، آرام کرنے سے ہی تمہارا بخار اتر جائے۔''

''معمولی حرارت ہے امی جان!''

''ٹمپریچر لو۔''

عابدہ نے خود تھرمامیٹر نکال کر اس کا ٹمپریچر لیا۔

''سو ہے۔'' وہ بولیں۔ ''اب بہتر یہی ہے کہ تم کھانا نہ کھاؤ۔ میں تمہارے لیے جوشاندہ بنا کر لاتی ہوں۔''

عابدہ حکمت کی بہت قائل تھیں۔ اس کے برخلاف زبیری ایلوپیتھ پر بھروسا کرتے تھے۔

ماں کے جانے کے بعد احسن کی نظر اپنے موبائل فون پر پڑی۔ اس نے تعجب سے دیکھا کہ موبائل آف تھا۔ اس نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ بستر پر لیٹنے کے بعد کیا اس نے موبائل آف کر دیا تھا؟

اسے یاد نہیں آیا تو اس نے سوچا، شاید بے خیالی میں بند ہی کر دیا ہو۔ اس نے موبائل آن کر کے رکھ دیا اور لیٹا رہا۔ دماغ پر بھی خیالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

عابدہ اس کے لیے جوشاندہ بنا لائیں۔ احسن کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ لیکن ماں کی خاطر اسے جوشاندہ پینا ہی پڑا۔

"موبائل آن کرلیا تم نے؟" عابدہ بولیں۔

احسن چونکا۔ "آپ نے بند کیا تھا؟"

"ہاں۔" عابدہ نے جواب دیا۔ "کال آئی تھی، میں نے ہی بند کر دیا تھا تاکہ دوبارہ کال نہ آئے۔ تمہاری نیند خراب ہوتی۔ ایک گھنٹی سے تو تمہاری آنکھ نہیں کھلی تھی لیکن بار بار گھنٹی بجتی تو جاگ جاتے۔"

احسن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "جانے کس کی کال ہو!"

"کوئی ساحرہ تھی۔ میں نے اسکرین پر اس کا نام دیکھ لیا تھا۔ تمہارے کالج کے زمانے کی کوئی دوست ہوگی۔ میں اس سے کیا بات کرتی، اس لیے فون بند ہی کر دیا۔ کالج ہی کی کوئی لڑکی ہے نا؟"

"جی۔"

"کوئی خاص بات ہوگی تو پھر فون کرلے گی۔ تم اب اوڑھ لپیٹ لو۔" عابدہ نے خود ہی احسن کو کمبل اڑھایا۔ "پسینا آئے گا تو اتر جائے گا بخار! سونے کی کوشش کرو، نیند آجائے تو اچھا ہے۔"

احسن نے آنکھیں بند کرلیں لیکن وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد ساحرہ کو فون کرے، معلوم تو ہو کہ اس نے کال کیوں کی تھی۔

جب اسے قدموں کی آہٹ سے اندازہ ہوگیا کہ عابدہ کمرے سے چلی گئیں تو اس نے جلدی سے اپنا موبائل فون اٹھا کر ساحرہ کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے فوراً کال ریسیو کی گئی اور ساحرہ کی آواز آئی۔ "شکر ہے کہ تم نے فون کیا۔ میں تو سمجھی تھی کہ بہت ہی زیادہ ناراض ہوگئے ہو۔ میری کال تک ریسیو کرنا گوارا نہیں رہا۔ فون بند کرکے بیٹھ گئے۔"

"غلط سمجھ رہی ہو۔" احسن نے دھیمی آواز میں کہا۔ "دراصل امی جان بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے تم سے کیا بات کرتا۔ اسی لیے فون بند کر دیا تھا۔"

"وہ اتنی دیر تک بیٹھی رہیں، کیوں؟" ساحرہ کے لہجے میں شوخی آگئی۔ "کوئی لڑکی تو نہیں دیکھ لی تمہارے لیے؟ اسی کے بارے میں بات کر رہی تھیں کیا؟"

احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میری شادی کا تو اب سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"ارے چھوڑو، شادی تو تمہارے فرشتے بھی کریں گے۔ میں خود کراؤں گی تمہاری شادی!"

احسن کو ساحرہ کے اس لب و لہجے سے تکلیف پہنچی۔

"زندہ درگور تو کر دیا ہے تم نے مجھے!" وہ بولا۔

"ارے واہ! بس شادی ہو رہی ہے میری! میں مری تو نہیں جا رہی ہوں، زندہ رہوں گی اور تم سے ملتی بھی رہوں گی اور....." وہ ہنسی۔ "کسی نہ کسی دن تم سے اپنی بات منوا تو لوں گی۔"

"انہی باتوں کے لیے فون کیا تھا؟"

"ارے نہیں! وہ تو میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ آج کا پرچہ بھی اچھا ہوگیا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاید کچھ گڑبڑ ہوجائے۔ تمہاری کل کی باتوں سے میرا دل تھوڑا سا بوجھل سا ہوگیا تھا۔"

"تم جس معاملے میں ابنارمل ہو، اس معاملے میں آدمی کا دماغ بہت تیز ہوتا ہے۔ تمہارا پرچہ خراب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔ "میں نے پڑھائی پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی لیکن ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہوں۔ خیر چھوڑو، مجھے یہ بھی کہنا تھا کہ آج میں کسی طرح تم سے ملنا چاہتی تھی لیکن گھر میں آج ہی سے اتنا ہنگامہ شروع ہوگیا ہے کہ گھر سے میرا نکلنا ممکن ہی نہیں، اور کل شادی ہے۔ اب میں تمہیں پرسوں فون کرسکوں گی۔ ملیں گے کسی جگہ۔"

"اب اس کی کیا ضرورت ہے!" احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ارے واہ! اس کی ضرورت تو ساری زندگی رہے گی۔"

احسن خاموش رہا۔

"اچھا، اب میں بند کرتی ہوں۔" ساحرہ بولی۔ "ٹھیک؟"

"ٹھیک۔" احسن کی آواز بہت دھیمی ہوگئی۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے ریسیور چوما گیا ہو اور پھر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی لڑکی بھی ہوسکتی ہے؟ احسن نے سوچتے ہوئے اپنا موبائل بند کیا۔

ایک گھنٹے بعد عابدہ نے اس کے کمرے کا چکر لگایا۔ احسن نے اس طرح آنکھیں بند کرلیں جیسے سو رہا ہو۔ عابدہ بیگم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور ہٹا لیا۔ چند لمحے کھڑی رہیں، پھر کسی سوچ میں ڈوبی آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے نکل گئیں۔

احسن محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بخار میں کچھ تیزی آگئی تھی۔

آدھا گھنٹا اور گزرا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی

بجی۔ اس نے جلدی سے اٹھایا لیکن اسکرین پر ایک نیا اور اجنبی نمبر دیکھ کر اس پر جھنجلاہٹ سی طاری ہوگئی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ وہی گم نام فون ہوگا۔ اس نے سوچا کہ آج اس نامعلوم شخص کو کھری کھری سنا ہی دے گا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"کون ہو تم!" احسن نے ترختی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "کیا چاہتے ہو؟ فون کرتے ہو تو بولتے کیوں نہیں ہو؟ کیا تمہیں کوئی بیماری ہے؟...... کیا میں تمہیں کسی اچھے اسپتال کا پتا بتاؤں؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!" دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

احسن چونک پڑا۔ "کو...... کون!" وہ ہکلا سا گیا۔

"میں بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی جہاں آپ نے پڑھا ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں آپ سے آج ہی ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟" احسن نے دھیمی آواز میں پوچھا اور پھر کہا۔ "میں آج کسی سے نہیں مل سکتا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ شاید نہ ملنے کے لیے بہانہ بنا رہے ہیں۔ ہاں اتنا یقین مجھے ضرور ہے کہ آپ بہت ڈسٹرب ہوں گے۔ آپ سے آج ملاقات بہت ضروری ہے احسن!"

"لیکن......"

"مجھے ساحرہ کے بارے میں بات کرنا ہے۔" دوسری طرف سے بات کاٹ دی گئی۔

"جی؟" احسن چونک پڑا۔

"جی ہاں، ساحرہ کے بارے میں ضروری بات کرنا ہے آپ سے!"

"کون ہیں آپ؟" احسن کے تنفس کی رفتار کچھ تیز ہوگئی۔

"جب آپ مجھے دیکھیں گے تو پہچان لیں گے۔"

اگر احسن کی طبیعت خراب نہ بھی ہوتی تو وہ اپنی ذہنی کیفیت کے باعث کسی لڑکی سے ملنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن ساحرہ کا نام آجانے کی وجہ سے وہ بے تاب ہوگیا تھا۔ وہ لڑکی اس سے ساحرہ کے بارے میں جانے کیا بات کرنا چاہتی تھی؟

"کہاں ملنا چاہتی ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"کسی ریسٹورنٹ میں! جہاں آپ مناسب سمجھیں۔"

احسن نے ایک ایسے ریسٹورنٹ کا نام لیا جو اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "آپ کب آسکیں گے؟"

"آپ کب ملنا چاہتی ہیں؟"

"میں تو فوراً ملنا چاہتی ہوں۔"

"تو میں آدھے گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

بخار کے باوجود احسن بستر سے اٹھ گیا۔

"مگر میرے گھر سے اس ریسٹورنٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے سے زیادہ کا ہے۔"

"میں انتظار کرلوں گا۔"

"شکریہ احسن صاحب!" اس جواب کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

احسن نے الماری کھول کر وہ ہینگر نکالا جس میں اس کے کپڑے ٹنگے تھے۔ اسی وقت عابدہ کمرے میں آئیں اور چونکیں۔

"کیا کہیں جا رہے ہو؟" انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

"جی امی جان!" احسن نے بہانہ سوچ لیا۔ "میری طبیعت زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے، میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔"

عابدہ نے قریب آکر احسن کا ماتھا چھوا۔

"ہاں۔" وہ تشویش سے بولیں۔ "بخار تیز تو ہوا ہے۔ ایک سو ایک سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بار جوشاندہ اور پی لو۔ دو گھنٹے اور دیکھ لو۔ اگر اس کے بعد بھی......"

"نہیں امی جان! میں اب جوشاندہ نہیں پیوں گا۔"

"تم باپ بیٹے بس!...... ایلو پیتھ، ایلو پیتھ!...... اچھا خیر!...... تم ٹیکسی میں جانا۔ اس حالت میں موٹر سائیکل چلانا مناسب نہیں ہوگا۔ تم کپڑے بدلو، میں پڑوس کے کسی بچے سے ٹیکسی منگواتی ہوں۔"

ٹیکسی اسٹینڈ قریب ہی تھا، احسن پیدل وہاں تک جاسکتا تھا لیکن وہ ماں سے اس بحث میں پڑ کر ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کچھ نہیں بولا۔ جب وہ باہر نکلا تو ٹیکسی گھر کے دروازے پر موجود تھی۔

عابدہ نے ایک اسپتال کا نام لیتے ہوئے اس کی تعریف کی اور کہا۔ "وہیں جانا۔ ابھی میں نے تمہارے ابو جان کو بھی فون پر بتا دیا تھا۔ وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔"

"جی اچھا۔"

"وہاں پہنچ کر مجھے فون بھی کر دینا۔"

"جی...... جی......"

احسن بے تابانہ گھر سے نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ڈرائیور کو اس نے ریسٹورنٹ کا نام بتایا۔
ٹیکسی چل پڑی۔ احسن کا دماغ اس وقت بہت زیادہ الجھا ہوا تھا۔ نہ جانے کون لڑکی ہے اور ساحرہ کے بارے میں اس سے کیا بات کرے گی؟ وہ سوچتا رہا لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔
ٹیکسی ریسٹورنٹ کے سامنے رکی تو احسن نے جلدی سے اتر کر اپنا پرس نکالا۔ وہ کرایہ ادا کر رہا تھا کہ ایک قیمتی کار قریب آ کر رکی۔
"سنیے احسن!" نسوانی آواز تھی۔ "میں نے ہی بلایا ہے آپ کو۔"
احسن نے چونک کر دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی شیبا تھی۔ کالج میں احسن کی اس سے کبھی بات چیت نہیں رہی تھی اور کالج چھوڑے ہوئے اسے ایک سال گزر چکا تھا۔ شیبا کا چہرہ شاید اسے یاد نہ رہتا لیکن ساحرہ کیونکہ شیبا کا تذکرہ کرتی ہی رہتی تھی اس لیے وہ شیبا کو فوراً پہچان گیا۔
ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے احسن کار کے قریب گیا۔
"چلیں۔" وہ ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیبا سے بولا۔
"اب یہیں مل گئے ہیں تو ضرورت نہیں ہے ریسٹورنٹ میں بیٹھنے کی۔ آپ گاڑی ہی میں آ جائیں۔" شیبا نے کہا۔
احسن قدرے متذبذب رہا لیکن پھر کار میں بیٹھ گیا جس کا دروازہ خود شیبا ہی نے کھول دیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی شیبا کار حرکت میں لے آئی۔ اس وقت احسن کے ذہن میں یہ خیال چکرا رہا تھا کہ شیبا یقیناً ساحرہ کے بارے میں اہم باتیں کر سکتی ہے۔ وہ جانتا ہی تھا کہ ساحرہ اسٹڈی کرنے کے لیے اس کے گھر جایا کرتی تھی۔
"آپ یقیناً بہت الجھ رہے ہوں گے احسن!" شیبا بولی۔
"پلیز!" احسن نے کہا۔ "ایک کالج میں پڑھتے ہوئے اگر ایک دوسرے کے ساتھ آپ جناب کے ساتھ بات کریں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کو تم کہہ کر بھی مخاطب کر سکتے ہیں۔"
"دراصل میرا خیال تھا احسن کہ آپ...... میرا مطلب ہے...... تم شاید اتنی بے تکلفی پسند نہ کرو۔"
"تم نے فون پر اپنا نام کیوں نہیں بتایا تھا؟" احسن نے پوچھا۔
"مجھے ڈر تھا کہ میرا نام جان کر آپ ساحرہ کو فون نہ کر بیٹھیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے آپ سے میری ملاقات کا علم ہو۔ اوہ، سوری! میں پھر آپ کہہ بیٹھی۔"
"تم نے مجھے بلایا کیوں ہے؟" احسن نے بے تابی سے پوچھا۔ "ساحرہ کے بارے میں تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہو؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟"
"مجھے اندازہ ہے کہ تم اس بارے میں بات کرنے کے لیے بے چین ہو گے۔" شیبا بولی۔ "میں نے بھی اسی کے بارے میں بات کرنے کے لیے تم سے ملنا ضروری سمجھا تھا۔ تم دونوں کے معاملات مجھ سے کبھی پوشیدہ نہیں رہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تمہیں اپنی شادی کے بارے میں بتا چکی ہے جو کل ہی ہو رہی ہے۔ آخر تم یہ ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے کہ ملازمت ملنے سے پہلے شادی نہیں کرو گے۔"
"یہ ضد کی نہیں، میرے اصول کی بات تھی۔" احسن نے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کی دوسری جگہ شادی کی وجہ میرا یہ اصول نہیں ہے۔"
"میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ تمہارا اصول ہی تھا۔"
"نہیں۔" احسن نے جواب دیا۔ "وجہ کچھ اور ہے۔"
"وہ کیا ہے؟"
"تم نے کہا تھا کہ تمہیں ساحرہ کے بارے میں بات کرنا ہے۔ اس سے میں سمجھا تھا کہ تم مجھے ساحرہ کے بارے میں یا اس کی شادی کے بارے میں کوئی خاص بات بتانا چاہتی ہو لیکن تم نے تو مجھ سے ہی سوالات شروع کر دیے۔"
"میں وجہ اس لیے جاننا چاہتی ہوں کہ اگر اس کا کوئی حل نکل سکے تو...... تو...... شاید......"
شیبا کی نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ شیبا نے غالباً جان بوجھ کر گاڑی اس سڑک پر موڑی تھی۔ ٹریفک کی حد درجہ کمی کے باعث کہا جا سکتا تھا کہ وہ سڑک ویران تھی۔
احسن سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "تم نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔"
"حل نکلنے کی صورت میں۔" شیبا کا لہجہ دھیما تھا۔ "ممکن ہے کہ ساحرہ اب بھی اس شادی سے انکار کر دے جو کل ہی ہے۔ میں اس سے بات کر لوں گی۔ اس معاملے میں وہ اتنی ابنارمل ہے کہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ وہ اس شادی سے انکار کر دے اور اس کی شادی تمہی سے ہو۔"
"تمہارے لہجے میں اعتماد نہیں ہے۔"
"تم ٹھیک سمجھے ہو احسن!" شیبا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن میں کوشش تو کر سکتی ہوں اگر وجہ معلوم ہو جائے۔"

"مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا حل نہیں نکل سکتا، لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم اس کے لیے کیوں بے چین ہو کہ اس کی شادی مجھی سے ہو۔"

"اس لیے کہ تم اسے بے تحاشا چاہتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکو گے۔" شیبا جذباتی ہوگئی۔ "میرا مطلب ہے، تم اس طرح نہیں جی سکو گے جس طرح زندہ رہنا چاہیے۔"

"ہاں۔" احسن کے لہجے میں درد تھا۔ "لیکن..... لوگ کہتے ہیں، وقت گزرتا رہتا ہے تو یادوں پر دھول جمتی چلی جاتی ہے۔"

"تمہاری یادوں کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اس پر دھول جمنے میں برسوں لگ جائیں گے اور اس طویل عرصے میں تم شاید جینے کے معنی بھی بھول جاؤ۔ میں صرف سانس لینے کو زندگی نہیں سمجھتی۔"

"تمہاری دوست تو خوش ہے نا!"

"ہاں۔ اس کے خیالات غیر معمولی طور پر عجیب ہیں۔ میں نے بتایا نا کہ ایک معاملے میں غیر معمولی طور پر ابنارمل ہونے کی وجہ سے وہ ہر معاملے میں ابنارمل ہوگئی ہے۔ اس کے خیال میں شادی اور محبت، دو الگ الگ باتیں ہیں۔"

"میں اس کے خیالات سے، اس کی ابنارملٹی سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن میں اس کی خواہش پوری نہیں کرسکتا۔" احسن ایک دم چپ ہوگیا۔ آخری جملہ بے اختیاری میں اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ ساحرہ کی اس خواہش کے بارے میں کسی کو کچھ بتائے۔

"خواہش۔" شیبا زیرلب بڑبڑائی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو۔ احسن کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"خواہش۔" وہ پھر بڑبڑائی۔

احسن چپ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شیبا کو یہ سب باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

شیبا کچھ توقف سے بولی۔ "کیا اس کی خواہش کا تعلق اس کی ابنارملٹی سے ہے؟"

احسن پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے خود پر جھنجلاہٹ ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھی۔ شیبا کو ساحرہ کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ وہ صرف ایک لفظ "خواہش!" سے شاید حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

"احسن!" شیبا کچھ توقف سے بولی۔ "اگر تم اس کی شرط مان لیتے تو کیا وہ تم سے شادی کے لیے، تمہیں ملازمت ملنے تک انتظار کرلیتی؟" احسن اب بھی چپ رہا۔

"بتاؤ احسن!" شیبا کے انداز میں بے تابی تھی۔ "وہ شرط پوری ہونے سے اس کی شادی تم سے ہوسکتی ہے؟"

"تم نے شاید۔" احسن تذبذب سے بولا۔ "بات سمجھ لی ہے۔"

"میں اس کی فطرت سے، اس کے مزاج سے، اس کے اندازِ فکر سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے صرف ایک لفظ نے ہی مجھے بہت کچھ بتادیا ہے۔"

"تو پھر اب مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"احسن!" شیبا کی آواز کانپ گئی۔ "میں ابھی جاکر اسے سمجھا سکتی ہوں اگر تم اس کی شرط مان لو۔"

احسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔"

"پلیز احسن!" شیبا کی آواز بھرا گئی۔ "اس کی بات مان لو۔"

"شیبا!" احسن نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ "جب میں نے ساحرہ کا اصرار نظرانداز کردیا تو تمہاری بات کیسے مان سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ساحرہ کے بغیر شاید میں زندہ درگور ہوجاؤں لیکن میں خود کو اپنی ہی نظروں میں نہیں گرانا چاہتا۔ تم کیوں چاہتی ہو کہ میں خود کو اپنی نظروں سے گرادوں۔"

"شاید میں پاگل ہوگئی ہوں۔" شیبا کی آواز رندھ گئی۔

احسن نے محسوس کیا کہ شیبا کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے۔ احسن نے جھک کر شیبا کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں واقعی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"تم رو رہی ہو؟" احسن حیرت سے بولا۔

ٹپ! ٹپ!..... شیبا کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

"شیبا!" احسن پھر حیرت سے بولا۔

شیبا کچھ نہیں بولی۔ اچانک ایسا لگا تھا جیسے اس پر ہیجان طاری ہوگیا ہو۔ ایکسیلریٹر پر اس کے پیر کا دباؤ بڑھ گیا۔ کار کی رفتار خاصی تیز ہوگئی لیکن اس ویران سڑک پر وہ رفتار کسی حادثے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں شیبا؟" احسن پریشان ہوگیا تھا۔

"احسن!" شیبا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے سوچا تھا، میں کسی طرح بھی اپنی زندگی ہنسی خوشی گزار دوں گی۔"

"تو ساحرہ کی شادی سے اس میں کیا رکاوٹ آسکتی ہے؟"

''تم خوش نہیں رہ سکو گے۔''

''تو اس سے تمہاری خوشی کا کیا تعلق؟'' احسن کے لہجے میں پھر حیرت آگئی۔

''ہے تعلق! بہت گہرا تعلق ہے۔'' شیبا نے کہا۔ اب اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔

اس سے پہلے کہ احسن پھر کچھ کہتا، اس کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ اسے یقین تھا کہ کال اس کی ماں کی ہوگی۔ شیبا سے باتوں میں وہ اپنی ماں کو کال کرنا بھول ہی گیا تھا۔

''جی امی جان!'' اس نے موبائل کان سے لگایا۔

''پریشان کر دیا تم نے!'' عابدہ کی آواز آئی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ اسپتال سے فون کر دینا لیکن اب تو اتنی دیر ہو چکی ہے کہ تمہیں اسپتال سے واپس بھی آجانا چاہیے تھا۔''

''مسئلہ ہو گیا ہے امی! میں اسپتال آگیا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب دوسرے مریضوں میں بہت مصروف ہیں۔ آپ فکر نہ کیجیے! میری طبیعت زیادہ خراب نہیں ہے۔''

یکایک شیبا نے بڑی تیزی سے بریک لگائے۔ چرچراہٹ کی آواز خاصی تیز تھی۔

''ہیں؟'' عابدہ حیرت سے بولیں۔ ''یہ آواز کیسی تھی؟''

''ایک احمق وارڈ بوائے۔'' احسن کو پھر جھوٹ بولنا پڑا۔ ''بڑی تیزی سے اسٹریچر کھینچ کر لے گیا ہے۔''

شیبا نے کار سڑک کے کنارے روک دی اور اپنی آنکھیں خشک کر کے احسن کی طرف دیکھنے لگی۔

''اچھا خیر!'' عابدہ بولیں۔ ''ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد مجھے ایک فون ضرور کر دینا۔''

''اچھا امی جان!'' احسن نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''احسن!'' شیبا تیزی سے بولی۔ ''تمہاری طبیعت خراب ہے؟''

''معمولی سا بخار ہے۔''

''اب میں نے غور سے دیکھا ہے تمہیں......! تمہارا چہرہ تپ رہا ہے احسن!'' شیبا نے کہتے ہوئے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ احسن کی کلائی پر رکھ دیا۔ ''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تمہیں پہلے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے تھا احسن! مجھ سے بعد میں مل لیتے۔'' شیبا پھر گاڑی حرکت میں لائی اور اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں اسپتال لے چلتی ہوں۔ تم سیٹ پیچھے کر لو۔ آرام سے دراز ہو جاؤ۔''

''یوں ہی ٹھیک ہے شیبا!'' احسن نے اپنا سر پشت گاہ سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ شیبا کی ساحرہ کے بارے میں باتوں کے باعث اسے اپنی حالت کا احساس ہی نہیں رہا تھا لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ اسے چکر سا آرہا تھا۔

''بڑی غلطی ہوئی مجھ سے کہ میں نے تمہیں اس وقت بلایا۔'' شیبا کی آواز احسن کو کچھ دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''شیبا!'' احسن آنکھیں بند کیے بڑبڑایا۔ ''تمہاری خوشی...... میری خوشی...... تعلق......'' بے ربط الفاظ کے باوجود احسن کی بات واضح تھی۔

''خاموشی سے آرام کرو احسن!'' شیبا نے جھرجھراتی سی آواز میں کہا۔ ''تمہیں بہت تیز بخار ہے۔ آرام کرو۔ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔''

''جب...... جب گھر سے...... چلا تھا تو......''

''ہاں اس وقت بخار اتنا تیز نہیں ہوگا۔'' شیبا اس کی بات سمجھ کر تیزی سے بولی۔ ''لیکن اب بہت تیز ہے۔ شاید ایک سو تین سے بھی زیادہ!''



شیبا کا اندازہ غلط تھا یا اسپتال پہنچتے پہنچتے بخار میں مزید تیزی آئی تھی۔ ڈاکٹر ٹمپریچر لینے کے بعد حیرت سے احسن کی طرف دیکھنے لگا۔

''یقین نہیں آتا کہ آپ اپنے پیروں پر چل کر آئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہاسپٹلائز ہو جائیں، فوری طور پر۔''

اب خود احسن کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی حالت خاصی غیر ہو گئی تھی۔ سر گھومتا ہوا سا لگ رہا تھا۔

''ٹمپریچر کیا ہے ڈاکٹر؟'' احسن نے شیبا کی گھبرائی ہوئی آواز سنی اور پھر وہ اس طرح ڈگمگایا جیسے کرسی سمیت گر پڑے گا۔ ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اسے فوراً سنبھالا۔ پھر احسن کے ساتھ جو کچھ ہوا یا جو کچھ اس نے دیکھا، وہ کسی بکھرے ہوئے خواب کے مانند تھا۔ کوئی کمرا...... ڈاکٹر...... نرسیں...... شیبا...... پھر بازو میں ہلکی سی چبھن جس کے بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

غشی تھی، غنودگی تھی یا نیند؟

یہ احسن کے لیے ایک سوال تھا جب اسے ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں ہی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ شیبا کے علاوہ اس کے والدین بھی اس کے بستر کے قریب تھے۔

''شکر ہے تیرا، مولا!'' عابدہ نے اوپر دیکھتے ہوئے

کہا۔ اس وقت ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

زبیری محبت سے احسن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "اب کیسا محسوس کر رہے ہو بیٹا؟"

"ٹھیک...... شاید...... ٹھیک تو ہوں۔" احسن کی آواز میں کمزوری تھی۔ "کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"پہلے انہیں یہ کیپسول کھلا دیجیے!" شیبا نے ایک کیپسول اور پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے زبیری سے کہا۔

احسن نے خود اٹھنا چاہا لیکن زبیری اور عابدہ نے بیک وقت اسے سہارا بھی دیا۔ کیپسول کھانے کے بعد وہ لیٹا تو اس کی نظر ایک طرف ڈیکوریٹ کلاک پر پڑی۔ بارہ بجنے والے تھے۔

"رات ہو گئی۔" وہ چونک کر بولا۔

"چار گھنٹے تو اسپتال میں رہے ہو تم۔" عابدہ نے بتایا۔

پھر احسن کو تفصیل معلوم ہوئی۔ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی اس لیے اسے فوری طور پر اسٹریچر پر ڈال کر ایک کمرے میں لے جایا گیا تھا جہاں اسے ایک کیپسول کھلانے کے بعد اسے انجکشن لگایا گیا تھا جس کے بعد اس پر گہری غنودگی طاری ہو گئی تھی۔

شیبا نے عابدہ کو فون کر کے صورت حال بتا دی تھی۔ ان کا فون نمبر اسے احسن کے موبائل میں مل گیا تھا۔ عابدہ اور زبیری گھبرائے ہوئے وہاں پہنچے تھے لیکن اتنا وقت گزر جانے کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب تشویش کی کوئی بات نہیں کیونکہ بخار کم ہونے لگا تھا۔

شیبا نے احسن کے والدین کو بتایا تھا کہ وہ احسن کی کالج کے زمانے کی دوست ہے۔ اس نے احسن کو ٹیکسی میں دیکھا تھا تو اسے ٹیکسی سے اتروا کر اپنی کار میں اسپتال لے گئی تھی۔

چار گھنٹے بعد انہیں اس بات کی اجازت مل گئی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو احسن کو گھر لے جائیں۔ اسے ایمبولینس میں گھر لا کے بستر پر لٹایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اسے جگایا نہ جائے اور جب وہ خود جاگے تو اسے کیپسول کھلا دیا جائے۔ کیپسول کے علاوہ صرف ٹیبلٹس تھیں جو اسے چار چار گھنٹے سے کھلانے کی ہدایات کی گئی تھیں۔

"اب تو تم جاؤ بیٹی!" عابدہ نے کہا۔ "تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔"

"نہیں ہوں گے۔" شیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں نے پہلے ہی فون کر دیا تھا کہ کسی دوست کی بیماری کے باعث اسپتال میں رک گئی ہوں۔ ابھی ایس ایم ایس بھی آیا تھا گھر سے! میں جواب بھی دے چکی ہوں کہ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔"

"ہاں شیبا!" احسن دھیمی آواز میں بولا۔ "آدھی رات تو ہو گئی۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔"

احسن کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ یہ اسی دیے جانے والے کیپسول کا اثر تھا۔ ڈاکٹر نے چاہا ہو گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کر لے۔ اس نے شیبا کو رخصت ہوتے دیکھا اور پھر نیند کی آغوش میں جا گرا۔

جب وہ جاگا تو صبح ہو چکی تھی۔ عابدہ اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر جاگی تھیں۔ "اب تمہیں بالکل بخار نہیں ہے۔" وہ شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ "ہاں نقاہت ضرور ہو گی۔ چلو میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔ باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو کر کلی کر لو۔ پھر میں تمہارے لیے ناشتا تیار کر کے لاتی ہوں۔ تمہارے ابو جان کو کوئی ضروری کام تھا۔ تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر چلے گئے ہیں۔"

احسن نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والے تھے۔ احسن کو اشتہا محسوس نہیں ہو رہی تھی اس لیے اس نے صرف کارن فلیکس لے لیا۔

"چلو اب تھوڑی دیر بعد چائے کے ساتھ کچھ سلائس وغیرہ لے لینا یا جیسا تم چاہو۔ ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کا پرہیز نہیں بتایا ہے۔"

احسن نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ جاگنے کے چند لمحوں بعد سے ہی اس کے دماغ میں ساحرہ کی شادی کا خیال اور شیبا کی باتیں چکرانے لگی تھیں۔ شیبا کی یہ بات اس کے لیے معما بنی ہوئی تھی کہ اس کی خوشی اسی میں ہے کہ احسن خوش رہے۔

"احسن!" عابدہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "تمہاری دوست ہے تو بہت خوب صورت!...... شادی تو شاید نہیں ہوئی ہو گی ابھی اس کی!"

"جی۔" احسن نے ماں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "شادی تو ابھی نہیں ہوئی۔"

"تمہیں کیسی لگتی ہے؟ کیا اپنی بہو بنا لوں اسے؟"

احسن نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ "اس طرح نہ سوچیے امی جان! وہ بہت بڑے گھرانے کی بیٹی ہے۔ زنجانی شوگر ملز اس کے والد ہی کی ہیں۔"

"اس کے مزاج میں تکبر تو نہیں ہے۔"

"یہ الگ بات ہے۔" احسن نے کہا، پھر جلدی سے بولا۔ "چائے پلا دیں امی جان! عادت ہے نا اس کی اسی میں

ہلکا ہلکا سا درد ہونے لگا ہے۔"
"ابھی لاتی ہوں بیٹا!" عابدہ جلدی سے اٹھ گئیں۔
دراصل احسن یہ چاہتا تھا کہ اس موضوع پر زیادہ بات نہ ہو جو اس کی ماں نے چھیڑ دیا تھا۔ تنہائی ملتے ہی اس کی دماغی رو پھر چل پڑی۔ اسے اندازہ ہی نہیں، بڑی حد تک یقین تھا کہ ساحرہ کی شادی کا صدمہ ہی اس کے بخار کا سبب بنا تھا۔
ساحرہ کی شادی اسی دن ہونے والی تھی۔ احسن کے لیے اس کا خیال اذیت ناک تو تھا لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس کے دماغ میں یہی بات آئی کہ ساحرہ سے اس کی شادی نہ ہونا ہی اس کے حق میں بہتر رہا ہے۔ ساحرہ کے انداز فکر سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر وہ اس کی بیوی بنتی تو بھی خود کو اس کی ملکیت نہیں سمجھتی۔ گویا وہ ایسے معاملات میں بھی آزاد ہوتی جو احسن کے لیے ناقابل برداشت ہوتے۔ ساحرہ سے اس کی شادی اس کے لیے سوہان روح بن کر رہ جاتی۔
ساحرہ کے بارے میں سوچ کے ساتھ شیبا کا خیال بھی اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ شیبا اس سے باتیں کرتے کرتے رونے بھی لگی تھی۔ اس پر کچھ ہیجان بھی طاری ہو گیا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ احسن کی شادی ساحرہ سے ہو ورنہ وہ زندگی بھر خوش نہیں رہ سکے گا جس کی وجہ سے وہ بھی خوش نہیں رہ سکے گی۔
یہ آخری بات احسن کے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھی۔
عابدہ چائے بنا لائیں۔ احسن نے پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔
"کون آ گیا!" عابدہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولتی ہوئی اٹھیں۔ "تمہارے خیال سے تمہارے ابو جان تو جلدی نہیں آ گئے۔"
احسن نے چائے کا دوسرا گھونٹ لیا۔ عابدہ کمرے سے جا چکی تھیں۔ احسن نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اپنا موبائل نظر نہیں آیا۔
امی جان نے ہی کہیں رکھ دیا ہوگا، اس نے سوچا اور شاید بند بھی کر دیا ہو۔
پھر اس وقت وہ چونک پڑا جب عابدہ کے ساتھ ہی اس نے شیبا کو بھی کمرے میں آتے دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھلوں کی باسکٹ اور دوسرے ہاتھ میں گل دستہ تھا۔
"ہیلو احسن! ہاؤ آر یو!" وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی، پھر فوراً ہی ہنس کر بولی۔ "یہ بھی میں نے رسماً پوچھ لیا۔ تم بالکل ٹھیک نظر آ رہے ہو۔"

احسن مسکرا دیا۔ شیبا نے پھلوں کی باسکٹ احسن کے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھی اور گل دستہ اس کی طرف بڑھایا۔
"تھینک یو شیبا!" احسن نے گل دستہ لے لیا۔
"میں تمہارے لیے بھی چائے بنا کر لاتی ہوں بیٹی!" عابدہ نے کہا۔
شیبا نے تکلفاً بھی انکار نہیں کیا۔ عابدہ کے جاتے ہی اس نے جلدی سے اپنا پرس کھولا اور ایک لفافہ نکال کر احسن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ جلدی سے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لو۔ جب میں چلی جاؤں، تب دیکھنا۔"
"کیا ہے؟" احسن نے لفافہ لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
"میری ممکنہ شادی کا دعوت نامہ۔" شیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
احسن دھیرے سے ہنس دیا۔ "ممکنہ شادی؟"
"ہاں۔"
"اس کا کیا مطلب ہوا؟"
"جب تک کوئی کام ہو نہ جائے، یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہو گیا۔ اسے ممکنہ ہی سمجھنا چاہیے۔"
"اچھا!" احسن نے کچھ تعجب سے کہا۔ "بہرحال!...... پیشگی مبارک باد۔"
"پیشگی مبارک باد مجھے قبول نہیں! وقت پر ہی دینا۔ اچھا لفافہ تو رکھ لو تکیے کے نیچے!"
"ابھی دیکھ لوں تو کیا حرج ہے؟"
"میں چاہتی ہوں، میرے ممکنہ شوہر کا نام تم کو میرے سامنے نہ معلوم ہو۔"
"عجیب......" احسن اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے لفافہ تکیے کے نیچے رکھ لیا۔
عابدہ چائے لیے ہوئے اندر آئیں۔
"ارے!" شیبا نے جلدی سے اٹھ کر پیالی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی بنالی چائے۔"
"کسی کام کے لیے پانی گرم کرنا تھا۔ مائیکرو ویو پر رکھ کر ہی آئی تھی احسن کو چائے دینے۔ اتنے میں تم آ گئیں۔ جا کر دیکھا تو پانی کھولا ہی تھا۔ اسی سے ایک پیالی بنالی۔" عابدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"شکریہ امی!"
"لو! پھر کوئی آ گیا۔" عابدہ بولیں۔
کال بیل کی آواز سنائی دی تھی۔ عابدہ دیکھنے چلی گئیں۔

"تمہیں اب بالکل بخار نہیں ہے۔" شیبا نے احسن کی کلائی چھو کر کہا، پھر بولی۔ "تمہیں اتنی جلدی ٹھیک ہونا ہی تھا۔ بس ساحرہ کی شادی کا صدمہ دھیرے دھیرے اثر انداز ہوتا رہا تھا۔ یہ بات میں نے ڈاکٹر کو بھی بتادی تھی۔"

احسن چونکا۔ "ساحرہ کے بارے میں؟"

"اتنی بے وقوف تو نہیں ہوں احسن!" شیبا نے ہنس کر کہا۔ "میں نے بس اتنا بتایا تھا کہ تمہیں ایک شدید صدمہ پہنچا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا خیال بالکل درست نکلا۔ تمہارے جسم میں کسی وائرس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ ایک گھنٹے میں تمہارے کئی بلڈ ٹیسٹ کر لیے گئے تھے۔"

"ہوں!" احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔ شاید اس نے شیبا کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا، اسے ساحرہ یاد آگئی تھی۔

شیبا نے اس کی ٹھنڈی سانس سے شاید کچھ سمجھ لیا اور اسی لیے احسن کا دھیان ہٹانا چاہا۔ "ابھی دوا کی ایک خوراک تو باقی ہوگی جو بارہ بجے کے لیے تھی۔"

"ہاں!"

"نہیں۔ اب وہ مت کھانا۔ امی نے نہیں بتایا؟ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بخار بالکل اتر جائے تو پھر کوئی خوراک لینے کی ضرورت نہیں۔"

"سب کچھ یاد رکھا ہے تم نے!" احسن پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ "کاش کوئی اور خیال رکھتا میرا۔"

"بس اب غذا پر دھیان دینا ہے تمہیں۔" شیبا نے جلدی سے بات بدلی۔

قدموں کی آہٹیں قریب آنے لگی تھیں۔ احسن نے اپنے والد کی آواز پہچان لی۔ وہ عابدہ کو کچھ بتاتے ہوئے آرہے تھے۔

"چلیں اچھا ہے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عابدہ نے زبیری سے کہا۔ "ایک دن کے بخار نے بہت کمزور کر دیا ہے احسن کو...... اور بھی آب وہوا بدل لے گا تو اچھا رہے گا۔"

"کیا معاملہ ہے ابو جان؟" احسن نے پوچھا۔

زبیری نے بستر کے قریب آتے ہوئے، احسن کو جواب دینے سے پہلے شیبا کے سلام کا جواب دیا، پھر کہا۔ "بیٹا تم جانتے ہی ہو کہ مجھے اپنے ایک کلائنٹ کے معاملات میں کسی سے بات کرنے کے لیے سال میں ایک آدھ بار اسلام آباد جانا پڑتا ہے۔ آج اچانک کچھ ایسی صورت بنی ہے کہ اب کل ہی مجھے اسلام آباد جانا پڑے گا اور تم جانتے ہی ہو کہ تمہاری امی جان میرے ساتھ ضرور جاتی ہیں۔ اب اس مرتبہ تم بھی چلے چلو۔ صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"نہیں ابو جان!" احسن نے کہا۔ "آپ دونوں ہی چلے جائیے...... میں پہلے بھی کبھی آپ کے ساتھ نہیں گیا۔"

"اس مرتبہ چلے چلو۔" زبیری نے کہا۔ "تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہاری امی جان کا دل نہیں لگ رہے گا۔"

"میری صحت کو کیا ہوا۔ اب میں ٹھیک ہوں، شام تک آپ مجھے اور بہتر پائیں گے۔ کل صبح تک میں بالکل ٹھیک نظر آؤں گا۔"

"اگر کل صبح تک بالکل ٹھیک نظر نہیں آئے تو چلنا پڑے گا۔" عابدہ بولیں۔

"ٹھیک ہے۔" احسن نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

عابدہ بیگم اور زبیری میں اتنی ہی محبت تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے کے لیے بھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوئے تھے۔ احسن نے سنا تھا کہ شادی کے بعد عابدہ ایک رات کے لیے بھی اپنے والدین کے گھر نہیں رکی تھیں۔ زبیری شہر سے جب بھی کسی کام سے کہیں جاتے تھے، عابدہ ضرور ان کے ساتھ جاتی تھیں۔

"میں تو تین ٹکٹ بنواتا ہوا لایا ہوں۔" زبیری بولے۔

احسن نے کہا۔ "اگر کل صبح میں بالکل ٹھیک نظر آؤں تو ایک ٹکٹ کینسل کروا دیجیے گا۔ آپ کی واپسی کب ہوگی؟"

"بس ایک دن بعد! کل صبح گیارہ بجے کی فلائٹ ہے۔ پرسوں صبح کی فلائٹ سے واپسی ہوگی۔ اگر تم بھی ساتھ ہوئے تو ایک آدھ دن کے لیے مری ہو آئیں گے۔"

اس دوران میں شیبا بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی۔ بیٹے سے بات کرنے کے بعد زبیری اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے چند باتیں کیں اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کے بیٹے کا اتنا خیال رکھا۔

"شرمندہ نہ کیجیے ابو جان!"

کیونکہ احسن نے زبیری کو ابو جان کہہ کر مخاطب کیا تھا اس لیے شیبا نے بھی ایسا ہی کیا۔

زبیری اپنے کلائنٹ سے فوراً کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ فون کرنے کے لیے وہاں سے چلے گئے۔ عابدہ بیٹھی رہیں۔

"میرا فون کہاں ہے امی جان؟" احسن نے پوچھا۔

"وہ میں نے بند کر کے دراز میں ڈال دیا تھا، شیبا بجی! وہ نکال کر دے دو احسن کو۔"

شیبا جس کرسی پر بیٹھی تھی، وہ احسن کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کے قریب تھی۔ شیبا نے سائڈ ٹیبل کی دراز سے موبائل فون نکال کر احسن کو دے دیا۔

"رات دس بجے ساحرہ کی کال آئی تھی۔" شیبا آہستہ سے بولی۔ "تبھی امی جان نے فون بند کر دیا تھا اور گھبرا کے دراز میں ڈال دیا تھا۔"

"یہ ساحرہ کون ہے بیٹا!" عابدہ نے پوچھا۔ "پہلے بھی ایک بار اس کی کال آئی تھی تو میں نے تمہارا موبائل بند کر دیا تھا۔"

احسن سے پہلے شیبا بول پڑی۔ "وہ بھی ہماری کالج کی دوست ہے امی جان!" پھر شیبا کھڑی ہوگئی۔ "اب میں چلوں گی۔" پھر اس نے ہنس کر احسن سے کہا۔ "اب خوب پھل وغیرہ کھاؤ۔ سوپ پیو، کھانا کھاؤ، صبح تک تمہیں بالکل ٹھیک ہونا ہے ورنہ تو پھر جانا ہی پڑے گا تمہیں امی جان اور ابو جان کے ساتھ۔"

احسن خفیف سا مسکرا دیا۔



ساحرہ کی شادی کی تیاریاں گزشتہ روز سے ہی شروع ہوگئی تھیں۔ جو تیاری ساحرہ کے گھر کی طرف سے ہونا چاہیے تھی، وہ بھی آغا نصیر ہی کروا رہا تھا۔ ساحرہ کے والدین کی مالی حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ اتنا پیسا خرچ کر سکتے۔

وہ تیاریاں آغا نصیر کی پرسنل سیکریٹری عشرت اعوان کر رہی تھی جس کی عمر لگ بھگ پچاس پچپن سال ہوسکتی تھی لیکن اس نے خود کو بہت زیادہ مین ٹین کیا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ دلکش نظر آتی تھی لیکن بہت سنجیدہ تھی۔ سارا دن اور دوسری صبح بھی ساحرہ کا اور اس کا ساتھ رہا تھا لیکن وہ ایک بار بھی مسکراتی نظر نہیں آئی تھی۔

گزشتہ روز ساحرہ صبح سے شام تک مسلسل عشرت اعوان کے ساتھ رہی تھی اور خریداری کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ بوتیک، جیولری شاپز، واچ ہاؤسز اور جانے کہاں کہاں!

ساحرہ کی ماں بو جان اور باپ سرکار احمد کے لیے بھی کپڑے وغیرہ خریدے گئے تھے اور خاصے زیادہ پیسے دے کر اتنے ارجنٹ سلوائے گئے تھے کہ رات کو آٹھ بجے سے پہلے مل بھی گئے تھے۔ زیورات کی خریداری بو جان کے لیے بھی کی گئی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ اس کے برخلاف سرکار احمد کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا رہا تھا کہ وہ طوعاً و کرہاً اور شاید بیوی کے دباؤ میں یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔

ساحرہ کو عشرت اعوان سے معلوم ہوا تھا کہ آغا نصیر نے اس شادی سے پہلے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے اس کی ایک نوجوان بیٹی اور اس سے دو سال بڑا بیٹا تھا۔ ان دونوں کی ماں کا انتقال آٹھ سال پہلے ہوا تھا۔ انتقال کے ایک سال بعد ہی اس نے دوسری اور پھر تین سال بعد تیسری شادی کی تھی۔ ان دونوں بیویوں کی اموات پراسرار انداز میں ہوئی تھیں۔

ساحرہ "پراسرار موت" کے ذکر پر زیادہ نہیں الجھی تھی۔ اس کا سارا دھیان اپنی شادی پر لگا رہا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اگلے دن سے اس کے بدن کا دوزخ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو جائے گا۔ اس دوران میں اسے خیال آتا رہا تھا تو صرف احسن کا...! اس سے پہلی مرتبہ ایک بار فون بند ہونے کے بعد تو احسن نے اسے خود کال کر لیا تھا لیکن رات کو فون کرنے کے بعد احسن نے اپنا فون بند کرنے کے بعد مسلسل بند رکھا تھا۔

منالوں گی اسے بعد میں، ساحرہ نے سوچا تھا۔

رات ہی کو عشرت اعوان نے اس کے مہندی بھی لگوائی۔ مہندی لگوانے سے پہلے بھی ساحرہ نے احسن سے بات کرنا چاہی تھی مگر اس کا موبائل فون بند ملا تھا۔

بہت ناراض ہے لیکن مجھ سے بچ کر تھوڑی رہ سکے گا، ساحرہ نے مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا۔

رات ساحرہ نے بڑی بے چینی میں اور نہ جانے کیا کیا خواب دیکھتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح نو بجے عشرت اعوان اسے لینے آ گئی۔

آس پاس رہنے والے اس کار کی آمد و رفت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے حالانکہ بو جان نے کئی پڑوسیوں کو بتا دیا تھا کہ اس کی بیٹی بیاہ کر ایک بہت بڑے گھر میں جا رہی ہے۔

عشرت جہاں ساحرہ کو ایک شاندار بیوٹی پارلر میں لے گئی وہیں ساحرہ نے وہ لباس بھی پہنا جو آغا نصیر نے خود خرید کر بھجوایا تھا۔

اپنا میک اپ مکمل ہونے کے بعد ساحرہ نے آئینہ دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ خود کو ایک اجنبی روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بالوں کا اسٹائل بھی دیدنی تھا۔

بیوٹی پارلر سے ساحرہ کو ایک مسجد میں لے جایا گیا۔ نکاح وہیں ہونا تھا۔ ابتدا میں آغا نصیر نے سول میرج کی تجویز رکھی تھی جو سرکار احمد نے سختی سے رد کر دی تھی۔

مسجد میں سرکار احمد اور بو جان پہلے سے موجود تھے۔

انہیں لینے کے لیے آغا نصیر نے کار بھجوائی تھی۔ وہی کار انہیں واپس بھی لے جاتی۔

سرکار احمد کی خواہش پر پڑوس کے دو بزرگ بھی آگئے تھے۔

نکاح کے بعد سرکار احمد اور بوجان نے بیٹی کو مسجد ہی سے رخصت کیا۔ ساحرہ اس شاندار کار میں ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی۔ ڈرائیونگ سیٹ خود آغا نصیر نے سنبھالی تھی۔ کار میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ عشرت اعوان مسجد سے کسی اور کار میں رخصت ہوئی ہوگی۔

آغا نصیر کی تصویر ساحرہ کو پہلے ہی دکھادی گئی تھی لیکن اب وہ جیتی جاگتی حالت میں سامنے آیا تو وہ ساحرہ کو زیادہ متاثر کن محسوس ہوا۔ وہ لمبے قد کاٹھ اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی چمک بتارہی تھی کہ خضاب لگانا اس کے لیے اب تک ضروری نہیں ہوا تھا۔

کار چل پڑی۔ ساحرہ نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم خوش تو ہونا ساحرہ!'' آغا نصیر بولا۔

ساحرہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آغا نصیر ہنسا۔ ''میں نے بس بات کرنے کے لیے یہ سوال کر دیا۔ مجھے عشرت اعوان سے معلوم ہو چکا ہے کہ تم خوش ہو۔ مجھے شدت سے یہی خواہش تھی۔ دراصل بعض لڑکیاں زیادہ عمر کے شخص سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں۔''

ساحرہ خاموش رہی۔

''تم مجھے اتنا عمر دراز نہیں پاؤ گی جتنا میں ہوں۔'' آغا نصیر نے معنی خیز جملہ کہا۔

یہی تو میں بھی چاہتی ہوں، ساحرہ نے اپنے دل میں کہا۔

آغا نصیر پھر بولا۔ ''میں نے تمہارے والدین کے بارے میں بھی ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس پر عمل درآمد پہلے بھی کیا جاسکتا تھا لیکن میرا دھیان صرف تم سے شادی کرنے پر لگا رہا۔ کل مجھے خیال آیا تھا لیکن عشرت تمہارے معاملات میں اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ اس منصوبے کے سلسلے میں کچھ کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اچھا نہیں ہے نا کہ میری بیوی کے والدین ایک چھوٹے سے مکان میں پسماندگی کی زندگی گزاریں۔ اب عشرت نے اس منصوبے پر کام شروع کر دیا ہوگا۔ آج ہی تمہارے والدین کے لیے ایک خوب صورت فلیٹ خرید لیا جائے گا۔ آج ہی ایک انٹیریئر ڈیکوریٹر کو وہ فلیٹ دکھا دیا جائے گا۔ کل فلیٹ کے لیے فرنیچر خریدا جائے گا اور فلیٹ کو ڈیکوریٹ بھی کیا جائے گا پردے بھی کل ہی سل جائیں گے۔ فلیٹ میں شاید آدھی رات تک کام ہوتا رہے۔ پرسوں صبح تمہارے والدین اس فلیٹ میں منتقل ہو جائیں گے۔ ایک کار بھی انہیں شوفر کے ساتھ مل جائے گی۔ کچھ دن میں ایک اسکول بھی بنوا دوں گا جو تمہارے والد چلائیں گے۔ اگر کوئی اچھا اسکول خریدا جاسکا تو وہ خرید لیا جائے گا۔''

ساحرہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس نے کبھی ایسی زندگی کے خواب تو دیکھے تھے لیکن اس معاملے میں سنجیدہ یا جذباتی نہیں ہوئی تھی۔ احسن اسے ایسی زندگی نہیں دے سکتا تھا جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو اس کے جسم کی پکار تھی جس نے اسے آغا نصیر سے شادی کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ شاید وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوتی اگر احسن اس کی بات مان جاتا، اس کے جسم کی پکار سن لیتا۔

آغا نصیر جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا اور ساحرہ اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔ بس کبھی کبھی لاشعوری طور پر اثبات میں سر ہلا دیتی تھی۔ جب کار ایک بنگلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی، اس وقت ساحرہ ایسی تدبیروں میں الجھی ہوئی تھی جن میں سے کسی ایک پر عمل کر کے وہ احسن کو منا سکتی۔

کار بہت ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رکی اور ساحرہ کے خیالات کی کڑیاں بکھر گئیں۔ ان کڑیوں کے بکھرنے کا سبب صرف کار کا ہلکا سا دھچکا نہیں تھا۔ اس کی نظر برآمدے میں کھڑی ہوئی شیبا پر پڑی تھی۔

''یہ میری بیٹی شیبا ہے۔'' آغا نصیر کی آواز ساحرہ کے صرف کانوں میں نہیں، کسی گونج کی طرح اس کے سارے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔ ''یہ تمہارے استقبال کے لیے کھڑی ہے، اپنی نئی ممی کے استقبال کے لیے!'' یہ دوسری گونج تھی جو ساحرہ کے وجود میں پھیلی۔ ''تمہاری تو دوست ہے نا یہ!'' تیسری گونج!

ساحرہ کار سے اتری تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ کار کا دروازہ اس کے لیے ایک باوردی ملازم نے کھولا تھا۔ وہاں کچھ اور ملازم بھی اپنی نئی مالکہ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

''کار کا دروازہ تمہیں کھولنا چاہیے تھا شیبا!'' آغا نصیر کی آواز تھی۔

لیکن شیبا دروازہ کیسے کھولتی! اسے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ ساحرہ کو یوں تکے جارہی تھی جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق کو دیکھ رہی ہو۔

یکایک ساحرہ اتنی تیزی سے آگے بڑھی جیسے کسی نے

اسے خواب سے نکال کر اچانک حقیقت کی دنیا میں دھکیل دیا ہو۔ وہ شیبا سے لپٹ گئی۔

"جانی......! جانی!" وہ کہہ رہی تھی۔ "یہ تم ہو......؟ ارے!...... جانی! میری جان!" ساحرہ کا انداز ہیجانی تھا۔ "تم ہی ہو نا!...... میری پیاری شیبا! میری جان! میری دوست!"

"اب صرف دوست نہیں۔" آغا نصیر ہنس کر بولا۔ "اب یہ تمہاری بیٹی بھی ہے۔"

"نہیں۔" ساحرہ کے منہ سے نکلا۔ "یہ صرف میری دوست ہے۔" پھر اس نے شیبا کو جھنجوڑ ڈالا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟...... مجھے اس روپ میں دیکھ کر خوش نہیں ہوئی ہو؟"

شیبا نے آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر ساحرہ کے شانوں پر رکھ دیے اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اب وہ سکتے کی حالت سے باہر آ گئی تھی۔

"میری جان!" ساحرہ نے کہتے ہوئے شیبا کو چوم لیا۔

"اب اندر چلو بھئی!" آغا نصیر پھر ہنسا۔

"چلو!" ساحرہ نے شیبا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد بھی ساحرہ، شیبا سے لپٹی جا رہی تھی، اسے پیار کر رہی تھی۔

"کچھ ہماری بھی خبر لیں بیگم صاحبہ!" آغا نصیر مسکراتا ہوا بولا۔ "کیا صرف اپنی دوست سے ہی باتیں کرتی رہیں گی؟"

اب ساحرہ چونکی۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھول ہی گئی تھی کہ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کا نکاح ہوا تھا۔ وہ دلہن تھی اور اس گھر میں اپنی دوست سے ملنے نہیں، اس گھر میں رہنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے چونک کر خود کو شیبا سے الگ کیا اور نظریں جھکا لیں۔ اس کی سانسیں بہت تیزی سے چلنے لگی تھیں۔

"کسی سے کھانا لگوانے کے لیے کہو شیبا!" آغا نصیر بولا۔

"عشرت اعوان کہاں ہیں؟" شیبا نے پوچھا۔

"وہ بہت مصروف ہے، کل تک مصروف رہے گی۔ کسی وقت آئے گی بھی تو ذرا دیر کے لیے......! کسی ملازم سے کہہ دو کھانے کے لیے۔"

شیبا نے ایک ملازم کو بلا کر اس سے کھانے کی میز لگانے کے لیے کہا۔

آغا نصیر نے ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شیبا سے تو تم مل لیں۔ اس کے بڑے بھائی سے کچھ ہی عرصے بعد مل سکو گی۔ میں نے اسے تعلیم کے لیے باہر بھیجا ہے۔ وہ آکسفورڈ سے پڑھ کر آئے گا۔"

اس بات سے ساحرہ کی ایک الجھن دور ہو گئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ لڑکی کے علاوہ آغا نصیر کا ایک بیٹا بھی ہے۔

ساحرہ کو ایک اور الجھن بہرحال لاحق ہو گئی تھی۔ شیبا کو دیکھ کر وہ خود تو بہت خوش ہوئی تھی لیکن ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شیبا اگرچہ اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ساحرہ نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ فکر مند تھی۔

"کھانا لگنے تک میں ذرا واش روم ہو آؤں۔" آغا نصیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ساحرہ کو اس کی عدم موجودگی میں شیبا سے کچھ باتیں کرنے کا موقع ملا۔

"کیا تم خوش نہیں ہو شیبا!" ساحرہ نے پوچھا۔

"یہ تم نے کیوں سمجھ لیا؟"

"میرا خیال ہے کہ تم کچھ فکر مند ہو!"

"فکر مند ہونا دوسری بات ہے۔" شیبا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"فکر مندی کی وجہ؟"

"بس کچھ ہے۔ ابھی اسے رہنے دو۔ کچھ دن بعد تمہیں شاید خود ہی معلوم ہو جائے۔ مجھے امید ہے کہ تم اصرار نہیں کرو گی۔"

"اچھا!" ساحرہ نے طویل سانس لی۔ "چھوڑ دیتی ہوں یہ ذکر! ایک اور بات بتاؤ۔ میں تو اپنی شادی کی تیاریوں میں اور شادی کے خیالوں میں الجھی ہوئی تھی اس لیے ایک بارے میں ان سے تفصیل پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اب مجھے ان کی وہ بات یاد آ رہی ہے۔ تمہاری والدہ کے بعد آغا صاحب نے مجھ سے پہلے دو شادیاں اور کی تھیں۔ عشرت اعوان نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی اموات پراسرار انداز میں ہوئی تھیں۔ پراسرار کیوں شیبا؟"

"پہلی تو دم گھٹ جانے کی وجہ سے دنیا چھوڑ گئی۔" شیبا نے بتایا۔ "حالانکہ کراچی میں گیس ہیٹر کا رواج نہیں ہے لیکن اسے سردیوں میں الیکٹرک ہیٹر کی گرمی پسند نہیں تھی۔ دراصل وہ رہنے والی پنڈی کی تھی۔ وہیں کی عادت پڑی ہوئی تھی اسے۔ ڈیڈی نے گیس ہیٹر لگوا دیا تھا۔ ڈیڈی ایک دن پہلے کسی کام سے عشرت اعوان کے ساتھ بیرون شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ رات کو کسی وقت گیس بند ہو جانے سے ہیٹر بجھ گیا لیکن گیس کی بندش وقتی طور پر بند

ہوئی تھی وہ دوبارہ جاری ہوئی۔ ہیٹر بجھا ہوا تھا، گیس کمرے میں بھرتی چلی گئی۔ اسی سے اس کا دم گھٹ گیا۔"

"یہ تو اتفاقی بات تھی۔ اسے پراسرار کیوں سمجھا گیا؟"

"اس لیے کہ گیس کیوں بند ہوئی! کیا کسی نے وقتی طور پر والو بند کیا تھا؟ اس سوال کا جواب پولیس کو نہیں مل سکا۔"

"پولیس تک بات چلی گئی تھی؟"

"ہاں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ پولیس کیسے آگئی تھی۔ کئی سال پرانی بات ہے۔ پولیس نے کچھ دن تفتیش کی، پھر فائل بند کردی گئی۔" شیبا نے جواب دینے کے بعد کچھ تُنکی سے کہا۔ "ہماری پولیس کو فائل بند کرنے میں تو مہارت ہے نا!"

"ضروری بھی تو نہیں ہے کہ کسی نے والو بند کیا ہو۔ مجھے ٹیکنیکل باتوں کا خود تو کوئی علم نہیں لیکن سنا ہے میں نے! کسی وقت گیس کی لائن میں از خود بھی کچھ گڑبڑ ہوجاتی ہے اور پھر از خود ہی ٹھیک بھی ہوجاتی ہے۔"

"بہرحال! عشرت اعوان نے ہی اسے پراسرار قرار دیا تھا۔"

"اور دوسری کی موت؟"

"وہ کرنٹ کی وجہ سے ہوئی۔" شیبا نے بتایا۔ "شاید اس نے چیخ پکار کی ہو مگر اتفاق سے اس وقت بھی گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد ڈیڈی آئے تھے اور باتھ روم میں گئے تھے تو انہیں پتا چلا تھا، وہ بالکل جل بھن گئی تھی۔ دراصل ڈیڈی الگ سے پانی گرم کرنے کے لیے باتھ روم میں ایک الیکٹرک راڈ بھی رکھتے تھے۔ جب باتھ ٹب میں اس کی لاش ملی تو راڈ اس میں گری ہوئی تھی۔ پانی بری طرح کھول رہا تھا۔ باتھ روم میں بھاپ پھیلی ہوئی تھی۔ ڈیڈی نے راڈ کا سوئچ آن دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے سوئچ آف کرنے کے بعد پولیس کو اطلاع دی۔ کھولتے ہوئے پانی سے لاش نکالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔"

"یہ کیسے ہوگیا؟" ساحرہ حیرت سے بولی۔ "میرے گھر میں تو باتھ ٹب تھا نہیں لیکن میں نے پڑھا تو ہے۔ اس میں پانی بھرنے کے لیے گرم پانی کی لائن الگ ہوتی ہے۔"

"قیاس یہ کیا گیا تھا کہ الیکٹرک راڈ غالباً باتھ ٹب کے سرہانے کی طرف رکھی ہوئی ہوگی۔ دراصل وہ شراب بہت پینے لگی تھی۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ اس وقت بھی بہت زیادہ شراب پیے ہوئے تھی۔ شاید وہ ڈگمگائی ہو اور اس کا ہاتھ لگنے سے راڈ کا سوئچ آن ہوگیا ہو۔ وہ اس سے بے خبر باتھ ٹب میں اتر گئی۔ پھر جب وہ نہا رہی تھی تو شاید اس نے ہاتھ اوپر کیے ہوں۔ راڈ اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر باتھ ٹب میں گر گئی یا پانی کے چھینٹے اوپر جانے سے وہ خود ہی پھسل کر باتھ ٹب میں گر پڑی ہو۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوا، بہرحال وہ موت اس طرح ہوئی تھی۔" شیبا جواب دینے کے بعد ایک بار پھر تُنکی سے بولی۔ "ممکن ہے کہ دونوں ہی اموات اتفاقیہ ہوں لیکن عشرت اعوان نے اس موت کو بھی پراسرار قرار دیا تھا۔"

"کیوں؟" ساحرہ حیرت سے بولی۔ "عشرت اعوان نے اسے کیوں پراسرار قرار دیا؟"

"دراصل......" شیبا کے لہجے میں اب بھی تلخی تھی لیکن اسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ آغا نصیر واش روم سے آگیا تھا۔

کھانے کی میز لگائی جاچکی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد آغا نصیر نے مسکرا کر ساحرہ سے کہا۔ "اچھا بیگم صاحبہ! تم اپنی دوست یا بیٹی سے باتیں کرو۔ ہم چلے دفتر! اب شام کو ملاقات ہوگی۔"

"صبح سے اب تک دفتر نہیں گئے!" ساحرہ نظریں جھکائے دھیمی آواز میں بولی۔ "اب کیا کام یاد آگیا؟"

"تمہاری خاطر وقت نکالا تھا۔" آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب جاکے تھوڑا سا کام دیکھ لوں کیونکہ کل تو...... اچھا خیر، چھوڑو! رات کو بتاؤں گا۔"

ساحرہ کو اس خیال سے بڑی کوفت ہوئی کہ اب رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔

آغا نصیر کے جانے کے بعد وہ بولی۔ "ہاں شیبا! تم عشرت اعوان کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔"

"ہاں...... تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں، مجھے ہی نہیں بلکہ بھائی جان کو بھی شبہ ہوا تھا کہ وہ ان اموات کو قتل ظاہر کرکے ہم بھائی بہن کو پھنسوانا چاہتی ہے۔"

"کیا اس وقت تمہارے بھائی جان نہیں تھے۔"

"پہلی موت کے وقت وہ باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور دوسری موت جب ہوئی، ان دنوں وہ چند دن کی چھٹی لے کر آگئے تھے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"لیکن وہ تم دونوں کی دشمن کیوں ہوگی؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی۔ بس ایک شبہ ہے جو ممکن ہے کہ غلط ہو۔"

"تم اور تمہارے بھائی جان تو دوسری موت کے وقت گھر میں ہوں گے بھی نہیں...... ابھی تم بتا چکی ہو کہ گھر

میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔"
"ہاں گھر میں تو کوئی نہیں تھا۔ میں اور بھائی جان لان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔"
"پولیس نے تم سے پوچھ گچھ کی تھی۔"
"پوچھ گچھ تو سبھی سے کی تھی۔ ملازمین سے بھی لیکن انہیں کسی قسم کے شواہد نہیں مل سکے تھے اور ہمارے منہ سے بھی ان کے کسی سوال کے جواب میں ایسا کوئی لفظ نہیں نکلا تھا کہ وہ اسی کو پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ بہرحال اس کیس کی فائل بھی بند ہو چکی ہے۔ ڈیڈی بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اتفاقیہ اموات تھیں ورنہ وہ کیس کی فائل بند نہیں ہونے دیتے۔"
ساحرہ نے سوچتے ہوئے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔ اس کے تصور میں عشرت اعوان کی شخصیت ابھر آئی تھی۔ پھر اسے کچھ اور خیال آیا۔ وہ پوچھ بیٹھی۔ "لیکن اگر وہ قتل ہوئے تھے تو ان میں تم دونوں کا ہاتھ آخر کیوں ہوگا۔"
"ایک جواز تو تھا۔"
"وہ کیا؟"
"یہی کہ ہمیں اپنی سوتیلی ماؤں سے حسد ہوگا۔"
"ہوں۔" ساحرہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔
شیبا کچھ طنزیہ انداز میں بولی۔ "اس شادی سے تم اتنی خوش ہو کہ اتنی دیر میں ایک بار بھی تمہاری زبان پر احسن کا نام نہیں آیا۔"
ساحرہ ہنس دی۔ "وہ بہت ناراض ہے مجھ سے۔ فون بھی ریسیو کرنا چھوڑ دیا ہے اس نے لیکن...... مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، منالوں گی میں اسے!"
"اب بھی ملتی رہو گی اس سے؟"
ساحرہ کچھ سنجیدہ ہوئی، پھر اس نے کہا۔ "اب اگرچہ حالات بدل چکے ہیں لیکن میں اب بھی...... اور آغا صاحب کی بیٹی، یعنی تمہارے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں کہ مجھے احسن سے محبت ہے اور رہے گی۔"
"کیا تم یہ بات ڈیڈی کو بھی بتا سکو گی۔"
ساحرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر ضروری ہوا تو کسی مناسب موقعے پر بتا دوں گی لیکن مجھے امید ہے کہ تم ان سے کچھ نہیں کہو گی۔"
شیبا اس کا منہ تکتی رہ گئی۔
"کل سے اب تک بہت تھک گئی ہوں۔" ساحرہ پھر بولی۔ "اب آرام کرنا چاہتی ہوں لیکن......" وہ مسکرائی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ اس گھر میں اب میرا کمرا کہاں ہے۔"
"اب ظاہر ہے کہ ڈیڈی ہی کا کمرا تمہارا کمرا ہوگا۔"
شیبا کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "چلو، دکھا دوں تمہیں!"
ساحرہ اپنے نئے شاندار گھر کا ایک ایک گوشہ دیکھنا چاہتی تھی مگر تھکن کی وجہ سے اس نے پہلے آرام ہی کر لینا چاہا۔
شیبا اسے کمرے میں پہنچا کر چلی گئی۔ وہ کہیں کھوئی کھوئی سی تھی اور ساحرہ نے یہ بات محسوس کر لی تھی لیکن اس نے شیبا سے کچھ کہا نہیں۔
مہکتے ہوئے کمرے کی فضا نے ساحرہ کو مخمور سا کر دیا۔ اتنا شاندار کمرا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ نرم و گداز بستر پر لیٹی تو خود کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس نے تکیہ اٹھا کر اپنے سینے سے بھینچ لیا اور خود کو مزید نڈھال ہوتا محسوس کیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ نیند کی آغوش میں تھی۔
اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب اسے جگایا گیا۔ جگانے والا آغا نصیر تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔ "بہت تھک گئی تھیں شاید! کئی گھنٹے سولیں۔ ساڑھے سات بج رہے ہیں۔"
ساحرہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔
"تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے چائے منگواتا ہوں۔" آغا نصیر نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
وہ دروازہ باتھ روم کا تھا۔ ساحرہ اس میں داخل ہوئی۔ اتنے شاندار باتھ روم کا بھی اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا لیکن اس کی نظریں باتھ روم کی دل کشی کا جائزہ نہیں لے سکیں۔ وہ ذرا دیر کے لیے باتھ ٹب کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی اور اسے آغا نصیر کی دوسری بیوی کی موت کا خیال آیا تھا۔
باتھ روم میں ساحرہ نے صرف کلی کی۔ وہ فوری طور پر اپنا میک اپ ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میک اپ ہی کی وجہ سے معمولی نقش و نگار کے باوجود وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔
کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ چونک پڑی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے آغا نصیر کے سامنے بوتل کھلی ہوئی تھی اور گلاس سے وہ شاید ایک آدھ گھونٹ لے بھی چکا تھا۔ وہ ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لو گی تم؟" اشارہ شراب کی طرف تھا۔
ساحرہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"میرے قریب آکر تو بیٹھو!" آغا نصیر بولا۔ "تمہارے لیے چائے آتی ہی ہوگی۔"
"یہ۔" اس نے شراب کی طرف اشارہ کیا۔ "میری ایک بیوی تو یہ بہت پیتی تھی، تم کو بھی اس کا عادی بنا دوں گا۔

سوات کی ٹھنڈک میں تو ویسے بھی یہ آگ...... یہ پگھلی ہوئی آگ...... اس کی ضرورت ہوگی تمہیں!''

''سوات!'' ساحرہ چونک پڑی۔

''ہاں۔'' آغا نصیر نے کہا۔ ''میں ٹکٹ بنوا تا لایا ہوں۔ کل ہم پشاور روانہ ہوجائیں گے۔ ہنی مون سوات میں منائیں گے۔ دس دن بعد واپسی ہوگی۔ ہماری واپسی کے آٹھ دن بعد میرا بیٹا بھی باہر سے آجائے گا۔ فون آیا تھا اس کا!''

ساحرہ اس کے آخری دو جملے ٹھیک سے سن بھی نہیں سکی۔ اسے فوری طور پر خیال آیا تھا کہ وہ دس دن تک احسن سے مل بھی نہیں سکے گی۔ اس نے شدید بے چینی محسوس کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آغا نصیر کی بات رد کر دیتی۔

ملازم چائے لے آیا۔ شراب کی بوتل اور گلاس دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ وہ منظر اس کے لیے نیا نہیں ہوگا۔

ساحرہ چائے بنا رہی تھی جب آغا نصیر نے پوچھا۔ ''جانتی ہو، میں نے تم سے شادی کیوں کی؟''

ساحرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

آغا نصیر نے ہنس کر کہا۔ ''تم شیبا کے ساتھ اسٹڈی کرنے آتی تھیں نا! اتفاق ہے کہ ہمارا آمنا سامنا کبھی نہیں ہوا لیکن میں نے بیڈروم کی اس کھڑکی سے تمہیں پھاٹک سے اندر آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد چھپ کر بھی تمہیں کئی بار دیکھا۔ تمہارے چہرے کے دانوں نے مجھے پاگل بنا دیا تھا تمہارا۔ چہروں پر دانوں کی کئی وجوہ ہوتی ہیں لیکن تمہارے دانوں نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ تم بہت ہی پرجوش لڑکی ہوگی۔''

ساحرہ کا جسم سنسنا گیا۔ وہ آغا نصیر کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

آغا نصیر اس کے چہرے کے دانوں پر اس طرح بولتا رہا جیسے اس نے کوئی ریسرچ ورک کیا ہو جس میں انٹرنیٹ بھی اس کے کام آیا ہو۔

اس دوران میں ساحرہ نے چائے پی لی۔ اس وقت تک آغا نصیر دوسرا گلاس بھی آدھا کر چکا تھا۔

''ابھی۔'' وہ ساحرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہوا بولا۔ ''گھنٹا بھر میں ثابت ہوجائے گا کہ میرا خیال درست ہے یا نہیں...... ہاں اگر تم شراب کا ایک گلاس بھی پی لیتیں، تب تو غضب ہی ہوجاتا۔''

ساحرہ نے شراب نہیں پی لیکن وہ ایک گھنٹا کسی غضب ناک سمندر کی تمثیل بن گیا۔ ساحرہ کے تنفس کی بلاخیز موجیں ایسی تھیں کہ شاید کشادہ خواب گاہ کی ساری فضا میں بھر گئی ہوں۔



دوسری صبح احسن کے والدین اسلام آباد چلے گئے۔ احسن کی طبیعت اب تک مکمل طور پر بحال نہیں ہوئی تھی لیکن خود کو بالکل ٹھیک ظاہر کرنے کے لیے وہ انہیں چھوڑنے ائرپورٹ بھی گیا تھا۔

گھر واپس آکر اس نے بستر پر لیٹتے ہی تکیے کے نیچے سے وہ لفافہ نکالا جو گزشتہ روز شیبا اسے دے گئی تھی۔ اس لفافے میں شیبا کے بہ قول ''ممکنہ دعوت نامہ'' دراصل ایک خط تھا جو شیبا نے اس کے نام لکھا تھا۔ اس تحریر میں ایک سے زائد مقامات ایسے تھے کہ احسن چونک گیا تھا۔ اب اس خط کے الفاظ پھر اس کے سامنے تھے۔ شیبا نے لکھا تھا۔

''احسن! ساحرہ کے بارے میں میرا خیال اب یہ ہے کہ وہ شاید خوف ناک حد تک ابنارمل ہے۔ مجھے اس کی ابنارملٹی کا علم بہت پہلے ہوگیا تھا لیکن اب جو اس نے میرے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں کانپ گئی۔ وہ معاشرے کی باغی ہے اور وہ اس بغاوت کو فطرت کے عین مطابق سمجھتی ہے۔ اسی لیے تم سے محبت کے باوجود کسی اور سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ لیکن وہ سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد بھی فریقین ایک دوسرے کی ملکیت نہیں ہوجاتے۔ غالباً اس نے یہ بات تم سے بھی کہی ہوگی اور اس کا مطلب کیا ہے، یہ تم نے بھی بہ خوبی سمجھ لیا ہوگا۔

میری شدید خواہش تھی کہ تمہاری شادی ساحرہ سے ہوجائے۔ اسی لیے میں تم سے ملی بھی تھی۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا، یعنی تمہیں جس بات پر آمادہ کرنا چاہا تھا، وہ یقیناً میرا پاگل پن ہی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ ساحرہ کے بغیر تمہاری زندگی بہت ویران ہوجائے گی۔ میں نے کالج ہی میں اندازہ لگالیا تھا کہ تم اس سے کتنی شدید محبت کرتے ہو۔ پھر تم سے ملنے کے بعد جب میں نے کوشش کر کے غیر جذباتی انداز میں سوچا تو مجھے احساس ہوا کہ ساحرہ سے شادی کر کے تم بھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ اس کا رویہ تمہیں شدید اذیت میں مبتلا رکھے گا۔ عین ممکن ہے کہ صورت حال تمہاری برداشت سے باہر ہوجائے اور تم ساحرہ سے علیحدگی اختیار کرلو...... اس سے بہتر تو یہی ہوگا کہ اس کی شادی تم سے نہ ہو۔ یقیناً ساحرہ کی شادی تمہارے لیے اتنا بڑا صدمہ ہے کہ تم تشویش ناک حد تک بخار میں مبتلا ہوگئے تھے۔ صد شکر کہ تمہاری جسمانی حالت بہت جلد سنبھل گئی لیکن

تمہارا دل تو اب بھی زخم زخم ہوگا۔"
یہاں تک شیبا نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے احسن کو مکمل اتفاق تھا۔ یہ سب کچھ وہ خود بھی سوچ چکا تھا لیکن شیبا کا اس حد تک سوچ لینا اس کے لیے قدرے تعجب کی بات تھی۔ پھر اس سے آگے کی تحریر نے تو اسے خاصا چونکا دیا۔ شیبا نے لکھا تھا۔
"یہ زخم زخم ہونا تمہارے حق میں بہتر ہے احسن!...... ممکن ہے کوئی تمہارے ان زخموں پر مرہم رکھ دے، اگر تم چاہو۔ اس کے بعد میں خاصے تذبذب کے بعد لکھ رہی ہوں کہ تم اپنے زخموں کو مندمل کرنے کی ذمے داری مجھے بھی سونپ سکتے ہو۔"
انہی سطروں نے احسن کو چونکا دیا تھا اور پھر باقی خط اس نے بڑی تیزی سے پڑھ ڈالا تھا۔
"تم چونک گئے ہو گے احسن! یقیناً چونک گئے ہو گے۔ میرے جملے کا جو مطلب ہے وہ تم نے سمجھ لیا ہوگا۔ تم اسے میری پیشکش نہ سمجھنا جو میں تمہاری حالت کی وجہ سے کر رہی ہوں۔ نہیں احسن! حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔"
یہ پڑھتے ہوئے احسن کا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔
"میں پہلی نظر کی محبت کو ایک افسانوی بات سمجھا کرتی تھی لیکن یہ محض افسانوی نہیں ہے۔ یہ میں نے اس وقت جانا جب میں نے تمہیں کالج میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اپنے اس وقت کے جذبات کا اظہار بہت اچھے انداز میں کروں لیکن ایسے الفاظ میرے دماغ کی گرفت میں نہیں آ رہے ہیں، اس لیے میں ایک عام سی بات لکھ رہی ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھا اور دل ہار بیٹھی لیکن اس سے پہلے کہ میں تمہارے قریب ہونے کی کوشش کرتی، میں نے ساحرہ سے تمہاری محبت محسوس کرلی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ تم اس سے شدید محبت کرتے ہو۔ تمہاری نظریں ساحرہ کے علاوہ کسی چہرے پر ٹکتی ہی نہیں تھیں۔ تم ہی نہیں، ساحرہ بھی تمہیں چاہتی تھی اور اس کے دعوے کے مطابق وہ اب بھی تمہیں چاہتی ہے لیکن اب اس کی چاہت کی تشریح کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں...... بہرحال جب میں نے محسوس کیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں آپ دونوں کے درمیان میں آنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ ایسی کوئی کوشش میری محبت کی توہین ہوتی۔ محبت اگر خودغرض ہو تو کیا اسے محبت کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! سو میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور ساحرہ کو خود سے قریب کرتی چلی گئی۔ اس کی قربت میرے لیے باعث تسکین تھی کیونکہ وہ تمہاری محبوبہ تھی۔ ان باتوں کے بعد تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہیں خوش دیکھ کر ہی میں خوش رہ سکتی تھی، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دوں لیکن یہ سب کچھ خود کہنے کی ہمت مجھے نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے قلم کا سہارا لیا ہے۔ میرے احسن، یقین کرو، میں تمہارے سب زخم مندمل کردوں گی۔ میری چاہت کی دیوانگی تمہیں ہر غم بھلا دے گی۔ میرے اس اظہار محبت کو تمہاری پذیرائی ملے گی یا نہیں، میں نہیں جانتی۔ اسی لیے میں نے اسے اپنی شادی کا ممکنہ دعوت نامہ کہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہاری بیوی ہی نہیں، تمہاری محافظ بھی بننا چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری حفاظت ساحرہ سے کرنا ہوگی کیونکہ ساحرہ کسی اور سے شادی کرلینے کے باوجود...... میں اب اور کیا لکھوں تم نے میرا مطلب سمجھ ہی لیا ہوگا۔ بس اب میں قلم رکھتی ہوں۔ میں پہلے تو نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اب...... صرف تمہاری، شیبا۔"
احسن نے یہ خط متعدد مرتبہ پڑھا تھا اور تمام حالات پر مسلسل غور کرتا رہا تھا۔ ساحرہ اس کی محبت تو یقیناً تھی لیکن اس کی شادی کے بعد اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اس سے ملتا۔ ایک دوست کی حیثیت سے ملنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ساحرہ اس سے صرف دوست کی حیثیت سے نہیں ملے گی۔ اس کا مطالبہ اب بھی قائم رہے گا۔ اس بات پر یقین اس لیے کیا جاسکتا تھا کہ ساحرہ نے اس سے اپنے خیالات کا اظہار کردیا تھا۔ اس کے نظریات ایسے تھے جو احسن کے خیال میں تو دنیا کی کسی اور لڑکی کے نہیں ہوسکتے تھے۔ اگر وہ کسی بہت ہی الٹرا ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہوتی تو اس کے ان نظریات کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی لیکن اس نے تو ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کا انداز فکر ایسا ہو جانا نہایت تعجب خیز تھا۔
اس کے برخلاف شیبا ایک نہایت ماڈرن اور آزاد خیال گھرانے کی بیٹی تھی۔ یہ خیال اسے یوں تھا کہ اس کے باپ کی تین شوگر ملز تھیں۔ اس کے خیال کے مطابق اتنے مال دار لوگ عموماً نہایت ماڈرن اور آزاد خیال ہوتے ہیں لیکن شیبا......؟
اس پر شاید مادر پدر آزادی کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔
احسن بڑی سنجیدگی سے اس کا اور ساحرہ کا موازنہ کرتا رہا۔ کال بیل کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھا۔ وہ متذبذب ہو گیا تھا۔ گزشتہ روز سے اس نے ساحرہ

کی کال ریسیو کرنے سے اجتناب برتتا تھا اور اب کال بیل بجنے پر اسے خیال آیا تھا کہ ساحرہ خود ہی نہ آ گئی ہو۔

دوسری مرتبہ کال بیل کچھ توقف سے بجی تو وہ بستر سے اٹھا لیکن بستر ہی پر بیٹھا رہ گیا۔ وہ اس وقت تنہا تھا اور ساحرہ یہی کوشش کرتی رہی تھی کہ ان دونوں کی ملاقات تنہائی میں ہو۔

تیسری مرتبہ گھنٹی بجی لیکن اس مرتبہ وہ موبائل فون کی تھی۔ احسن نے دیکھا کہ اسکرین پر شیبا کا نام چمک رہا تھا۔

احسن نے فوراً کال ریسیو کی۔ ''ہیلو!''

''کیسے ہو احسن؟'' شیبا نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں شیبا!''

''ابو جان اور امی جان تو چلے گئے ہوں گے۔''

''ہاں وہ تو جا چکے ہیں۔''

''تم کہہ رہے ہو کہ ٹھیک ہو تو میں یقین کیے لیتی ہوں ورنہ تو میں ڈر گئی تھی کہ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے کال بیل کی آواز سن کر تم دروازہ کھولنے بھی نہیں آسکے۔''

''اوہ!'' احسن چونکا۔ ''دروازے پر تم ہو؟''

''تم کیا سمجھ رہے تھے؟''

''میں آرہا ہوں۔'' احسن نے بستر سے اٹھتے ہوئے موبائل بند کر دیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

شیبا اندر آتے ہوئے بولی۔ ''کال بیل سن کر تم کیا سمجھے تھے؟''

''ساحرہ کا خیال آ گیا تھا۔'' احسن جواب دیتے ہوئے واپسی کے لیے مڑتا ہوا بولا۔ ''اپنی تنہائی کی وجہ سے میں ڈر گیا تھا۔''

شیبا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تمہاری تنہائی میں یہاں آنے سے اس لیے ڈر نہیں لگا کہ میں تمہارے مضبوط کردار سے واقف ہوں۔''

احسن نے کچھ نہیں کہا۔

شیبا اس کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''ناشتا کب کیا تھا؟''

''صبح ہی کر لیا تھا۔''

''اس کے بعد کچھ کھایا؟''

''نہیں۔''

''کمال کرتے ہو۔ ابھی تمہیں اپنی غذا کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی تمہارے لیے چکن سوپ بنا کے لاتی ہوں۔ امی نے کل ہی مجھے بتا دیا تھا کہ فریج اور ڈیپ فریزر میں ہر چیز موجود ہے تاکہ تمہیں کسی بھی ضرورت کے تحت باہر نہ جانا پڑے۔ میں ابھی بنا کے لاتی ہوں۔'' وہ کمرے سے جانے کے لیے مڑی۔

''ارے رہنے دو شیبا!'' احسن نے جلدی سے کہا۔ ''بیٹھو، باتیں کرو۔ ابھی مجھے کچھ خواہش بھی نہیں ہے۔''

''سوپ پینے کے لیے خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' شیبا نے جاتے جاتے سر موڑ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''جب تک ابو جان اور امی جان نہیں آجاتے، مجھے ہی تمہارا خیال رکھنا ہوگا۔''

وہ کمرے سے چلی گئی اور احسن بستر پر بیٹھا پھر شیبا اور ساحرہ کا موازنہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شیبا لوٹی تو سوپ کے ساتھ وہ اپنے لیے چائے بھی بنا لائی۔ سوپ کا پیالہ احسن کو دے کر وہ خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ساحرہ کا فون تو آیا ہوگا؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں۔ کل دوپہر تک اس نے کئی مرتبہ کال کیا لیکن میں نے ریسیو نہیں کیا۔''

شیبا نے نظریں جھکا لیں۔

''مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس قسم کی بات کرے گی اور میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ اس کی باتوں کا کیا جواب دوں گا۔''

شیبا کچھ نہیں بولی، کچھ سوچتے ہوئے چائے کے گھونٹ لیتی رہی۔ پھر احسن بھی خاموشی سے سوپ پیتا رہا۔ جب وہ سوپ پی چکا تو شیبا نے پیالہ اس سے لے کر ایک طرف رکھنے کے ساتھ پیالی بھی وہیں رکھ دی۔ چائے وہ بھی پی چکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔ ''تمہاری طبیعت اب ٹھیک ہے لیکن اگر غذائیت کا خیال دو ایک دن اور رکھ لو گے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''کھانے کا کیا رہے گا؟''

''امی جان خاصا کچھ پکا کر ڈیپ فریزر میں رکھ گئی ہیں۔ بس گرم کرنا ہوگا۔''

''روٹی تو نہیں ہوگی!''

''میں ڈبل روٹی سے کام چلا لوں گا۔ وہ تو ہے۔''

''نہیں نہیں۔ میں روٹی پکا دوں گی۔ یہ مت سمجھنا کہ میں بڑے گھرانے کی لڑکی ہوں اس لیے مجھے یہ سب کچھ نہیں آتا ہوگا۔'' وہ مسکرائی۔

''اچھا کیا......'' احسن رک کر بولا۔ ''بس یہی باتیں کرتی رہو گی؟''

شیبا اس کا مطلب تو سمجھ گئی لیکن نظریں جھکا کر بولی۔ ''اور کیا بات کروں؟''

''تمہارا ایک خط ہے میرے پاس......اس کی بات

نہیں کر رہی ہو۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں پڑی ہوئی ہو۔"

"میں اس کی کیا بات کروں۔" شیبا نظریں جھکائے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ "مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ کہہ چکی۔"

"گویا اب مجھے کہنا ہے۔" احسن کی مسکراہٹ خزاں رسیدہ سی تھی۔

شیبا خاموش بیٹھی رہی۔

احسن یکایک اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ وہ کچھ مضطرب نظر آرہا تھا۔

"شیبا!" احسن کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "میں مرد ہوں، اس لیے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اب میں ساحرہ سے بہت خوف زدہ ہوں۔ کل اس کی شادی ہوچکی ہوگی۔ اب تو وہ بہت زیادہ بے باک ہوجائے گی۔"

شیبا اب بھی خاموش رہی۔

"تم اس سے بالکل مختلف ہو!" احسن کچھ توقف سے بولا۔ "زمین اور آسمان کا فرق ہے تم دونوں میں! تمہاری سوچ...... میں سلام کرتا ہوں اسے!...... یہ آسان نہیں ہے کہ کوئی اس طرح سوچ کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دے۔"

"میں نے اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹا احسن!" شیبا تیزی سے بولی۔ "میری محبت آج بھی زندہ ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم نے کل سے پہلے اپنے جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے۔ جو زمانہ کالج میں گزرا، اس میں بھی مجھے شبہ تک نہیں ہوسکا کہ ساحرہ کے علاوہ بھی کوئی مجھے چاہتا ہے، اور چاہت بھی ایسی کہ محبوب کی خوشی کے لیے خود کو اذیت میں دھکیل دے۔"

"ہرگز نہیں۔" شیبا پھر تیزی سے بول پڑی۔ "تم خوش رہتے تو میں بھی خوش رہتی۔"

"ایسی باتیں بس کہنے کی باتیں ہوتی ہیں شیبا! انسانی فطرت کے خلاف کچھ نہیں ہوتا۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی رہتی۔"

"میرے دل پر اگر کچھ گزرتی بھی تو کبھی کسی کے سامنے نہیں آتی۔"

"یہ دوسری بات ہے۔"

شیبا اب پھر خاموش رہی۔

احسن ٹہلتے ٹہلتے بستر کے قریب رکا اور پھر بیٹھ کر شیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا خط ملنے سے بھی پہلے، ساحرہ سے آخری ملاقات کے بعد میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ ساحرہ کی شادی کے بعد مجھے بھی کسی لڑکی سے شادی کرلینا چاہیے۔ اس طرح مجھے کچھ تو آڑ مل جائے گی۔ میں کسی ایسے معاملے میں ملوث نہیں ہوسکتا کہ خود ہی اپنی نظروں سے گر جاؤں اس لیے مجھے یقیناً کچھ تحفظ کی ضرورت ہے۔ میں اپنے تحفظ کی ذمے داری تمہیں سونپنے کے لیے تیار ہوں شیبا!"

"احسن!" شیبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور آب دیدہ ہوگئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا یقین کرلوں کہ میں نے جو سنا ہے وہی تم نے کہا ہے؟"

"ہاں شیبا!" احسن بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

اب اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی ٹپک پڑے۔

"یہ کیا شیبا!" احسن جلدی سے بولا۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں احسن!" شیبا پہلے سے زیادہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ساحرہ کی شادی کا معاملہ سامنے آنے سے پہلے تک۔ بلکہ تم سے اپنی پہلی ملاقات تک میرے دماغ میں یہ بات پتھر کی لکیر بنی ہوئی تھی کہ تم میرا مقدر نہیں ہو لیکن اس وقت تمہارے جواب نے اس پتھر کو ہی پگھلا دیا ہے جس پر وہ لکیر تھی۔"

"ہمیں جلد از جلد شادی کرلینی چاہیے۔" احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میرا تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ کیا تمہارے والد مان جائیں گے؟"

"میں ہر قیمت پر ان سے منوالوں گی۔" شیبا پرجوش ہوگئی، پھر اس نے پوچھا۔ "اور تمہارے والدین؟ انہیں خیال آسکتا ہے کہ میں ایک بہت ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہوں۔"

احسن مسکرایا۔ "تم نے اپنے خط میں پہلی نظر کی بات کی تھی۔ اس میں تم نے اپنی ہی طرف اشارہ کیا تھا لیکن ایسا ہی امی جان کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ انہیں بھی تم پہلی ہی نظر میں بھا گئی ہو۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں، تمہیں اپنی بہو بنالوں۔"

"سچ احسن!" شیبا کے ہونٹ لرز گئے۔

احسن نے اثبات میں سر ہلایا۔

شیبا نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا جس پر آنسوؤں کی لکیریں بن گئی تھیں، پھر وہ بولی۔ "تو اب ہمیں اس معاملے میں جلدی کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، ابو جان اور امی جان کل آجائیں گے۔ تم اپنے ڈیڈی سے بات کرلو۔"

"ڈیڈی تو آج سوات چلے گئے ہیں، دس دن بعد لوٹیں گے۔"

"اتنے بڑے کاروباری لوگوں کو تفریح کی اتنی فرصت مل جاتی ہے؟" احسن کے انداز میں تھوڑا سا تعجب تھا۔

"مال دار لوگوں سے زیادہ تفریح کون کرسکتا ہے۔" شیبا نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اپنی چوتھی بیوی کو گھمانے لے

گئے ہیں۔''

''چوتھی بیوی؟''

''ہاں، تمہیں بعد میں معلوم ہو ہی جائے گا اور تم سوچو گے کہ میں نے تم سے یہ بات چھپائی لہٰذا میں تمہیں ابھی بتا دیتی ہوں۔'' شیبا نے اپنے باپ کی چاروں شادیوں کے بارے میں بتایا لیکن پُراسرار اموات کا ذکر اس لیے نہیں چھیڑا کہ بات طویل ہو جاتی۔ اس کے علاوہ اس نے ابھی تک یہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ اس کے باپ کی چوتھی بیوی ساحرہ تھی۔

''اتنی بیویاں مرگئیں ان کی؟'' احسن نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ساحرہ تمہارے بارے میں بہت باتیں کرتی تھی مگر اس نے یہ نہیں بتایا۔''

''ڈیڈی کی شادیاں!'' شیبا کچھ تلخی سے بولی۔ ''ساحرہ کو یہ سب کچھ بتانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔''

احسن نے سر ہلایا۔ ''ساحرہ نے مجھے صرف یہ بتایا تھا کہ تمہارے والد کئی شوگر ملز کے مالک ہیں اور ہاں، یہ بھی بتایا تھا کہ تمہارے ایک بڑے بھائی بھی ہیں جو پڑھنے کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''وہ کچھ دن میں آنے والے ہیں، خیر یہ ذکر چھوڑو! میں نے ابھی کہا تھا کہ ہمیں اپنی شادی کے معاملے میں جلدی کرنا چاہیے۔''

''میں بھی اب جلدی چاہوں گا لیکن تم اپنے ڈیڈی کو تو آ جانے دو۔''

''میں انہیں بعد میں منالوں گی اور تمہاری امی جان تیار ہیں تو ابو جان بھی تیار ہو ہی جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں احسن...... کہ......'' وہ جھجک گئی۔

''کہ......؟'' احسن اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کہ...... ہم ......آج ہی......'' شیبا نے نظریں جھکالیں۔

''آج ہی؟'' احسن حیرت سے بولا۔

''ہاں۔'' شیبا کی نظریں بہ دستور جھکی رہیں۔ ''ہم آج ہی سول میرج کرلیں۔''

احسن کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ شیبا کا منہ تکتا رہ گیا تھا۔

''ہاں احسن! آج ہی......! لیکن میری اس عجلت کی وجہ وہ خواہش ہرگز نہیں ہے جو ساحرہ کی تھی۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم پر میرا ایک حق ہو جائے۔ تم میرے بن جاؤ اور میں ہر ایک کا یہ اختیار سلب کرسکوں کہ وہ مجھے تم سے چھیننے کی کوشش کرے۔''

احسن اسے غور سے دیکھنے لگا، پھر سر ہلا کر بولا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں۔ میری طرح تم بھی ساحرہ سے خائف ہو لیکن شیبا! اگر تمہارے والد......''

''میں نے کہا نا!'' شیبا نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں انہیں منالوں گی۔ دوسری بات یہ کہ ہم ابھی کسی پر ظاہر نہیں کریں گے کہ ہم نے سول میرج کرلی ہے۔ ہاں اگر کوئی مجبوری سامنے آگئی......'' شیبا نے ساحرہ کا نام لیے بغیر کہا۔ ''تب شاید وقت سے پہلے ظاہر کرنا پڑ جائے۔''

احسن بے چین سا ہو کر پھر بستر سے اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

''میں صرف بندھن چاہتی ہوں احسن!'' شیبا بولی۔ ''گھریلو طور پر باقاعدہ شادی ہونے سے پہلے ہم صرف دوست رہیں گے۔'' شیبا نے ''صرف دوست'' کے الفاظ پر خاصا زور دیا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے شیبا لیکن یہ بڑا عجیب سا لگے گا۔''

''عجیب حالات میں عجیب ہی فیصلے کرنا پڑتے ہیں احسن!'' شیبا نے کہا۔ ''تمہیں اپنے والدین کی طرف سے تو کوئی اندیشہ نہیں؟''

''ہرگز نہیں۔ امی جان تو تمہارے بارے میں کہہ بھی چکی ہیں اور ابو جان نے بھی میری کوئی خواہش نظرانداز نہیں کی۔''

''تو پھر؟'' شیبا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

''اچھا!'' احسن نے طویل سانس لی۔ ''اگر تم لڑکی ہوتے ہوئے اتنی مضبوط ہو تو میں بھی کمزور نہیں بنوں گا۔''

شیبا کا چہرہ کھل اٹھا۔

''تو تیار ہو جاؤ!'' وہ بولی۔ ''پہلے تو ہمیں کسی وکیل کے پاس جانا پڑے گا۔''

احسن نے اپنے کپڑوں کی الماری کی طرف دیکھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ شیبا کی کار میں تھا اور شیبا اسے خاصی تیز رفتاری سے چلا رہی تھی۔

''آج دن میں ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' احسن زیرلب بڑبڑایا۔

اس دن جو کچھ وہ اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکا تھا، حقیقت میں ڈھل رہا تھا۔ جب وہ دونوں عدالت سے لوٹ رہے تھے تو میاں بیوی بن چکے تھے۔ شیبا سیدھی احسن ہی کے گھر پہنچی۔

''اب تو بھوک سے بہت برا حال ہو گیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم کپڑے تبدیل کرو، میں روٹی پکاتی ہوں۔'' وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

سارا دن اس نے احسن کے ساتھ ہی گزارا۔ ان میں بس ایسی باتیں ہوتی رہیں جو دوستوں میں ہوتی ہیں۔ اس نے احسن کو رات کا کھانا بھی کھلایا اور اس کے بعد رخصت ہوگئی۔

رات کو بستر پر لیٹتے وقت بھی احسن کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شیبا کی آمد سے اب تک جیسے کوئی خواب دیکھتا رہا تھا۔ رات گئے اس کی آنکھ لگی۔ پھر اس کے جاگنے کا سبب کال بیل کی آواز تھی۔

آنے والی شیبا تھی۔ وہ اندر آتے ہی بولی۔ ''تم شاور لے لو! میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔''

''جو حکم بیگم صاحبہ!''

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ناشتا کر رہے تھے۔

''ابو جان اور امی جان اب روانہ ہونے والے ہوں گے اسلام آباد سے۔'' شیبا بولی۔ ''ایک گھنٹے بعد ہم دونوں ہی انہیں لینے کے لیے ایئر پورٹ چلیں گے۔'' وہ اتنی ہی خوش نظر آرہی تھی جتنی خوش کوئی اچھی بہو اپنے ساس سسر کے آنے پر ہوسکتی ہے۔

مگر یہ خوشی برقرار نہیں رہ سکی، جب روانگی کے لیے تیار ہونے سے قبل شیبا نے خبریں سننے کے لیے ٹی وی کھولا۔

ٹی وی کی بریکنگ نیوز یہ تھی کہ پچاس منٹ پہلے اسلام آباد سے کراچی روانہ ہونے والا طیارہ کریش ہوگیا تھا اور غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس بدقسمت طیارے کا ایک مسافر بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

''نہیں۔'' احسن چیخ پڑا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ وہ ایئر پورٹ فون کر کے انکوائری سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ طیارہ لیٹ تو نہیں ہے؟

لیکن طیارہ تو ہمیشہ کے لیے لیٹ ہو چکا تھا۔

احسن نے دیوانگی کی سی کیفیت میں چیختے ہوئے اپنا موبائل فون ٹی وی کی اسکرین پر دے مارا تھا۔

شیبا اس طرح بیٹھی رہ گئی جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔

ٹی وی سے بریکنگ نیوز بار بار دہرائی جا رہی تھی۔

شیبا سکتے کے عالم سے باہر آئی اور دھیرے دھیرے احسن کی قریب آگئی۔ ''یہ کیا ہوگیا احسن!'' اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

احسن نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے ان میں نمی اتر آئی ہو۔ اس کا سارا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے اسے شدید کوشش کرنا پڑ رہی ہو۔

شیبا کے کانوں میں بریکنگ نیوز کا ایک اور جملہ گونجا۔

''اب تصدیق ہوگئی ہے کہ مسافر طیارے کا کوئی مسافر زندہ نہیں بچا۔''



ساحرہ کو اس طیارے کی تباہی اور تمام مسافروں کی ہلاکت کا علم سوات جانے والے راستے میں ایک جگہ رکنے پر ہوا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ان مسافروں میں احسن کے والدین بھی تھے۔

رات کو وہ اور آغا نصیر سوات ہوٹل میں تھے۔ ساحرہ بہت خوش تھی کہ آغا نصیر اس کا دیوانہ ہوگیا تھا اور اس کی دیوانگی ہی ساحرہ کو بھی سرشار کر رہی تھی۔ اسے گمان تھا کہ شادی کے بعد اس کے اندر بھری ہوئی آگ پر پانی کے چھینٹے پڑ جائیں گے لیکن ہوا یہ کہ وہ اسے پیٹرول کے چھینٹے محسوس ہوئے۔ آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اس کی وحشت ہی نے آغا نصیر کو اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ اسے ایک پل کے لیے بھی ساحرہ سے دور رہنا گوارا نہیں تھا۔ اس نے اپنا موبائل تو بند کر ہی دیا تھا کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے مگر ساتھ ہی اس نے ساحرہ کا موبائل بھی بند کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

''جب تک ہم یہاں ہیں، کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کر سکے۔'' اس نے کہا تھا۔

ساحرہ کی خواہش تھی کہ وہ کسی وقت احسن سے بات کرے لیکن موبائل آغا نصیر کے پاس ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکی لیکن سوات میں گزارے جانے والے دس دنوں میں ایک دن بھی ایسا نہ تھا کہ اسے احسن کا خیال نہ آیا ہو۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی رہی تھی کہ کاش آغا نصیر کی جگہ احسن ہوتا۔

دس دن بعد وہ سوات سے لوٹے۔ ساحرہ کو اس کا موبائل واپس مل گیا۔ صبح آغا نصیر کے دفتر جانے کے بعد اس نے اپنے موبائل سے احسن کے موبائل پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔

ایسی تیسی، اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اپنا موبائل بند کرتے ہوئے سوچا، میں خود جا کر ملتی ہوں اس سے!...... بھلا کوئی تک ہے! شادی کر لی میں نے تو کیا فرق پڑ گیا، میرے دل سے اس کی محبت تو ختم نہیں ہوئی، بے وفا تو نہیں ہوں میں۔

عجیب ہی انداز فکر تھا ساحرہ کا!

وہ نئی کار میں بیٹھ کر احسن کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ کار اسے آغا نصیر نے دی تھی اور ڈرائیونگ اس نے کالج کے زمانے میں شیبا سے سیکھ لی تھی۔ بس شوق تھا اسے کہ

ڈرائیونگ سیکھ لے۔ اس وقت اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ کبھی خود اس کے پاس کار ہوگی۔

وہ احسن کے گھر پہنچ گئی لیکن احسن سے نہیں مل سکی۔ گھر مقفل تھا۔ ساحرہ کو تعجب ہوا۔ احسن کی والدہ تو گھر ہی میں رہتی تھیں۔ اس نے قریب ہی کے گھر میں رہنے والی ایک معمر خاتون سے اس بارے میں پوچھا تو طیارے کے حادثے میں احسن کے والدین کی ہلاکت کا علم ہوا۔

''لاشیں کیا...... نامکمل لاشوں کے ٹکڑوں کی تدفین ہوئی تھی۔'' پڑوس کی خاتون نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بے چارے احسن پر قیامت گزر گئی۔ اکیلا رہ گیا دنیا میں......! اس کی ایک دوست آتی رہی ان دنوں میں۔ اسی نے کسی طرح سنبھالا ہوگا اسے۔''

احسن کے والدین کی حادثے میں ہلاکت، ساحرہ کے لیے بھی افسوس ناک تھی لیکن اس بات نے اسے چونکایا بھی کہ کوئی لڑکی ان دنوں میں احسن کے پاس آتی رہی تھی۔

مزید پوچھ کچھ پر اسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی نیلے رنگ کی کار میں آیا کرتی تھی۔ ''نیلے رنگ'' کی بات نے ساحرہ کو اور چونکا دیا۔ نیلا رنگ شیبا کی کار کا تھا۔ پھر پڑوس ہی کے کسی شخص نے اسے کار کا نمبر بھی بتا دیا۔ اس کے بعد کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

''لیکن گھر کیوں مقفل ہے؟'' ساحرہ نے پوچھا۔

''احسن صاحب کل صبح یہاں سے کہیں اور منتقل ہو گئے۔'' اسی شخص نے بتایا۔ ''کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ گھر بیچ دیں گے۔''

ساحرہ کو اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہاں سے لوٹی، راہ میں اس نے اپنے والدین سے ملنا ضروری سمجھا۔ اسے آغا نصیر نے بتا دیا تھا کہ ان لوگوں کو کس عمارت میں فلیٹ دلایا گیا تھا۔

بو جان کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ساحرہ کو جھنجوڑ دینے کی حد تک خوشی سے لپٹائے رکھا۔ سرکار احمد نے بھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ اپنے بدلے ہوئے حالات سے بہت خوش تو نہیں مگر ناخوش بھی نہیں تھا۔

بو جان کی خواہش کے خلاف ساحرہ نے ماں باپ کے ساتھ کم ہی وقت گزارا اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔ وہ شیبا سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ یہ اس کے لیے حیران کن تھا کہ اتنی جلدی، بلکہ اچانک احسن سے شیبا کے تعلقات اتنے زیادہ کیسے بڑھ گئے۔

ساحرہ کے ان خیالات میں حسد، جلن جیسے جذبے کی رمق بھی نہیں تھی۔ اس کا انداز فکر ہی ایسا تھا کہ احسن کا کسی بھی لڑکی سے ملنا اس کے لیے کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔ اسے شیبا کی وجہ سے صرف تعجب تھا۔

جب وہ گھر پہنچی تو شیبا کہیں جا چکی تھی۔ ساحرہ نے اس سے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ ''کہاں ہو جانی؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک دوست کے پاس ہوں۔'' شیبا نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

ساحرہ کو فوراً احسن کا خیال آیا۔ اس کی دانست میں شیبا کو احسن کی نئی قیام گاہ کا علم ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے فون پر یہ بات چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ''کب آؤ گی؟'' اس نے پوچھا۔

''دو ڈھائی بجے تک۔''

''میں انتظار کروں گی۔''

''کوئی خاص بات؟''

''آؤ گی تو بتاؤں گی۔''

ساحرہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ یہ باتیں اس نے بستر پر لیٹے لیٹے کی تھیں۔ اسے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ شیبا احسن ہی کے ساتھ ہوگی۔

کیا وہ احسن کے ساتھ شادی کر سکتی ہے؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔ اس کے خیال میں اگر ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔

دو ڈھائی بجے کے درمیان شیبا آگئی۔ ساحرہ نے اسے بہت سنجیدہ پایا۔

''میں احسن کے گھر گئی تھی۔'' ساحرہ نے کہا۔ ''وہاں مجھے ان سب باتوں کا علم ہوا جن سے تم بھی واقف ہوگی۔''

شیبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

ساحرہ نے کہا۔ ''مجھے اس کے والدین کا سن کر بہت افسوس ہوا جو ہونا ہی چاہیے تھا لیکن اس پر تعجب ہوا کہ اس دوران میں تم احسن کے گھر جاتی رہی ہو۔ وہاں کسی نے مجھے تمہاری کار کا نمبر بتایا تھا۔ یقین جانو، مجھے تمہارا وہاں جانا قطعی برا نہیں لگا ہے۔''

شیبا بہ دستور سنجیدگی سے بولی۔ ''تم تو سوات جا چکی تھیں۔ تمہاری شادی کے بعد والدین کی وفات احسن کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا اور اس وقت اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔''

''تمہارا سہارا اس نے بہ خوشی قبول کر لیا؟'' ساحرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

شیبا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ اچھا ہوا۔" ساحرہ بھی مسکرائی۔ "لیکن اس نے اپنا گھر کیوں چھوڑ دیا؟"

"میں نے ہی اصرار کر کے اس کا گھر بدلوایا ہے۔ وہ وہاں رہتا تو والدین کی یاد اسے تڑپاتی رہتی۔ گھر کا ایک ایک گوشہ اسے ان کی یاد دلاتا۔"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا، لیکن ایک بات سچ سچ بتاؤ!"

شیبا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ساحرہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم نے صرف ہمدردی میں اسے سہارا دینا ضروری سمجھا تھا یا...... اتنے دن اس کے قریب رہ کر تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی اور جذبہ بھی پیدا ہو گیا ہے؟"

وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ شیبا یکا یک مضطربانہ انداز میں کھڑی ہوئی اور سامنے کے دوسرے صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کا یہ سارا عمل قطعی غیر ارادی تھا۔ چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات تھے۔ ساحرہ اسے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ شیبا کی نظریں جو فرش کی طرف تھیں، یکا یک ساحرہ کی طرف اٹھیں۔ جیسے اس نے کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تم نے پوچھا تھا ساحرہ کہ میرے دل میں کوئی اور جذبہ تو پیدا نہیں ہو گیا...... اب میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ وہ جذبہ جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے، وہ تو بہت پہلے سے میرے دل میں تھا۔ اس وقت سے جب میں نے کالج میں اسے پہلی بار دیکھا تھا۔"

ساحرہ صوفے سے اچک جانے کی حد تک چونک گئی تھی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ہے ساحرہ!" شیبا نے سنجیدگی سے کہا اور احسن سے اپنی محبت کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ احسن کو بھی بتا چکی تھی۔

ساحرہ چند لمحے اس کا منہ تکتی رہی، پھر مسکراتے ہوئے تیزی سے اٹھی اور سامنے کے صوفے پر جا کے والہانہ انداز میں شیبا سے لپٹ گئی۔

"جانی!...... میری جان!...... تم نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی؟"

"میں لفظ قربانی تو اپنی زبان پر نہیں لا سکتی لیکن جب میں نے اسے تمہاری طرف متوجہ دیکھ لیا تھا تو پھر یہ بالکل مناسب نہیں تھا کہ میں تم دونوں کے بیچ میں آتی۔"

"تم گریٹ ہو جانی!...... لیکن اب...... میرا مطلب ہے...... کیا تم نے احسن کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کر دیا ہے؟"

"جب ڈیڈی سے تمہاری شادی طے پا چکی تھی، تبھی میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت اس کی ضرورت بھی تھی۔ احسن تمہاری شادی سے بہت اداس تھا۔ میں اس کے زخم مندمل کرنا چاہتی تھی۔"

"تمہیں اس میں کامیابی ہوئی؟" ساحرہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"اپنی توقعات سے بڑھ کر......" جواب دیتے ہوئے شیبا سوچ بھی رہی تھی۔ وہ قدرے تذبذب کے عالم میں بولی۔ "جس دن تم سوات گئی تھیں، اسی روز میں نے اور...... احسن نے...... مطلب یہ کہ...... ہم نے سول میرج کر لی تھی۔"

ساحرہ چونکی اور ایک بار پھر شیبا سے لپٹ گئی۔

"شاندار!...... بہت شاندار!...... تم نے تو مجھے خوش کر دیا جانی!...... احسن تو محبت کے معاملے میں بے تکی سوچ رکھتا تھا لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی کہ کسی لڑکی سے اس کی شادی کرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ میری پیاری دوست ہی اس کی بیوی بن گئی۔"

"عملاً بیوی نہیں بنی ہوں ابھی۔" شیبا نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم میں طے پایا تھا کہ باقاعدہ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کے دوست رہیں گے۔ سول میرج میں جلدی تو میں نے اس لیے کی تھی کہ اس پر حق جتا سکوں ورنہ میں گھر چھوڑنے کے لیے بھی اس سے اصرار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو کھانا پینا بھی بھول گیا تھا۔ میں ہی جا کر اسے زبردستی کھلاتی پلاتی رہی ہوں۔ ابھی اسے کھانا کھلا کر ہی آئی ہوں۔"

ساحرہ اس کا منہ تکتے ہوئے سب کچھ سنتی رہی تھی لیکن خوش نظر آ رہی تھی۔

"اب میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوں کہ ڈیڈی سے شادی کی بات کس طرح کروں۔" شیبا بولی۔ "کیا تم میری خاطر ڈیڈی سے بات کر سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں!" ساحرہ جلدی سے بولی۔ "احسن کی خوشی کے لیے، تمہاری خوشی کے لیے میں کیا نہیں کر سکتی جانی!"

شیبا مسکرائی۔ "آج ہی بات کرنا۔"

"آج ہی کروں گی۔" ساحرہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔

پھر اس کا وقت سوچ بچار میں گزرنے لگا۔ یہ اس کے

لیے خوشی کی بات تھی کہ احسن شادی کر چکا تھا لیکن وہ فکر مند تھی کہ شیبا کی موجودگی میں وہ احسن کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ شیبا کی عدم موجودگی میں احسن خود بھی گھر پر نہیں رہتا۔ وہ اس سے ناراض تھا اور اس سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ساحرہ اسے اسی صورت میں منا سکتی تھی جب وہ اس سے ملتا مگر اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ احسن نے اس کی کال ہی ریسیو کرنا چھوڑ دی تھی۔

سوچتے سوچتے ساحرہ کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوئی جیسے اسے کوئی تدبیر سوجھ گئی ہو۔ وہ مسکرا دی۔ وہ اس وقت اکیلی ہی تھی۔ شیبا اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

ساحرہ کو اچانک ایک خیال اور بھی آیا۔ اگر وہ کسی دوسرے نمبر پر احسن کو رنگ کرتی تو قوی امکان تھا کہ وہ کال ریسیو کر لے۔

آغا نصیر نے ساحرہ کو ایک خوب صورت موبائل فون پشاور سے دلایا تھا جو اس نے ابھی تک استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنی خواب گاہ کی طرف گئی۔ اس نے سامان میں سے وہ موبائل نکالا جو آغا نصیر نے اسے ایکٹی ویٹ کر کے دیا تھا۔ ساحرہ نے اس پر احسن کے نمبر ملائے۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔ آواز احسن کی تھی۔

''سب سے پہلے تو میں ابو جان اور امی جان کی رحلت پر افسوس کا اظہار کروں گی احسن!'' ساحرہ نے کہا۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے طویل سانس لی گئی ہو۔

''پلیز احسن!'' ساحرہ پھر جلدی سے بولی۔ ''فون بند نہ کرنا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم مجھ سے کتنے ناراض ہو، تم نے شاید اپنا گھر بھی اس لیے چھوڑا ہے کہ میں تم سے ملنے وہاں نہ آ جاؤں۔''

''اب کیا چاہتی ہو ساحرہ!'' احسن کی آواز بے جان سی تھی۔

''تم سے ملنے کے علاوہ میں اور کیا چاہ سکتی ہوں؟''

''اب تم کسی کی بیوی بن چکی ہو۔''

لفظ ''کسی'' سے ساحرہ نے ایک نتیجہ اخذ کر لیا۔ احسن کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کی بیوی بنی تھی۔ شیبا نے اسے اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔

''بیوی بن گئی ہوں تو کیا ہوا؟'' ساحرہ بولی۔ ''میں تمہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر چکی تھی۔''

''مگر میں ان خیالات سے متفق نہیں ہوں۔''

''تم اب مجھ سے کبھی نہیں ملنا چاہتے؟'' ساحرہ مسکرائی۔

''تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

اتنی بے رخی؟ ساحرہ مسکرائی۔ ''نہیں احسن! تمہیں تو اب میں اپنی دسترس کے بہت قریب لے آؤں گی۔''

رات کو اس نے آغا نصیر سے شیبا کا ذکر چھیڑا۔

''اب اس کی شادی ہو جانا چاہیے آغا صاحب!''

''کوئی رشتہ تو آئے!''

ساحرہ نے اسے احسن اور شیبا کی محبت کے بارے میں بتایا مگر اس میں اپنا نام نہیں آنے دیا۔

''کون ہے یہ احسن!'' آغا نصیر نے چونک کر پوچھا۔

ساحرہ نے اسے احسن کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

آغا نصیر کا منہ بن گیا۔ ''یہ لڑکیاں اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہیں۔ بس محبت، محبت! یہ نہیں سوچتیں کہ ان کا مستقبل کیسے گزرے گا جو ملازمت کی تلاش میں ہو، کیا وہ شیبا کے اخراجات پورے کر سکتا ہے؟ وہ کہیں ملازم ہو بھی گیا تو اس کی آدھی تنخواہ شیبا کی کار کے پیٹرول میں خرچ ہو جائے گی۔''

''کیا آپ نے ایک غریب لڑکی سے شادی نہیں کی؟''

''لیکن اب وہ لڑکی غریب نہیں ہے۔'' آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کے والدین بھی ایک اچھے فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ کچھ ہی دن بعد وہ ایک اچھے اسکول کے مالک ہوں گے۔''

''احسن کے لیے بھی آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اسے اپنی کسی شوگر مل کا منیجر بنا دیجیے گا۔''

''کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے؟''

''تھوڑی سی ٹریننگ دلوا دیجیے گا۔ وہ بہت ذہین ہے۔''

آغا نصیر کوئی جواب دیے بغیر اٹھا اور کپ بورڈ سے شراب نکالنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ساحرہ کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔ وہ دو پیگ بنانے لگا۔ ایک اپنے لیے اور ایک ساحرہ کے لیے۔ سوات میں وہ شیبا کو اس راہ پر لے آیا تھا۔

ساحرہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ مرد سے کوئی عورت اپنی بات کن لمحات میں منوا سکتی ہے۔

جب آغا نصیر نے تیسرا پیگ شروع کیا، ساحرہ دوسرا پیگ تھوڑا سا ہی پی سکی تھی۔ اس دوران میں آغا نصیر ساحرہ کی پُرجوش رفاقت کے تذکرے کر کے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ شیبا کے بارے میں اس نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ پھر جب اس نے شراب سے مخمور ہو جانے کے بعد ساحرہ کو اپنی آغوش میں لینا چاہا تو وہ تیزی سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کی یہ حرکت آغا نصیر کے لیے ایک نئی بات تھی۔ وہ حیرت سے ساحرہ کی طرف دیکھنے لگا جو اب منہ پھلائے ہوئے تھی۔

"میں نے جو بات کی تھی، وہ آپ کی بیٹی کی بھلائی کے لیے کی تھی۔ اگر آپ میری وہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو پھر کیا مجھے برا نہیں لگے گا؟"

"مگر جانِ من......"

"کوئی جانِ من نہیں آپ کا!" ساحرہ اپنی آنکھوں میں آنسو لے آئی جو مصنوعی تھے۔ "آپ نے ہمیشہ صرف اپنے جذبات کی آسودگی کے راستے تلاش کیے ہیں۔ آپ کو شاید احساس ہی نہیں کہ آپ کی بیٹی جوان ہے، اس کے بھی جذبات ہوں گے۔ وہ ایک خوب صورت نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ کسی وقت ان دونوں کے قدم بھی ڈگمگا سکتے ہیں۔"

آغا نصیر چونکا۔ "ڈگمگا سکتے ہیں یا ڈگمگا چکے ہیں؟ شیبا نے تمھیں صاف صاف کچھ بتایا ہے؟"

"اس نے مجھے صرف اپنی محبت اور شادی کی خواہش سے آگاہ کیا ہے۔ یہ تو بس میرا اندازہ ہے کہ جب دو جوانیوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

نشے میں ہونے کے باوجود آغا نصیر کے چہرے سے تشویش کا اظہار ہونے لگا۔

گرم لوہے پر ساحرہ نے ایک اور چوٹ لگائی۔ "کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے آپ! یہ کام ایسا ہے جو جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سوچی ہے۔ آپ یہ شرط رکھ دیجیے کہ شادی کے بعد احسن کو ہمارے ہی گھر میں رہنا ہوگا۔ وہ یہاں رہے گا تو کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔" ساحرہ نے احسن کو اپنے قریب کرنے کی یہی ایک تدبیر سوچی تھی۔

"میں شیبا سے بات کروں گا۔" آغا نصیر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ سے بات کرسکتی تو بہت پہلے کر چکی ہوتی اور مجھ سے نہ کہتی۔ میں پھر کہوں گی کہ اس معاملے میں آپ کو جلدی کرنا چاہیے۔"

"اچھا خیر! سوچوں گا۔ یہ تم نے رونا کیوں شروع کر دیا۔"

"صدمہ پہنچا ہے مجھے!" ساحرہ نے سسکی لی۔ "پہلی مرتبہ آپ سے کوئی بات منوانا چاہی جس میں میری اپنی کوئی غرض بھی نہیں، لیکن آپ میری یہ پہلی بات بھی نہیں مان رہے ہیں۔"

"اچھا تم میرے قریب تو آؤ۔" آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ہونٹوں سے تمہارے آنسو تو پی لوں۔"

ساحرہ نے شراب کا ایک گھونٹ لیا اور خود ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے، بستر پر آغا نصیر کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔

آغا نصیر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ "اب آپ مجھ سے دور ہی رہیے۔ مجھے شیبا سے بھی شرمندہ ہونا پڑے گا اب! آپ کی محبت پر ناز تھا اس لیے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ آپ کو آمادہ کرلوں گی۔"

آغا نصیر نے زبردستی اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا اور اس کی بھیگی ہوئی سی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

"رہنے دیں یہ دکھاوے کی محبت!" ساحرہ نے اس کی آغوش سے نکلنا چاہا۔

"دکھاوا نہیں ہے۔ دل و جان سے چاہنے لگا ہوں تمھیں! چلو ٹھیک ہے۔ شیبا کی شادی اسی سے کردی جائے گی جس سے وہ چاہتی ہے لیکن تمہاری بات ٹھیک ہے۔ احسن کو یہاں آکر رہنا پڑے گا۔"

"پکی بات؟" ساحرہ نے مسکرا کر آغا نصیر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"بالکل پکی۔" آغا نصیر نے کہا۔ "لیکن چند دن تو رکنا پڑے گا۔ شہریار تو آجائے۔"

شہریار، شیبا کے بڑے بھائی کا نام تھا۔

ساحرہ بولی۔ "آپ نے بتایا تھا کہ ہم سوات سے لوٹیں گے تو دو چار دن میں شہریار آجائے گا۔"

"ہاں کہا تو تھا لیکن کسی وجہ سے کچھ دن اور لگیں گے۔ آج شہریار کا فون پھر آیا تھا۔ اسے آنے میں دس پندرہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"اتنے دن شیبا انتظار نہیں کرسکتی۔"

"اس کا مطلب ہے......" آغا نصیر سوچتے ہوئے بولا۔ "غلطی ہوچکی ہے شیبا سے! تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔"

"آپ شیبا سے کوئی بات نہیں کیجیے گا۔" ساحرہ نے کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ آغا نصیر اس شک میں مبتلا رہے۔

''تو پھر یہ شادی دو تین دن میں ہی ہو جانا چاہیے۔''
ساحرہ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ احسن جلد از جلد اس کے قریب آجائے۔
''بس۔'' آغا نصیر بولا۔ ''وہ کسی طرح بھی احسن کو یہاں رہنے پر آمادہ کرلے۔''
''میں اس سے کہہ دوں گی۔ پوری کوشش کروں گی کہ ایسا ہی ہو۔''
''اب تو دور نہ رہو مجھ سے!'' آغا نصیر نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس مرتبہ ساحرہ نے اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے جو چاہا تھا، وہ ہو گیا تھا۔
دوسرے دن ساحرہ نے صبح ہی صبح مسکرا کر شیبا سے کہا۔ ''آغا صاحب سے منوالی ہے میں نے بات! احسن سے تمہاری شادی دو تین دن میں ہو جائے گی۔ شادی کی تیاریوں کی ساری ذمے داری آغا صاحب نے مجھے ہی سونپ دی ہے۔''
خوشی سے شیبا کا چہرہ کھل اٹھا۔
''لیکن ایک شرط ہے آغا صاحب کی۔'' ساحرہ نے کہا۔ ''وہ احسن کو اپنی ایک شوگر مل کا منیجر تو بنا دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ احسن کو یہیں آکر رہنا پڑے گا۔''
شیبا کے چہرے سے خوشی رخصت ہو گئی۔ اس نے پریشانی سے کہا۔ ''احسن شاید یہاں رہنا پسند نہ کرے۔''
''اگر اسے تم سے محبت ہے تو وہ سب کچھ مانے گا۔ آغا صاحب تو یہ شادی دس پندرہ دن بعد کرنا چاہتے تھے کیونکہ تمہارا بھائی شہریار دس پندرہ دن بعد ہی آئے گا لیکن میں نے آغا صاحب کو جلدی کرنے پر آمادہ کرلیا ہے۔''
''بھائی جان تو دو تین دن میں آنے والے ہیں۔''
''نہیں۔'' ساحرہ نے جواب دیا اور اسے جو کچھ آغا نصیر سے معلوم ہوا تھا، وہ اس نے شیبا کو بتا دیا۔
شیبا اپنی الجھن کے باوجود خفیف سا مسکرادی۔ ''میرا خیال ہے کہ بھائی جان دو تین روز میں ہی آجائیں گے۔ انہیں سرپرائز دینے کی عادت سی ہے۔''
''آجاتے ہیں تو اچھا ہے۔ تم احسن کو جلد از جلد تیار کرو۔''
''میں اسی کے پاس جا رہی ہوں۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہوگا، مجھے ہی اس کی ہر بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔''
''تو جاؤ!'' ساحرہ نے مسکرا کر شیبا کا گال تھپکا۔
''بیسٹ آف لک!''



شیبا گھر سے روانہ ہوئی۔ کار چلاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، کیا احسن مان جائے گا کہ وہ اس کے گھر میں آکر رہے؟ شیبا کو یہ معاملہ خاصا مشکل نظر آرہا تھا۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچنا چاہتی تھی کہ احسن کو اس پر کس طرح آمادہ کیا جائے؟ ذہن میں بہت سی تدبیریں ابھریں تو سہی لیکن اس نے محسوس کیا کہ ان میں سے کوئی بھی تیر بہ ہدف کے نسخے کے مصداق نہیں تھی۔
کار اس نے اپارٹمنٹس کی ایک عمارت کے احاطے میں پارک کی۔ دوسری منزل کا ایک اپارٹمنٹ فوری طور پر کرائے پر مل گیا تھا۔ دوسرا مکان خریدنے سے پہلے احسن کا پہلا مکان بکنا ضروری تھا۔ وہ شیبا نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے حوالے کر دیا تھا۔
دوسری منزل کے اپارٹمنٹ کا لاک شیبا نے چابی سے کھولا۔ خود احسن ہی کی خواہش تھی کہ شیبا اپارٹمنٹ لاک کر کے جایا کرے۔ وہ بہت پژمردہ تھا اور اپارٹمنٹ سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اپارٹمنٹ کی دوسری چابی شیبا نے احسن کے پرس میں رکھ دی تھی کہ شاید اسے کسی وقت باہر نکلنے کی ضرورت پڑ جائے۔
شیبا اس کمرے میں داخل ہوئی جسے خواب گاہ کے فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس نے احسن کو بستر پر نیم دراز دیکھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر احسن نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ اس کا شیو خاصا بڑھا ہوا تھا۔
''اب آج تو شیو بنا لو احسن!.... میں اتنی دیر میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔''
''کچھ زیادہ تو نہیں بڑھا!'' احسن نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
''تم کو تو کسی بات کا احساس ہی نہیں رہا ہے۔ کل تک شیو اتنا بڑھ جائے گا کہ ڈاڑھی کا گمان ہونے لگے گا۔ پلیز! آج شیو کرلو!''
''اچھا!'' احسن نے طویل سانس لی اور بستر سے اٹھنے لگا۔ شیبا کے اصرار پر ہی وہ شیو بنایا کرتا تھا۔ اسے اپنی سدھ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ کپڑے بھی وہ شیبا کے اصرار پر ہی تبدیل کرتا تھا۔ شیبا کی عدم موجودگی میں اس کے بال بھی بکھرے رہتے تھے اور اس وقت بھی بکھرے ہوئے تھے۔ شیبا ہی اس کے بالوں میں برش کیا کرتی تھی۔
شیبا نے ناشتا خاصے اہتمام سے تیار کیا۔ جب وہ ٹرے لے کر احسن کے کمرے میں داخل ہوئی تو احسن شیو بنا

کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔

''آؤ!'' شیبا اس صوفہ سیٹ کی طرف بڑھی جو ایک گوشے میں لگایا گیا تھا۔ اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔

''یہ آج اتنا کچھ کیوں بنالیا؟'' احسن نے قریب آتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس کا انداز گفتگو عموماً ایسا ہی رہنے لگا تھا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو۔

شیبا نے کہا۔ ''اتنے دن سے میں چپ ہوں۔ تم نہ تو کھانا ٹھیک سے کھاتے ہو، نہ ہی ناشتا ٹھیک سے کرتے ہو۔ اب واضح طور پر نظر آنے لگا ہے کہ اس سے تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''اگر آج بھی تم نے ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا تو میں بھوک ہڑتال شروع کردوں گی۔''

''میری صحت خراب ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے شیبا! زندگی سے اب مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔''

''اب تمہاری زندگی صرف تمہاری نہیں رہی۔ میرا بھی حق ہے اس پر!'' شیبا جذباتی ہوگئی۔ ''تمہیں میری خاطر جینے کی امنگ پیدا کرنا ہوگی خود میں!''

''میں اندر سے بالکل ویران ہو چکا ہوں شیبا!''

''چلو ناشتا کرو۔ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔''

اسی روز شیبا نے شدید اصرار کرکے احسن کو معمول سے زیادہ ناشتا کرایا۔ وہ خود گھر سے صرف چائے پی کے آیا کرتی تھی اور ناشتا احسن کے ساتھ کرتی تھی۔

ناشتے کے بعد شیبا برتن کچن میں رکھ آئی اور بستر پر احسن کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کب تک سوگ مناتے رہوگے احسن!''

''سوگ منایا نہیں جاتا شیبا! سوگ تو ہوتا ہے۔ میری زندگی میں اگر کچھ تھا تو وہ میرے ماں باپ ہی تھے۔ ویسے تو اولاد ہی ماں باپ کا سرمایہ ہوتی ہے لیکن میرا سرمایہ میرے والدین تھے۔''

''میرا خیال تھا کہ گھر کی تبدیلی سے تم پر اچھا اثر پڑے گا۔''

''گھر.....'' احسن بولا۔ ''یہ لفظ اب میرے لیے بے معنی ہو چکا ہے۔ کوئی محل ہو یا جنگل، کوئی اہمیت نہیں میرے لیے۔''

''میں تمہیں جہاں چاہوں لے جاؤں؟'' شیبا نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''کیوں اعتراض ہوگا مجھے! تم مجھے کہیں بھی لے جاؤ۔ میرے لیے ایک سی بات ہوگی۔''

شیبا کی کچھ امید بندھی۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک اچھی خبر سناؤں! ڈیڈی تم سے میری شادی کے لیے تیار ہوگئے ہیں۔''

احسن نے ایک بار اس کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

شیبا بولی۔ ''کیا تمہیں اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی؟''

''خوشی!'' احسن نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے مزید کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن وہ صرف لفظ ''خوشی'' کہہ کر خاموش ہوگیا۔ شاید اب خوشی بھی اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔

شیبا کا دل بھر آیا۔ جب سے احسن کے والدین کی وفات ہوئی تھی، احسن کی حالت دیکھ کر اکثر شیبا کا دل بھر آتا تھا لیکن وہ مایوس نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی ''قربت'' پانے کے بعد احسن دھیرے دھیرے نارمل ہو ہی جائے گا۔ ابھی تو وہ طے شدہ پروگرام کے تحت صرف دوست ہی بنے ہوئے تھے۔ باقاعدہ شادی کے بعد ہی ان دونوں میں میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوتا۔

احسن نے پھر نظریں جھکا لیں۔

شیبا بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ اب دو تین روز میں ہی ہماری شادی ہو جائے۔ ڈیڈی کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''ہماری شادی تو ہو چکی ہے شیبا!'' احسن نے آہستہ سے کہا۔

''سول میرج۔'' شیبا بولی۔ ''اور طے یہ پایا تھا کہ ہماری باقاعدہ شادی بھی ہوگی۔ سول میرج کی بات تو ہم کسی کو بتائیں گے ہی نہیں۔''

''ہوں۔''

''تو تم تیار ہو نا!''

''ایک رسم۔'' احسن بولا۔ ''ٹھیک ہے، تمہاری خاطر یہ بھی سہی...... تم نے ٹھیک کہا تھا شیبا کہ اب میری زندگی صرف میری نہیں رہی۔ تمہارا بھی حق ہو چکا ہے اس پر! یقین کرو شیبا! اگر ان حالات میں تم نہ ہوتیں تو شاید میں پاگل ہو جاتا، یا شاید خودکشی کر لیتا۔ تم سے پہلے میرا سب کچھ میرے والدین ہی تھے۔''

''والدین کے علاوہ تو کوئی خلش نہیں ہے تمہارے دل میں؟''

''اور کیا ہوگی؟''

''ساحرہ۔'' شیبا نے اسے غور سے دیکھا۔

احسن نے اس کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے سر ہلایا۔ ''ہاں۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ ''ایک خلش وہ بھی ہے تو

سہی! لیکن وہ خلش...... میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ نہیں رہے گی۔ یہ تو تم بھی کہہ چکی ہو اور میں بھی سوچتا رہا ہوں کہ ساحرہ سے شادی کا نتیجہ میرے لیے بہت کرب ناک ہوتا۔ میں بھول جاؤں گا اسے!''

شیبا مسکرائی۔ وہ خوش ہوگئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ابھی تم نے کہا تھا کہ میں تمھیں کہیں بھی لے جاؤں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہارے لیے۔''

''ہاں۔'' احسن نے کہا۔ ''کسی جگہ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں کسی محل میں بھی رہوں تو بس ایک کمرا ہی تو ہوگا میرے لیے سب کچھ۔''

''تو پھر۔'' شیبا نے ہمت کر کے کہا۔ ''شادی کے بعد تم میرے ساتھ میرے گھر میں رہو گے۔''

''تمہارا گھر؟'' پہلی مرتبہ احسن کا لہجہ سپاٹ نہیں تھا اور اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات بھی نظر آئے تھے۔

''ہاں، میرا گھر۔'' شیبا کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔ ''جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ کا گھر۔''

''گویا...... گھر داماد!''

''تم وہاں رہ کر ایسی کوئی بات محسوس نہیں کرو گے۔'' شیبا نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی بات ہو چکی ہے نا! تم تو بس ایک کمرے میں رہو گے۔ میرے علاوہ تمھیں کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''احسن!'' شیبا کے منہ سے نکلا۔ وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ بے اختیار ہو کر اٹھی اور احسن سے لپٹ گئی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے چونکی اور احسن سے الگ ہوگئی۔ اسے یہ عہد یاد آ گیا تھا کہ فی الحال وہ صرف دوست رہیں گے۔ ان میں کسی قسم کی قربت نہیں رہے گی۔

شیبا کی اس حرکت کے باوجود احسن کا چہرہ بے تاثر رہا۔

احسن کو دوپہر کا کھانا کھلانے کے بعد شیبا نے کہا۔ ''شادی کے بعد تمھیں ایک ایسی بات معلوم ہوگی احسن جو میں نے تمھیں اب تک نہیں بتائی۔ کیا میں امید کروں کہ وہ بات معلوم ہونے پر تمھیں مجھ پر غصہ نہیں آئے گا؟''

''ایسی کیا بات ہے؟''

''ابھی نہیں بتانا چاہتی۔''

''اچھا۔'' احسن اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

ان دنوں اس کی حالت ایسی ہی تھی۔ نہ کسی معاملے میں متجسس ہوتا تھا، نہ کسی معاملے میں سوچ بچار کرتا تھا۔ اسی لیے اس نے سوچے سمجھے بغیر شیبا کے گھر میں رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

''وعدہ کر رہے ہو نا؟'' شیبا نے پوچھا۔

''کس بات کا؟''

''بعد میں تم مجھ پر غصہ نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے، نہیں کروں گا۔ جو چاہو، وہ کرو شیبا!...... ہاں شیبا!...... اب مجھے صرف تمہارے لیے ہی تو زندہ رہنا ہے۔''

شیبا کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ شادی کے بعد احسن کو معلوم ہوتا کہ آغا نصیر کی چوتھی بیوی ساحرہ تھی تو وہ یقیناً چونک جاتا لیکن شیبا نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ چراغ پا نہیں ہوگا۔ اس پر غصہ نہیں کرے گا۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں'' شیبا بولی۔ ''تیسرے پہر کو آؤں گی۔''

شیبا کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ گھر سے اس کی عدم موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا تھا۔

جب وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو بہت خوش تھی۔ وہ تو احسن کو اپنے گھر میں لانے کے لیے تدبیریں سوچتی رہی تھی لیکن معاملہ کسی خاص تدبیر پر عمل کرنے کے بجائے بڑی آسانی سے طے پا گیا تھا جس کی وجہ شیبا نے سمجھ لی تھی۔ احسن ان دنوں بالکل خالی الذہن رہنے لگا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ فوراً ساحرہ سے ملی۔

''آ گئیں احسن سے مل کر؟'' ساحرہ مسکرائی۔

''ہاں۔'' شیبا نے خوشی سے کہا۔ ''میں نے اسے تیار کر لیا ہے۔ وہ شادی کے بعد یہیں رہے گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا جانی! اب میں تمہارے ڈیڈی کو بتا دوں گی کہ احسن نے ان کی شرط مان لی ہے۔''

''لیکن ایک مشکل اب بھی باقی ہے ساحرہ!''

''وہ کیا؟''

''شادی کے موقع پر اگر اس نے تمھیں یہاں دیکھ لیا اور یہ بھی جان لیا کہ تم یہاں کس حیثیت سے ہو تو اس کا ردعمل نہ جانے کیا ہو!''

''اس کی فکر نہ کرو، میں کوئی ایسی تدبیر سوچ لوں گی کہ شادی سے پہلے اس کے سامنے نہ آؤں۔ بس اب تم شادیانے بجاؤ خوشی کے۔''

شیبا کو خوب اندازہ تھا کہ ساحرہ کے دل میں کیا تھا لیکن وہ مطمئن تھی، اس کا خیال تھا کہ احسن یہاں رہے گا تو وہ اس کی حفاظت آسانی سے کر سکے گی اور اسے ساحرہ سے بچا

کر رکھنے میں کامیاب رہے گی۔ اگر اس کے برخلاف ہوتا تو اس کے خیال میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ احسن ساری زندگی تو اس طرح خالی الذہن نہیں رہتا۔ ماں باپ کا صدمہ دھیرے دھیرے سہی لیکن کم ہوتا رہے گا اور کم ہوتا رہے گا تو ختم بھی ہو جائے گا۔ وہ اس کی نظروں سے دور رہتا اور اس دوری سے ساحرہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ اس کے برخلاف ایک گھر میں رہنے کے باعث شیبا کے لیے احسن کا خیال رکھنا آسان ہوتا۔ کم از کم وہ یہی سمجھ رہی تھی۔

دوسری طرف ساحرہ بھی بہت خوش تھی اور اب اسے احسن کا قرب حاصل کرنے کی کوششوں کے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔

اسی دن عشرت اعوان نے آغا نصیر کی ہدایت پر شیبا اور احسن کی شادی کی تیاریاں شروع کروا دیں۔

انسان دولت مند ہو تو بیشتر کام مہینوں کے بجائے ہفتوں میں اور ہفتوں کے کام دنوں میں ہو جاتے ہیں۔ اس شادی کی مکمل تیاری میں بھی تین دن سے زیادہ نہیں لگے اور چوتھے دن شادی کی تقریب میں حصہ لینے کے لیے آغا نصیر کے مہمانوں کا ہجوم ہو گیا۔

احسن دولہا کی حیثیت سے وہاں موجود تھا لیکن ایسی ذہنی کیفیت میں جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ اسی لیے وہ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا کہ آغا نصیر اس دوران میں افراتفری کا شکار کیوں تھا۔ وہ نکاح تک اور نکاح کے بعد کھانے کے خاتمے تک گھر کے بھی کئی چکر لگا چکا تھا۔ جب وہاں موجود ہوتا تو بھی بار بار موبائل پر کسی نہ کسی سے بات کرتا رہتا تھا۔

صرف شیبا ہی جانتی تھی کہ تقریب میں شریک نہ ہونے کے لیے ساحرہ نے پیٹ کی شدید تکلیف کا بہانہ بنایا تھا۔ آغا نصیر کی وجہ سے کئی ڈاکٹر آغا نصیر کے گھر پہنچتے رہے۔ تکلیف کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ابتدا ہی میں کسی ڈاکٹر نے رائے دی تھی کہ ساحرہ کو کسی اسپتال لے جایا جائے جہاں پیٹ کی تکالیف سے متعلق تمام ٹیسٹ کیے جاسکتے تھے لیکن ساحرہ نے ضد کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ اسپتال نہیں جائے گی چنانچہ ڈاکٹرز آپس کے مشورے سے مختلف دوائیں آزماتے رہے۔ آخر ساحرہ نے تکلیف بتدریج کم ہونے کا اظہار اس وقت شروع کیا جب تقریب ختم ہونے میں ایک گھنٹا رہ گیا تھا اور وہ اس وقت خود کو بالکل ٹھیک ظاہر کرنے لگی جب شیبا اور احسن کمرے میں جا چکے تھے۔

اگرچہ شادی کے بعد وہ پہلی رات تھی لیکن سول میرج ہوئے اتنے دن گزر چکے تھے کہ شیبا پہلی رات کی دلہن کی طرح شرمائی ہوئی نہیں تھی۔ ”بہت تھکے ہوئے نظر آرہے ہو۔“ اس نے احسن سے کہا۔ ”کچھ دیر آرام کرلو۔“

احسن پہلے ہی بستر پر لیٹ چکا تھا۔ شیبا اس کے برابر میں لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں ماضی کے واقعات کسی کتاب کے اوراق کی طرح پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ جب اس نے کالج میں احسن کو دیکھا تھا، پھر اس کا اور ساحرہ کا تعلق سمجھنے کے بعد اس نے خود کو ان دونوں کے درمیان آنے سے روک لیا تھا۔ اس وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب وہ بیوی کی حیثیت سے احسن کے برابر میں لیٹی ہوگی۔

لیکن برابر لیٹنے کا یہ دورانیہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ شیبا نے تو سوچا تھا کہ احسن بس آدھے پون گھنٹے آرام کرلے گا لیکن دو گھنٹے گزر گئے۔ احسن اگرچہ اب بھی جاگ رہا تھا لیکن کبھی کروٹ لے لیتا تھا کبھی چت لیٹ کر چھت کو تکنے لگتا تھا۔

اب شیبا کو جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ بستر سے اٹھ کر اس نے اپنے زیورات اتار کر رکھے اور جو کپڑے وہ دلہن کی حیثیت سے پہنے رہی تھی، وہ اتار کر اس نے ایک باریک نائٹی پہن لی تھی۔ وہ پہن کر اس کے جسم کا ہر عضو بڑی حد تک نمایاں نظر آرہا تھا۔ اب جو احسن نے اسے دیکھا تو چند لمحوں کے لیے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر نظریں ہٹائیں لیکن دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

شیبا دبی دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پہلو میں اس سے لپٹ کر لیٹ گئی۔

یہ سنسنی خیز قرب احسن کو زیادہ دیر تک خالی الذہن نہیں رکھ سکا۔ دھیرے دھیرے احساسات کی بیداری شروع ہوئی اور جب احساسات پوری طرح بیدار ہو گئے تو وہ بھونچال بھی آیا جو شادی کی پہلی رات کا خاصہ ہوتا ہے۔



اس رات شیبا نہ تو خود سوئی تھی، نہ اس نے احسن کو سونے دیا تھا۔

”ڈیڈی نے کہا تھا کہ ناشتا ہم دونوں ان کے ساتھ ہی کریں۔“ شیبا نے احسن سے کہا۔ ”وہ آٹھ بجے ناشتے کی میز پر ہوتے ہیں۔ ہمیں اب تیار ہو جانا چاہیے۔“

”ہوں۔“ احسن خفیف سا مسکرایا۔

شیبا خوش ہو گئی۔ گزشتہ دنوں میں اس نے احسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق بھی نہیں دیکھی تھی۔ گزری ہوئی رات نے احسن کے دل و دماغ پر یقیناً کچھ مثبت اثرات

مرتب کیے تھے۔

لیکن اب کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم کی طرف جاتے وقت شیبا پر یہ ہول سوار ہوا کہ ڈائننگ روم میں آغا نصیر کے ساتھ ساحرہ بھی ہوگی۔

''احسن؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

''ہوں۔'' احسن نے اس کی طرف دیکھا۔

شیبا تذبذب کا شکار تھی۔

''بولو شیبا! کیا کہنا چاہتی ہو؟'' احسن نے پوچھا۔ اس کا یہ سوال بھی اس کی واضح ذہنی تبدیلی کی طرف اشارہ تھا، ورنہ تو شیبا اگر اپنی کوئی بات ادھوری چھوڑ دیتی تو وہ بھی خاموش ہو جاتا تھا، کبھی استفسار نہیں کرتا تھا۔

ڈائننگ روم قریب آتا جا رہا تھا۔ شیبا جلدی سے بولی۔ ''شادی سے پہلے، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ...... ایک بات...... شادی کے بعد بتاؤں گی۔''

''مجھے یاد ہے۔'' احسن نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ بھی لیا تھا کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا، تم پر غصہ بھی نہیں کروں گا۔''

''وہی بات ...... میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں اب۔''

شیبا کی سانسیں ناہموار ہو گئی تھیں۔

''تو بتاؤ!''

''وہ...... وہ میں نے تمہیں ڈیڈی کی...... چوتھی شادی کے بارے میں بتایا تھا نا؟'' شیبا رک رک کر بول رہی تھی۔ جملے اس کے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔

''ہاں ہاں بتایا تھا!...... پھر......؟''

''وہ شادی......''

''ہوں......''

''ڈیڈی کی وہ شادی......''

''گھبرا کیوں رہی ہو شیبا!'' احسن نے کہا۔ ''بتا بھی چکو۔''

ڈائننگ روم کا دروازہ اب دو قدم کے فاصلے پر تھا۔

شیبا نے جلدی سے کہا۔ ''ساحرہ سے ہوئی تھی۔''

''کیا!'' احسن ایک جھٹکے سے رک گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے...... ساحرہ نے تمہارے ڈیڈی سے شادی کی ہے؟''

اس وقت وہ دونوں ڈائننگ روم کے دروازے پر رکے ہوئے تھے جو بند نہیں تھا۔ پردے کے بجائے اس میں رنگارنگ موتیوں کی جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔

''ہاں احسن!'' شیبا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ڈائننگ روم میں وہ بھی ہوگی۔''

''یہ...... یہ...... یہ تم نے......''

احسن اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ اندر سے آغا نصیر کی آواز آئی۔ ''وہاں کیوں رک گئے تم دونوں......؟ آؤ نا!''

''آؤ۔'' شیبا نے احسن کا ہاتھ پکڑ کر اندر قدم رکھا۔

احسن کی اس وقت عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگیں سنسنانے لگی تھیں۔

''آؤ بیٹے!'' آغا نصیر نے اس سے کہا۔ ''تم میرے برابر میں آ کر بیٹھو! شیبا ساحرہ کے برابر والی کرسی پر بیٹھ جائے گی۔''

آغا نصیر ڈائننگ ٹیبل کے سرے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں جانب ساحرہ بیٹھی تھی۔ احسن اسی کرسی پر بیٹھا جس کی طرف آغا نصیر نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرح احسن اور ساحرہ بالکل آمنے سامنے ہو گئے۔ ساحرہ کے برابر میں شیبا بیٹھی۔ وہ کچھ پریشان نظروں سے احسن کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے چہرے کی کیفیت اس وقت ایسی تھی جیسے بار بار رنگ بدل رہا ہو۔

''کیسے ہو احسن!'' ساحرہ نے چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ آغا نصیر کو بتا چکی تھی کہ وہ اور شیبا اسی کالج میں پڑھا کرتے تھے جہاں احسن زیر تعلیم رہا تھا۔

احسن کے ہونٹ ہلے لیکن وہ ساحرہ کو جواب نہیں دے سکا۔ الفاظ اس کے حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

ساحرہ پھر بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تم دونوں کی شادی میں شریک نہیں ہو سکی۔ کل رات میرے پیٹ میں جانے کیوں بڑی شدید تکلیف ہو گئی تھی۔ آدھی رات کے بعد ٹھیک ہوئی ہوں۔ اس کے بعد بھی بہت دیر تک نڈھال پڑی رہی۔ یہ تو جانتے ہیں۔'' اس کا اشارہ آغا نصیر کی طرف تھا۔

''ہاں احسن میاں!'' آغا نصیر نے کہا۔ ''بہت بری حالت ہو گئی تھی ان کی۔ خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ناشتا شروع کرو۔''

احسن جیسے تیسے ناشتا کر سکا۔ شیبا اس کی حالت کا جائزہ لیتی رہی۔ اس دوران میں ساحرہ چہکتی رہی۔ اس نے کالج کے زمانے کی باتیں چھیڑ دی تھیں۔ بیچ میں ایک جگہ اسے روک کر آغا نصیر نے احسن سے کہا کہ وہ اسے اپنی ایک شوگر مل کا منیجر بنا دے گا۔ جواب میں احسن نے کہا تھا کہ اس میں اس قسم کی ذمے داری سنبھالنے کی اہلیت نہیں۔

''دو تین ماہ کی ٹریننگ سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' آغا نصیر نے کہا۔

''ڈیڈی!'' شیبا بولی۔ ''منیجر کا کوئی سیکریٹری بھی ہوتا ہوگا!''

''اسٹینو ہوتا ہے۔''

''سیکریٹری کی جگہ نکالی تو جاسکتی ہے۔ آپ مجھے احسن کی سیکریٹری بنادیجیے گا۔''

اس وقت ساحرہ نے معنی خیز نظروں سے شیبا کی طرف دیکھا۔

شیبا بولتی رہی۔ ''اس طرح میں گھر میں اکیلی پڑی بور ہونے سے بچ جاؤں گی۔''

''اچھا!'' آغا نصیر ہنسا۔ ''اگر تم چاہتی ہو تو ایسا ہی سہی۔''

کیونکہ ساحرہ نے اسے بتایا تھا کہ شیبا کو احسن سے بے پناہ محبت ہے اس لیے اس نے یہی سوچا ہوگا کہ شیبا محبت ہی کی وجہ سے ہر وقت احسن کے قریب رہنا چاہتی ہے۔

ناشتا کر چکنے کے بعد شیبا احسن کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹی تو وہ کسی قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ احسن کا ردعمل جانے کیا ہو!

کمرے میں داخل ہوکر احسن ٹہلنے لگا۔ شیبا نے بستر کے قریب جاکر سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ وہ اس وقت چور سی بن گئی تھی۔

''یہ بات ایسی نہ تھی شیبا جو تم مجھے پہلے نہ بتا سکیں۔'' احسن بولا۔

''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا احسن!'' شیبا نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ''تم مجھ پر ناراض نہیں ہوگے، تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آئے گا۔''

''میں ناراض کب ہو رہا ہوں شیبا!'' احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''نہ میں نے غصے کا اظہار کیا ہے۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ بات تم مجھے پہلے کیوں نہیں بتا سکی تھیں؟''

''میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی احسن!'' شیبا کی آواز بھرا گئی۔ ''پہلے تو ایک مرتبہ میں خود ہی تم سے دور ہوگئی تھی، اب دوبارہ تم سے دور ہوجاتی تو شاید خود کو سنبھال نہیں پاتی۔''

''یہ بتا دیتیں تو مجھ سے دور کیسے ہوجاتیں؟ ہم سول میرج تو کرہی چکے تھے۔''

''لیکن تم شاید اس گھر میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جہاں ساحرہ ہو۔''

احسن فوراً کچھ نہیں بولا، ٹہلتا رہا۔ اس کے انداز سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ شیبا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''یہ تو تم غالباً ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' احسن قدرے توقف سے بولا۔ ''یہ جاننے کے بعد اس گھر میں آنا......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نفی میں سر ہلایا، اس کے بعد پھر کچھ رک کر بولا۔ ''لیکن تم یہ کیوں چاہتی تھیں شیبا کہ میں یہاں آکر رہوں؟''

''صرف اس لیے احسن کہ میں تمہیں ساحرہ سے بچانا چاہتی ہوں۔''

''ساحرہ کے قریب لاکر؟''

''اپنے قریب رکھ کر۔'' شیبا نے جواب دیا۔ ''اب تم ہر وقت میری نظر میں رہو گے، جبکہ یہاں نہ رہتے تو......'' پھر اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس نے سوچا تھا۔

احسن خاموش رہا۔

شیبا کچھ رک کر پھر بولی۔ ''کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟''

''یہ تو میں ابھی نہیں کہہ سکتا شیبا!'' احسن نے کہا۔ ''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ تم نے صحیح سوچا تھا یا غلط، لیکن اس بات سے یہ ضرور اندازہ ہوا ہے کہ تم مجھ سے شدید محبت کرتی ہو۔'' وہ شیبا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

شیبا نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھ کر احسن کے قریب آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ احسن کی گردن میں ڈال دیے اور اس کے سینے سے لگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم میری روح بن چکے ہو اب، اور روح کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔''

احسن نے محبت سے اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اپنی زندگی کی ایک اہم رات گزارنے کے بعد اس کی خالی الذہنی کی کیفیت بالکل ختم ہوچکی تھی۔ وہ معمول کے مطابق نظر آنے لگا تھا۔ یکایک اس نے شیبا کو گود میں اٹھایا اور اسے لے جاکر بستر پر ڈال دیا۔ پھر بستر پر بیٹھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''اور تم میری زندگی بن چکی ہو۔ زندگی...... جس کے بغیر روح آدمی ہوجاتی ہے، لیکن میری یہ فکرمندی اپنی جگہ ہے شیبا کہ ساحرہ کی موجودگی میں ہم سکون سے زندگی گزار سکیں گے؟''

''بالکل گزار سکیں گے۔'' شیبا نے مسکرا کر کہا۔ ''ساحرہ کے خیالات کچھ بھی ہوں، میں جانتی ہوں کہ تم اس کے سامنے پگھل نہیں سکتے اور میں جو ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ساحرہ کو ایسا موقع ہی نہیں مل سکے گا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کوشش بھی کرسکے۔ گھر میں تو میں تمہارے ساتھ رہوں گی ہی، لیکن جب تم شوگر مل کے منیجر بن جاؤ گے تو

میں تمہاری سیکریٹری کی حیثیت سے وہاں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تمہیں ڈیڈی کی پیشکش منظور ہے نا؟"

"منظور تو کرنا ہی پڑے گی۔" احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس گھر میں آ تو گیا ہوں لیکن میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ میرا اور میری بیوی کے اخراجات کا بوجھ تمہارے ڈیڈی ہی اٹھاتے رہیں۔"

"میں خوش ہوئی تمہارے جواب سے۔"

"لیکن مجھے منیجر بننے سے پہلے کچھ عرصے تربیت بھی تو حاصل کرنا ہے۔ اس وقت تو تم میرے ساتھ نہیں رہو گی۔"

"کیوں نہیں رہوں گی۔" شیبا مسکرائی۔ "مجھے بھی تو تربیت حاصل کرنا پڑے گی کہ سیکریٹری کی ذمے داریاں کیا ہوتی ہیں۔"

احسن ہنس پڑا۔ "تم نے سب کچھ سوچ لیا ہے لیکن مجھ پر تمہاری یہ پہرے داری ساحرہ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر سکتی ہے۔"

"اس کی جھنجلاہٹ سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟"

"تم دونوں اب تک دوست بنی رہی ہو لیکن پھر شاید ایسا نہ رہ سکے۔ وہ تمہیں اپنا رقیب محسوس کرنے لگے گی۔"

"میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ تم کسی اور لڑکی کے نہیں، اس کی دوست کے شوہر بنے ہو اس لیے اسے اب تمہارے بارے میں سوچنا چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ وہ بات سمجھ لے گی۔"

لیکن شیبا کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ کچھ دن بعد وہ دونوں تربیت کے لیے ساتھ ساتھ جانے لگے اور گھر میں بھی شیبا ہر پل احسن کے ساتھ رہنے لگی تو ساحرہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ تبدیلی شیبا نے بھی محسوس کر لی اور احسن نے بھی۔

"سگنل اچھا نہیں مل رہا ہے شیبا!" ایک روز احسن نے کہا۔

شیبا اس کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔ "دیکھا جائے گا۔"

ان دونوں میں جس دن یہ بات ہوئی تھی، اسی رات کو شیبا نے کمرے میں اپنے موبائل پر ساحرہ کی کال ریسیو کی۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں شیبا!" وہ کہہ رہی تھی۔ "کیا تم ذرا دیر کے لیے میرے پاس آؤ گی؟"

"آتی ہوں۔" شیبا نے آہستہ سے کہا۔

میں بڑی سنجیدگی تھی۔

شیبا نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھتے ہوئے بولی۔ "دیکھتی ہوں، کیا کہتی ہے وہ!"

اپنے کمرے سے نکل کر شیبا ساحرہ کے کمرے میں پہنچی اور جاتے ہی مسکراتے ہوئے بولی۔ "کوئی خاص بات ہے کیا ساحرہ، اور......" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "ڈیڈی نہیں ہیں؟"

"وہ کسی کاروباری میٹنگ میں گئے ہیں۔" ساحرہ بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ "اور تم سے مجھے کسی تمہید کے بغیر ایک سوال کرنا ہے۔"

"کرو۔" شیبا مسکراتی رہی۔ اگرچہ اسے کچھ کھٹکا ہو گیا تھا لیکن وہ اس نے اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیا۔

ساحرہ بولی۔ "تم احسن کی بیوی بنی ہو یا اس کی پہرے دار؟"

"میں اس سے محبت کرتی ہوں ساحرہ!" شیبا نے کہا۔ "اور تم خوب جانتی ہو کہ میری محبت سطحی نہیں! میرا دل چاہتا ہے کہ ایک پل کے لیے بھی احسن سے دور نہ رہوں۔"

"تمہاری محبت قطعی خود غرضانہ ہے۔" ساحرہ نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع تک نہیں دینا چاہتی ہو۔ یہ خود غرضانہ محبت نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہیں ذرا بھی خیال نہیں کہ مجھے بھی اس سے محبت ہے۔"

"لیکن اب تم ڈیڈی سے شادی کر چکی ہو۔" شیبا اب سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"شادی اور محبت، دو الگ الگ باتیں ہیں۔" ساحرہ بولی۔ "کیا میں نے یہ بات تم سے پہلے نہیں کہی؟"

"کہی تھی۔" شیبا ٹہلتے ہوئے کھڑکی تک چلی گئی اور ساحرہ کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "لیکن...... اگر احسن کی شادی کسی اور لڑکی سے ہوتی تو تم کچھ بھی کرتیں، میں اس میں دخل اندازی نہیں کرتی۔ اب تمہیں سوچنا چاہیے کہ وہ کسی اور کا نہیں، تمہاری دوست کا شوہر ہے۔"

"دوستوں کی ہر چیز ایک دوسرے کی ہوتی ہے، مشترک ہوتی ہے۔"

شیبا تیزی سے اس کی طرف گھومی۔ "شوہر بھی مشترک

ہی نہیں کرنا چاہیے تھی اور اب شادی کرلی ہے تو اسے اپنی جاگیر نہ سمجھو۔"

"اگر تمہارے یہ خیالات ڈیڈی کو معلوم ہو جائیں تو؟" شیبا کے لہجے میں تلخی آگئی۔

ساحرہ چند لمحے اسے گھورتی رہی، پھر اس نے کہا۔ "میں خوب جانتی ہوں کہ اس سوسائٹی میں کیا ہوتا ہے جہاں میں ایک الٹرا ماڈرن شخص کی بیوی ہوں۔ اس سوسائٹی کے مرد اپنی بیویوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے بھی تعلقات رکھتے ہیں۔ مرد ہی نہیں، عورتیں بھی رکھتی ہیں۔ بس معاشرتی جبر کی وجہ سے مردوں کو ذرا کم لیکن عورتوں کو یہ سب کچھ بہت زیادہ چھپ کے کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کبھی کبھی یہ بات میاں بیوی پر کھل بھی جاتی ہے لیکن وہ ایک دوسرے کی ان باتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے انہیں کچھ معلوم ہی نہ ہوا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہی میرے اور آغا صاحب کے معاملے میں بھی ہو سکتا ہے لیکن تم سے مجھے یہ توقع نہیں کہ تم انہیں میرے خیالات سے آگاہ کرو گی۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو۔"

شیبا نے یہ تقریر بڑے تحمل سے سنی ورنہ دو ایک مواقع پر اس کا جی چاہا تھا کہ کچھ بول پڑے۔

"میں یقیناً ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "یہ ان کا معاملہ ہے، وہی جانیں..... شاید ہر ایک کو اپنے طرز کی زندگی گزارنے کا حق ہے لیکن اسے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کون سا طرزِ زندگی اس معاشرے کی تباہی کا سبب نہیں بنے گا۔"

"انسان کے فطری اعمال معاشرے کو تباہ نہیں کرتے۔"

"ضروری نہیں کہ میں تمہارے اس خیال سے بھی اتفاق کروں۔ میں بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرا شمار تم اس سوسائٹی کی ان بعض عورتوں میں نہ کرو جنہیں اس معاشرے کی تباہی کا خیال نہیں ہوتا۔"

"تو تم۔" ساحرہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "احسن کو اپنی ملکیت بنائے رکھنا چاہتی ہو؟"

"بنانا کیا مطلب! وہ میری ملکیت ہے۔" شیبا نے زور دے کر کہا۔ "اور میں اس کی ملکیت ہوں۔"

ساحرہ تلخی سے ہنسی۔ "میں نہیں جانتی کہ تم اس کی ملکیت رہ سکو گی یا نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ تمہاری ملکیت نہیں رہ سکے گا۔ جب اس نے مجھ سے گریز کیا، اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ عورت کا قرب کیا ہوتا ہے لیکن اب..... تم

شکرانہ

مہمان نے میزبان کے بچے سے پوچھا: "بیٹے! کیا تم رات کو سونے سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتے ہو۔"

بچے نے جواب دیا۔ "میں تو نہیں البتہ میری امی ضرور شکر ادا کرتی ہیں۔"

مہمان نے کہا: "کیا کہتی ہیں؟"

بچہ بولا: "خدا کا شکر ادا کرتی ہیں کہ میں سو گیا ہوں"

سے شادی کر کے اس نے جان لیا ہوگا کہ یہ پیٹ کی بھوک سے زیادہ طاقتور خواہش ہے اور اس معاملے میں تنوع پسندی تو ہوتی ہی ہے۔"

"میں احسن کو ایسا نہیں سمجھتی۔"

"تو اس کی پہرے دار، اس کی محافظ کیوں بنی ہوئی ہو؟"

"میں نہیں چاہتی کہ تم اس کی پریشانی کا سبب بنو۔"

"اب وہ عورت کے قرب کا مزہ چکھ چکا ہے اور میں نے کہا نا کہ اس معاملے میں تنوع پسندی بھی ایک فطری بات ہے۔ اب احسن کسی وقت بھی میری طلب محسوس کر کے سرنگوں ہو سکتا ہے اور ایسا ضرور ہوگا شیبا، تم لاکھ اس کی پہرے دار بنی رہو۔"

"آئندہ مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کرنا۔" شیبا نے مشتعل لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے اپنے عقب میں ساحرہ کی طنزیہ ہنسی سنی لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔

احسن بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیا بات تھی؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"پاگل ہوگئی ہے۔" شیبا نے غصے سے کہا اور بستر کے قریب جا کر جھٹکے سے بیٹھ گئی۔

"پاگل وہ کب نہیں تھی۔" احسن نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "خیر! بتاؤ تو سہی! کیا کہہ رہی تھی؟"

"اپنے نظریات کا پرچار کر رہی تھی۔" شیبا نے تلخی سے کہا۔ "ایک دوست کی حیثیت سے اس نے مجھ سے یہ باتیں کی تھیں تو میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا تھا لیکن تمہاری بیوی کی حیثیت سے میں وہ باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی!"

کسی بھی گفتگو کو جملوں یا الفاظ کے ساتھ یاد نہیں رکھا جا سکتا۔ شیبا کو بھی یاد نہیں تھا۔ اس نے گفتگو کا لب لباب بتا دیا

جو ساحرہ سے ہوئی تھی۔
احسن نے سب کچھ سن کر سر جھکا لیا۔ وہ اس دوران میں بستر کے قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔
شیبا بھی خاموش ہو جانے کے بعد کچھ سوچنے لگی۔ اس کے دماغ میں ساحرہ کی یہ بات بگولے کی طرح چکرا رہی تھی کہ احسن نے جب اس سے گریز کیا تھا، اس وقت وہ عورت کے قرب سے ناآشنا تھا لیکن اب شادی کے بعد وہ اس خواہش کا طابع ہوگا جو پیٹ کی بھوک سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے اور اس معاملے میں تنوع پسندی ایک فطری بات ہے۔
ان خیالات کی گونج میں اس نے احسن کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، احسن ایسا نہیں ہوگا۔
احسن اب بھی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔
''کچھ سوچ رہے ہو؟'' شیبا بولی۔
''ہاں۔'' احسن نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مناسب یہی ہوگا شیبا کہ ہم اس گھر میں نہ رہیں۔ کیوں یہاں کی فضا میں تناؤ پیدا کیا جائے۔ ساحرہ اب کھل کر سامنے آگئی ہے۔''
''تو میں بھی اب کھل کر اس کا سامنا کروں گی۔'' شیبا کے لہجے میں ضد تھی۔ ''اب میں بھول جاؤں گی کہ وہ میری دوست تھی۔ مجھے خود پر بھی اعتماد ہے اور تم پر بھی......! یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کسی کے حق پر ڈاکا ڈالنا چاہے اور ڈاکے کے خواہش مند کو دوست سمجھا جائے۔''
''تم نے تو کہا تھا کہ اسے سمجھاؤ گی۔''
''اس نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔''
احسن چپ ہو گیا۔



شادی کو آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اس دوران میں گھر کا ماحول پرسکون رہا تھا لیکن اس کے بعد تناؤ کی فضا کم از کم احسن نے محسوس کرلی۔ پہلے تو وہ سب ٹی وی لاؤنج میں یا لان میں ٹہلتے ہوئے بھی گپ شپ کیا کرتے تھے۔ ان اوقات میں کبھی آغا نصیر نہیں بھی ہوتا تھا لیکن اس دن کے بعد صورت حال بدل گئی۔ ان کا آمنا سامنا صرف ناشتے یا کھانے کی میز پر ہی ہونے لگا۔ اگر شیبا کھانے پینے کا اہتمام اپنے کمرے ہی میں کرنے لگتی تو یہ آغا نصیر کو چونکانے والی بات ہوتی اس لیے مجبوراً ڈائننگ ٹیبل پر تو یک جا ہونا ہی پڑتا تھا۔
ساحرہ کے رویے میں اس کے بعد بھی کوئی ظاہری تبدیلی نہیں آئی۔ وہ بدستور ہنس ہنس کر اسی طرح باتیں کیا کرتی جیسے پہلے کرتی تھی لیکن شیبا سنجیدہ ہی رہنے لگی تھی۔
احسن ضرور کوشش کرتا تھا کہ اس کے انداز میں ایسی تبدیلی نہ آئے جو آغا نصیر کو محسوس ہو اور وہ شیبا کو بھی سمجھاتا تھا کہ وہ اپنا رویہ معمول کے مطابق رکھے لیکن شیبا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ خود پر مصنوعی خول نہیں چڑھا سکتی۔
ساحرہ کا سارا وقت سیر سپاٹے، شاپنگ اور بیوٹی پارلر میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے والدین سے ملنے بھی چلی جاتی تھی۔ گھر کے معاملات سے اس نے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔
ان سب باتوں کو عشرت اعوان دیکھتی تھی یا شیبا تھوڑا بہت خیال رکھتی تھی۔ کبھی کسی ملازم کے معاملے میں یا کسی اور مسئلے میں کچھ گمبھیرتا آجاتی تھی تو عشرت اعوان وہ بات، آغا نصیر تک پہنچا دیتی تھی۔ ایسے مواقع پر آغا نصیر کبھی کبھی شیبا کو بلا کر مشورہ کرلیا کرتا تھا۔ احسن کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا۔ اس صورت میں شیبا اس کے کمرے کا دروازہ مقفل کر کے جایا کرتی تھی تاکہ باہر سے کوئی اور اس کے کمرے میں داخل نہ ہو سکے۔ دوسری چابی وہ احسن کے پاس رہنے دیتی تھی تاکہ وہ خود کو قید میں نہ سمجھے لیکن وہ احسن کو تاکید کر کے جاتی تھی کہ اس کی واپسی تک احسن کمرے سے نہ نکلے تو بہتر ہے۔
یہ صورتِ حال احسن کو ذہنی طور پر بوجھل کرنے لگی تھی لیکن وہ شیبا کو اس پر آمادہ نہیں کر سکا تھا کہ ان دونوں کو اپنے رہنے کے لیے کوئی فلیٹ لے لینا چاہیے۔
ایک رات نہ جانے کیا مسئلہ تھا کہ آغا نصیر نے شیبا کو بلوایا۔ معمول کے مطابق شیبا کمرا مقفل کر کے گئی۔
احسن ایسے مواقع پر زیادہ الجھ جاتا تھا اور اس معاملے پر غور کرنے لگتا تھا۔
شیبا کو گئے ہوئے مشکل سے دو تین منٹ گزرے تھے کہ احسن کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ اسے توقع تھی کہ شاید شیبا ہی نے کسی وجہ سے کال کی ہو لیکن اسکرین پر ساحرہ کا نام چمک رہا تھا۔ احسن نے ابھی تک اس کا نام اور اس کا موبائل نمبر ختم نہیں کیا تھا۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے ساحرہ کا نام مٹا دے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اب بھی اپنے دل میں ساحرہ کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھتا تھا۔
شادی کے بعد اس کے لیے یہ ساحرہ کی پہلی کال تھی۔
احسن نے فوری طور پر کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک بار وہ بھی ساحرہ کو سمجھانے کی کوشش کرے۔
''ہاں ساحرہ!'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے طویل سانس لینے کے ساتھ کہا تھا۔

"شکر ہے تم نے کال ریسیو کی!" ساحرہ کے لہجے میں چہکار تھی۔ "خوشی ہے یہ میرے لیے کہ میرا نام اب بھی تمہارے موبائل میں محفوظ ہے۔ یقیناً تمہارے دل میں بھی ہونا چاہیے۔"

"ساحرہ!" احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں واقعی تمہیں بھول نہیں سکا ہوں، اگرچہ بھلانے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔"

ساحرہ ہنسی۔ "بھلا بھی نہیں سکو گے۔"

"کہاں سے بول رہی ہو؟"

"یہیں لان میں ہوں۔ شیبا کو آغا صاحب نے بلایا تھا۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے کھسک آئی۔ یقین تو نہیں تھا کہ تم میری کال ریسیو کرو گے لیکن میں نے ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ احسن! اگر تم اب بھی مجھے نہیں بھلا سکے تو ملاقات کی کوئی سبیل نکالو۔ شیبا سے پیچھا چھڑاؤ کسی وقت۔"

"میں شیبا کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ساحرہ! غلطی ہوئی مجھ سے بے اختیار کہ میں تم سے سچ بات کہہ بیٹھا۔ میرا خیال اب اپنے دل سے نکال دو۔"

"تم بھی نہیں نکال سکے ہو مجھے اپنے دل سے۔"

"لیکن میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"میں کوشش نہیں کروں گی۔" ساحرہ پھر ہنسی۔ "کیوں کروں کوشش! محبت جب کسی سے ہوتی ہے، تو بس ہو جاتی ہے۔"

"لیکن اب تم شادی کر چکی ہو۔"

"پھر وہی بے تکی بات! شادی کا محبت سے کیا تعلق...... ! آغا صاحب نے اگر میرے جسم کی پکار سنی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے ان سے محبت ہو جائے گی۔ محبت مجھے صرف تم سے ہے۔ کاش تم نے ہی میرے جسم کی پکار سن لی ہوتی۔"

ساحرہ کو بے باکانہ باتوں کی طرف آتے دیکھ کر احسن گھبرایا اور جلدی سے بولا۔ "تمہیں اب ہر وقت آغا صاحب کا خیال رہنا چاہیے۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض بنتے جا رہے ہیں۔ دس بارہ دنوں میں دو مرتبہ ڈاکٹر گھر آچکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ چند گھنٹوں کے لیے ہاسپٹلائز بھی ہو چکے ہیں۔"

"بتا رہے تھے وہ مجھے!" ساحرہ نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "مجھ سے شادی کرنے کے بعد ہی انہیں یہ مرض لاحق ہوا ہے۔ میں نے ان کے سامنے تو اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن تم سے کہہ رہی ہوں کہ کسی دن ان کا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے وہ بھی میرے قرب کی وجہ سے۔"

"یہ فضول باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے تم نے مجھے!" احسن نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں احسن! یہ تو بات سے بات نکلی ہے۔ ویسے سچی بات بھی ہے احسن کہ...... میرا مطلب ہے...... اگرچہ آغا صاحب کی عمر بہت زیادہ نہیں لیکن ساٹھ سال بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ اس عمر میں ہائی بلڈ پریشر ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میں مانتی ہوں کہ شیبا مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے مگر اٹھلاتی ہوئی جوانی اس نے نہیں پائی۔"

احسن نے کچھ غصے سے کہا۔ "تم نے یہ بے ہودہ باتیں اگر میرے جذبات بھڑکانے کے لیے کی ہیں تو یقین کر لو کہ تمہیں ناکامی ہوئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" ساحرہ بڑے مزے سے بات کر رہی تھی۔ "لیکن عملاً یہ صورتِ حال سامنے آئے گی تو تم بے بس ہو جاؤ گے۔"

"میری قوت ارادی بہت مضبوط ہے۔"

"سب دھری رہ جائے گی۔"

"مجھے لگتا ہے کہ شادی کے بعد تم بہت جنونی ہو گئی ہو۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ پہلے جھکی نہیں تھی نا؟"

"میں تمہیں نصیحت ہی کر سکتا ہوں کہ اپنے جنون پر قابو پالو تو اچھا ہوگا۔"

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں احسن!...... بس!...... اور کچھ نہیں سننا مجھے! اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں۔"

احسن نے جھنجلا کر رابطہ منقطع کر دیا اور یہ شاید اس نے اچھا ہی کیا۔ اس نے ایسی آواز سنی تھی جیسے باہر سے دروازے کا لاک کھولا گیا ہو۔

آنے والی ظاہر ہے کہ شیبا ہی ہونا چاہیے تھی۔ احسن نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

"خیریت؟" احسن نے پوچھا اور لیٹے لیٹے موبائل کے ریکارڈ سے وہ کال ختم کر دی جو ساحرہ نے کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیبا کی نظر اس پر پڑ جائے۔ احسن اسے اس کال کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کال کے بارے میں بتاتا تو ساری باتیں بھی بتانا پڑتیں۔ وہ زیادہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور سچ بتاتا تو شیبا، عین ممکن تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو جاتی۔

"کیا کر رہے ہو؟" شیبا کی نظر اس کے موبائل پر تھی۔

احسن نے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔
''وقت گزاری کے لیے ایک گیم کھیلنے لگا تھا۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ ڈیڈی نے کیوں بلوایا تھا؟''

''میں ان کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔'' شیبا نے بستر کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''دو ملازموں میں کچھ تنازعہ ہو گیا تھا بلکہ بڑھ گیا تھا۔ عشرت اعوان اس معاملے کو سنبھال نہیں سکی تھی اس لیے ڈیڈی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ڈیڈی نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ میں معاملہ رفع دفع کروانے میں عشرت اعوان کی مدد کروں۔ میں پریشان تو اس لیے ہوئی کہ ساحرہ وہاں سے کھسک لی تھی۔ مجھے ڈر ہوا تھا کہ وہ ادھر نہ آئی ہو۔''

''ادھر آتی بھی تو کیا فرق پڑتا۔'' احسن خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''میں اس کے لیے دروازہ تو نہیں کھول دیتا۔''

''ہاں۔ میں شاید بلاوجہ ہی پریشان ہوئی تھی۔'' شیبا نے بستر پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

احسن کو ایک ڈر یہ بھی لگا ہوا تھا کہ ساحرہ پھر فون نہ کر بیٹھے مگر جب اتنی دیر تک گھنٹی نہیں بجی تو اسے اطمینان ہوا۔

''چلو اب لیٹو، آرام کرو۔''

''نو بجنے والے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اب لیٹ کے کیا کرنا۔ تم بھی اٹھو ڈائننگ روم میں چلنے کے لیے!''

''ہاں۔'' احسن اٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ابھی کچھ زیادہ بھوک نہیں تھی اس لیے خیال ہی نہیں رہا۔''

''یہ ساحرہ۔'' شیبا سوچتے ہوئے بولی۔ ''میرے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔''

''ارے دفع کرو۔'' احسن نے کہا، پھر اس کا دھیان بٹانے کے لیے بولا۔ ''پرسوں تمہاری سالگرہ بھی تو ہے۔ تم نے آج تک اس کی کوئی تیاری ہی نہیں کی۔ کل شاپنگ کے لیے چلو۔''

''اس مرتبہ چند دن کی تاخیر سے منالوں گی۔ بھائی جان کے آنے کے بعد......''

''ہاں! وہ شاید دو چار دن میں آنے والے ہیں مگر انہیں تو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ تم کہہ رہی تھیں کہ انہیں سرپرائز دینے کا بہت شوق ہے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

کے ساتھ ٹہلتے ہوئے احسن کا ایک پیر بے دھیانی میں ایک گملے سے ٹکرا گیا۔ ٹخنے میں خاصی چوٹ آئی۔ وہ لنگڑانے لگا تھا۔ احسن گھر میں موجود بام سے کام نکالنا چاہتا تھا لیکن شیبا اسے اسپتال لے گئی۔ اس کے ٹخنے کا ایکسرے کروایا گیا لیکن اس سے کوئی تشویشناک بات سامنے نہیں آئی۔ ڈاکٹر نے ایک کیپسول اپنے سامنے کھلایا اور ایک کریم دے کر رخصت کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں ٹخنے کا ورم بالکل اتر جائے گا اور وہ آرام سے چلنے پھرنے لگے گا۔

اسی شام دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ آغا نصیر کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ عشرت اعوان نے ان کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ وہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ عشرت اعوان نے فوری طور پر انہیں کوئی دوا کھلائی لیکن یہ ضروری سمجھا کہ انہیں فوراً اسپتال لے جایا جائے۔

افراتفری سی مچ گئی۔ لنگڑانے کے باوجود احسن بھی سب کے ساتھ تھا لیکن جب آغا نصیر کو اسپتال لے جایا جانے لگا تو شیبا کو یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ لنگڑاتا ہوا ساتھ جائے۔ کیونکہ آغا نصیر کو اسپتال لے جانے میں شیبا اور عشرت اعوان کے ساتھ ساحرہ بھی تھی اس لیے شیبا نے احسن کو گھر پر اکیلا چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ احسن اپنے کمرے میں رہ گیا۔ شیبا اس ہنگامی صورتِ حال میں بھی اس کا کمرا مقفل کرنا نہیں بھولی تھی۔

آٹھ بجے آغا نصیر کو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ نو بجے شیبا نے مضطرب احسن کو اطلاع دی کہ اب معاملہ ڈاکٹروں کے قابو میں آ چکا ہے لیکن اسپتال سے ڈسچارج کرنے کا فیصلہ وہ ساڑھے دس بجے کے چیک اپ کے بعد کریں گے۔

ہمیشہ کی طرح آغا نصیر نے ڈاکٹروں کا یہ مشورہ رد کر دیا تھا کہ وہ دو ایک دن اسپتال ہی میں رہے اور مکمل آرام کرے۔

''وحشت ہوتی ہے مجھے اسپتال کے بستر سے۔'' آغا نصیر کا کہنا تھا۔

شیبا نے اسپتال سے اطلاع دینے کے بعد احسن سے کہا۔ ''عشرت اعوان نے ایک ملازم کو فون کر کے ہدایات دے دی ہیں، وہ تیس چالیس منٹ میں ہم لوگوں کا کھانا لے کر آ ہی جائے گا۔ آج تم اکیلے ہی کھا لینا۔ مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا ہے یہ کہتے ہوئے لیکن......''

''تم اطمینان سے وہاں رکو اور ڈیڈی کو لے کر آؤ۔''

گئی تھی۔ سوا نو بجے اس نے ملازم سے کمرے ہی میں کھانا منگوا کر کھایا۔

سوا دس بجے وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ شیبا کا فون پھر آیا۔

''کھانا کھالیا؟''

''کھالیا بھئی!'' احسن نے مسکرا کر کہا۔ ''تم ڈیڈی کی فکر کرو۔''

''ان کی طبیعت اب بالکل ٹھیک معلوم ہو رہی ہے۔ میں، ساحرہ اور عشرت اعوان انہی کے کمرے میں بیٹھے ان سے باتیں کررہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ میں ڈاکٹر چیک اپ کے لیے آئے گا۔ امکان یہی ہے کہ ڈیڈی کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ ہم لوگ، میرا خیال ہے کہ گیارہ بجے تک تو آہی جائیں گے۔ تمہیں اگر نیند آئے تو سو جانا۔''

''ہاں، سو جاؤں گا۔''

احسن نے یہ کہہ تو دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے نیند نہیں آئے گی۔ وہ کم ہی دنوں میں شیبا کی موجودگی کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے بغیر اسے مشکل ہی سے نیند آسکتی تھی۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب احسن نے گھڑی دیکھی اور پھر کسی قسم کی آواز سے چونکا۔

ہلکی سی آواز دوبارہ آئی تو احسن کی نظریں بائیں جانب کی کھڑکی کی طرف گئیں جس پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ پردے ہلتے دیکھ کر چونک پڑا۔ ایک تو وہ کھڑکی ہوا کے رخ پر نہیں تھی، دوسرے بند بھی تھی۔ پھر پردے پر ایسا دباؤ پڑتا نظر آیا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہو۔

''کون ہے؟'' احسن بے اختیار زور سے بول پڑا۔

اب پردہ پوری طرح ہٹا اور کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی ساحرہ کود کر کمرے میں آگئی۔ وہ جینز اور کرتنک کی بنیان میں تھی۔

''تم!'' احسن گھبرا کے بستر سے اٹھا۔ اسے ٹخنے کی تکلیف کا دھیان نہیں رہا تھا لیکن جب اس نے سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کی تو درد کے باعث دھم سے بستر پر بیٹھ گیا۔

''احسن! میری جان!'' ساحرہ تیزی سے اس کی طرف آئی۔

احسن پھر جلدی سے اٹھا۔ اس مرتبہ اس نے بائیں پیر پر دباؤ نہیں ڈالا تھا جس کے ٹخنے میں تکلیف تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ساحرہ اس سے لپٹ جائے گی۔

''رک جاؤ ساحرہ!'' احسن نے سخت لہجے میں کہا۔

''آج میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی احسن!'' ساحرہ نے اس کے قریب آکر دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیے اور اس کے سینے سے لگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شیبا کی وجہ سے مجھے ایسے موقعے بار بار نہیں مل سکتے۔ آغا صاحب کو گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں عشرت اعوان کے ساتھ بل کی ادائیگی کے لیے کمرے سے نکل آئی تھی۔ پھر عشرت اعوان کو چھوڑ کر کار میں تیزی سے یہاں پہنچی ہوں۔ شیبا آغا صاحب کے کمرے میں تھی لیکن اب تک اسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں اسپتال سے جا چکی ہوں۔ وہ میری وجہ سے پریشان رہنے لگی ہے۔ وہ جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ یوں سمجھ لو کہ بس پندرہ منٹ ہیں میرے پاس!'' وہ برق رفتاری سے بولتی چلی گئی تھی اور پھر اس کا ایک ہاتھ احسن کی گردن سے ہٹ کر اس کی قمیص کے بٹن تک پہنچا۔

احسن نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے بولا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''شیبا سے شادی ہو چکی ہے تمہاری۔ یہ اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔''

احسن نے اسے قمیص کا بٹن نہیں کھولنے دیا اور کوشش کی کہ اسے دھکیل دے لیکن ساحرہ کا ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کی گردن کے گرد جما ہوا تھا۔ خود احسن اپنے ٹخنے کی تکلیف کے باعث زیادہ طاقت صرف نہیں کر سکا۔

''تم مجھے کیوں دور کرنا چاہتے ہو احسن!'' ساحرہ کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ ''کیا میرا لمس تمہارے جسم میں بجلیاں نہیں بھر سکا؟''

احسن کا جسم سنسنا تو اٹھا تھا۔ شیبا اس کے سینے سے بالکل چپکی ہوئی تھی۔

''تم جو کچھ چاہتی ہو، وہ کبھی نہیں ہوگا۔'' احسن نے کہا۔ اس کی سانس پھولنے لگی تھی اور وہ اب بھی کوشش کر رہا تھا کہ شیبا کو خود سے الگ کردے۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں احسن!'' اس مرتبہ ساحرہ کا انداز ایسا تھا جیسے رو پڑے گی۔ ''تمہیں حاصل کرنا تو میری زندگی کی تمنا رہی ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ تم صرف شیبا کی ملکیت بنے رہو۔''

''تم جسے محبت کہہ رہی ہو، یہ ہوس ہے ساحرہ!''

''یہ انسان کی فطرت ہے۔''

''انسان کی نہیں، جانور کی فطرت ہے۔ اس جنون نے تمہیں جانور بنا دیا ہے لیکن میں جانور نہیں ہوں۔''

ساحرہ ایک جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپکنے لگی تھی۔ اس نے احسن کو گھورتے

ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ سے کبھی محبت نہیں رہی۔ جھوٹ بولتے رہتے ہو تم مجھ سے!“ ساحرہ کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔

احسن نے کہا۔ ”محبت کا اس وحشت سے کوئی تعلق نہیں جو اس وقت تم پر طاری ہے۔“

”میں یہ وحشت تم پر طاری کر دوں گی۔ ابھی تم نے دیکھا نہیں ہے کہ میں کیا ہوں۔“ ساحرہ نے کہتے ہوئے اپنی گردن کے قریب سے اپنی بنیان پکڑی اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ چرچرا کر اتنی پھٹ گئی کہ اس کا جسم کسی سرکش موج کی طرح امڈتا دکھائی دیا۔ احسن نے گھبرا کر اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔

”میری طرف دیکھو احسن!“ ساحرہ ہانپنے سی لگی تھی۔ ”شیبا میں یہ سب کچھ ایسا نہیں ہوگا۔“

”چلی جاؤ ساحرہ!“ احسن نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لیکن ساحرہ کسی پاگل بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔ اس نے احسن کا ہاتھ پکڑ کر کوشش کی کہ وہ اس کے جسم کا لمس محسوس کرلے۔

احسن نے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی۔ ٹخنے کی تکلیف کے باعث وہ بستر پر گر پڑا۔ ساحرہ اسے بستر پر پوری طرح گراتے ہوئے اس پر چھا گئی۔

احسن کا ایک ہاتھ اب ساحرہ کی خواہش پوری کر رہا تھا لیکن دوسرا ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے ساحرہ کے بال پیچھے سے پکڑ کر انہیں اس طرح کھینچا کہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھا۔ احسن کا وہ ہاتھ آزاد ہو گیا جو شیبا کے ہاتھ میں دبا ہوا اس کے جسم پر تھا۔ اب احسن نے دھکیل کر ساحرہ کو اپنے اوپر سے ہٹایا اور تیزی سے بستر کی دوسری جانب اتر گیا۔ اگر اس کے ٹخنے میں تکلیف نہ ہوتی تو وہ ساحرہ کو اتنا بے قابو ہونے سے بہ آسانی روک لیتا۔

ساحرہ بستر کی دوسری جانب اتر گئی اور احسن کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”کچھ بھی ہو جائے احسن! آج میں تمہارے کمرے سے پیاسی نہیں لوٹوں گی۔“

احسن اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے اس کا قفل کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

”نہیں کھلے گا۔“ ساحرہ دیوانگی سے ہنسی۔ ”میں نے اسپتال جانے سے پہلے ہی اس میں ایلفی ڈال دی تھی۔“

”کون ہے اندر؟“ باہر سے شیبا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”احسن! کیا ساحرہ ہے؟“

”ہاں۔“ ساحرہ نے بلند آواز اور جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں ہی ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ آج تم مجھے بھول جاؤ ورنہ شاید بہت برا ہو، آج میں یہاں سے ناکام نہیں جاؤں گی۔“

”یہ چابی کیوں نہیں لگ رہی ہے احسن!“ شیبا کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”اسپتال جانے سے پہلے ہی بے کار کر دیا تھا میں نے لاک۔“ ساحرہ حقارت سے مسکرائی۔ ”آج کی رات اس کمرے میں قدم رکھنا تمہارے لیے ممکن نہیں۔ آج یہاں میری حکومت رہے گی۔“

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر احسن کی طرف متوجہ ہوئی اور تیزی سے بستر کے گرد گھوم کر احسن کی طرف بڑھی۔

احسن نے بھی تیزی سے بستر کے گرد گھوم کر ساحرہ سے دور رہنے کی کوشش کی۔ ٹخنے کی تکلیف کے باوجود وہ ساحرہ سے بچنے میں کامیاب رہا تھا۔ گھبراہٹ، پریشانی اور ساحرہ پر غصے کے باوجود اسے اس وقت اپنی حالت مضحکہ خیز محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ایک لڑکی سے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ اگر اس کے ٹخنے میں تکلیف نہ ہوتی تو وہ ساحرہ کو بے بس کر سکتا تھا۔

باہر اب شور ہونے لگا تھا۔ شیبا اب ملازموں کو پکار رہی تھی۔

”یہ اتنی جلدی کیسے آگئی!“ ساحرہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

احسن بستر کی دوسری جانب تھا۔ اس نے کھڑکی کی جانب بڑھنا چاہا۔ اسے خیال ہوگا کہ جس طرح ساحرہ ادھر سے آگئی تھی، اسی طرح وہ بھی ادھر سے نکل سکتا ہے۔

اس مرتبہ ساحرہ نے بستر کے گرد چکر نہیں لگایا۔ وہ بستر پر چڑھ کر احسن کی طرف جھپٹی اور اسے کمر سے پکڑ لیا۔ وہ اسے کھینچتے ہوئے بستر کے قریب لے گئی۔ احسن کے ٹخنے کی تکلیف اب بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ خود کو ساحرہ کے سامنے بے بس محسوس کر رہا تھا۔

باہر سے دروازے کو دھکے مارے جانے لگے۔ دھکے مارنے والے ملازم ہی ہو سکتے تھے اور دروازہ توڑنے کی ہدایت انہیں شیبا ہی سے ملی ہوگی۔

”اندر کیا ہو رہا ہے احسن؟“ شیبا نے چیخ کر پوچھا۔

”گھبرانا مت شیبا!“ احسن نے بھی چیخ کر کہا۔ ”میرے ٹخنے کی تکلیف مجھے بے بس کر رہی ہے لیکن میں

ساحرہ کا گھناؤنا مقصد پورا نہیں ہونے دوں گا۔"

"دروازہ بہت مضبوط ہے۔" ساحرہ احسن کو بستر پر گراتے ہوئی بڑبڑائی۔ "دیر لگے گی اسے ٹوٹنے میں۔" لیکن اپنے اس خیال کے باوجود وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے چیخی۔ "اگر کوئی اندر داخل ہوا شیبا...... تو قیامت آجائے گی آج......! اگر میری آگ نہ بجھی تو میں اس گھر میں آگ لگا دوں گی۔"

"یہ اندر کیسے پہنچ گئی!" یہ عشرت اعوان کی آواز تھی۔ اسے دروازے پر دھکے لگنے والے شور کے باعث زور سے بولنا پڑا تھا۔

"یہ بھی آگئی۔" ساحرہ بڑبڑائی اور پھر احسن کی طرف متوجہ ہوئی۔ احسن اب بستر پر بیٹھ گیا تھا اور کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساحرہ نے پھر اسے دھکیل دیا اور خود بھی اس پر چھا گئی۔ اس نے احسن کے کالر کے اندر ہاتھ ڈال کر زور سے جھٹکا دیا۔ قمیص بہت مضبوط کپڑے کی تھی۔ وہ پھٹ تو نہیں سکی لیکن اوپر کے دو بٹن ٹوٹ گئے۔

احسن کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے بڑی زور سے ساحرہ کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔

ساحرہ یک لخت خود ہی اس سے الگ ہو گئی اور اس طرح احسن کی طرف دیکھنے لگی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"تم نے مجھے مارا احسن!" ساحرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "اپنی ساحرہ کو طمانچہ مار دیا؟"

احسن کو بستر سے اٹھنے کا موقع مل گیا۔

یک لخت ساحرہ دیوانوں کی طرح ہنس پڑی۔ "لیکن تم نے مجھے نفرت سے نہیں مارا ہوگا۔ مجھے یقین ہے، تمہارے دل میں میری محبت اب بھی ہے۔ تم نے یہ تھپڑ میری وحشت کو مارا ہے کہ شیبا سے شادی کے بعد تمہیں اس سے آشنا ہو جانا چاہیے تھا"

اس وقت احسن نے دوبارہ کھڑکی کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ساحرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ ساحرہ کی [illegible] اس حد تک پھٹی ہوئی تھی کہ وہ تقریباً بے لباس نظر آنے لگی تھی۔

دروازہ دھڑام سے چوکھٹ سے نکل کر اندر آ گرا۔ ساحرہ کا خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ دروازہ ٹوٹنے میں زیادہ دیر لگے گی۔ وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔

شیبا دروازے کو پھلانگتے ہوئے اندر آگئی۔ ملازمین اندر نہیں آئے۔ غالباً شیبا ہی نے انہیں روک دیا ہوگا۔ احسن اب لنگڑاتا ہوا پیچھے ہٹا تاکہ شیبا کے قریب پہنچ جائے۔

"میں نے کہا تھا تم سے کہ اندر نہ آنا" ساحرہ نے دانت پیسے۔ اس وقت اس کے بال بالکل بکھر گئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے پاگل خانے سے کوئی دیوانی لڑکی بھاگ نکلی ہو۔

شیبا کا چہرہ سفید ہوا جا رہا تھا لیکن وہ غصے سے بولی۔

"بس اب یہاں سے چلی جاؤ ساحرہ! اس سے پہلے کہ ڈیڈی کو سب کچھ معلوم ہو جائے، یہاں سے چلی جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ میں زبان بند رکھوں گی اور اب احسن کی بات بھی مان لوں گی۔ ہم اس گھر سے کہیں چلے جائیں گے۔"

"میں جانے دوں گی، تب نا!" ساحرہ نے پھر دانت پیسے اور اپنا دایاں ہاتھ اپنی پشت پر لے گئی۔ جب اس کا ہاتھ سامنے آیا تو اس میں پستول تھا۔ غالباً وہ چھوٹا سا پستول اس نے پیٹھ کی طرف اپنی جینز میں اڑس رکھا تھا۔

"میں ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار ہو کر آئی تھی شیبا!" ساحرہ نے خوں خوار لہجے میں کہا۔ "میں نے آغا صاحب سے نشانہ بازی بھی سیکھی ہے اور دو دن پہلے یہ پستول بھی خرید لائی تھی۔ اس وقت مجھے خیال نہیں تھا کہ یہ مجھے کن حالات میں استعمال کرنا پڑے گا۔ چلی جاؤ تم یہاں سے۔ احسن کی ٹھیکے دار مت بنو۔"

"ٹھیکے دار تو میں ہوں احسن کی!" شیبا نے پستول سے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔

اسی وقت ایک نوجوان تیزی سے کمرے میں آیا اور پھر ٹھٹک گیا۔ ساحرہ نے تیزی سے اپنے پستول کی نال اس کی طرف کر دی تھی۔

"بھائی جان!" نوجوان کو دیکھتے ہی شیبا کے منہ سے نکلا۔

ایک غیر یقینی صورتِ حال کی وجہ سے اس کے لہجے میں خوشی کی وہ لہر نہیں تھی جو بھائی کو دیکھ کر ہونا چاہیے تھی۔

"کیا ہے یہ سب!" نوجوان کے لہجے میں حیرت تھی، پریشانی بھی اور تناؤ کی کیفیت بھی!

"تم بھی چلے جاؤ یہاں سے!" ساحرہ غرائی، پھر شیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "احسن کو یہاں چھوڑ کر تم بھی چلی جاؤ ورنہ تم دیکھ رہی ہو کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے، کچھ بھی ہو جائے گا شیبا! کچھ بھی!"

"کون ہو تم؟" شیبا کے بھائی نے ساحرہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ خاصا تیکھا تھا۔

شیبا تلخی سے بول پڑی۔ "یہ ہماری نئی سوتیلی ماں ہے بھائی جان اور یہ......" وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے رک گئی۔

"چلی جاؤ شیبا!" ساحرہ پھر کھا جانے والے انداز

میں بولی۔

"میں احسن کو ساتھ لے کر ہی یہاں سے جاسکتی ہوں۔"

"احسن نہیں جائے گا۔" ساحرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اور اگر جائے گی تو اس کی لاش جائے گی۔ اسے گولی مار کر میں خود کو بھی ختم کرلوں گی۔ اگر احسن میرا نہیں ہوسکتا تو پھر کسی کا بھی نہیں ہوگا۔"

اس صورتِ حال میں بہتر یہی تھا کہ ساحرہ پسپائی اختیار کرلیتی مگر وہ شاید اس وقت پاگل ہوچکی تھی۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی تھی۔

شیبا جلدی سے احسن کے سامنے آگئی اور ساحرہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ "احسن سے پہلے تمہیں مجھے گولی مارنا پڑے گی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ "میں احسن کو اپنے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

احسن نے شیبا کو اپنے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ "وہ پاگل ہورہی ہے۔"

"اس کے پاگل پن کا نشانہ پہلے میں بنوں گی۔"

"چلو تو ایسا ہی سہی!" ساحرہ نے دانت پیسے۔ اس وقت اس کی توجہ شیبا کے بھائی کی طرف سے کم ہوگئی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ دھیرے دھیرے ساحرہ کے قریب ہوتا جارہا تھا۔

"خدا حافظ شیبا!" ساحرہ نے کہا۔

اور پھر گولی چلی!...... شیبا کا بھائی ابھی ساحرہ سے کچھ دور ہی تھا۔

ساحرہ کے منہ سے کراہ نکلی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کے سینے سے خون ابل پڑا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ڈگمگائی اور گر پڑی۔

احسن، شیبا اور اس کے بھائی کو سکتہ سا ہوگیا۔ وہ اس آواز سے چونکے جو کھڑکی کی طرف سے آئی تھی۔ انہوں نے عشرت اعوان کو دیکھا جو کود کر کمرے میں آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ بڑی نفرت سے ساحرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"پولیس کو فون کرے کوئی۔" احسن بوکھلا کر بولا۔

"نہیں۔" عشرت اعوان سخت لہجے میں بولی۔ "میں نے اس طرح گولی ماری ہے کہ اس کا دل زد پر نہ آئے۔ اس کا خون بہنے دو۔ اسے تڑپ تڑپ کر ہی مرنا چاہیے۔ پولیس آئے گی تو ایمبولینس بھی آئے گی اور اسپتال میں اسے شاید بچالیا جائے۔"

ساحرہ تڑپ رہی تھی۔ احسن سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ وہ عشرت اعوان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ پڑا۔ "کیا پاگل ہوگئی ہو تم!"

"کوئی فون نہیں کرے گا۔" عشرت اعوان نے سفاک لہجے میں کہا اور گولی چھت کی طرف چلا کر ان لوگوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔

کمرے کے باہر سے ملازمین کی بلند آوازیں آنے لگی تھیں۔

احسن فرش کے قریب پڑی ساحرہ کے قریب پہنچ کر بیٹھا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

یک لخت ساحرہ کے چہرے سے اذیت کے آثار ختم ہوگئے۔ وہ مسکرا اٹھی۔ اس کا خون آلود ہاتھ احسن کے چہرے پر گیا اور وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ "میں نے کہا تھا نا! اب بھی محبت کرتے ہو تم مجھ سے!"

اسی وقت پریشان حال آغا نصیر تیزی سے کمرے میں آیا۔ اسے ملازمین سے صورتِ حال کا علم ہوگیا ہوگا لیکن اس کے ادھر آنے کا سبب گولیاں چلنے کی آوازیں ہی ہوسکتی تھیں۔

"کیا ہوا ہے یہ!" وہ ایک ایک کا منہ تکتے ہوئے بولا۔ اس نے خون آلود ساحرہ کا سر احسن کی گود میں دیکھا تھا لیکن اس کی نظریں عشرت اعوان پر جم گئیں۔ "یہ تم نے کیا، کیا؟" وہ چیخ پڑا۔

"میں نے وہی کیا ہے جو پہلے کرتی رہی ہوں۔" عشرت اعوان نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہاری دوسری اور تیسری بیوی کو بھی میں نے ہی مارا تھا۔ اب اسے بھی گولی مار دی ہے۔ جلد ہی یہ بھی مرنے والی ہے۔"

"یہ کیوں کیا تھا تم نے!" آغا نصیر پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"تم نے مجھے ذلیل کیا تھا آغا!" عشرت اعوان نے آغا نصیر کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے مجھے محبت کا جھانسا دے کر میری دوشیزگی ختم کی تھی اور پھر شیبا کی ماں سے شادی کرلی تھی۔ مجھے بتایا تھا کہ تم نے اپنے والد کے جبر کی وجہ سے وہ شادی کی تھی۔ پھر جب تمہارے والد کا انتقال ہوگیا تو تم نے مجھے بہلا پھسلا کر اپنی سیکریٹری بنا لیا، لیکن شیبا کی ماں کے انتقال کے بعد بھی تم نے مجھ سے شادی نہیں کی۔"

کمرے میں موجود سبھی لوگ حیرت سے عشرت اعوان کی باتیں سن رہے تھے مگر احسن ان سے بے خبر، ساحرہ کو اپنی

وش میں سمیٹنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے کپڑے بھی حرہ کے خون سے رنگین ہوگئے تھے۔

''بہت خوش قسمت ہوں میں!'' ساحرہ ڈوبتی ہوئی سی واز میں بولی۔ ''مرتے وقت ہی سہی!..... مجھے کم از کم ہاری آغوش تو.....'' اس سے مزید نہیں بولا جاسکا۔ تیزی سے بہتے ہوئے خون کے ساتھ اس کا چہرہ سفید پڑتا جارہا تھا۔

عشرت اعوان تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔ ''شیبا کی ں کے انتقال تک میری عمر خاصی ہوچکی تھی اس لیے اس قت بھی تم نے مجھ سے شادی کرنے کے بجائے ایک نوجوان ڑکی سے شادی کرلی۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوسکا۔ میں تے منصوبہ بندی کرکے اسے ہلاک کردیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد تم نے پھر ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی۔ موقع پا کر میں نے اسے بھی ہلاک کردیا۔ میں تمہاری کسی نوجوان بیوی کو زندہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تم کو میں نے اس لیے نہیں مارا آغا کہ تمہاری محبت تو میرے دل میں آج بھی ہے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ تم شادیاں کرتے رہوگے اور میں انہیں اس طرح مارتی رہوں گی کہ میں قانون کی زد پر نہ آؤں لیکن آج مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ قانون میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ گزشتہ ماہ مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ میں کینسر کا شکار ہوگئی ہوں۔ مرنا تو اب مجھے ہے۔''

اس وقت احسن کی آغوش میں ساحرہ کا سر ڈھلک چکا تھا۔ احسن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور اس نے ساحرہ کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کردیں۔

شیبا کی نظریں کبھی عشرت اعوان کی طرف جارہی تھیں اور کبھی ساحرہ اور احسن کی طرف.....!

شیبا کا بھائی سکتے کے سے عالم میں کھڑا ہوا تھا اور آغا نصیر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اسے اس وقت شاید یہ خیال بھی نہ ہو کہ اس کی مقتول بیوی احسن کی آغوش میں تھی۔

وزنی جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ وہ پولیس کے آدمی تھے۔ غالباً کسی ملازم نے فون کردیا تھا۔

♥♥♥

تین دن گزر گئے۔ آغا نصیر کے گھر میں سناٹا چھایا رہا۔ احسن اور شیبا ایک ہی بستر پر سو رہے تھے مگر ان کی آپس میں کوئی بات نہیں ہورہی تھی۔

تیسری رات احسن سے خاموش نہ رہا گیا۔ ''مجھ سے ناراض ہو شیبا؟''

''نہیں احسن!'' شیبا نے طویل سانس لی۔ ''بس سوچتی رہی ہوں کہ تم سے کیا بات کروں۔ ہاں ایک بات کا احساس مجھے بہرحال ہے..... انسان اپنی پہلی محبت بھی بھول نہیں سکتا۔''

''میں شرمندہ ہوں۔'' احسن نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے اس رات ساحرہ کو طمانچا بھی مار دیا تھا۔ میں اس کی وحشت کا نشانہ کسی قیمت پر نہیں بنتا۔ مجھے اس پر شدید غصہ آ رہا تھا لیکن جب اس کے گولی لگی، جب وہ مرنے لگی تو وہ منظر میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ مجھے خوب احساس ہے کہ جب میں نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا، اس وقت تمہارے دل پر کیا گزر گئی ہوگی۔''

''میرے دل پر جو کچھ گزری، وہ تو فطری امر تھا۔''

''یقین کرو۔ میں اسے بھلانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگیا تھا لیکن اسے مرتے دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا ہوگیا۔''

''وہی ہوا جو کسی محبت کرنے والے کو ہوتا ہے۔'' شیبا کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''ابھی کہہ چکی ہوں میں!..... پہلی محبت شاید کبھی نہیں بھلائی جاسکتی۔''

''لیکن اب وہ اس دنیا سے جاچکی ہے۔ اب صرف تم ہو اور میرے لیے ہو اور میں تمہارے لیے!''

''بدنصیب تھی وہ۔'' شیبا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اور جیسی بھی تھی، اس کا ذمے دار کسی کو ٹھہرانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن کاش..... کاش والدین اپنی جوان ہوتی ہوئی بیٹی کو اپنے کمرے میں نہ سلایا کریں۔''

''کیا مطلب؟''

''غربت..... انتہائی غربت میں زندگی گزاری تھی ساحرہ نے!..... گھر میں ایک ہی کمرا تھا۔ والدین کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ بیچ میں پردہ ڈال لیں۔ پردہ بھی نصیب نہ ہو تو ٹاٹ ڈال لیا کرتے۔''

احسن چپ رہ گیا۔ غالباً بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ رشتے داری بہت دور کی سہی لیکن اسے علم تھا کہ ساحرہ اپنے والدین کے ساتھ ہی کمرے میں سویا کرتی تھی۔

''خیر!'' شیبا پھر بولی۔ ''جو ہونا تھا، ہوگیا۔ اب تو تم صرف میرے ہو نا؟'' اس نے احسن کی طرف کروٹ لی اور مسکرائی۔

''ہاں شیبا!..... تمہارا ہوں، صرف تمہارا۔''

احسن واقعی پھر صرف شیبا ہی کا رہا لیکن جب ساحرہ کی برسی آتی تو وہ اس کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے ضرور جاتا تھا۔

♠♠♠


آخری مرحلہ
ایم اقبال

جرائم پیشہ افراد کے ایک گروہ نے جیل توڑ کر اپنے ان ساتھیوں کو چھڑایا تھا جو کچھ عرصے سے وہاں قید تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اور قیدی بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے۔ انہی میں ایک قیدی بختیار بھی شامل تھا جو دو ماہ سے ایک ایسے جرم کی سزا بھگت رہا تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔

جیل رات کی تاریکی میں توڑی گئی تھی۔ اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر بختیار شہری حدود تک پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کی پہلی کرن پھوٹنے میں بھی کچھ دیر تھی۔ اس وقت سے فائدہ اٹھانا بختیار کے لیے ضروری تھا۔ اس کے جسم پر جیل کے کپڑے تھے جن سے نجات حاصل نہ کرنے کی صورت میں وہ جلد ہی پھر قانون کی گرفت میں ہوتا اور اسے جیل سے فرار ہونے کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا۔ وہ خمیازہ کیا ہوتا، یہ بختیار نہیں جانتا تھا۔ اسے تو سزا ہی عمر قید کی ہوئی تھی۔

شہری حدود کا آغاز غریبوں کی ایک بستی سے ہوا تھا جہاں بنے ہوئے معمولی مکانات میں کچھ ایسے بھی تھے جن کے صحن کی دیواریں بہت زیادہ اونچی نہیں تھیں، پھر بھی نو دس فٹ کے قریب تھیں۔

بختیار کسی مکان میں گھس کر مردانہ کپڑے چرانا چاہتا تھا اگر ایسے کپڑے مل جاتے جو اس کے قد کاٹھ کے لیے بالکل مناسب ہوتے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوتی۔

اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا اور قانون کی نظروں سے بچنے کے لیے کس طرح خود کو محفوظ رکھا جاتا، یہ سب کچھ بھی اسے سوچنا تھا مگر سب سے پہلے اسے جیل کے کپڑوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر تھی۔

وہ محتاط انداز سے گلیوں کے چکر لگانے لگا۔ اسے کسی ایسے مکان کی تلاش تھی جس کے صحن کی دیوار سات فٹ سے زیادہ اونچی نہ ہو۔ کیونکہ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ سے ذرا ہی زیادہ نہیں تھا۔

کہیں قریب ہی سے سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ بختیار کا دل اچھل پڑا۔ اسے پولیس کا خیال آیا تھا۔ وہ فوراً قریب کے ایک مکان کی دیوار سے تقریباً چپک کر زمین پر لیٹ گیا۔ وہاں اس کے چھپنے کے لیے کوئی اور جگہ تھی ہی نہیں۔

کچھ وقفے سے سیٹی کی آواز پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے گلی کے سرے پر ایک آدمی کو اندھیرے کے باعث سائے کے مانند دیکھا۔ وہ دائیں سے بائیں جاتے ہوئے بختیار کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بختیار نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ پولیس کانسٹیبل نہیں، اس محلے کا چوکیدار تھا۔ اس کی وضع قطع ایسی ہی تھی۔

بختیار کھڑا ہو کر پھر دبے قدموں ایک جانب بڑھنے لگا۔ اسے رات کی تاریکی میں کتوں کے بھونکنے کا اندیشہ تھا۔

کچھ دیر بعد بختیار مایوس ہونے لگا۔ اسے کوئی ایسا مکان نظر نہیں آیا تھا جس کے صحن کی دیوار اتنی کم اونچی ہو جس پر وہ چڑھ سکے۔ مایوسی کے عالم میں اسے یکایک امید کی کرن نظر آئی۔ اسے ایک جگہ چالیس پچاس اینٹیں نظر آئی تھیں جو وہاں رہنے والے کسی شخص نے اپنے مکان میں کچھ بنوانے کے لیے رکھی ہوں گی۔

ایک امید نظر آتے ہی بختیار تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ وہ دو اینٹیں اٹھا کر قریب ہی کے ایک مکان کے صحن کی دیوار تک لے گیا۔ کئی چکروں کے بعد وہ اتنا اونچا چبوترا بنانے میں کامیاب ہوگیا کہ اس پر کھڑے ہو کر دیوار پر چڑھنا اگرچہ بہت آسان تو نہیں لیکن بہت مشکل بھی نہیں رہا تھا۔ چبوترے کو مزید اونچا کر کے وہ اپنے لیے آسانی بھی پیدا کر سکتا تھا مگر اسی وقت محلے کی کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ چبوترا مزید اونچا کرنے کے لیے بختیار کے پاس اب وقت نہیں تھا۔ اذان کے بعد وہ لوگ تو فوراً ہی گھر سے نکل پڑتے ہیں جو پہلے ہی جاگ چکے ہوں ایسے لوگ اس گلی میں بھی آ سکتے تھے اور ان کی نظر بختیار پر پڑ سکتی تھی۔

یہ صورت حال پیدا ہوتے ہی بختیار نے جلد از جلد دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ جدوجہد کے بعد وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ مکان میں دو کمرے تھے جن کے دروازے صحن کی طرف کھلے ہوئے تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ دونوں کمرے چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان میں سے ایک بالکل تاریک تھا لیکن دوسرے کمرے میں زرد سی روشنی تھی۔ اس روشنی کا کچھ اثر صحن پر بھی پڑ رہا تھا۔

''اٹھ جا بیٹی! اذان ہو رہی ہے۔'' ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

صحن میں ایک ہی چارپائی تھی۔ عورت کے جملے سے بختیار سمجھ گیا کہ وہ ماں بیٹی ایک ہی پلنگ پر سو رہی تھیں۔ ان دونوں میں سے ماں جاگ کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کا رخ اس دیوار کی طرف نہیں تھا جس پر بختیار چڑھا تھا۔

ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر بختیار صحن میں پنجوں کے بل کودا تا کہ کم از کم آواز ہو لیکن کچھ آواز تو بہر حال ہوئی تھی۔

''دیکھ تو پروین، ادھر کچھ گرا ہے۔'' بڑی جلدی میں کہا گیا تھا۔ آواز اسی عورت کی تھی۔ اس طرح بختیار کو دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس عورت کی بیٹی کا نام پروین تھا

بختیار بہت تیزی سے پلنگ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت پروین بھی اٹھ بیٹھی تھی۔

''کک...... کون؟'' پروین خوف سے ہکلا گئی۔

اس نے بختیار کو ایک ہیولے ہی کے مانند دیکھا ہوگا۔ وہاں اتنی روشنی نہیں تھی کہ وہ بختیار کو واضح طور پر دیکھ سکتی۔ اس وقت گلی میں دو ایک آدمیوں کے قدموں کی آوازیں ہونے لگی تھیں۔

''کون ہے بیٹی؟'' پروین کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

اب بختیار کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ پروین کی ماں کو غالباً کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

''زیادہ آواز مت نکالنا۔'' بختیار نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ''چاقو ہے میرے پاس! دونوں کی گردنیں کاٹ کر پھینک دوں گا۔'' اس نے اپنے لہجے میں سفاکی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''چوووور۔'' پروین کی ماں کی آواز بہت سہمی ہوئی تھی۔

''چارپائی سے اترو اور کمرے میں چلو۔''

بختیار نہیں چاہتا تھا کہ وہاں ہونے والی باتوں کی مدھم سی آواز بھی گلی میں جائے۔ اسے گلی سے اب باتیں کرنے کی آواز بھی آنے لگی تھی۔

پروین نے چارپائی سے اترتے ہوئے اپنی ماں کو بھی اٹھنے کے لیے سہارا دیا تھا۔

''ارے واہ! یہ اینٹیں یہاں کیوں رکھی ہیں۔'' گلی سے آواز آئی۔ ''کوئی چور تو نہیں چڑھا ہے یہاں سے!''

بختیار کا دل جو پہلے ہی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، چور کا حوالہ دیے جانے پر اچھل ہی پڑا۔

''کوئی پاگل ہی چور ہوگا۔'' جواب میں ہنس کر کہا گیا تھا۔ ''بے چاری آسیہ خالہ کے گھر میں ہے ہی کیا جو کوئی چرانے آئے گا۔''

اس بات پر پہلا شخص بھی ہنسا اور قدموں کی آواز دور ہونے لگی۔ بختیار نے سکون کا سانس لیا۔ ان دونوں کی باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ پروین کی ماں کا نام آسیہ تھا اور محلے میں شاید سبھی اسے آسیہ خالہ کہتے تھے۔

پروین اپنی ماں کے ساتھ پلنگ سے کھڑی ہوگئی تھی۔ اندھیرے میں ان دونوں کے چہروں پر آنے والے خوف کے تاثرات دیکھے تو نہیں جاسکتے تھے لیکن بختیار کو یقین تھا کہ وہ دونوں بہت خوف زدہ ہوں گی۔

پروین کی جسامت سے بختیار نے یہ اندازہ بھی لگالیا تھا کہ وہ کوئی بچی نہیں، جوان لڑکی تھی۔ بختیار انہیں اس کمرے کی طرف لے جانے لگا، جہاں ایک بلب کی روشنی تھی۔

بختیار ان دونوں کے بعد کمرے میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی دروازہ بند کرلیا۔

پروین اتنی خوف زدہ تھی کہ اب بھی اس نے مڑ کر بختیار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ غالباً اسی کی وجہ سے اس کی ماں بھی دوسری طرف منہ کیے رہی تھی۔

''اب میری طرف دیکھو، اور میری بات سنو!'' بختیار نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ کمرے میں آنے کے بعد بھی نہیں چاہتا تھا کہ بلند آواز میں بات ہو۔

وہ دونوں اس کی طرف مڑیں۔ آسیہ خالہ کی عمر اتنی زیادہ معلوم ہو رہی تھی کہ اسے پروین کی دادی ہونا چاہیے تھا۔

پروین کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ ہوسکتی تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ نقش و نگار ایسے تھے کہ اگر اس نے آسودہ حالی میں پرورش پائی ہوتی تو خوب صورت نظر آتی۔

''دیکھ بھیا!'' آسیہ خالہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہمارے گھر میں ایسا سامان نہیں ہے جسے چرا کر تجھے کوئی فائدہ پہنچے۔ بس ایک سلائی مشین رکھی ہے دوسرے کمرے میں۔ اگر تو وہ بھی لے گیا نا بھیا...... ہم تو فاقوں سے مر جائیں گے۔''

بختیار کو اس کمرے کے سامان سے بھی انتہائی غربت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ایک گوشے میں کچھ میلے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ سامان کے نام پر وہاں بھی بس ایک چارپائی تھی جس پر کچھ دھلے ہوئے کپڑے پڑے تھے۔

''دوسرے کمرے میں کون سویا ہوا ہے؟'' بختیار نے اب بھی اپنے لہجے میں سفاکی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''کوئی...... کوئی نہیں۔'' پروین کی زبان سے یہ الفاظ اس طرح اٹک اٹک کر نکلے جیسے اس کا حلق خشک

ہو رہا ہو۔

اس دوران میں بختیار کو یقین ہو چکا تھا کہ آسیہ خالہ کے چہرے پر آنکھیں تو تھیں لیکن ان کی روشنی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ نابینا تھی۔

''تم دونوں میرے آگے آگے اس کمرے میں چلو۔'' بختیار نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ ''میں اِس وقت اپنا چاقو نکال لوں گا۔ اگر مجھے وہاں کوئی نظر آیا تو میں ایک پل ضائع کیے بغیر تم دونوں کو تو چاقو مار ہی دوں گا۔''

''اس گھر میں بس ہم دونوں ہی رہتے ہیں۔'' آسیہ خالہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

''دوسرے کمرے میں چلو۔'' بختیار غرایا۔

''چلو اماں!'' پروین نے آسیہ خالہ کا بازو پکڑتے ہوئے پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔

بختیار کو ان دونوں کے لب و لہجے سے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ دونوں سچ بول رہی تھیں لیکن وہ مکمل اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اطمینان حاصل کر لیا۔ اس کمرے کے ایک حصے میں نظر آنے والے سامان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جگہ باورچی خانے کے طور پر استعمال کی جاتی ہو گی۔ دوسری طرف کی دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی پرانی سی چادر پر ہاتھ سے چلائی جانے والی سیونگ مشین رکھی تھی۔ مشین کے قریب ہی کچھ نئے لیکن معمولی سے کپڑے تھے۔ ایک کپڑا مشین کی سوئی میں اٹکا ہوا تھا، جیسے سیتے سیتے چھوڑ دیا گیا ہو۔

''ایک گلاس پانی پلا دو۔'' بختیار نے پروین سے کہا۔ اس نے بہت دیر سے پانی نہیں پیا تھا۔ حلق خشک ہوتا جا رہا تھا۔ پروین نے اسے گلاس میں پانی لا دیا۔

''بس یہ ایک مشین ہے بھیا!'' آسیہ خالہ بولی۔ ''یہ مت لے جانا۔ یہ ہم ماں بیٹی کا ایک ہی سہارا ہے۔''

بختیار کو ''ماں بیٹی'' کے الفاظ پر تعجب ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق ان دونوں کو ''دادی پوتی'' ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے اپنا دماغ اس الجھن میں نہیں پھنسایا۔ وہ بڑی حد تک مایوسی کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ جس گھر میں کوئی مرد رہتا ہی نہ ہو، وہاں سے کوئی مردانہ لباس ملنا ناممکن ہی معلوم ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک امید موہوم کو پیش نظر رکھا۔

''دیکھو!'' وہ پانی کا خالی گلاس پروین کو لوٹاتے ہوئے اس مرتبہ نرم لہجے میں بولا۔ ''میں تم دونوں کو ذرا بھی نقصان پہنچانے یہاں نہیں آیا ہوں۔ مجھے صرف مردانہ لباس کی ضرورت ہے، صرف ایک جوڑے کی۔''

''ہمارے گھر میں کوئی مرد ہی نہیں تو......'' آسیہ خالہ نے کہنا چاہا۔

پروین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم نے ابا کے دو ایک جوڑے تو بہت سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اماں! ان میں سے ایک جوڑا دے دو۔'' پروین کو اتنا بولنے کی ہمت غالباً اس لیے ہوئی تھی کہ بختیار نے اب نرم لہجہ اختیار کیا تھا۔

''وہ......وہ تو......'' بختیار نے آسیہ خالہ کے چہرے پر اداسی بکھرتے دیکھی۔

''وہ کپڑے شاید تم نے یادگار کے طور پر رکھ چھوڑے ہیں بڑی بی!'' بختیار بولا۔ ''لیکن مجھے بہر حال ایک جوڑے کی شدید ضرورت ہے۔''

''ایک جوڑا دے دو اماں!'' پروین پھر بولی۔

''اچھا۔'' آسیہ خالہ کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ ''وہ پوٹلی اسی کمرے میں ہے۔ میلے کپڑوں ہی میں کہیں دبی ہو گی۔''

''میں وہ ڈھونڈتی ہوں۔ تم بیٹھ جاؤ اماں!'' پروین نے کہا اور پھر بختیار کی طرف دیکھا جیسے اسے اس کی طرف سے کسی اعتراض کا اندیشہ ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' بختیار اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا۔ ''بٹھا دو تم اپنی ماں کو۔''

پروین نے آسیہ خالہ کو سیونگ مشین کے قریب چادر پر بٹھا دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے کے بعد سوالیہ نظروں سے بختیار کی طرف دیکھنے لگی۔

میلے کپڑوں کا ڈھیر بختیار نے اس کمرے میں دیکھا تھا جہاں سے وہ ان ماں بیٹی کو دوسرے کمرے میں لایا تھا۔

''چلو! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' بختیار نے کہا اور پھر آسیہ خالہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''دیکھو بڑی بی!...... اگر تم نے یہاں سے باہر جا کے شور مچایا تو سمجھ لو کہ تمہاری بیٹی کی گردن کاٹنے میں مجھے دیر نہیں لگے گی۔''

آسیہ خالہ نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے دکھائی ہی نہیں دیتا تو باہر کیسے جاؤں گی۔ میں تو کہیں جاتی ہوں تو پروین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتی ہوں۔''

''گھر کے باہر کہیں جاتی ہو گی اس طرح۔'' بختیار نے کہا۔ ''گھر کا ایک ایک گوشہ تو تمہارا سمجھا بوجھا ہو گا۔ نابینا لوگ اپنے گھر کے ہر حصے سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ دروازے تک بھی جا سکتے ہیں۔''

''یہ کہیں نہیں جائیں گی۔'' پروین بول پڑی۔

''انہیں اپنی جان سے زیادہ میں عزیز ہوں۔''

اس جواب سے بختیار نے محسوس کیا کہ پروین تھوڑی بہت پڑھی لکھی ضرور تھی۔ وہ اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا۔ پروین نے میلے کپڑوں سے ایک پوٹلی نکال کر اس میں سے دو جوڑے نکالے۔

''تم یہ دونوں ہی لے لو۔'' وہ بولی۔ ''میں تو چاہتی تھی کہ یہ کپڑے گھر میں نہ رہیں۔ اماں کبھی کبھی ان کپڑوں کو نکال کر سینے سے لگاتی ہیں اور پھر سارے دن بالکل اداس رہتی ہیں۔''

''کیا تمہارے باپ کا انتقال ہو چکا ہے؟''

''اگر وہ زندہ ہوتے تو ہمیں اکیلا کیوں رہنا پڑتا۔''

پروین افسردہ ہو گئی۔

بختیار ان دونوں میں سے ایک لباس اپنے جسم سے ناپنے لگا۔

''یہ آٹھ نو سال پرانے ہیں۔'' پروین نے بتایا۔ ''لیکن ابا نے بس سال بھر ہی پہنے تھے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا تھا۔''

بختیار کا دھیان کپڑوں کی طرف تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کپڑے اس کے جسم پر قدرے تنگ رہیں گے۔

''تم جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہو۔'' پروین پھر بولی۔

بختیار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اب اسے یقین بھی ہو گیا کہ پروین تھوڑی بہت پڑھی ہوئی ضرور تھی۔ بالکل ان پڑھ لڑکیاں عموماً نہیں جان سکتیں کہ جیل کے قیدیوں کا لباس کیسا ہوتا ہے۔ پروین یہ بات جانتی تھی ورنہ وہ جیل سے اس کے فرار کی بات نہ کرتی۔

''لیکن تم بہت برے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔'' وہ پھر بولی۔

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟'' بختیار نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میں اس کمرے میں تمہارے ساتھ اکیلی ہوں لیکن تم نے بدتمیزی کی ایک بات بھی نہیں کی۔'' پروین نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میرے محلے کی تو یہ حالت ہے کہ باہر نکلتی ہوں تو لڑکے سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔''

''اچھا اب دوسری طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔ میں کپڑے بدل لوں، مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ تمہاری موجودگی میں کپڑے بدلوں لیکن مجبوری ہے۔''

''میں نے ابھی کہا تھا نا! تم بہت برے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔'' پروین نے کہا اور دوسری طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

بختیار نے کپڑے تبدیل کیے۔ وہ اس کے جسم پر تنگ تو تھے لیکن اتنے نہیں جتنا اس نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ ان کپڑوں میں خود کو کسا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''اب تم میری طرف مڑ سکتی ہو۔'' بختیار نے پروین سے کہا۔

پروین مڑی اور اس پر بس ایک نظر ڈالنے کے بعد بولی۔ ''اتنی دیر لگ گئی۔ اماں کو وہاں ہول آ رہا ہوگا۔''

''چلو، وہیں چلو۔''

''تم یہ دوسرا جوڑا بھی لے لو۔ تمہیں یہی چاہیے تھا نا!...... اب تمہیں جانا چاہیے ہمارے گھر سے! میں باہر کے دروازے کی کنڈی کھول دوں گی۔ تم ادھر ادھر دیکھ کر باہر نکل جانا۔''

''دوسرے کمرے میں چلو۔'' بختیار غرایا۔ ''اپنی ماں کے پاس۔''

پروین جس نے نہ جانے کیسے خود کو سنبھال لیا تھا، اس کے لہجے سے ایک بار پھر سہم گئی۔

بختیار کو خود اس بات سے تکلیف پہنچ رہی تھی کہ وہ ان ماں بیٹی سے کسی نہ کسی حد تک زیادتی کر رہا تھا لیکن اس کے حالات اسے اس کے لیے مجبور کر چکے تھے۔ اس نے مستقبل میں جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہو، کرے۔

پروین کے ساتھ وہ باہر نکلا۔ اب صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ گلی میں قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ اسی وقت کسی نے زور سے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا جو صحن ہی میں تھا۔

بختیار کے اعصاب میں تناؤ آ گیا۔

''دودھ والا تو اتنی جلدی نہیں آتا۔'' پروین بڑبڑائی۔

''آسیہ خالہ!'' باہر سے آواز آئی۔

''تمہی جواب دو! پوچھو کون ہے؟'' بختیار نے سختی سے لیکن سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔

''اماں سو رہی ہیں ابھی بابو چاچا!'' پروین نے آواز سے محلے کے اس شخص کو پہچان لیا تھا جس نے آواز دی تھی۔

''یہ تمہارے صحن کی دیوار کے پاس بھورے خان کے گھر کی اینٹیں رکھ کر چبوترا سا بنا ہوا ہے۔'' آواز آئی، پھر

ہنس کر کہا گیا۔ ”یہ اپنا جمیل ہے نا، یہ کہہ رہا تھا، کوئی چور نہ گھسا ہو آسیہ خالہ کے گھر میں!“

”یہاں کوئی کیا چرانے آئے گا بابو چاچا!“ پروین نے جواب دیا۔

”میں نے بھی یہی بولا تھا جمیل سے......! رات کو محلے کے دو ایک لونڈوں نے وہاں بیٹھ کر گپیں ہانکنے کے لیے بنایا ہوگا وہ چبوترا۔“

”ہاں بابو چاچا! رات کو ادھر سے کچھ آوازیں تو آرہی تھیں۔“

ہنسنے کی آواز آئی اور پھر دو افراد کے قدموں کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔

بختیار نے محسوس کیا تھا کہ پروین اس سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ تھی۔ اس نے اس کی ہدایت کے بغیر ”بابو چاچا“ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں پہنچے۔

”میں آگئی اماں!“ پروین بولی۔

”چلا گیا وہ؟“ آسیہ خالہ نے بے تابی سے پوچھا۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔ ”عجیب چور تھا، ایک جوڑا کپڑا لینے کے لیے گھسا تھا ہمارے گھر میں۔“

پروین نے بختیار کی طرف دیکھا۔

”میں ابھی یہیں ہوں بڑی بی!“ بختیار بولا۔

آسیہ خالہ چونک گئی۔

”تم دونوں ناشتا تو کرو گی۔“ بختیار نے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ زیادہ نہ ہو لیکن ایک پیالی چائے کی گنجائش تو نکل آنا چاہیے۔“

”ارے اب ہمارا پیچھا چھوڑ دے بھیا!“ آسیہ خالہ نے کسی قدر جھنجلائے اور کسی قدر التجائیہ انداز میں کہا۔ ”تجھے کپڑے چاہیے تھا نا! وہ مل گئے تجھے! یہ سلائی کی مشین لے جانا چاہتا ہے تو یہ بھی لے جا! پیچھا چھوڑ دے اب ہمارا۔“

لیکن بختیار کچھ اور ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ صرف جیل کے لباس سے چھٹکارا اسے قانون کی نظر سے نہیں بچا سکتا۔ ضروری تھا کہ وہ اپنی وضع قطع میں تبدیلی کرتا جو فی الحال صرف اسی طرح ہو سکتی تھی کہ وہ اپنا شیو اتنا بڑھا لے کہ چھوٹی سی ڈاڑھی بن جائے۔ اس عرصے میں سر کے بال بھی بڑھ جاتے اور مونچھیں بھی نکل آتیں...... یہ سب کچھ کرنے کے لیے اس نے کچھ دن اسی گھر میں رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ ماں بیٹی اس کے لیے بے ضرر ثابت ہو سکتی تھیں۔ کسی جگہ کچھ دن گزارنے کے لیے اسے اس گھر کے دو افراد سے بہتر لوگ کہیں نہیں مل سکتے تھے۔

بختیار نے بھی آسیہ خالہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ پروین کمرے کے اس گوشے کی طرف بڑھ گئی جہاں باورچی خانے کا سامان تھا اور دیوار سے ایک نل بھی نکلا ہوا تھا جس سے برتن دھوئے جا سکتے تھے۔

”آسیہ خالہ!“ بختیار نے پہلی مرتبہ ”بڑی بی“ کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ابھی میں کچھ دن تمہارا مہمان رہوں گا۔“

یہ بات سن کر پروین نے بھی چونک کر بختیار کی طرف دیکھا لیکن ایسا نہیں ہوا کہ دیکھتی رہ جاتی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے چائے کی کیتلی اٹھانے لگی۔

”نہ بھیا نہ!“ آسیہ خالہ بولی۔ ”تو ہماری سلائی مشین بھی لے جا مگر ہمارا پیچھا چھوڑ!“

”میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں آسیہ خالہ!“ بختیار نے بہ دستور نرم لہجے میں کہا۔ ”بس ایک مجبوری کی وجہ سے مجھے چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آنا پڑا۔ بس ایک جوڑے کپڑے کی ضرورت تھی مجھے۔ میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا، وہ بہت گندے ہوگئے تھے۔“

”تو ایک جوڑے کے لیے تجھے ہمارا ہی گھر ملا...... اور اب تو یہاں رکنا بھی چاہتا ہے، نہ بابا نہ! بس چائے پی اور چلا جا!“

”مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔“ بختیار نے لہجہ نرم ہی رکھا۔ ”کیا میں نے اب تک کوئی نقصان پہنچایا ہے تم دونوں کو؟“

”جان تو آدھی کر دی ہے۔“

”تم ماں بیٹی اتنی باتیں بھی اس لیے کر سکی ہو کہ میں نے جیب سے چاقو نکال کر دکھایا بھی نہیں! اگر میں ایسا کرتا تو تمہاری بیٹی کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تم دونوں کو۔“

”چپ ہو جاؤ اماں!“ پروین بول پڑی۔

آسیہ خالہ نے پہلو بدلا اور زیر لب کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ گھر میں اس کی ایک جوان بیٹی بھی ہے اور ایک اجنبی گھر میں گھس آیا ہے جس کا نہ جانے کیا ارادہ ہے۔

پروین نے چائے بنا کر اسے دی۔ پیالی کی طشتری میں ایک پاپا بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ بختیار کچھ استفسار کرتا، پروین بول پڑی۔ ''میں اور اماں ابھی چائے نہیں پی سکتے، یہ تھوڑا سا دودھ تھا کل کا بچا ہوا۔ اب دودھ والا آتا ہی ہوگا۔ اس کے بعد.....'' پروین کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ باہر سے کسی اسکوٹر کی آواز سنائی دی جو دروازے پر آکے رکی تھی۔ پروین اپنی بات ادھوری چھوڑ کر جلدی سے بولی۔ ''آ گیا دودھ والا۔'' اس نے ایک پتیلی اٹھائی۔ بختیار بھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے جلدی سے کھڑا ہوگیا تھا۔ پروین اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' بختیار نے کہا۔

''جب تم دودھ لینے کے لیے دروازہ کھولو گی تو میں آڑ میں کھڑا رہوں گا۔''

وہ فی الحال ان ماں بیٹی میں سے کسی پر بھی مکمل بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

پروین کچھ بولے بغیر کمرے سے نکلی۔ بختیار پیالی رکھ کر اس کے پیچھے ہولیا تھا۔ جب پروین دروازہ کھولنے لگی تو بختیار دروازے کی بائیں جانب دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا اور پروین کے چہرے پر نظر رکھے رہا۔

پروین دودھ لے کر دروازہ بند کرنے لگی۔ پھر وہ واپس کمرے کی طرف مڑی۔ اب بختیار اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''تم کسی کھاتے پیتے اچھے گھر کے لگتے ہو۔'' پروین بولی۔

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟''

''غریبوں میں تم جیسے تندرست اور اتنے خوب صورت لوگ نہیں ہوتے۔'' پروین بڑی سادگی سے کہہ گئی۔

''اچھا!'' بختیار خفیف سا مسکرایا۔ ''خوب صورت بھی ہوں میں؟''

''جیل کیوں گئے تھے؟'' پروین نے پوچھا اور کمرے سے چند قدم کے فاصلے ہی پر رک گئی۔ وہ ماں کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہتی ہوگی۔

''کسی نے سازش کرکے مجھے کسی کے قتل کے کیس میں پھنسایا تھا۔ میں اپنی صفائی میں کوئی ثبوت نہیں دے سکا اس لیے مجھے سزا سنادی گئی۔''

''جیل سے بھاگے کیسے؟''

اس سوال کا جواب بختیار نے سچ سچ لیکن بہت مختصر طور پر دیا۔

پروین نے پوچھا۔ ''کب تک بھاگتے رہو گے پولیس سے؟''

''مجھے بھاگنا نہیں، بس اس وقت تک چھپنا ہے، جب تک میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب نہ ہوجاؤں!''

''ہوجاؤ گے؟''

''مجھے یقین ہے۔''

کمرے سے آسیہ خالہ کی بلند آواز آئی۔ ''کہاں رہ گئی پروین؟''

''آرہی ہوں اماں!'' پروین نے جلدی سے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''چپل کا انگوٹھا ٹوٹ گیا تھا۔ اسے ٹھیک کرنے لگی تھی۔''

بختیار اس کے جھوٹ پر اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو آسیہ خالہ نے پوچھا۔ ''ٹھیک ہوگئی چپل؟''

''نہیں اماں!.....ٹنکے گی یہ۔'' پروین نے پھر جھوٹ بولا۔

بختیار نے چائے کی پیالی جہاں چھوڑی تھی، وہاں سے اٹھالی۔

پروین نے کیتلی میں پانی بھرا اور اسے ایک طرف رکھ کر دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھ دی۔ اس کا دماغ یقیناً الجھا ہوا تھا ورنہ وہ پہلے دودھ چولھے پر رکھتی، اس کے بعد پتیلی میں پانی بھرتی۔

ذہن بختیار کا بھی الجھ گیا تھا۔ دودھ لے کر واپس آتے ہوئے پروین ایک بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آئی تھی۔ اس نے اس طرح باتیں شروع کردی تھیں جیسے ''بن بلائے مہمان'' کو اس نے ذہنی طور پر قبول کرلیا ہو اور اب اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی ہو...... بختیار اس الجھن کا شکار بھی تھا کہ اس کے خیال کے مطابق اسے کچھ دن گزارنے کے لیے اس گھر سے زیادہ بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی لیکن کیا واقعی وہ وہاں رک کر محفوظ رہ سکتا تھا؟

کچھ دیر بعد بختیار اور پروین کو باتیں کرنے کا موقع اس وقت ملا جب آسیہ خالہ رفع حاجت کے لیے گئی۔ وہ جگہ کمرے کے برابر میں ذرا اندر کی طرف تھی۔

''جیل سے کب بھاگے تھے؟'' پروین نے پوچھا۔

''گیارہ بجے کے قریب جیل توڑی گئی تھی۔ اسی وقت بھاگا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ راستے میں ایک جگہ کنواں مل گیا تھا۔ وہاں سے پیاس بجھائی تھی ورنہ یہاں تک آتے آتے تو حلق میں کانٹے پڑ جاتے۔'' بختیار نے جواب دیا۔ پھر غور سے پروین کی

طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے بارے میں بہت زیادہ جان لینا چاہتی ہو۔''

''میں جان بھی چکی ہوں۔'' پروین نے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔

''کیا جان چکی ہو۔'' بختیار اسے گھورتا رہا۔ ''تم تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہو۔''

''ابا کا انتقال ہوا تو میں آٹھویں پاس کر چکی تھی رانا بختیار صاحب!''

بختیار اتنی شدت سے چونکا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''آپ کسی بینک میں منیجر تھے۔'' پروین نے دوسرا دھماکا کیا۔

بختیار کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔

''ماڈل گرل کا نام شبانہ تھا جو قتل ہوئی!'' پروین کا ایک اور دھماکا......

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوگیا!'' بختیار کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اور کیا جانتی ہو؟''

''بس اتنا ہی جانتی ہوں۔'' پروین نے جواب دیا۔ یہ ساری باتیں اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہی تھیں۔ وہ مزید بولی۔ ''میں نے تو پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ آپ کوئی برے آدمی نہیں ہیں۔ جب میں دودھ لے کر لوٹ رہی تھی تو آپ نے جو باتیں بھی کی تھیں، سچ سچ کی تھیں۔ جھوٹ نہیں بولا تھا۔''

اس گفتگو میں وہ یکا یک بختیار کو ''تم'' کہتے کہتے ''آپ، جناب'' پر آگئی تھی لیکن بختیار اس پر دھیان اس وقت دیتا جب پروین کے انکشافات کے دھماکے اسے کچھ اور سوچنے سمجھنے کی مہلت دیتے۔

''آپ جیسا آدمی کسی کو قتل کر ہی نہیں سکتا۔'' پروین اپنی رو میں کہتی چلی گئی۔ ابا کہا کرتے تھے، شریف لوگ اگر کسی مصیبت میں پڑ جائیں تو ان کی مدد کرنا چاہیے۔ میں بھی آپ کی مدد کروں گی جو بھی مجھ سے ہوسکے گی۔ آپ جب تک چاہیں، اس گھر میں چھپے رہیے۔ بالکل اطمینان سے! میں اماں کو سمجھا دوں گی۔ اب یہ چاقو واقو کی بات مجھ سے نہ کیجیے گا۔ آپ کے پاس چاقو نہیں ہوگا۔ یہ بات مجھے اور اماں کو ڈرانے کے لیے تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ خود کو چھپانے کے لیے خود آپ کو بھی خیال رکھنا ہوگا۔ جو عورتیں مجھ سے کپڑے سلواتی ہیں، ان کا آنا جانا رہتا ہے۔ جب میں ساتویں کلاس میں داخل ہوئی تھی تو میں نے سلائی کڑھائی کا کورس بھی کیا تھا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ابا کے مرنے کی وجہ سے وہ سب میرے کام آئے گا جو میں سیکھ رہی تھی۔''

''اچھی لڑکی!'' بختیار نے جھرجھراتی سی آواز میں کہا۔ ''تم نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ آخر تمہیں اچانک میرے بارے میں کئی باتیں کیسے معلوم ہوگئیں؟''

''اخبار سے۔'' پروین نے جواب دیا۔ ''دودھ والا اخبار بھی بیچتا ہے۔ اخبار اس کی اسکوٹر کے ہینڈل پر بندھے رہتے ہیں۔ میری نظر ایک خبر کی سرخی پر پڑ گئی تھی۔ جیل ٹوٹنے کے بارے میں لکھا تھا۔ فرار ہونے والوں میں بینک منیجر بختیار رانا کا نام بھی تھا اور ماڈل گرل شبانہ کی تصویر کے ساتھ آپ کی تصویر بھی تھی۔ چھوٹی سرخی میں لکھا تھا کہ آپ کو شبانہ کے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔''

پروین کے دھماکوں سے بختیار کے اعصاب میں جو تناؤ آیا تھا، وہ ختم ہوگیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی۔

''تم وہ خبر اور میری تصویر دیکھ کر چونکی نہیں تھیں۔ تمہیں اپنے اعصاب پر بہت قابو ہے۔''

پروین اب کچھ نہیں بولی۔ بختیار سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ پروین کا چہرہ کیا پیدائشی طور پر بے تاثر تھا؟

لیکن جب وہ اس مکان میں آیا تھا تو وہ اس سے خوف زدہ تو نظر آئی تھی۔

وہ کچھ رک کر بولی۔ ''جو عورتیں کپڑوں کی سلائی کے لیے آتی ہیں، میں انہیں اسی کمرے میں بٹھاتی ہوں جہاں سلائی مشین رکھی ہے۔ کبھی کوئی عورت اماں سے ملنے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اب میں اماں کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا کروں گی۔ آپ دوسرے کمرے سے اس وقت باہر مت نکلا کیجیے گا۔''

''پروین!'' آسیہ خالہ نے پکارا۔

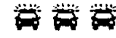
''آئی اماں!''

پروین کا سہارا لے کر آسیہ خالہ باہر نکلی اور کمرے تک آگئی۔

بختیار جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ پروین کے انکشافات کا پس منظر اگرچہ سامنے آچکا تھا، پھر بھی اس کی باتیں بختیار کے دماغ میں کچھ دیر تک سائیں سائیں کرتی رہیں۔

حالات بہرحال اب بہ ظاہر ایسے ہوگئے تھے کہ وہ کچھ دن اس گھر میں بے خوف و خطر گزار سکتا تھا۔ پروین اب قابل اعتماد بن چکی تھی، وہ اپنی ماں کو کس طرح سمجھاتی، یہ بختیار کا دردِ سر نہیں تھا مگر اسے امکان یہی نظر آرہا تھا کہ وہ

اپنی ماں کو سمجھانے میں ناکام نہیں رہے گی۔
آئندہ دو ایک دن میں یہ ثابت بھی ہو گیا۔ آسیہ خالہ اپنی زبان پر پھر کبھی ایسی کوئی بات نہیں لائی کہ وہ اب اس گھر کا پیچھا چھوڑ دے۔
سودا سلف کے لیے بھی پروین ہی کو گھر سے نکلنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ قفل لگا کر جاتی تھی۔ جب وہ پہلے پہل گھر سے گئی تھی تو بختیار قدرے وسوسے کا شکار رہا تھا کہ پروین کسی کو اس کے بارے میں بتا نہ دے مگر دو تین روز کے بعد اسے مکمل اطمینان ہو گیا۔
بختیار کے لیے وہ ایک عجیب لڑکی اس اعتبار سے بھی ثابت ہوئی تھی کہ اس نے ایک بار بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ بختیار ماڈل گرل شبانہ کے قتل میں کیسے پھنس گیا تھا لیکن بختیار کے دماغ میں اپنے ماضی کے وہ واقعات چکراتے ہی رہتے تھے۔



یہ بختیار کی زندگی کا المیہ تھا کہ وہ جس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا، وہ لڑکی کسی اور کو چاہتی تھی۔ لڑکی کا نام فروزاں تھا۔ وہ بینک کے وائس پریذیڈنٹ عبداللہ خان کی بیٹی تھی۔
بختیار نے بہت کم عمری میں ترقی کی منازل طے کی تھیں۔ وہ اکیس سال کی عمر میں کلرک کی حیثیت سے بینک میں ملازم ہوا تھا اور پچیس سال کا ہونے تک منیجر بن گیا تھا۔ ابتدا میں اسے ایک چھوٹی سی برانچ ملی تھی۔ پھر دو سال گزرتے گزرتے اسے ایک بہت بڑی برانچ کا منیجر بنا دیا گیا۔ اسی برانچ کی اوپری منزل پر اس کے بینک کے وائس پریذیڈنٹ عبداللہ خان بیٹھا کرتے تھے۔
وہ بختیار کو اس وقت سے جانتے تھے جب وہ منیجر بنا تھا۔ پھر جب وہ بڑی برانچ میں آیا اور قربت بڑھی تو عبداللہ خان اسے پہلے سے زیادہ پسند کرنے لگے۔ ابتدا میں انہیں بختیار کی صرف صلاحیتوں کا علم تھا، قربت ہوئی تو انہوں نے جانا کہ وہ ایک اچھا انسان بھی تھا۔ عبداللہ خان خود بھی ایک اچھے انسان تھے۔
فروزاں انہی کی بیٹی تھی جو اس وقت تعلیم کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنے والد سے ملنے بینک آیا کرتی تھی۔ اوپر کی منزل تک جانے کے لیے بینک کے اندر آنا ضروری تھا۔ اسی لیے بختیار نے اس بینک کا منیجر بننے کے بعد تیسرے ہی دن اسے دیکھ لیا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔
ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ بختیار نے ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی پہلے کبھی نہ دیکھی ہو لیکن ایسا حسن اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جسے ''سوگوار حسن'' بھی کہا جا سکتا۔ فروزاں کے خوب صورت چہرے پر بہ قول شاعر، اداسی بال کھولے سو رہی تھی۔
جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بختیار چونکا۔ اسے خیال آیا کہ کسی لڑکی کو اس طرح تکتے رہ جانا ایک غیر مہذبانہ حرکت تھی۔ بختیار نے اپنے کیبن کے شیشوں سے بینک میں کام کرنے والوں کا طائرانہ جائزہ لیا۔ تو اسے بینک کے کیشئر رندھاوا کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ کن انکھیوں سے بختیار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بختیار کو ادھر ادھر نظریں دوڑاتے دیکھا تو سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
بختیار اس وقت اپنے کیبن میں اکیلا تھا، اس کے سامنے میز پر ایک کلائنٹ کی درخواست تھی جس میں اوورڈرافٹ کے لیے لکھا گیا تھا۔ بختیار دوبارہ اس درخواست کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکا۔ اس کے ذہن میں فروزاں چکراتی رہی جس کے نام تک سے بھی وہ اس وقت واقف نہیں تھا۔
آدھے گھنٹے بعد اس نے فروزاں کو واپس جاتے دیکھا۔ مزید آدھے گھنٹے بعد ایک بجے بینک کے دروازے بند کر دیے گئے۔
رندھاوا کو بختیار نے اپنے کیبن کی طرف آتے دیکھا۔ ان دونوں کے تعلقات خاصے پرانے تھے۔ بختیار جب بینک کی ایک برانچ میں کلرک تھا، وہاں بھی رندھاوا کیشئر ہی تھا۔ اس میں بینکاری کی صلاحیت نہیں تھی یا شاید کوئی اور سبب ہو، وہ بہرحال ترقی نہیں کر سکا تھا۔ اس کی عمر بختیار سے دس سال زیادہ تھی۔
اس کا تبادلہ کئی برانچوں میں ہوتا رہا تھا لیکن اس دوران میں بختیار سے اس کی ملاقاتیں رہی تھیں۔ اب بختیار اس برانچ میں منیجر کی حیثیت سے آیا تھا جہاں رندھاوا کو کام کرتے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔
''آؤ رندھاوا!'' بختیار نے اس سے نظریں ملائے بغیر قدرے جھینپے ہوئے انداز میں کہا۔
''شرما کیوں رہے ہو۔'' رندھاوا ہنستا ہوا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔
''میں تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔'' بختیار نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھی ہوئی درخواست کی طرف اشارہ کیا۔

''ابھی اس پر بھی بات کرلیں گے۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''میں تمہیں اس لڑکی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ تیسرے چوتھے دن آتی رہتی ہے اور اس کے آنے کا وقت یہی ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ تم اسے اس طرح مت تکنا۔ اگر بات بڑے صاحب تک پہنچ گئی تو تمہارے بارے میں ان کی رائے تبدیل ہوسکتی ہے۔ اب تک تو وہ تمہارے خاصے گرویدہ ہیں۔ وہ لڑکی......''

''کوئی بڑی اکاؤنٹ ہولڈر ہے!'' بختیار نے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''اس کا نام فروزاں ہے اور وہ ہمارے بڑے صاحب کی بیٹی ہے۔''

بختیار چونکا۔ ''عبداللہ صاحب کی بیٹی؟''

رندھاوا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر بولا۔ ''پچھلی سڑک پر جو کالج ہے، اسی میں پڑھتی ہے، جب وہ آتی ہے، اس وقت اس کا کوئی پیریڈ شاید خالی ہوتا ہو، یا سبب کچھ بھی ہو، وہ آتی اسی وقت ہے۔''

''خیر چھوڑو!'' بختیار نے کہا۔ ''اس پر میری نظریں ٹک گئی کہ ایسے حسین چہروں پر میں نے ایسی اداسی کبھی نہیں دیکھی۔ کیا اس کے ساتھ کوئی المیہ ہوگیا ہے؟''

''خیر چھوڑو؟'' رندھاوا معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یہ بھی کہہ رہے ہو اور پھر اسی کے بارے میں سوال بھی کررہے ہو۔ خیر! میں بھی کہہ دیتا ہوں کہ خیر چھوڑو، لیکن بتا دیتا ہوں کہ اس کے ساتھ ہرگز کوئی المیہ نہیں ہوا۔ اس کے نقش ونگار ہی ایسے ہیں کہ وہ اداس نظر آتی ہے۔''

دوسری مرتبہ ''خیر چھوڑو'' کہتے وقت بختیار نے سنجیدگی سے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فروزاں کا خیال ذہن سے جھٹک دے گا۔ وہ سنجیدگی سے رندھاوا سے اس درخواست کے بارے میں بات کرنے لگا جو اس کے سامنے رکھی تھی۔ لیکن وہ سنجیدگی بس اتنی دیر کی تھی جتنی دیر رندھاوا اس کے کیبن میں رہا۔ رندھاوا کو رخصت کرتے ہی فروزاں پھر اس کے تصور میں آگئی۔ نہ صرف اس وقت بلکہ آئندہ دو تین دنوں میں بھی ایسا ہوتا رہا کہ فروزاں اس کے تصور میں ابھری اور وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

چوتھے دن اس نے فروزاں کو ایک بار پھر بینک میں آتے دیکھا۔ اس موقع پر اس نے خود کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ وہ فروزاں کو تکتا رہ جاتا، البتہ اس نے فروزاں پر دو تین مرتبہ اچٹتی سی نظر بہرحال ڈالی تھی۔

''یہ تو شاید کچھ اور ہی معاملہ ہوگیا ہے آپ کے ساتھ بختیار صاحب!'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

آنے والے دنوں میں فروزاں کے بارے میں اس کی سوچ بہ تدریج شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کے دل میں یہ خواہش اٹھنے لگی کہ وہ فروزاں سے ملے۔

تین دن بعد جب فروزاں کے آنے کی توقع تھی، بختیار اس کی آمد کے وقت سے ذرا پہلے ایک فائل لے کر اس پر بات کرنے کے بہانے عبداللہ خان کے پاس پہنچ گیا۔

گفتگو پانچ منٹ ہی جاری رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر فروزاں اندر آئی۔ اس نے باپ کو سلام کیا اور بختیار پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

''آؤ بیٹی! بیٹھو!'' عبداللہ خان نے کہا، پھر بختیار سے بولا۔ ''کافی تو منگاؤ بختیار!...... ہماری بیٹی کو کافی...... اوہ! میں تم دونوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ تو تم سمجھ ہی گئے ہوگے کہ یہ میری بیٹی ہے، فروزاں اور فروزاں! یہ ہیں بختیار، اس برانچ کے منیجر! نہایت ذہین اور ہونہار نوجوان!''

''ہائے!'' فروزاں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''ہیلو!'' بختیار بھی مسکرایا۔

اس نے کبھی کبھی فروزاں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے اداس حسن کے لیے ''زرد گلاب'' کی تمثیل سوچی تھی لیکن اس وقت وہ مسکرائی تو یوں لگا جیسے زرد گلاب یکا یک سرخ ہوگیا ہو۔ اداسی اس کے چہرے سے غائب ہوگئی تھی۔

بختیار نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کسی کو دو پیالی کافی لانے کی ہدایت کی۔

عبداللہ خان بول پڑے۔ ''اپنے لیے بھی منگاؤ بختیار!''

''جی نہیں سر!'' بختیار بولا۔ ''آپ سے اس فائل پر جتنی بات ہوچکی ہے، اس سے ہی میں نے پورا معاملہ سمجھ لیا ہے۔ اب میں نیچے جاؤں گا، کچھ اور کام دیکھنا ہیں۔'' وہ فائل لے کر کھڑا ہوگیا۔ وہ عبداللہ خان پر یہ تاثر ذرا بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ وہاں اس کی بیٹی کی وجہ سے رکا ہے، حالانکہ اس کا دل یہی چاہ رہا تھا۔ اس کی یہ خواہش عبداللہ خان نے پوری کردی اور اسے بہ اصرار روکا۔

بختیار نے دوبارہ انٹرکام اٹھا کر تین پیالی کی ہدایت کردی۔

عبداللہ خان مسکراتے ہوئے بولے۔ ''میں نے اپنی بیٹی سے تمہاری تعریف تو کردی۔ اب تمہیں اپنی بیٹی کے بارے میں بھی تو بتاؤں۔ اسے مصوری کا شوق ہے، آرٹس کونسل باقاعدگی سے جاتی ہے۔ یہ مستقبل میں اچھی مصور ثابت ہوگی۔''

''ماشاءاللہ!'' بختیار نے فروزاں کی طرف دیکھتے ہوئے بہ ظاہر اس کے مصور ہونے کی لیکن دراصل اس کے حسن کی تعریف کی تھی، پھر کسی خیال کے تحت اس نے کہا۔ ''فائن آرٹس سے کچھ دلچسپی مجھے بھی ہے۔''

''تو تم بھی آرٹس کونسل کے ممبر بن جاؤ۔'' عبداللہ خان نے کہا اور پھر اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''کیا خیال ہے بیٹی؟''

''جی ہاں ڈیڈی! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہاں فائن آرٹس کے ہر شعبے سے متعلق لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔'' فروزاں اس وقت سرخ گلاب بنی ہوئی تھی۔ ''میں انہیں ممبر شپ کا فارم لادوں گی۔''

''گڈ!'' عبداللہ خان نے سر ہلایا، پھر بختیار کی طرف متوجہ ہوا۔ ''یہ ٹھیک رہے گا نا؟''

بختیار کے لیے یہ ''ٹھیک'' نہیں ''بہت ٹھیک'' تھا۔ اس نے فائن آرٹس سے اپنی دلچسپی کا اظہار اسی لیے کیا تھا کہ بات کچھ آگے بڑھ سکے۔

کافی پینے تک مصوری ہی کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ بختیار نے خود تو کبھی کوئی ایک رنگین لکیر بھی نہیں کھینچی تھی لیکن مصوری پر اس نے کتابیں ضرور پڑھی تھیں اس لیے اس موضوع پر باتیں کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔

کافی پینے کے بعد بختیار عبداللہ خان کے کمرے سے نکل آیا۔ فروزاں سے باتیں کرکے وہ بہت خوشی محسوس کررہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب فروزاں رخصت ہورہی تھی تو وہ بختیار کے کیبن کے شیشوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر سرخ گلاب بنی۔

رندھاوا نے بھی اسے بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت نہ جانے کیوں وہ سنجیدہ ہی رہا حالانکہ اپنے مزاج کے مطابق اسے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بختیار کی طرف دیکھنا چاہیے تھا۔ چند دن بعد ہی فروزاں نے اسے آرٹس کونسل کا ممبر بنوادیا۔ بختیار نے روزانہ شام کو آرٹس کونسل جانا شروع کردیا۔ فروزاں سے روز ملاقاتیں ہونے لگیں جس سے بختیار کے مزاج کی بالیدگی میں اضافہ ہوتا رہا۔ آرٹس کونسل میں اس کی ملاقاتیں اور لوگوں سے بھی ہوتی رہیں۔ ان لوگوں میں ایک ماڈل گرل شبانہ بھی تھی جس نے ایک فلم میں کوئی چھوٹا موٹا رول بھی کیا تھا۔ اس نے بختیار سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن بختیار خوش اسلوبی کے ساتھ اس سے اپنا دامن بچاتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ شبانہ ماڈل گرل ہونے کے ساتھ کچھ اور بھی تھی۔

''یہ آپ اچھا کررہے ہیں بختیار صاحب کہ شبانہ سے بچے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ایک دن فروزاں نے اس سے کہا۔ ''یہاں آنے والے سبھی اچھے لوگ اس سے بچتے ہیں۔ جو اس سے بے تکلف ہوتے ہیں، وہ ٹھرکی قسم کے ہوتے ہیں۔''

بختیار کو فروزاں کے منہ سے ''ٹھرکی'' کا لفظ اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔

وقت گزرتا رہا۔ ان دونوں کی بے تکلفی اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنی نجی زندگی کے بارے میں بہت کچھ تو نہیں مگر کچھ نہ کچھ بتادیا۔ بختیار کو اس سے اظہار محبت کرنے کی ہمت ابھی نہیں ہوسکی تھی لیکن بختیار نے بے صبری اس لیے بھی نہیں کی کہ ابھی بہت وقت پڑا تھا۔ کسی وقت فروزاں نے ایسی بات کہی تھی جس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ گریجویشن سے پہلے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بختیار ایک دن اپنے کیبن میں تنہا تھا اور کچھ فیگرز چیک کررہا تھا کہ ''ہیلو'' کی آواز نے اسے چونکادیا۔

شبانہ اتنی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آئی تھی کہ بختیار کو اس کی آمد کا علم اس کی آواز سے ہوا تھا۔

''آیئے مس شبانہ!'' بختیار کو منیجر کی حیثیت سے پیشہ وارانہ انداز میں مسکرانا پڑا۔

''میں آپ کی برانچ میں اکاؤنٹ کھولنا چاہتی ہوں۔'' وہ اپنے پرس سے ہزار ہزار کے نئے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''پہلے آپ کا اکاؤنٹ کہاں تھا؟'' بختیار نے پوچھا۔

''وہ اب بھی ہے۔'' شبانہ نے جواب دیا۔ ''لیکن یہاں اکاؤنٹ میں اس لیے کھلوانا چاہتی ہوں کہ یہ میرے گھر سے کچھ قریب ہے۔''

بختیار چاہتا تو یہ کام بینک کے کسی اور آدمی کے سپرد کرکے شبانہ کو اپنے کیبن سے ٹال سکتا تھا لیکن اس نے یہ

انداز اختیار کر کے شبانہ کو کھسیانے کا موقع دینا مناسب نہیں سمجھا، اس نے شبانہ سے فارم بھروایا۔ گارنٹر کی حیثیت سے فارم پر خود دستخط کر دیے۔ سلپ بھر کے پیسے بھی جمع کروائے، سلپ بھی وہیں آ گئی۔

''چائے نہیں پلوائیں گے؟'' شبانہ اٹھلائی۔

''ہاں ہاں ضرور۔'' بختیار کو کہنا پڑا۔

اس نے شبانہ کے لیے چائے منگوائی لیکن اخلاقاً اس کے ساتھ شریک نہیں ہوا۔ چائے آنے تک شبانہ نے آرٹس کونسل میں آنے والے کچھ لوگوں کی بات چھیڑ دی۔ بختیار نے محسوس کر لیا کہ شبانہ اس کے کیبن میں زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہے۔

جس وقت چائے آئی، کسی کا فون آ گیا۔ بختیار نے ریسیور اٹھایا، فون کسی اکاؤنٹ ہولڈر کا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم میں بات ختم ہو گئی لیکن بختیار ریسیور کان سے لگائے خوامخواہ اس طرح بولتا رہا جیسے بہت اہم گفتگو ہو رہی ہو۔

چائے پیتے ہوئے شبانہ کے چہرے سے اکتاہٹ اور کسی قدر جھنجلاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ اسے بختیار سے باتیں کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بختیار نے اس وقت ریسیور رکھا جب شبانہ چائے پی چکی تھی۔

''بعض لوگ فون پر بھی اتنی دیر تک اٹکے رہتے ہیں۔'' وہ خوامخواہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اور کلائنٹ اہم ہو تو اس کی باتیں سننا ہی پڑتی ہیں۔ اس نے ایک کام بھی ایسا بتا دیا ہے کہ مجھے فوراً اس بارے میں بات کرنے کے لیے صاحب کے پاس جانا پڑے گا۔'' وہ ایک فائل نکالتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''میری یہ بداخلاقی معاف کر دیجیے گا مس شبانہ...... ! ملازمت میں یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں......'' شبانہ زبردستی مسکرائی۔ ''اب میں بھی بس چلوں گی۔''

''آئیے!'' بختیار نے آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھولا، پھر اس کے پیچھے خود بھی باہر نکلا۔

جب وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی تو بختیار رندھاوا کی میز کے قریب گیا۔ مقصد ذرا سا وقت گزارنا تھا۔

''کیسا کام جا رہا ہے رندھاوا؟''

''میرا کام تو ٹھیک جا رہا ہے لیکن......'' اس نے آواز دھیمی کی۔ ''یہ شبانہ بڑی حرافہ ہے۔''

''جانتے ہو اسے؟''

''میں اس شہر کے ہر نیک نام اور بدنام شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوں۔ ذرا بچ کے رہنا اس سے!''

''جتنا بچ سکتا ہوں، بچتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟ کیا پہلے بھی......''

''یہ آرٹس کونسل میں بہت آتی ہے۔''

''پھر تو جناب، قبلہ بختیار صاحب! بہت چوکنا رہیے گا۔''

بختیار نے مسکرا کر رندھاوا کے کندھے پر تھپکی دی اور اپنے کیبن میں لوٹ آیا۔

دو دن بعد شبانہ چیک بک لینے آئی۔ اس دن بھی اس نے بختیار سے چپکنا چاہا لیکن بختیار کسی نہ کسی طرح اسے ٹالنے میں کامیاب ہو گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ فروزاں فائنل ایر میں آ گئی۔ بختیار نے اب تک اس سے اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف شبانہ نے اس کی جان نہیں چھوڑی تھی۔ بختیار کے گریزپا ہونے کے باوجود وہ چیک کیش کرانے یا کسی بہانے سے بینک آ کر اس کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتی تھی۔

ایک دن اس نے کہا۔ ''ایک پریشانی میں پڑ گئی ہوں بختیار!''

وہ خود ہی اتنی بے تکلف ہوئی تھی کہ اس نے ''بختیار صاحب'' کہنا چھوڑ دیا تھا۔

''کیسی پریشانی؟'' بختیار نے پوچھا۔

''میں ایک کاروبار شروع کرنا چاہتی ہوں، اسی ادارے کے نام سے ایک اکاؤنٹ اور کھولوں گی۔ اس کے لیے آپ بیس لاکھ کا اوورڈرافٹ منظور کروا دیجیے گا۔''

''پہلے آپ کام تو شروع کیجیے!''

''اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔''

''تب تو آپ کا یہ کام ہونا ممکن نہیں۔''

''اچھا تو میرے ہی اکاؤنٹ کے لیے او ڈی منظور کرا دیں۔ میرا اکاؤنٹ تو خاصا پرانا ہو گیا ہے۔''

''زیادہ پرانا تو نہیں ہوا، اور پھر آپ کا ٹرانزکشن بھی اتنا نہیں رہا کہ بیس لاکھ کا اوورڈرافٹ منظور کروایا جا سکے۔''

''آپ چاہیں تو کروا سکتے ہیں۔'' شبانہ نے ایک ادا سے کہا۔ ''بینک منیجر یہ سب کچھ کروا سکتا ہے۔''

''میں نے اگر آؤٹ آف دی وے جا کے اس قسم کے کام کروانا سیکھا ہوتا تو آج اتنی بڑی برانچ کا منیجر نہ ہوتا۔''

''پلیز بختیار!'' شبانہ اٹھلائی۔ ''میری خاطر!''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔''

یہ جملہ ٹالنے کے عمل کا ایک حصہ تھا جو بختیار کی ہوشیاری سے مہینوں پر محیط ہو گیا۔

فروزاں سے ملاقاتیں برابر جاری تھیں۔ ایک شام وہ دونوں آرٹس کونسل کی کینٹین میں ایک میز پر بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے، ان کے ساتھ کوئی تیسرا نہیں تھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ان دونوں میں بھی اتنی بے تکلفی ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کہنے لگے تھے۔

''ہم بڑے اچھے دوست تو بن گئے ہیں۔'' بختیار نے مسکرا کر کہا۔ اس روز اس نے دل کی بات کہنے کی ٹھان لی تھی۔

''یقیناً۔'' فروزاں بھی مسکرائی۔ ''یہاں میرے کئی اچھے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔''

''لیکن دوسروں نے تمہارے بارے میں اس طرح نہیں سوچا ہوگا جس طرح میں سوچتا رہا ہوں۔''

''یعنی؟'' فروزاں سنجیدہ ہوگئی۔

''اب تم زرد گلاب نظر آرہی ہو۔''

''کیا مطلب!''

''تمہارے نقوش عجیب وغریب ہیں فروزاں!'' بختیار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جب تم سنجیدہ ہوتی ہو تو اداس نظر آنے لگتی ہو حالانکہ سنجیدگی اور اداسی دو مختلف چیزیں ہیں۔ پھر جب مسکراتی ہو، یا خوشگوار انداز میں باتیں کرتی ہو تو وہ اداسی غائب ہوجاتی ہے۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو تمہاری اداسی کو دیکھ کر میرے تصور میں زرد گلاب ابھر آیا تھا، اور پھر جب تم مسکرائی تھیں تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے گلاب کی زردی سرخی میں بدل گئی ہو...... تمہاری یہی کشش تو ہے کہ میں تمہارے قریب ہوتا چلا گیا ہوں۔''

''بہتر ہوگا کہ آئندہ اتنا زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہ کرنا۔'' فروزاں نے حد درجہ سخت اور کھردرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ فوراً ہی اٹھ کر اس طرف بڑھتی چلی گئی جہاں آرٹس کونسل میں آنے والے اپنی کاریں کھڑی کیا کرتے تھے۔

بختیار دم بخود رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے فروزاں اس کے منہ پر تھپڑ رسید کرگئی ہو۔ بختیار جب دم بہ خود رہ جانے والی کیفیت سے نکلا تو اس کے چہرے پر اداسی تھی۔

دوسرے دن وہ اداسی اس کے چہرے پر اس وقت بھی تھی جب وہ بینک میں کام کررہا تھا۔ دوسروں نے اس میں یہ تبدیلی محسوس کی ہو یا نہ کی ہو لیکن رندھاوا نے متعدد بار اسے معنی خیز انداز میں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوئی بات کرنے بختیار کے کیبن میں نہیں آیا۔

شام کو بختیار آرٹس کونسل گیا۔ فروزاں سے آمنا سامنا ہوا تو ''ہیلو ہائے'' بھی ہوئی۔

پھر آئندہ چند دن بھی اسی طرح گزرے۔ اگر کبھی وہ دونوں کچھ اور لوگوں کے ساتھ ہوتے تو ان میں سرسری سی باتیں بھی ہوجاتیں۔ فروزاں کا وہ کھنچاؤ بختیار نے شدت سے محسوس کیا۔ اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے آرٹس کونسل جانا بھی کم کردیا۔ فروزاں کے رویے نے اسے اتنا دل برداشتہ کیا تھا کہ اس کی اداسی بڑھتی چلی گئی۔

عبداللہ خان سے ملاقات کرنے کے لیے فروزاں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا تھا لیکن اب اس میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ پہلے وہ آتی تھی تو اوپر جاتے جاتے بختیار کے کیبن کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار مسکراتی ضرور تھی لیکن اب مسکرانا تو کیا، وہ کیبن کی طرف اچٹتی سی نظر بھی نہیں ڈالتی تھی۔

ایک دن بختیار نے رندھاوا کو اپنے کیبن میں بلایا۔ رندھاوا آکر سنجیدگی سے بیٹھ گیا۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ بختیار اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا تھا۔

''تم شراب پیتے ہو نا رندھاوا؟''

رندھاوا چونک گیا۔ ''یہ تو تم خود جانتے ہو......! لیکن میں زیادہ پینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بس رات کو کھانے سے پہلے دو پیگ لیتا ہوں۔''

''میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ تم کتنی پیتے ہو۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم لاتے کہاں سے ہو؟''

''میں نہیں لاتا۔ ایک مہربان ہیں۔ وہ دے دیتے ہیں، میرے لیے ایک بوتل ہفتے بھر کے لیے کافی ہوتی ہے۔'' جواب دیتے ہوئے رندھاوا کے چہرے سے الجھن آشکارا تھی۔

بختیار نے پوچھا۔ ''اپنے مہربان سے زیادہ نہیں منگواسکتے؟''

''منگواسکتا ہوں...... مگر کیوں؟''

''مجھے چاہیے۔''

رندھاوا نے طویل سانس لی۔ ''چوٹ کھا گئے......؟ ہاں یہ تو ہونا ہی تھا۔ مجھے بہت کم امید تھی کہ وہ بدل جائے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''دل ہار بیٹھے تھے نا فروزاں کو دیکھ کر؟''

بختیار چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
''آرٹس کونسل بھی جانے لگے تھے۔'' رندھاوا نے کہا۔''وہ تمہارے کیبن کی طرف دیکھ کر مسکرانے بھی لگی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ شاید تمہاری وجاہت اس کی جذباتیت کا دھارا موڑ دے اس لیے میں نے پہلے سے کچھ بتا کر تمہارا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔''
''کیا نہیں بتایا تم نے؟'' بختیار نے پہلو بدلا۔
''کنور ثقلین کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ کچھ دنوں سے اخبارات میں اس کا نام خاصا آنے لگا ہے۔ وہ سیاست کے میدان میں کود رہا ہے۔ جانتے ہو کچھ اس کے بارے میں؟''
''ہاں۔'' بختیار نے کہا۔''وہ شمالی پہاڑی علاقے کی ایک چھوٹی سی ریاست کے والی کا بیٹا ہے۔ اس نے سوشل کام بھی بہت کیے ہیں۔''
''صرف شہرت کے لیے۔'' رندھاوا نے تلخی سے کہا۔''باپ کی موت کے بعد بے تحاشا دولت کا مالک بن گیا ہے۔ سوشل کاموں میں شہرت حاصل کرنا اس کی منصوبہ بندی تھی۔ وہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ نواحی علاقے میں غریبوں کے لیے ایک بستی بھی بنوائی تھی اس نے! ثقلین آباد کا نام تم نے سنا ہی ہوگا۔''
''تم ان تفصیلات میں کیوں جا رہے ہو؟ اصل بات بتاؤ مجھے۔''
''وہ اسے چاہتی ہے۔''
''فروزاں؟'' بختیار چونکا۔
''اور کس کی بات ہو رہی ہے!''
بختیار کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔''پھر تو......'' وہ جھرجھراتی ہوئی سی آواز میں بولا۔''پھر تو ٹھیک ہے۔''
''کیا ٹھیک ہے۔''
''وہ پہلے ہی سے کسی کو پسند کرتی ہے، یا تمہارے الفاظ کے مطابق اسے چاہتی ہے تو پھر اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ مجھے ٹھکرا دے۔ اگر تم مجھے پہلے سے یہ بات بتا دیتے تو عین ممکن تھا کہ میں خود کو سنبھال لیتا۔''
''میں نے یہ سوچا تھا نا کہ شاید تمہاری وجاہت اسے بدل دے...... تم غیر معمولی طور پر وجیہہ ہو۔ کیا تمہیں اس کا احساس نہیں؟''
''محبت صرف وجاہت سے نہیں ہوتی۔'' بختیار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔''وہ کنور ثقلین سے محبت کرتی ہے تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں اس کی راہ میں دیوار بنوں۔''

''حق پہنچے یا نہ پہنچے۔'' رندھاوا نے زور دے کر کہا۔ ''تمہیں اگر اس سے محبت ہے تو اس کے راستے کی دیوار ضرور بنو۔''

''یہ تو میری خودغرضی ہوگی۔''

''نہیں۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''یہ تمہاری محبت کا تقاضا ہوگا کہ تم اسے تباہی سے بچاؤ۔''

''تباہی؟'' بختیار الجھا۔

''ہاں۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''کنور ثقلین ہر اعتبار سے اوباش ہے۔ شرابی، جواری، عورتوں کا رسیا! ریس کورس وہ جاتا ہے۔ چوری چھپے چلنے والے جوئے کے اڈوں میں اس کے قدم پہنچتے ہیں۔ وہ فروزاں سے شادی نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے کر بیٹھا تو کچھ دن بعد اسے چھوڑ بھی دے گا۔''

''کیا فروزاں کو نہیں معلوم؟'' بختیار نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا نہیں معلوم؟''

''کنور ثقلین ایسا ہے۔''

''نہیں معلوم ہوگا اسے! بہتوں کو نہیں معلوم! وہ تمام برے کام بڑی احتیاط سے کرتا ہے۔ اس کی ان حرکتوں کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو خود بھی ان حرکتوں میں ملوث ہیں۔ مجھ جیسے شاید دو ایک ہی آدمیوں کو معلوم ہوگا کہ کنور ثقلین کتنے گھناؤنے کردار کا مالک ہے۔ وہ شاید ابھی فروزاں کے معاملے میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا ورنہ اسے برباد کر چکا ہوتا، اور اگر کسی وجہ سے اس نے فروزاں سے شادی کر بھی لی تو کچھ دن بعد اسے چھوڑ دے گا۔''

''تم یہ بات دوسری بار کہہ رہے ہو کہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔''

''مجھے معلوم ہے نا اس کا مزاج! لڑکیوں کی کمی نہیں ہے اس کے لیے! وہ مستقل روگ نہیں پالنا چاہتا۔ ایک بہت خوب صورت لڑکی اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ویسے اس کے ہاتھ نہیں لگ سکی تو اس نے اس سے شادی کر لی لیکن صرف تین ماہ بعد چھوڑ دیا۔''

''لڑکی نے احتجاج نہیں کیا؟''

''کیا احتجاج کرتی...... مہر کے کئی لاکھ کا چیک اس نے لڑکی کے منہ پر دے مارا اور کہا کہ وہ جسے چاہتا ہے، اسے ہر قیمت پر خرید لیتا ہے۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم!''

''مجھے......'' رندھاوا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم میرے اچھے دوست تو بن گئے لیکن مجھے اندر سے نہیں دیکھ سکے۔ میں اپنا اندرون کسی پر بھی ظاہر نہیں کرتا۔ میرا اٹھنا بیٹھنا ہر جگہ ہے۔ بڑے حلقوں میں بھی اور چھوٹے حلقوں میں بھی۔ اچھے حلقوں میں بھی اور برے حلقوں میں بھی لیکن میں نے برے حلقوں کا اثر قبول کیا، نہ چھوٹے حلقوں کا۔ اسی لیے آج تک بس کیشئر ہوں ایک بینک کا۔'' رندھاوا کی مسکراہٹ میں تلخی آگئی۔ ''مجھے سفارش پسند ہے، نہ دھونس دھمکی!...... اور ترقی کی صلاحیت تو یقیناً مجھ میں نہیں ہے۔''

بختیار حیرت سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رندھاوا اتنا گہرا آدمی ہوگا۔

''تمہارے سوالوں نے دھکیل دیا مجھے ان باتوں کی طرف۔'' رندھاوا سنجیدگی سے بولا۔ ''کوئی ضرورت نہیں تھی کہ میں تمہیں اپنے بارے میں یہ سب کچھ بتاتا۔ شاید میں یہ جان کر جذباتی ہوگیا تھا کہ تم فروزاں کا دل نہیں جیت سکے۔ میری شدید خواہش تھی کہ تم کامیاب ہوجاؤ اور ایک اچھی لڑکی تباہی سے بچ جائے۔ تمہیں اب بھی اپنی کوششیں جاری رکھنا چاہئیں۔ کسی طرح بھی فروزاں کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔ اس سے محبت ہے تو اسے تباہی سے بچاؤ اور یہ تمہیں شراب کی کیا سوجھی؟ کیا رکھا ہے شراب میں؟''

''میں اپنا غم اس میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔'' بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔

''خام خیالی ہے تمہاری کہ تم ایسا کر لیتے۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''یہ کہانیوں کی باتیں ہیں کہ شراب پی کر غم بھلائے جا سکتے ہیں۔ شراب کا نشہ دائمی تو نہیں ہوتا۔ ادھر نشہ ختم ہوا اور ادھر رنجیدہ خیالات پھر دماغ پر سوار۔ ہاں اگر آدمی آنکھ کھلنے سے لے کر سونے تک پیتا ہی رہے تو اور بات ہے۔ کیا تم اپنی زندگی اس طرح برباد کرو گے کہ اور کسی کام کے نہ رہ جاؤ!''

بختیار چپ رہا۔ رندھاوا کی باتوں میں خلوص تھا۔ شراب سے قطع نظر فروزاں کو تباہی سے بچانا بھی ضروری تھا۔ اسے فروزاں سے محبت تھی اس لیے اسے فروزاں کو کنور ثقلین سے بچانے کی کوشش کرنا ہی چاہیے تھی۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں کئی دن تک نہیں آسکی کہ یہ کام وہ کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے پھر باقاعدگی سے آرٹس کونسل جانا شروع کر دیا۔ وہ خواہاں تھا کہ اسے فروزاں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے لیکن فروزاں بڑی ہوشیاری سے خود کو اس سے دور رکھتی رہی۔

ایک مہینا اسی طرح گزر گیا۔ بختیار پر پھر مایوسی طاری ہونے لگی۔ اس کے لیے بینک کے کاموں میں دل لگانا بھی مشکل ہوگیا تھا۔

ایک روز جب وہ بینک میں ہی تھا تو اس کے انٹرکام کا بزر بجا۔ دوسری طرف عبداللہ خان تھے۔ ''بختیار!'' انہوں نے کہا۔ ''پبلک کے لیے جب بینک بند ہوجائے تو میرے پاس آنا۔ کچھ ضروری بات کرنا ہے۔''

''جی سر!''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ بختیار نے آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ بینک میں ان دنوں وہ جس ناکارگی کا شکار رہا تھا، اس کے بارے میں عبداللہ خان کو اس کا علم ہوگیا ہوگا۔

پندرہ منٹ بعد ہی جب بینک بند کیا گیا تو وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر بوجھل قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''آؤ بختیار!'' عبداللہ خان نے خوشگوار لہجے میں کہا جب بختیار دستک دینے کے بعد ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

بختیار نے عبداللہ خان کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ بات کچھ اور ہے۔ اگر عبداللہ خان اس کی ناکارگی سے ناخوش ہوتے تو ان کا لہجہ مختلف ہوتا۔ وہ بہت گمبھیر لہجے میں بات کرتے۔

''بیٹھو!'' انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج مجھے تم سے جو باتیں کرنا ہیں، وہ تمہارے لیے شاید تعجب خیز ثابت ہوں۔''

بختیار سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

عبداللہ خان پھر بولے۔ ''میں نے تم سے ہمیشہ دفتر کے معاملات پر گفتگو کی ہے۔ تم کیا، میں کسی سے بھی اس کے نجی اور گھریلو معاملات پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن آج مجھے تم سے کچھ ایسی ہی باتیں کرنا ہیں۔ میں تمہارے گھر والوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

بختیار نے اطمینان کی سانس لی۔ بات وہ نہیں تھی جس کا اسے خیال آیا تھا۔

''سر!'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''اگر آپ میرے والدین یا میرے بھائی بہنوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ میرا نہ تو کوئی سگا بھائی ہے، نہ سگی بہن ہے۔ میرے والد کا انتقال میری پیدائش سے دو ماہ قبل ہوگیا تھا اور جب میں دو سال کا تھا تو میری والدہ بھی دنیا سے سدھار گئی تھیں۔''

''اوہ!'' عبداللہ خان کے لہجے سے افسوس کا اظہار ہوا۔ ''میں نے تو غیر ارادی طور پر ایک غم ناک موضوع......''

''نہیں سر!'' بختیار نے ان کی بات کاٹی۔ ''یہ سب کچھ اب بہت پرانی باتیں ہو چکی ہیں، وقت کی گرد میں دب چکی ہیں۔''

''تو پھر تمہاری پرورش...... تمہاری تعلیم و تربیت؟''

''میں اس کے لیے اپنی خالہ اور خالو کا احسان مند ہوں۔ میں انہی کے سایۂ عاطفت میں بڑا ہوا ہوں۔ دراصل میری خالہ کی کوئی اولاد نہیں ہوسکی تھی اس لیے انہوں نے مجھے اپنے سگے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ مجھے ہی نہیں بلکہ آفتاب کو بھی......! دراصل میری ایک اور خالہ اور ان کے شوہر ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ ان کا چار سال کا ایک بیٹا تھا، میں نے ابھی اسی کا نام لیا ہے۔''

''یعنی آفتاب؟''

''جی۔'' بختیار نے کہا۔ ''آفتاب مجھ سے دو سال بڑا ہے۔''

''تمہارے خالو کیا کرتے ہیں؟''

''وہ ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ وراثت میں بھی انہیں بہت کچھ ملا تھا۔ مجھے ملازمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ خالو کی خواہش تو تھی کہ میں تجارت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میرا رجحان شروع ہی سے بینکنگ کی طرف تھا۔ خالو نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اب بھی اکیلے ہی اپنا سارا کاروبار دیکھ رہے ہیں۔ مجھ سے پہلے انہیں آفتاب کی طرف سے بھی مایوسی ہو چکی تھی۔''

''آفتاب کیا کرتا ہے؟''

''وہ سیاست میں گھس گیا ہے۔ اسے بہ ظاہر کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوسکی لیکن وہ اپنا وتیرہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا ربط ضبط انتہا پسند گروپس سے ہے۔ خالہ اور خالو کو اس قسم کی زندگی پسند نہیں لیکن وہ اس سلسلے میں آفتاب سے کچھ زیادہ نہیں کہتے۔ انہیں اندازہ ہے کہ ایسی صورت میں آفتاب سرکش ہوجائے گا اور وہ نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔''

''یعنی وہ اچھا انسان ثابت نہیں ہوا؟''

''میرا وہ بھائی خالہ زاد سہی۔'' بختیار نے کہا۔ ''لیکن

میں اس کے لیے یہ الفاظ اپنی زبان پر نہیں لاسکتا۔''
''سوری! مجھے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔''
''سوری کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے سر!''
''آفتاب کی شادی ہو چکی؟''
''جی نہیں سر!''
''تم سے اس کے تعلقات خوشگوار ہیں؟''
''ناخوشگوار نہیں ہیں۔'' بختیار نے مبہم جواب دینے کی کوشش کی۔ اپنے گھر کی ساری تفصیلات بتانے کے باوجود اس نے اس اظہار سے پہلو تہی کی تھی کہ آفتاب اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ اس کی ترقی آفتاب کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ خاص طور سے اس وقت وہ بہت کڑھ جاتا تھا جب خالہ یا خالو اسے بختیار کی مثال دے بیٹھتے تھے۔

''خیر!'' عبداللہ خان قدرے توقف سے بولے۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''میری بیٹی فروزاں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

فروزاں کا نام آنے سے تو بختیار چونکا ہی تھا لیکن یہ بات بھی اس کے لیے تعجب خیز تھی کہ عبداللہ خان فروزاں کے بارے میں اس کی رائے لینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اس کے لیے چکرا دینے والی بات تھی کہ اس کے خاندان کی تفصیل جاننے کے بعد عبداللہ خان نے اچانک فروزاں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''جواب نہیں دیا تم نے بختیار!'' عبداللہ خان کچھ انتظار کے بعد بولے۔

''میں پریشان ہو گیا ہوں سر!'' بختیار نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے کہ آپ ان کے بارے میں میری رائے کیوں جاننا چاہتے ہیں؟''

''میں اپنی پیاری بیٹی کے بارے میں ہر ایک کی رائے پوچھتا ہوں بختیار! مجھے اپنی بیٹی میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ سوال بھی میرے ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ میری عزیز بیٹی ہے لہٰذا مجھے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ دوسروں کی رائے اسی لیے پوچھتا ہوں کہ شاید مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ زیادہ خوش فہمی ہو گئی ہو۔''

''دوسروں کی رائے کیا ہے سر؟''

''سبھی نے یہ کہا ہے کہ وہ مہذب ہے، با اخلاق ہے، بڑوں کا ادب کرتی ہے اور تعلیم کے حصول میں بھی نمایاں رہتی ہے۔ کچھ دن بعد وہ گریجویشن بھی کر لے گی۔''

''اسی رائے کا اظہار میں بھی کر سکتا ہوں سر!''

''نہیں۔'' عبداللہ خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دوستوں کی رائے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ فروزاں کے دوست اور بھی ہیں لیکن میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔ بہت دن سے تم آرٹس کونسل جا رہے ہو۔ فروزاں بھی بلاناغہ جاتی ہے۔ وہاں تم دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے فروزاں ہی نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس کے اچھے دوست ہو۔''

بختیار سمجھ گیا کہ فروزاں نے اپنے باپ سے یہ بات اس دن سے پہلے کہی ہو گی جب بختیار نے اس سے اظہار محبت کرنا چاہا تھا۔

بختیار نے احتیاط سے جواب دیا۔ ''دوست کی حیثیت سے بھی ان کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔''

عبداللہ خان فوراً کچھ نہیں بولے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ آخر انہوں نے سکوت ختم کیا اور مسکرا کر بولے۔ ''تمہارا کیا پروگرام ہے؟ شادی کب کرو گے؟''

بختیار کا دل دھک سے رہ گیا اور اس کے ذہن میں سوال ابھرا کہ وہ اب جس نتیجے تک پہنچ رہا ہے، کیا وہ صحیح ہو سکتا ہے؟

''سر!'' وہ نظریں جھکا کر بولا۔ ''میری خالہ کو بھی اب جلدی ہے کہ میری شادی کر دیں لیکن میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک وائس پریذیڈنٹ نہ بن جاؤں۔''

''وہ تو تم شاید اسی سال بن جاؤ گے۔'' عبداللہ خان نے مسکرا کر کہا۔

''جی!'' بختیار چونکا۔

''ہاں۔'' عبداللہ خان بولے۔ ''اوپر کی سطح پر یہ بات زیرِ غور ہے کہ تمہیں وائس پریذیڈنٹ بنا دیا جائے۔''

''اتنی جلدی؟'' بختیار کو حیرت ہوئی۔

''صلاحیت ہو تو انسان بہت سی منزلیں ایک دن میں سر کر سکتا ہے اور تم میں یہ صلاحیت ہے جس سے بینک کے بڑے بے خبر نہیں ہیں۔''

بختیار نے طویل سانس لی۔ ''اگر ایسا ہو گیا تو لوگوں کا شبہ یقین میں بدل جائے گا۔''

''کیسا شبہ؟''

''لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ میری اتنی تیزی سے ترقی کے پیچھے کوئی بڑی سفارش کام کر رہی ہے۔''

''ناکارہ لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔ تمہیں ان کی

پروا نہیں کرنا چاہیے۔ خیر! ہم موضوع سے کچھ ہٹ گئے۔ اگر تمہاری خالہ کو فروزاں جیسی کوئی لڑکی نظر آجائے تو کیا وہ اسے تمہارے لیے منتخب کرلیں گی؟"

اس مرتبہ بختیار کا دل بہت زور سے دھڑکا اور اس نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔ "یقیناً۔"

"تو پھر اپنی خالہ کو میرے گھر بھیج دو۔ میرا گھر تم نے دیکھا ہی ہے اور ہمارے مشرقی رواج کے مطابق لڑکے والوں ہی کو لڑکی والوں کے گھر بھیجا جاتا ہے۔"

"سر!" بختیار کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ وہ عبداللہ خان کا منہ تکنے لگا جو شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"لیکن سر......" بختیار کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

عبداللہ خان یکا یک سنجیدہ ہوگئے۔ "کیا تم کسی اور لڑکی کا انتخاب کرچکے ہو؟"

"جی نہیں سر! میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ......آپ نے اپنی بیٹی سے بھی پوچھا ہے؟"

"پوچھ لوں گا۔ میں اس سلسلے میں فکر مند نہیں ہوں۔ وہ ہمیشہ کہتی رہی ہے کہ میں اس کے لیے بھی کچھ برا نہیں کرسکتا لہٰذا میں جب اسے تمہارے بارے میں بتاؤں گا تو وہ انکار نہیں کرے گی۔"

بختیار کو ان باتوں سے جو خوشی حاصل ہورہی تھی، وہ لمحاتی ثابت ہوئی۔ اسے خیال آیا تھا کہ فروزاں اسے قبول کرنے سے انکار کردے گی اور عبداللہ خان کی خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

یہی خیالات تھے جن کی وجہ سے اس نے اپنی خالہ کو عبداللہ خان کے گھر نہیں بھیجا، اور نہ ان سے اپنی اور عبداللہ خان کی باتوں کا ذکر کیا، لیکن آٹھ دس دن گزر جانے کے بعد امتحان پھر اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"تم نے بھیجا نہیں اپنی خالہ کو!" عبداللہ خان نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر پوچھا۔

"جی...... وہ......" بختیار کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ کیا کہے۔

"تمہاری شرط مجھے منظور ہے بختیار!" عبداللہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم جب وائس پریذیڈنٹ بن جاؤ گے، شادی تبھی ہوگی اور ہاں! میں نے فروزاں سے بھی بات کرلی ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔"

بختیار چونکا۔ عبداللہ خان نے جیسے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اسے ہر ملاقات میں چونکاتے رہیں گے۔

"ہاں بختیار!" عبداللہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فروزاں کی شادی تم سے ہوجائے، اس پر فروزاں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میری خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔"

بختیار ان باتوں سے رندھاوا کو برابر آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس نے اس دن کی باتیں بھی رندھاوا کو بتائیں۔

رندھاوا نے ایک طویل سانس لی۔ "گویا اس نے باپ کی وجہ سے سر جھکایا ہے لیکن مجھے ڈر ہے بختیار کہ اس سے تمہاری شادی کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ میرے علم کے مطابق اس کے اعصاب پر اب بھی کنور ثقلین ہی سوار ہے۔"

"رندھاوا!" بختیار نے پرجوش انداز میں کہا۔ "جب وہ میرے قریب ہوجائے گی تو اسے میری محبت کی شدت کا اندازہ ہوگا۔ میں اسے اتنا خوش رکھوں گا کہ وہ بھول جائے گی کنور ثقلین کو۔"

رندھاوا کی سنجیدگی برقرار رہی۔ "اگر تمہیں خود پر اتنا اعتماد ہے تو اپنی وائس پریذیڈنٹ کی شرط کو پس پشت ڈال دو۔ جلد از جلد شادی کرلو۔ کنور ثقلین کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے اس لیے وہ اب تک فروزاں کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوا ہے لیکن اسے فروزاں کی شادی کا علم ہوگا تو پھر وہ فروزاں کو......" رندھاوا جو کچھ بھی کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔

"میں سمجھ گیا۔" بختیار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی شرط ختم کردوں گا۔ خالہ سے یہ بھی کہلوا دوں گا کہ فروزاں شادی کے بعد بھی گریجویشن کرسکتی ہے۔"

"شاید یہی بہتر ہو۔" رندھاوا نے کہا، پھر اس نے پوچھا۔ "فروزاں نے اس بارے میں تم سے کچھ کہا؟"

"میں ان دنوں آرٹس کونسل نہیں جارہا ہوں۔"

"اس سے مل لیتے تو اچھا تھا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ جب خالہ بات پکی کر آئیں، اس کے دوسرے دن فروزاں سے ملوں۔"

رندھاوا کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ "خیر! جیسا تم مناسب سمجھو۔"

اور بختیار نے وہی مناسب سمجھا جو اس نے رندھاوا سے کہا تھا۔

اس نے جب خالہ کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا تو وہ خوشی سے کھل اٹھیں۔ خالو بھی خوش ہوئے۔ خالہ کو بختیار نے

سب کچھ بتانے کے علاوہ یہ بھی سمجھا دیا کہ شادی کے سلسلے میں عجلت سے کام لیا جائے۔
اور جب خالہ عبداللہ خان کے گھر سے لوٹیں تو انہوں نے بتایا کہ ایک ماہ بعد کی تاریخ پکی بھی کر لی ہے۔
دوسرے دن عبداللہ خان نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ ''شرط واپس لے لی تم نے؟ چلو خیر! کوئی حرج نہیں ہے۔ فروزاں سے بھی میں نے کہہ دیا ہے کہ گریجویشن وہ شادی کے بعد کرے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تم میری بیٹی کو پسند کرنے لگے تھے اس لیے تم سے صبر نہیں ہوسکا۔''
بختیار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکالیں۔
اسی دن شام کو وہ آرٹس کونسل گیا۔ فروزاں پہلے سے موجود تھی۔ اس روز اس نے خود کوشش کی کہ بختیار سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نکالے اور اس نے موقع نکال ہی لیا۔
''جیت گئے تم!'' فروزاں سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''مبارک ہو!''
''کیا تم مبارک باد نہیں لوگی؟'' بختیار مسکرایا۔
''ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔'' فروزاں کا لہجہ سپاٹ رہا۔
''کیسی بات کر رہی ہو فروزاں......! درخواست کیا مطلب؟ تم مجھے حکم دو۔ کیا چاہتی ہو۔''
''جو بات میں تم سے کہنا چاہتی ہوں، وہ تم کسی کو بتاؤ گے نہیں۔''
''نہیں بتاؤں گا۔'' بختیار مسکرایا۔
''وعدہ کر تو رہے ہو، وعدے کی اہمیت جانتے ہو؟''
''خوب جانتا ہوں۔''
''تو سنو! میں چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے تم ایک گھر کا بندوبست کرلو جہاں صرف میں اور تم رہو۔ میں ساس سسر، جیٹھ دیور یا نندوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''
بختیار سنجیدہ ہوگیا۔ ''وہ میری ماں نہیں، خالہ ہیں فروزاں!''
''خلیا ساس سہی، ہیں تو ساس!...... خالو بھی ہیں تمہارے! ایک خالہ زاد بھائی بھی ہے۔ میں ان سب کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔''
''لیکن فروزاں!''
''تم وعدہ کر چکے ہو۔'' فروزاں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔
بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اچھا!...... اگر تم چاہتی ہو کہ میں اپنی خالہ کا دل دکھاؤں تو...... ٹھیک ہے۔ میں اپنا وعدہ ایفا کروں گا۔''
لیکن یہ وعدہ ایفا کرنے کے لیے بختیار کو خاصے کرب سے گزرنا پڑا۔ فروزاں کی شرط کو اس نے اپنی خواہش بنا کر خالہ کے سامنے پیش کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بختیار انہیں بہ مشکل سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس زمانے میں ساس بہو کا رشتہ بہت نازک ہو چکا ہے لہٰذا شادی کے بعد الگ رہنے ہی میں محبت قائم رہتی ہے۔ اس معاملے میں اس کے خالو نے بھی دل سے یا بے دلی سے اس کی حمایت کی۔ خالہ کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔
''لیکن بیاہ کر پہلے دن اسے یہیں لانا پڑے گا۔'' ہتھیار ڈالنے کے ساتھ ہی وہ اس بات پر اڑ بھی گئیں۔ ''دوسرے دن تم اسے جہاں چاہو، لے جانا۔''
اب بختیار کو خاموش ہونا پڑا۔
دوسرے دن اس نے فروزاں کو خالہ کی شرط سے آگاہ کرنے کے بعد بڑی لجاجت سے کہا۔ ''پلیز فروزاں! کم از کم اس بات سے انکار نہ کرنا۔ خالہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ وہ تمہیں بھی اتنا ہی چاہیں گی۔ ان کی اتنی سی بات تو رکھ لو۔''
اندیشوں کے برخلاف بختیار کو زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی۔ فروزاں نے بات مان لی، پھر کہا۔ ''آج کے بعد شادی تک میں آرٹس کونسل نہیں آؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پھر کوئی شرط لے آؤ۔ مجھے اس دوران میں فون بھی مت کرنا۔ اگر کرو گے تو میں ریسیو نہیں کروں گی اور کسی اجنبی نمبر سے آنے والی کال تو میں ریسیو ہی نہیں کرتی ہوں۔ آرٹ کونسل میں اس لیے بھی نہیں آؤں گی کہ اب میں شادی تک خود کو گھر میں قید کرلوں گی۔ کالج بھی نہیں جاؤں گی۔'' پھر وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ ''شاید کسی کا بھی فون ریسیو نہ کروں۔''
بختیار نے اندازہ لگایا کہ وہ ''کسی'' کنور ثقلین بھی ہوسکتا تھا۔ بہر حال اسے اس بات سے خوشی ہوئی کہ فروزاں خود کو اپنے ہی گھر میں قید کرلینا چاہتی تھی۔ بختیار کے لیے اس میں خوشی کا پہلو یہ تھا کہ اب اگر کنور ثقلین کو فروزاں کی شادی کا علم ہو جاتا تو بھی وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔
ایک ماہ شادی کی تیاری کے لیے کم ہوتا ہے لیکن جب دونوں طرف پیسے کی کمی نہ ہو تو ساری تیاریاں ایک ماہ

سے کم مدت میں بھی ہوجاتی ہیں۔ بختیار اتنا زیادہ پیسا خرچ نہیں کرسکتا تھا لیکن اس کے خالو کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے پیسا پانی کی طرح بہایا اور یہ شادی نہایت دھوم دھام سے ہوگئی۔

شادی کی پہلی رات......! امنگوں اور ولولوں کی رات......! سرشاری ودیوانگی کی رات! لیکن یہ سب کچھ بختیار تک محدود رہا۔ فروزاں برف کی سِل بنی رہی۔

''خیر۔'' بختیار نے اپنے دل میں کہا۔ ''میں تمہاری محبت جیت کر رہوں گا فروزاں!''

اس شام بختیار کے خالو نے ایک بڑے سبزہ زار میں ولیمے کا اہتمام کیا تھا (شادی سے قبل) ولیمے کے دعوت ناموں کی خاصی بڑی تعداد عبداللہ خان کو بھی بھجوائی گئی تھی۔ ان کی طرف سے آئے ہوئے مہمانوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی لیکن دعوت ناموں کی تعداد سے کم تھی۔

خود فروزاں نے بھی اپنے دوست لڑکوں اور لڑکیوں کو بلایا تھا۔ ان میں سے جن کا تعلق آرٹس کونسل سے تھا، وہ سب تو نہیں آئے لیکن جو آئے تھے وہ فروزاں اور بختیار کے مشترکہ مہمان تھے۔ ساڑھے نو بجے تک سب مہمان آچکے تھے یا جو تھوڑے بہت رہ گئے تھے، وہ آتے جارہے تھے۔ جب فروزاں اور بختیار مہمانوں میں گھل مل گئے تو جگہ جگہ ان کے جاننے والوں نے انہیں گھیرا۔ بختیار سب سے ہنستے مسکراتے ہوا مل رہا تھا لیکن فروزاں کے ہونٹوں پر بس ہلکی سی مسکراہٹ رہی جو بختیار کے خیال کے مطابق جبری تھی۔

ایک جگہ فروزاں چونکی۔ بختیار نے اس شخص کی طرف دیکھا جو فروزاں کے چونکنے کا سبب بنا تھا۔

''حیران رہ گئیں مجھے دیکھ کر!'' وہ آدمی قریب آتے ہوئے بولا۔ پھر قریب آکر اس نے بختیار کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بختیار نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

''مجھے ثقلین کہتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اور یہ لوگوں کی محض محبت ہے کہ وہ مجھے کنور ثقلین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔''

''آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ آپ کنور لگتے بھی ہیں۔'' بختیار نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ وہ فروزاں کو شبہ بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے اور کنور ثقلین کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

''شکریہ۔'' کنور ثقلین نے کہا اور پھر فروزاں کا نام لے کر اس کی طرف متوجہ ہوا، پھر جلدی سے دوبارہ بختیار کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''برا مت مانیے گا کہ میں انہیں مسز بختیار کہنے کے بجائے ان کا نام لے رہا ہوں۔ دراصل ہم بہت پرانے دوست ہیں، فروزاں نے کبھی آپ سے میرا ذکر نہیں کیا؟''

''شاید کیا ہو۔'' بختیار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل ان کے بہت سے دوست ہیں۔ میں زیادہ تر کے نام بھول چکا ہوں۔''

کنور ثقلین نے مسکراتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی، پھر دوبارہ فروزاں کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا تم سے کہ شادی کی عجلت میں کچھ نام تمہیں یاد نہیں رہے ہوں گے۔ ان میں سے ایک نام میرا بھی ہوگا اس لیے تم نے مجھے بھی اپنی شادی کا دعوت نامہ نہیں بھیجا لیکن میں نے سنا تو خود ہی آگیا۔ میں بن بلایا مہمان ہوں۔''

بختیار نے محسوس کیا کہ فروزاں اس وقت جذباتی ہوگئی تھی۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کے اس مشکل وقت میں شبانہ اس کے کام آئی۔

''میں بھی بن بلائی مہمان ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے کسی جانب سے ان کے قریب آئی اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بینک سے معلوم ہوگیا تھا کہ آج آپ کا ولیمہ ہے۔ اگر کل معلوم ہوجاتا تو میں شادی میں بھی ایک بن بلائی مہمان ہوتی۔'' اس کا لہجہ بہت شوخ تھا۔

''ہاں۔'' بختیار نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے کئی جاننے والوں کو بلانا بھول گیا۔ یہاں تک کہ دو ایک دوستوں کو بھی بھول گیا ہوں۔''

شبانہ کی مسکراہٹ گہری تھی۔ ''آپ مجھے باور کرانا چاہتے ہیں کہ میں آپ کی دوست نہیں ہوں۔''

''دراصل۔'' بختیار سنجیدہ ہوا۔ ''آپ سے آرٹس کونسل میں کبھی کبھی ملاقات ہوئی ہے۔ میں آپ کو اپنے بینک کی کلائنٹ کی حیثیت سے زیادہ جانتا ہوں اور ایک منیجر کی حیثیت سے مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے آپ کو دوست کہا تو شاید آپ برا مان جائیں۔''

''ہرگز برا نہیں مانوں گی۔'' شبانہ نے کہا۔ ''آپ مجھے دوست صرف کہیں نہیں بلکہ سمجھیں بھی!''

''ہیلو شبانہ!'' ایک جانب سے آواز آئی۔

شبانہ اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس طرح بختیار بھی ایک مشکل جواب دینے سے بچ گیا۔

اس مختصر دورانیے میں فروزاں نے اپنی جذباتی

کیفیت پر قابو پالیا تھا۔ وہ کنور ثقلین سے بولی۔ ''معاف کرنا کنور! میں واقعی بھول گئی تھی، ویری سوری۔''
''کوئی بات نہیں، ہوجاتا ہے ایسا۔''
''پھر ملاقات ہوگی تم سے! میں ذرا کچھ اور مہمانوں کو دیکھ لوں۔''
''شیور، شیور، ضرور۔''
فروزاں نے بختیار کا ہاتھ پکڑ کر قدم آگے بڑھائے۔ اس تقریب کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا جب فروزاں نے اس کا ہاتھ خود پکڑا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتی تھی کہ بختیار اور کنور ثقلین میں کوئی اور بات ہو۔
اس محفل میں رندھاوا بھی موجود تھا مگر نہ جانے کیوں اس کی کوشش تھی کہ وہ فروزاں اور بختیار سے دور دور ہی رہے۔
فروزاں اور بختیار آگے بڑھے ہی تھے کہ بختیار کے خالہ زاد بھائی آفتاب سے سامنا ہوگیا۔ اس کے ساتھ شبانہ بھی تھی۔
''آج تم بہت اچھے لگ رہے ہو بختیار!'' وہ بولا۔
''اور یہ؟'' بختیار نے فروزاں کی طرف اشارہ کیا۔
''یہ آخر تمہارا انتخاب ہیں۔ یہ ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہوں گی۔'' آفتاب نے کہا، پھر فروزاں سے بولا۔ ''کیوں بھا...... اوہ، نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''میں بھابی کہنے والا تھا۔ کوئی تک نہیں ہوگی اس کی۔ بختیار مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں اس کا نام لیتا ہوں اور یہ مجھے بھیا کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔''
''آپ میرا نام لے سکتے ہیں۔'' فروزاں نے سنجیدگی سے کہا۔
''یہ ہوئی نا بات!'' آفتاب ہنسا۔
شبانہ اس کے برابر میں کھڑی مسکراتی رہی۔
''اب آپ اپنی گپ شپ جاری رکھیں بھیا! ہم اور مہمانوں کو دیکھتے ہیں۔'' بختیار نے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ اس کے ساتھ فروزاں نے بھی قدم بڑھائے۔ اب اس نے بختیار کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
شبانہ اور آفتاب کو باتیں کرتے دیکھ کر بختیار چونک گیا تھا۔ پہلے کبھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ شبانہ سے آفتاب کی بھی شناسائی یا دوستی ہوگی۔ آفتاب کبھی آرٹس کونسل میں نظر نہیں آیا تھا۔
کچھ دیر بعد اس نے آفتاب اور کنور ثقلین کو بھی ایک جگہ کھڑے باتیں کرتے ہوئے دیکھا لیکن یہ اس کے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ آفتاب سیاست دانوں میں گھسا رہتا ہے اور رندھاوا نے بتایا تھا کہ کنور ثقلین اب سیاست میں باقاعدہ قدم رکھ چکا ہے۔ غالباً وہ آنے والے انتخابات میں حصہ بھی لیتا۔
تقریب میں کئی سیاست دان نظر آرہے تھے لیکن وہ سبھی عبداللہ خان کے مہمان ہوسکتے تھے۔ بختیار کا یا اس کے خالو کا کسی سیاست دان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
بارہ بجے سے پہلے تقریب ختم ہوئی جب فروزاں اور بختیار وہاں سے روانہ ہونے لگے تو آفتاب نے کہا۔
''تم دونوں کے تحائف کل پہنچا دوں تمہارے گھر فروزاں!''
بختیار کو نہ جانے کیوں یہ اچھا نہیں لگا کہ آفتاب نے یہ بات اس سے کہنے کے بجائے فروزاں سے کہی تھی۔
دوسرے دن آفتاب اپنے کہنے کے مطابق انہیں تحائف پہنچانے آیا جو ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ وہ ڈھیر وہ اپنی کار میں لایا تھا۔ ساتھ میں ایک ملازم بھی تھا جس نے وہ سب تیسری منزل تک پہنچایا۔
ملازم کو رخصت کرنے کے بعد آفتاب وہیں رکا رہا۔
''کیا چائے نہیں پلواؤ گی میری چھوٹی سی پیاری بھابی!'' اس نے چہکنے کے سے انداز میں کہا۔
بختیار کو یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ وہ فروزاں سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔
فروزاں نے اسے جواب دیا۔ ''ابھی ہم نے کوئی ملازم نہیں رکھا۔ صبح کا ناشتا ہم نے باہر جا کے ہوٹل میں کیا تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے لیے بھی یہی کرنا پڑے گا۔''
''تو گھر آجایا کرو!'' آفتاب نے کہا۔ ''میں خود بھی دو ایک ڈشز خاص تمہارے لیے بنایا کروں گا۔ بختیار کو معلوم ہے کہ میں اچھا خاصا باورچی ہوں۔'' وہ ہنسا۔
فروزاں اسے کوئی جواب دیے بغیر کھڑی ہوگئی اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بہت ہی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ تیزی سے خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔
آفتاب اس کی بے رخی پر چند لمحے کے لیے سنجیدہ ہوا۔ اس کے بعد پھر ہنسا۔ وہ ہنسی کھسیاہٹ کی تھی۔ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اب چلتا ہوں بختیار!''
''شکریہ بھیا! آپ نے ناحق زحمت کی۔ تحائف کسی ملازم سے بھجوا دیتے!''
''میں نے سوچا تھا کہ...... اچھا خیر!...... چلتا ہوں،

خدا حافظ۔''

بختیار اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک گیا۔ پھر دروازہ بند کر کے خواب گاہ میں پہنچا۔ فروزاں آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی سو جاتی۔

''فروزاں!'' بختیار اس کے برابر میں لیٹتے ہوئے بولا۔ ''تم ابھی سوئی تو نہیں ہوگی۔''

''ہوں۔'' فروزاں آنکھیں بند کیے رہی۔

''تم مجھ سے شادی کر کے بالکل خوش نہیں ہوئیں!''

فروزاں نے نہ صرف آنکھیں کھول دیں بلکہ بختیار کی طرف کروٹ بھی لی اور بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ''آرٹس کونسل میں تم نے میرے رویے سے اندازہ نہیں لگایا تھا کہ میں تمہیں دوست سے زیادہ سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔''

''تو پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟''

''ڈیڈی کی کوئی بات رد کرنا میرے لیے مشکل تھا۔''

بختیار چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ ''کل ویسے میں کنور ثقلین سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ تم اس کی پرانی دوست ہو۔ پھر تم نے اسے مدعو کیوں نہیں کیا تھا؟''

''بھول گئی تھی۔''

''کیا تم اسے بھول سکتی ہو؟''

فروزاں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں؟ کیا کسی کو بھولا نہیں جا سکتا؟ کل تم بھی شبانہ سے کہہ رہے تھے کہ دو ایک دوستوں کو بلانا بھول گئے ہو۔''

''لیکن تم کنور ثقلین کو نہیں بھول سکتیں۔'' بختیار اس وقت کھل کر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ ''دیکھو فروزاں! یقین کرو کہ میں تمہیں بہت شدت سے چاہنے لگا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں۔ اسی لیے میری خواہش ہے کہ آج تمہیں بہت کچھ بتا دوں۔''

فروزاں خاموشی سے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

بختیار اس کی طرف دیکھے بغیر ڈرامائی انداز میں بولنے لگا۔ ''میں تمہیں شدت سے چاہنے لگا تھا۔'' اس نے اپنی بات دہرائی۔ ''یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ تم کنور کو چاہتی ہو۔ یہ جاننے کے بعد میں کوشش کرتا کہ اپنی محبت کا گلا گھونٹ لوں لیکن مجھے کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوئیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگر تم نے کنور سے شادی کی تو یہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہوا کہ تمہیں کنور سے میری محبت کا علم ہو چکا ہے۔'' فروزاں نے کچھ تلخی سے کہا۔ ''لیکن یہ تم کیوں کہہ رہے ہو کہ اس سے میری شادی میرے حق میں اچھی ثابت نہیں ہوتی۔''

''کنور ایسا ہی آدمی ہے۔ نئی نئی لڑکیوں سے آسودہ ہونا اس کا شوق ہے۔ تم سے وہ شادی نہیں کرتا۔ اسی کے الفاظ کے مطابق وہ مستقل روگ پالنے کا قائل نہیں۔ وہ کسی وقت بھی تمہیں...... خیر چھوڑو! اپنی یہ بات مکمل کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اگر مجبوراً اسے تم سے شادی کرنا ہی پڑ جاتی تو وہ ایک ماہ میں تم سے دل بھر جانے کے بعد تمہیں طلاق دے دیتا۔''

''بند کرو یہ فضول باتیں۔'' فروزاں تقریباً چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ ''میں اب تمہاری بیوی ہوں اس لیے اب کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی، لیکن کنور پر اس قسم کے الزامات بھی میں برداشت نہیں کر سکتی۔''

''ابھی میں تمہیں اس کے بارے میں وہ کچھ بھی بتاؤں گا جو تم نہیں جانتیں۔'' بختیار نے دکھی لہجے میں کہا اور پھر وہ سب کچھ بیان کر ڈالا جو اسے کنور کے بارے میں رندھاوا سے معلوم ہوا تھا۔

''بس کرو!'' فروزاں چیختی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اس طرح اپنے کانوں پر رکھ لیے تھے جیسے اب بختیار کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔

''بس۔'' بختیار نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تمہیں اس جہنم سے بچانے ہی کے لیے میں نے تم سے شادی کی ورنہ......''

''چپ ہو جاؤ اب۔'' فروزاں کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ ''میں تمہاری بیوی بن چکی ہوں اور میں شبانہ جیسی لڑکی نہیں ہوں۔ اب میں کنور سے ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، لیکن میں اس کے بارے میں یہ خرافات بھی نہیں سننا چاہتی۔''

اب بختیار کو بھی کچھ غصہ آیا وہ بولا۔ ''میں اگر کوشش کروں تو ثبوت بھی حاصل کر لوں گا کہ وہ آوارہ ہے، بدمعاش ہے، شہدہ ہے۔''

غصے سے فروزاں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ وہ کچھ بولی تو نہیں لیکن یکایک بیڈ کی دراز کی طرف گئی۔ اس دراز میں اس کار کی چابی بھی پڑی ہوئی تھی جو عبداللہ خان نے جہیز میں دی تھی۔ چابی لے کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بڑی زور سے بند کیا

تھا۔بختیار دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ فروزاں اتنی چراغ پا ہو جائے گی۔بیرونی دروازہ بھی اتنی ہی زور سے بند کیا گیا تھا کہ بختیار کو اس کی آواز صاف سنائی دے گئی تھی۔وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔اسے اب خیال آرہا تھا کہ اس نے فروزاں کو سمجھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار نہیں کیا اور شاید مناسب الفاظ بھی استعمال نہیں کیے تھے۔

وہ بستر پر پڑا رہا۔دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بھی کہیں نہیں گیا۔پھر شام ہوگئی۔اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ شام تک فروزاں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ جہاں بھی گئی ہوگی، وہاں سے واپس آجائے گی لیکن جب رات کے نو بج گئے تو وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

دس بجنے والے تھے جب اس نے موبائل پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

''کہاں ہو؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''میں اپنے گھر آگئی ہوں۔'' فروزاں نے رکھائی سے جواب دیا۔

''گھر تو تمہارا یہ ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ میں اپنے پہلے گھر آگئی ہوں، ڈیڈی کے گھر۔''

''کب آؤ گی؟''

''واپس آنے کے ارادے سے نہیں نکلی تھی وہاں سے۔''

''ذرا سی بات کو اتنا نہ بڑھاؤ۔''

''ذرا سی بات نہیں تھی وہ! دل پر چرکے لگائے ہیں تم نے میرے۔''

''اس بدمعاش کی بات سے چرکے لگ گئے تمہارے دل پر؟''

بختیار روانی میں اپنا جملہ تو پورا کر گیا جبکہ فروزاں نے لفظ ''بدمعاش'' سنتے ہی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

بختیار نے جھنجلا کر موبائل ایک طرف ڈالا اور بستر پر گر پڑا۔صبح کے ناشتے کے بعد ایک کھیل بھی اڑ کر اس کے منہ میں نہیں گئی تھی لیکن کچھ کھانے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔اسی عالم میں کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو چوبیس گھنٹے بھوکا رہنے کی وجہ سے کچھ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔اسی حالت میں اس نے جیسے تیسے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے دفتر روانہ ہو گیا۔

شادی کے لیے اس نے پانچ دن کی چھٹی لی تھی جو گزشتہ روز ختم ہو چکی تھی۔

دفتر پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کیبن میں چلا گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔پھر وہ اس وقت چونکا جب رندھاوا اس کے کیبن میں آیا۔

''خیریت تو ہے؟'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے بختیار کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔فروزاں کے اس طرح چلے جانے سے وہ بہت دکھی ہو گیا تھا۔

''کیا بات ہے بختیار!'' رندھاوا بے چین نظر آیا۔

بختیار نے کچھ رک رک کر مختصر طور پر گزشتہ روز کا واقعہ رندھاوا کو بتا دیا۔

سب کچھ سن کر رندھاوا نظریں جھکا کر سوچ میں ڈوب گیا، پھر ایک طویل سانس لے کر اس نے سر اٹھایا اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''تمہارا چہرہ بہت اترا ہوا سا ہے۔کل سے تم نے کچھ کھایا بھی؟''

بختیار نے نفی میں سر ہلایا۔''دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔''

پھر وہ ''نہیں نہیں'' کرتا رہ گیا لیکن رندھاوا نے چپراسی کو بلا کر ناشتا لانے کے لیے قریبی ریستوران بھیج دیا۔

انٹر کام کی گھنٹی بجی۔بختیار نے ریسیور اٹھایا۔

دوسری طرف سے عبداللہ خان کی آواز آئی۔''ذرا آنا بختیار!''

''جی۔'' بختیار نے اتنا ہی کہہ کر ریسیور رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

رندھاوا بڑبڑایا۔''میں حیران تھا کہ آج بڑے صاحب تم سے بھی دو منٹ پہلے آگئے۔عام طور پر دس بجے سے پہلے نہیں آتے۔''

بختیار کیبن سے نکلا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔بینک میں کام کرنے والے اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔انہوں نے اپنے منیجر کو اتنا بدلا ہوا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بختیار نے عبداللہ خان کے کمرے میں قدم رکھا۔

''آؤ، بیٹھو!'' عبداللہ خان نے سنجیدگی سے لیکن نرم لہجے میں کہا۔

بختیار سر جھکائے بیٹھ گیا۔

''ایسا'' عبداللہ خان بولے۔''ایسا بہت کم...... شاذونادر ہی ہوتا ہے کہ شادی کے بعد دو ہی دن میں میاں بیوی کا کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا ہو جائے۔کل جب فروزاں آئی تھی تو بہت اداس تھی۔میں نے اس سے استفسار کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔رات تک میں نے اس سے کئی بار پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔میرے

سوال کرتے ہی وہ بس رو پڑتی ہے۔ رات کو بھی وہ تمہارے پاس نہیں گئی۔ اسی سے مجھے، اندازہ ہوا کہ معاملہ کچھ سنگین ہے۔ خیر! میرے کچھ اصول ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میاں بیوی کو اپنے جھگڑے خود ہی نمٹانا چاہئیں۔ بڑوں کی دخل اندازی مناسب نہیں ہوتی، تاوقتیکہ چھوٹے خود نہ چاہیں اور فروزاں نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے جواب نہ دینے سے میں سمجھتا ہوں کہ بات کچھ ایسی ہے جو وہ مجھے نہیں بتانا چاہتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم بھی بتانا چاہو گے یا نہیں۔''

بختیار نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ ''آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ میں فروزاں کو منالوں گا۔ دور کردوں گا اس کی ناراضی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں خود بھی اسی بات کا قائل ہوں کہ میاں بیوی میں جھگڑا ہو تو وہ تصفیہ بھی خود ہی کریں۔ اب تم جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔''

''جی۔''

بختیار اٹھ کر اپنے کیبن میں آ گیا۔ ناشتا آ چکا تھا۔ اس کی خوشبو سے بھی بختیار کی اشتہا نہیں جاگ سکی لیکن رندھاوا نے اصرار کرکے اسے ناشتا کرایا اور ناشتے کے دوران میں پوچھا کہ عبداللہ خان نے اسے کیوں بلایا تھا۔ بختیار نے سب کچھ بتادیا۔

ناشتا کرنے کے بعد رندھاوا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ فروزاں سے یہ سب کچھ کہنے میں تم نے عجلت سے کام لیا ہے۔''

بختیار خاموش رہا۔

پھر دن گزرتے رہے۔ بختیار کی حالت غیر ہوتی رہی۔ وہ یہ معلوم کرنے سے بھی قاصر تھا کہ فروزاں کس حال میں تھی۔

اس دوران میں اس کی خالہ کے کئی فون آئے۔ بختیار مصروفیت کے بہانے انہیں ٹالتا رہا۔ وہ اداس تھیں کہ بختیار نے ان کے پاس آنا تک چھوڑ دیا تھا۔

آخر ایک دن بختیار ضبط نہ کرسکا اور اس نے موبائل فون پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

''کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''گھر پر ہی ہوں۔'' فروزاں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک دن کے لیے کیا، گھنٹا بھر کے لیے بھی باہر نہیں نکلی۔ اطمینان رکھو کہ میں نے فون پر بھی کنور سے کوئی بات نہیں کی۔''

''اچھا اب غصہ تھوک دو۔''

''میں اب غصے میں نہیں، بس اذیت میں ہوں۔''

''اذیت؟ کیوں؟''

''دل پر لگے ہوئے چرکوں کی وجہ سے۔''

''میں تمہارے زخم مندمل کردوں گا۔ گھر آجاؤ۔''

کچھ توقف کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں اس دن بہت جذباتی ہوگئی تھی۔ میں نے کنور کو ایس ایم ایس کیا تھا اور تم نے اس پر جو الزامات لگائے تھے، وہ سب لکھ دیے تھے۔ پھر اس کا ایس ایم ایس آیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے ہے یا یہ سب کچھ مجھ سے کسی اور نے کہا ہے لیکن میں نے اسے جواب نہیں دیا۔ میں نہیں جانتی کہ اس وقت میری ذہنی کیفیت کیا تھی کہ میں اسے وہ ایس ایم ایس کر بیٹھی۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم آؤ گی تو ہم بات کرلیں گے۔''

اس مرتبہ پھر کچھ توقف سے جواب آیا۔ ''میں صرف ایک شرط پر آسکتی ہوں۔''

''بولو!''

''میں تمہیں کنور کا نمبر دیتی ہوں۔ اسے ایس ایم ایس کرو۔ اسے بتاؤ کہ وہ سب کچھ مجھ سے تم نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تم اس سے معافی بھی مانگو۔''

''کیا!'' بختیار اکھڑ گیا۔ ''میں اس سے معافی مانگوں؟''

''بس۔'' فروزاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں اسی شرط پر واپس آسکتی ہوں۔ جب مجھے معلوم ہوجائے گا کہ تم نے اس سے معافی مانگ لی ہے تو میں آجاؤں گی۔''

یہ سب کچھ سنتے ہوئے بختیار کے خون کی گردش تیز ہوتی رہی تھی۔ اس نے فروزاں کے خاموش ہوتے ہی جبڑے بھینچ کر کہا۔ ''یہ ناممکن ہے کہ میں اس سے معافی مانگوں۔''

دوسری طرف سے کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

''شٹ۔'' بختیار کے منہ سے نکلا۔

وہ اسی وقت بینک سے لوٹا تھا اور فروزاں سے بات کی تھی۔ شام تک اس کی حالت غیر ہوچکی تھی۔ اندھیرا پھیلتے پھیلتے وہ گھر سے نکلا اور تیز رفتاری سے کار چلاتا ہوا رندھاوا کے گھر پہنچ گیا۔

''خیریت؟'' رندھاوا اسے دیکھ کر چونکا۔ ''آؤ، اندر آؤ!''

''نہیں۔ میں بس کھڑے کھڑے آیا ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم مل گئے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ فون کر کے آؤں۔ اب میں بس یہ چاہتا ہوں کہ اس وقت تم ناصح کا کردار ادا کرنا بھول جاؤ۔ میں تمہیں اس وقت ایک چارہ ساز دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، تم کیا کہہ رہے ہو!'' رندھاوا نے حیرت سے کہا۔

''شراب ہوگی تمہارے پاس۔'' بختیار نے کہا۔ ''مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

''لیکن...... بختیار! تم......''

بختیار نے اس کی بات کاٹی۔ ''ابھی کہا ہے نا تم سے! مجھے تمہاری چارہ سازی کی ضرورت ہے، غم گساری کی ضرورت ہے۔ ناصح نہ بنو!''

''تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔''

بختیار جھلائے ہوئے انداز میں واپسی کے لیے مڑا۔ ''ٹھیک ہے، رہنے دو، میں کہیں اور سے بندوبست کرلوں گا۔''

رندھاوا نے بڑی مضبوطی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا اور شکست خوردہ لیکن تشویش کے لہجے میں بولا۔ ''ٹھہرو! لاتا ہوں۔''

بختیار رک گیا۔

رندھاوا جلد ہی واپس لوٹا اور بڑا سا براؤن لفافہ بختیار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ آدھی ہو چکی ہے۔ آدھی میں پی چکا ہوں۔''

''اور منگاؤ گے اپنے لیے؟''

''ظاہر ہے۔''

''تو اس کے ساتھ میرے لیے کئی بوتلیں منگا لینا، میں پے منٹ کردوں گا۔''

جواب سنے بغیر بختیار مڑ کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ کار تیز رفتاری سے چلادی۔ جلد ہی وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھا۔

''میں اس ملعون سے معافی مانگوں!'' وہ اس وقت بڑبڑایا جب ایک گلاس میں شراب انڈیل کر اس میں پانی ملا چکا تھا۔

اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں پی تھی لیکن فلموں میں دیکھ چکا تھا کہ گلاس میں شراب کی مقدار کم اور پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ بعض افراد پانی ملائے بغیر پیتے ہیں لیکن نئے پینے والوں کے لیے خالص شراب پینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں آگ اتر گئی ہو۔ منہ میں کڑواہٹ پھیل گئی۔ ساتھ ہی اسے ابکائی بھی آئی لیکن اس نے خود کو قے کرنے سے روکا۔ دوسری مرتبہ اس نے چھوٹا سا گھونٹ لیا۔

دھیرے دھیرے وہ کڑواہٹ اور آگ اس کے لیے قابل برداشت ہوتی چلی گئی۔ تیسرا گلاس بنا کے اس نے گھونٹ لیا اور پھر کرسی سے کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔

''بہت محبت ہے تم سے۔'' وہ پھر بڑبڑایا۔ ''لیکن تم ہی مجھے ذلیل کروانا چاہو تو یہ نہیں ہوگا۔''

اس نے اپنے قدموں میں ڈگمگاہٹ محسوس کی تو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں رندھاوا کے الفاظ گونجے۔ ''شراب کا نشہ دائمی نہیں ہوتا۔ شراب پی کر غم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر آنکھ کھلنے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو اور بات ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، میں مسلسل پیتا رہوں گا۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے چونک کر شراب کی بوتل پر نظر ڈالی۔ اس نے تین گلاسوں میں اتنی شراب انڈیلی تھی کہ بوتل ایک چوتھائی سے کم رہ گئی تھی۔ ''یہ ختم کرتے کرتے نیند تو آجائے گی مجھے۔'' وہ پھر بڑبڑایا۔ ''صبح جاگوں گا تو...... کیا کروں گا۔'' اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ اس نے موبائل اٹھا کر رندھاوا سے رابطہ کیا۔ ''اور منگائی میرے لیے؟''

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر کہا گیا۔ ''تم پہلی مرتبہ پی رہے ہو۔ ابھی تم نے دو ڈھائی پیگ سے زیادہ نہیں پیے ہوں گے مگر تمہارے لہجے میں لکنت آگئی ہے۔''

''آگئی ہے نا!'' بختیار کھلکھلا کر ہنسا۔ وہ تیسرا گلاس ختم کر چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آگئی ہے تو آنے دو سالی کو......! فروزاں نہیں آتی تو نہ آئے، لکنت تو آرہی ہے نا......! یار یہ...... لکنت...... یہ کسی لڑکی کا نام بھی ہوسکتا ہے۔'' وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ شراب اب اس کے سر چڑھ کر بولنے لگی تھی۔ ''میرے لیے...... اور منگائی؟'' اس نے رندھاوا سے پوچھا۔

''کل لا دوں گا۔''

''نا ئیں......! صبح اٹھ کر کیا پیوں گا؟...... ابھی چاہیے......! کہیں سے بھی منگاؤ، ابھی منگاؤ...... نہیں تو میں...... شہر میں لوگوں سے پوچھتا پھروں گا کہ شراب کہاں ملتی ہے۔''

''پلیز!'' رندھاوا جلدی سے بولا۔ ''اس حالت

میں باہر مت نکلنا۔ میں ابھی...... گھنٹا بھر میں...... آتا ہوں لے کر!''

''شاباش جانِ من! تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔'' بختیار نے کسی حد تک جھومتے ہوئے کہا اور موبائل بند کردیا۔

''مزہ آرہا ہے اب!'' وہ چوتھا گلاس بناتے ہوئے مسکرایا۔ ''سالی اب کڑوی بھی نہیں لگ رہی ہے۔''

اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بج چکے تھے۔

''رات ہوگئی، فروزاں ابھی تک نہیں آئی۔'' وہ بڑبڑایا اور پھر یکا یک جھلا گیا۔ ''میں بھول کیوں نہیں رہا ہوں اسے!''

فروزاں سامنے آکھڑی ہوئی۔

''کیوں آئی ہو اب!'' وہ غصے سے چیخا۔ ''چلی جاؤ!'' اس نے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس اس پر کھینچ مارا جو دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ وہ صرف خیال تھا فروزاں کا جو شراب کے نشے نے بہت گہرا کردیا تھا۔

''چلی گئی۔'' وہ بڑبڑایا اور گلاس کے ٹکڑوں کو گھورتا رہا، پھر اٹھا اور دوسرا گلاس لے آیا۔ گلاس اس نے تپائی پر پٹخ سا دیا اور اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔ اس کے سر میں درد شروع ہوگیا تھا۔

''شٹ!'' اس نے منہ بنایا اور پھر جیب سے موبائل نکال کر رندھاوا سے رابطہ کیا۔ ''یہ میرے سر میں...... درد کیوں ہونے لگا؟''

''تیزی سے پی رہے ہوگے۔'' رندھاوا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''چھوٹے چھوٹے گھونٹ کچھ وقفے سے لو اور دروازہ کھولو!''

''دروازہ کھولوں؟'' بختیار حیرت سے بولا۔ ''بوتل میں دروازہ بھی ہوتا ہے؟''

''اپنی برداشت سے زیادہ پی چکے ہو تم!'' رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں تمہارے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ کال بیل بجانے ہی والا تھا کہ تمہاری کال آگئی۔''

''ارے!'' بختیار ہنسا۔ پھر اٹھ کر ڈگمگاتے قدموں سے بیرونی دروازے پر گیا۔ دروازہ کھلا تو سامنے رندھاوا پریشان سا کھڑا تھا۔

''لاؤ۔'' بختیار نے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا بڑا سا براؤن لفافہ لے لیا۔ ''بس اب جاؤ۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ شراب پی کر تنہائی بہت اچھی لگنے لگی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''کل شام کو ایک بوتل اور دے جانا۔''

رندھاوا نے ایک شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ ''اس میں چکن بروسٹ وغیرہ ہے۔ خالی پیٹ نہ پیتے رہنا۔''

''اچھا۔'' بختیار نے بچگانہ سعادت مندی سے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔ اس نے رندھاوا سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا تھا، جیسے وہ اس کا دوست نہیں، کوئی ملازم تھا جو اسے شراب اور کھانے پینے کا سامان دینے آیا تھا۔

کرسی پر بیٹھ کر اس نے لفافے میں سے بوتل نکالی اور اس پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ''اب تمہیں پیوں یا......'' اس نے پہلی بوتل پر نظر ڈالی جس میں اب ایک پیگ سے کچھ زیادہ شراب باقی رہ گئی تھی۔

''خالی پیٹ نہ پیتے رہنا۔'' اسے رندھاوا کی بات یاد آئی۔

اچھا! بختیار نے سر ہلایا اور شاپر میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں دو ڈبے تھے۔ ایک اضافی ڈبا رندھاوا اس لیے دے گیا ہوگا کہ وہ دوسرے دن بختیار کے کام آئے لیکن بختیار نے کھانا شروع کیا تو دوسرا ڈبا بھی خالی کر بیٹھا۔ پھر یک بہ یک اسے بہت زور کی قے آئی۔ اسے اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ باتھ روم کی طرف جاتا۔ فرش پر بچھا ہوا غالیچہ گندا ہوگیا۔ اس کے سوٹ پر بھی قے گری تھی۔ اس نے غالیچے ہی پر تھوک تھوک کر اپنا منہ صاف کیا اور کوٹ کی آستین سے ہونٹ صاف کیے۔

''خالی پیٹ نہ پیتے رہنا۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے رندھاوا کی بات دہرائی۔ ''بے وقوف!...... کھانے سے تو قے ہوجاتی ہے...... خالی پیٹ ہی پینا چاہیے۔''

اس نے محسوس کیا کہ قے ہوجانے سے نشہ بھی کم ہوگیا تھا۔ اس نے نئی بوتل کھولی۔ اسے اپنے گندے کپڑے تبدیل کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک گلاس بنایا۔ اس مرتبہ اس نے رندھاوا کی یہ بات خوش دلی سے مان لی تھی کہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے۔

گیارہ بج چکے تھے۔ بختیار کا نشہ پھر دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔ نئی بوتل سے اس نے دوسرا گلاس بنایا تو ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔

''تم زیادہ مزے کی ہو۔'' اس نے بڑے پیار سے ایک بار پھر نئی بوتل پر ہاتھ پھیرا۔ ''اب فروزاں یاد نہیں آرہی ہے۔'' وہ یک بہ یک چپ ہوگیا۔ اس کے گھومتے ہوئے دماغ میں بھی یہ بات آئی کہ اگر اسے فروزاں یاد نہیں

آ رہی تھی تو اس کا نام اس کی زبان پر کیوں آیا؟
نشہ نہیں ہوا ہے، اس نے حتمی انداز میں سوچا اور نیا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر بیٹھا۔ گلاس میز پر رکھ کر اس نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اسے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا۔ موبائل فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ سیدھا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ جیب خالی تھی۔ اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں آ گیا۔
''ہے.....لو.....'' اس نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔
دوسری طرف خاموشی رہی۔
''ہل.....لو!'' وہ قدرے زور سے بولا۔
جواب اب بھی نہیں آیا۔
''بولونا..... یار!'' بختیار نے منہ بنایا۔ اب اس کی آواز ایسی ہوگئی تھی جیسے زبان موٹی ہوگئی ہو۔ ''کون ہو بھائی میاں!''
اس مرتبہ دوسری طرف سے ہلکی سی نسوانی ہنسی سنائی دی اور پھر دوسری ہی طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
بختیار موبائل اپنے چہرے کے سامنے لایا۔ کون تھی یہ؟ اس نے سوچا، فروزاں؟
بختیار کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی بھنچ گئی اور موبائل پر گرفت اتنی سخت ہوئی کہ ہاتھ کی رگیں ابھر آئیں۔ پھر اس نے نیا گلاس بھرا۔ وہ فروزاں کو اتنا بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کا نام بھی اس کی زبان پر نہ آئے۔
وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا مگر کچھ جلدی جلدی!
آدھا گلاس خالی ہوا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔
کون آ گیا اب؟ اس نے سوچتے ہوئے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی اسے دو کے بجائے چار سوئیاں گڈمڈ ہوتی نظر آئیں۔ وہ ہنسا، سالی آنکھوں نے بھی شراب پی لی ہے!
وہ صوفے سے اٹھا۔ گلاس ہاتھ میں لیے وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ہینڈل پر گرفت کرنے میں اسے کچھ دقت ہوئی۔ بہرحال اس نے دروازہ کھول دیا۔
باہر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بختیار نے آنکھیں مچکا کر اسے پہچاننا چاہا مگر نہیں پہچان سکا۔
''کون.....کون.....؟'' بختیار اتنا ہی بول سکا۔
''اتنی کیوں پی لی تم نے!'' لڑکی نے کہا اور اندر آ گئی۔
''بس پی لی.....! مرضی میری.....'' بختیار نے جھومتے ہوئے کہا۔
لڑکی نے دروازہ بند کیا جس میں آٹومیٹک لاک تھا۔ اس نے دروازہ بولٹ بھی کیا۔
''تم سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا ہے ٹھیک سے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''آؤ۔'' اس نے بختیار کا ایک ہاتھ اپنے شانے پر پھیلا لیا۔ ''مجھ پر زور ڈال کر چلو۔''
بختیار نے قدم بڑھاتے ہوئے ایک گھونٹ لیا۔
''بو آ رہی ہے تمہارے لباس سے۔'' لڑکی بولی۔ ''شاید قے کی ہے تم نے!''
بختیار کچھ نہیں بولا۔ اب اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس گرا اور ٹوٹ گیا۔ جو شراب اس میں تھی، وہ بہہ گئی..... دماغ پر اندھیرا چھاتا چلا گیا۔
حواس جب بیدار ہوئے تو وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پوری طرح کھولنے کی کوشش کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کے پپوٹے بہت وزنی محسوس ہو رہے تھے۔ فوری طور پر اسے یہ بھی یاد نہیں آ سکا کہ وہ کون تھا اور کہاں تھا۔ دھیرے دھیرے ہی اسے یاد آنا شروع ہوا۔ پہلے اسے یہ ادراک ہوا کہ وہ کون ہے۔ پھر یاد آیا کہ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔
مزید کچھ یاد آنے سے پہلے وہ یک بیک اسی طرح اچھل کر کھڑا ہوا جیسے اسے کسی اسپرنگ نے اچھال دیا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس لاش کی طرف دیکھنے لگا جو غالباً کچھ سے ذرا ہٹ کر فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک چاقو اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن میں پیوست تھا۔
وہ لاش شبانہ کی تھی..... اس کی گردن میں پیوست چاقو کا دستہ بھی خون سے رنگین تھا، جیسے قاتل نے چاقو اس کی گردن میں اتارنے کے بعد اس پر اپنی گرفت اس وقت تک قائم رکھی ہو جب تک شبانہ نے تڑپ تڑپ کر جان نہ دے دی ہو۔
خون اس کی گردن سے ادھر ادھر پھیلا تھا اور بہتے ہوئے اس کی موٹی پتلی دھاریں بھی کئی اطراف گئی تھیں۔ ان میں سے دو کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ ایک دروازے کے قریب جا کر ختم ہوگئی تھی لیکن دوسری دروازے کے نیچے غائب تھی۔
''خدایا!'' بختیار کے منہ سے نکلا اور اس نے

آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ فوراً اسے اپنے چہرے پر چپچپاہٹ محسوس ہوئی تھی۔ بختیار نے جلدی سے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ خون میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ خون تازہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے کچھ دھبے بائیں ہاتھ پر بھی آئے تھے۔

نشہ بالکل کافور ہو جانے کے باوجود بختیار پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب کال بیل بجی تھی تو اس نے نشے ہی کی حالت میں جا کے دروازہ کھولا تھا اور کوئی لڑکی اندر آئی تھی۔ بختیار اپنی آنکھوں پر بار بار چھاتی ہوئی دھند اور گہرے نشے کے باعث اسے پہچاننے سے قاصر رہا تھا۔

کیا وہ لڑکی شبانہ ہی تھی؟

بختیار اپنے دماغ میں ابھرنے والے سوال پر توجہ نہیں دے سکا کیونکہ اسی وقت بیرونی دروازے کے باہر کچھ قدموں کی آہٹیں ہوئی تھیں اور پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی۔ ''لاک کھولیے!''

لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔

''نہیں کھل رہا۔'' فروزاں کی آواز آئی۔ ''اندر سے بولٹ کیا گیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ توڑنا پڑے گا۔''

اس کے بعد دروازہ توڑنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اس وقت بختیار سکتے کی سی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔

پھر دروازہ توڑ کر جو لوگ اندر آئے، ان میں فروزاں کے ساتھ پولیس کے لوگ تھے۔

''نہیں۔'' بختیار یکایک پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔ ''یہ قتل میں نے نہیں کیا۔''

لیکن اس طرح چیخنا اس کے کام نہیں آسکا۔ اسے گرفتار کرلیا گیا۔

فروزاں آنکھیں پھاڑے کبھی شبانہ کی لاش کی طرف اور کبھی بختیار کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بختیار جب حوالات میں تھا تو اسے معلوم ہوا کہ فروزاں اپنی کچھ ضروری چیزیں لینے کے لیے صبح ہی صبح وہاں آئی تھی۔ لاک کی دوسری چابی اس کے پاس تھی لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے وہ اس وقت رک گئی جب اس نے وہ خون جما ہوا دیکھا جو دروازے کے نیچے سے باہر تک پہنچ گیا تھا۔

یہ باتیں بختیار کو رندھاوا سے معلوم ہوئی تھیں جو اس سے ملنے آیا تھا اور بہت اداس تھا۔ اس کی باتوں نے ظاہر کر دیا کہ وہ بختیار کو قاتل نہیں سمجھ رہا تھا۔

بختیار کی خالہ، خالو، خالہ زاد بھائی آفتاب اور عبداللہ خان تک اسے قاتل تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

مگر ان سب کے خیالات کچھ بھی ہوں۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو تمام ثبوت بختیار کے خلاف ہی تھے۔ فلیٹ مقفل تھا۔ اس کی ایک چابی بختیار کے پاس اور دوسری فروزاں کے پاس تھی۔ ایسے شواہد نہیں تھے کہ اس قتل میں فروزاں کا ہاتھ ہوگا۔ شبانہ کی گردن میں پیوست چاقو کسی حد تک اس کی گردن کے مہرے تک میں دھنس گیا تھا اور اتنی طاقت فروزاں میں نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ شبانہ کا قتل رات ایک بجے کے لگ بھگ ہوا تھا اور اس وقت فروزاں عبداللہ خان کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں بیرون ملک جانے والے اپنے کسی عزیز کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس لوٹے تھے۔

بختیار ایک الزام سے البتہ بچ گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق شبانہ تین ماہ کی حاملہ تھی اس لیے بختیار کا ڈی این اے ٹیسٹ لیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں تھا۔

مخالف وکیل نے یہ کہانی بنائی تھی کہ شبانہ اور بختیار آرٹس کونسل میں ایک دوسرے سے واقف ہوئے تھے۔ شبانہ ماڈل گرل ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں سے تعلقات بھی رکھتی تھی۔ انہی میں سے کوئی اس کے ہونے والے بچے کا باپ ہوسکتا تھا۔ شبانہ بارہ بجے کے قریب بختیار سے ملنے پہنچی تھی۔ اس نے بختیار کے ساتھ شراب نوشی کے دوران میں کوشش کی کہ بختیار اس کا گناہ اپنے سر لے لے۔ اس پر نشے کے باعث دونوں میں کچھ تلخ کلامی ہوئی تو بختیار نے شراب کے نشے اور غصے میں شبانہ کو قتل کر دیا اور چونکہ بختیار بہت زیادہ پی چکا تھا اس لیے نشے میں اپنے جرم کی سنگینی کا احساس نہ کرسکا اور دھت ہو کر وہیں سو گیا۔

میڈیکل ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ بختیار بہت زیادہ پی گیا تھا اور جو شراب اس نے پی تھی، وہی شبانہ کے معدے میں بھی پائی گئی تھی۔ کمرے کی تپائی پر شراب کے دو گلاس بھی ملے تھے جن میں سے ایک پر شبانہ کی انگلیوں کے نشانات اور لپ اسٹک کے داغ تھے جبکہ چاقو کے دستے پر بختیار کی ساری انگلیوں کے نشانات تھے۔ بختیار کو جب گرفتار کیا گیا تھا، اس وقت بھی اس کے ہاتھ شبانہ کے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔

بختیار کے بہت زیادہ پینے کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ

شادی کے دو دن بعد ہی کوئی جھگڑا ہونے پر اس کی بیوی اسے چھوڑ کر اپنے باپ کے پاس چلی گئی تھی۔
گواہی کے لیے فروزاں کو بھی عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا۔ اس نے جھگڑے کی وجہ ذاتی بتاتے ہوئے اس کے اظہار سے گریز کیا تھا لیکن یہ بات صاف صاف کہہ دی تھی کہ اس جھگڑے کا شبانہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
مخالف وکیل نے یہ قیاس بھی کیا تھا کہ بختیار، شبانہ کے بچے کا باپ نہ سہی مگر ان دونوں میں تعلقات ضرور تھے۔ بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے فون پر ان دونوں کا رابطہ ہوا تھا، بختیار نے رات گزارنے کے لیے اسے اپنے گھر بلایا ہوگا اور رات بھر وہاں رکنے کے ارادے ہی کے باعث شبانہ اپنی کار کے بجائے ٹیکسی سے وہاں پہنچی تھی۔
پولیس کو وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی مل گیا تھا جس نے شبانہ کو اپنی ٹیکسی سے بختیار کے اپارٹمنٹ کے سامنے اتارا تھا۔
بختیار اس کے علاوہ کوئی بیان نہیں دے سکا کہ وہ بہت زیادہ نشے میں تھا جب کوئی لڑکی اس کے اپارٹمنٹ میں آئی تھی۔ وہ نشے کے باعث اسے پہچان بھی نہیں سکا تھا۔
شراب اس کے پاس کہاں سے آئی؟
عدالت کے اس سوال کے جواب میں بختیار نے اپنے دوست رندھاوا کو ملوث کرنا دوستی کے آداب کے منافی سمجھتے ہوئے یہ بات شبانہ ہی پر ڈال دی تھی۔
''مجھے علم تھا کہ وہ شراب پیتی تھی۔'' بختیار نے کہا تھا۔ ''میری خواہش پر وہ شام ہی کو مجھے ڈیڑھ بوتل شراب دے گئی تھی۔''
بختیار کے اس بیان کی وجہ سے مخالف وکیل کے اس قیاس کو خاصی تقویت ملی کہ ان دونوں میں ناجائز تعلقات تھے۔
انہی تمام حالات کی روشنی میں بختیار کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔
پولیس جب اسے عدالت سے لے جا رہی تھی، فروزاں نے اسے روک کر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے طلاق دے دے کیونکہ وہ عمر بھر اس کے انتظار میں بیٹھی نہیں رہ سکتی۔
بختیار نے اس کو جواب دیا تھا کہ طلاق دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں کہ یہ کھڑے گھاٹ دے دی جائے لیکن فروزاں اس پر اڑ گئی تھی کہ تین مرتبہ طلاق کا اعلان کر دیا جائے تو طلاق ہو جاتی ہے۔
بختیار کے خیال کے مطابق اس طرح طلاق نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب ان کی باتوں کو سن کر لوگ جمع ہونے لگے اور دوسری طرف پولیس بھی اسے وہاں سے لے جانے کے لیے بے چین تھی لہٰذا بات ختم کرنے کے لیے اس نے صرف اتنا کہا کہ ''تم جو چاہو سمجھو...... میری طرف تم پر کوئی پابندی نہیں ہے'' اور اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تاکہ بات مزید نہ بڑھ سکے۔
عدالت سے وہ جیل پہنچ گیا جہاں اسے دس دن سے زیادہ نہیں گزارنا پڑے۔ نامعلوم جرائم پیشہ افراد نے جیل توڑی تو بختیار کو بھی وہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔
چھپتے چھپاتے پولیس سے بچتے، اس نے غریبوں کی ایک نواحی بستی میں قدم رکھا اور وہاں اسے پروین کے گھر میں پناہ مل گئی۔



بیس دن گزر گئے!
بختیار کے بال خاصی تیزی سے بڑھتے تھے۔ ان دنوں اس کے سر کے بالوں کے ساتھ شیو بھی اتنا بڑھا کہ ڈاڑھی معلوم ہونے لگی اور مونچھیں بھی اچھی خاصی ہو گئیں۔
ابتدائی دنوں میں بختیار چند روز کے لیے بخار میں مبتلا ہو گیا تھا۔ علاج کے لیے گھر سے نکلنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کچھ دواؤں کے نام اسے یاد تھے جو پروین نے اسے قریب کے کسی میڈیکل اسٹور سے لا کر دی تھیں۔ اس کے یہ اخراجات بھی پروین ہی پورے کر رہی تھی۔
ابتدائی دو ایک دن تو ایسے گزرے تھے کہ بختیار پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ دماغ جیسے ہوا میں اڑنے لگا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی چیزیں دکھائی دینے لگی تھیں جو اس نے شاید کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ پھر ایک بار یہ بھی ہوا کہ اسے فروزاں نظر آئی۔
''فروزاں!'' اس کے منہ سے چیخ سی نکلی اور اس نے فروزاں کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا تھا۔
پھر جب اس کا بخار اترا تو وہ سب کچھ اسے کسی خواب کی طرح یاد تھا۔
''میں تم لوگوں کے لیے مالی اعتبار سے بھی بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔'' بختیار نے پروین سے کہا تھا۔ ''لیکن جب بھی میں اپنے حالات درست کر سکا، واپس آ کر سب کچھ ادا کر دوں گا۔''
''میں اخراجات پورے کرنے کے لیے سلائی زیادہ کرنے لگی ہوں۔'' پروین کی آواز معمول کے مطابق سپاٹ تھی۔ ''تھوڑا بہت جوڑ کے بھی رکھا تھا جو کام آ گیا۔ آپ

اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔''
بیماری کے ان دنوں میں پروین نے اس کا خیال بھی بہت رکھا تھا۔ اس کے کھانے کے لیے ہلکی غذائیں بھی تیار کی تھیں۔ اس کے رہنے کے لیے وہ کمرا مخصوص کر دیا گیا تھا جہاں آسیہ خالہ رہتی تھی مگر ان دنوں میں اس نے اپنا ٹھکانا اسی کمرے میں کرلیا تھا جہاں سلائی مشین رکھی تھی۔ اس طرح کپڑے سلوانے والی عورتوں کو اس سے ملنے کے لیے اس کمرے میں آنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی جہاں آسیہ خالہ اپنا دن کا وقت گزارا کرتی تھی۔ رات کو تو وہ دونوں ماں بیٹی صحن ہی میں سویا کرتی تھیں۔

اکیسویں دن بختیار نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل جائے گا۔ اس نے پروین کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

''میں دس پندرہ دن بعد ضرور واپس آؤں گا۔'' اس نے مزید کہا۔ ''تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اس کا صلہ تو نہیں دیا جاسکتا، میں تم دونوں ماں بیٹی کے لیے جو کچھ بھی کرسکا، ضرور کروں گا۔''

''آپ کچھ کریں یا نہ کریں، آیئے گا ضرور۔ آپ مجھے یاد رہیں گے۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے پروین کی نظریں جھک گئی تھیں۔ بختیار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت بھی پروین کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے لیکن اس کا آخری فقرہ کچھ معنی رکھتا تھا۔ بختیار کے دماغ میں بہت سے خیالات چکرا گئے۔

''یہاں سے وہ سڑک قریب ہی ہے جہاں سے بس ملتی ہے۔'' پروین نے کچھ توقف سے نظریں اٹھا کر کہا۔

''جب میں اس بستی میں آیا تھا تو وہ سڑک دیکھ لی تھی۔''

''تیرہ روپے لیتا ہے بس والا، یہ رکھ لیجیے!'' اس نے دس دس کے دو نوٹ نکال کر بختیار کی طرف بڑھائے۔

بختیار نے اب تک نقد کچھ نہیں لیا تھا۔ اب بھی اس کا ہاتھ آگے نہ بڑھ سکا تو پروین نے وہ نوٹ اس کے قریب رکھ دیے اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

رات کا اندھیرا پھیلے جب دو گھنٹے گزر چکے تو پروین، بختیار کے ساتھ بیرونی دروازے پر پہنچی۔ طے پایا تھا کہ پروین دروازہ کھول کر باہر دیکھے گی اور جب گلی میں سناٹا ہوگا تو اس کا اشارہ ملتے ہی بختیار باہر نکل جائے گا۔ پروین تو کیا، وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس گھر سے نکلتے دیکھے۔

''خدا حافظ۔'' پروین کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی جب بختیار اس کا اشارہ ملتے ہی تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ پروین کی آواز کا وہ گھٹا گھٹا انداز اس کے جذباتی ہوجانے کا مظہر تھا۔ بختیار کا ذہن اس سوال میں الجھ گیا کہ پروین اسے رخصت کرتے ہوئے جذباتی کیوں ہوگئی تھی؟ بختیار کو اس کی یہ بات بھی یاد تھی کہ وہ اسے یاد رہے گا۔

بختیار کو گمان ہوا کہ وہ سیدھی سادی لڑکی اسے پسند کرنے لگی تھی، یا اس کی پسندیدگی محبت کی حدوں کو چھونے لگی تھی۔

اگر واقعی ایسا ہے تو اس میں کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں، بختیار آگے قدم بڑھاتے ہوئے سوچتا رہا...... جب کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی زندگی میں پہلی مرتبہ جنس مخالف کے قریب ہوتے ہیں تو اسی کو پسند کرنے لگتے ہیں اور پروین ایک ایسی ہی سیدھی سادی لڑکی تھی جو اپنی زندگی میں پہلے کبھی کسی مرد کے اتنا قریب نہیں رہی ہوگی۔

بختیار نے اپنے دل میں پروین کے لیے ہمدردی محسوس کی اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

سامنے سے دو آدمی آرہے تھے۔ بختیار خود کو ان کی طرف سے بے پروا ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اس نے بس کن انکھیوں سے دیکھا تھا کہ وہ دونوں اسے غور سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ غالباً اس بستی میں رات کے وقت کسی اجنبی کا گزر نہیں ہوتا ہوگا۔ دوسرے بختیار کی وضع قطع بھی عام آدمیوں کی سی نہیں تھی۔ اس کے بال خاصے بڑھے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں بھی ترشی ہوئی نہیں تھیں۔ بختیار بس اتنا کرسکا تھا کہ اس نے ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کرلی تھی۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد اس نے جو بس آتی دیکھی، اسی کو ہاتھ دے کر روک لیا اور اس میں سوار ہوگیا۔ بس میں کچھ ہی مسافر تھے۔ انہوں نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ بختیار کو یہ اطمینان تو تھا کہ اسے ''مفرور قیدی'' کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا جاسکے گا لیکن اسے مشکوک شخص سمجھا جاسکتا تھا۔ اگر بس میں محکمۂ پولیس کا کوئی آدمی سادہ لباس میں موجود ہوتا تو وہ بختیار کے لیے کسی پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔

لیکن ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی اور بس جب شہر کے بارونق علاقوں میں داخل ہوئی تو بختیار ان سب مقامات کو پہچاننے لگا۔

ایک جگہ وہ بس سے اتر گیا۔ وہاں سے رندھاوا کا

گھر دو میل کے فاصلے پر تھا۔ بختیار نے اپنی خالہ کے گھر کا رخ کرنے کے بجائے رندھاوا کے گھر جانے کا فیصلہ پروین کے گھر ہی میں کرلیا تھا۔
جب اس نے رندھاوا کے گھر کی کال بیل کا بٹن دبایا، گیارہ بجنے والے تھے۔ اسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ شاید رندھاوا اس وقت گھر پر نہ ہو۔
کسی بچے نے پھاٹک کھولے بغیر اندر سے پوچھا۔
''کون ہے؟''
''رندھاوا صاحب ہیں؟'' بختیار نے بلند آواز میں پوچھا۔
''بابا! بابا!'' بچہ چیخا۔ ''کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔''
بختیار کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رندھاوا نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا اور اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔
''کیا بات ہے؟ کون ہو؟'' وہ سخت لہجے میں بولا۔ ممکن ہے کہ وہ بختیار کو فقیر ہی سمجھا ہو۔ بختیار کو خوشی ہوئی کہ رندھاوا بھی اسے فوراً نہیں پہچان سکا تھا۔
''میں بختیار ہوں رندھاوا!'' وہ بولا۔
''ارے!'' رندھاوا اس کی آواز سن کر چونکا اور پھر اسے سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''جلدی سے اندر آؤ۔''
بختیار نے اندر قدم رکھا۔ رندھاوا نے فوراً پھاٹک کا ذیلی دروازہ بند کیا۔ ''تم یہیں رکو۔ میں بیرونی کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں۔ گھر کے لوگ نہ دیکھ لیں کہ اس حال میں کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔''
ذرا ہی دیر بعد بختیار اور رندھاوا ایک کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور بختیار اپنی ساری کہانی سنا رہا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد رندھاوا نے کہا۔ ''مجھے شروع ہی سے یقین رہا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو سکتے اس لیے...... اچھا خیر چھوڑو! وہ باتیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تمہارے کھانے پینے کا اور تمہارا حلیہ درست کرنے کا کچھ بندوبست کروں۔''
رندھاوا نے گھر کے کسی فرد کو وہاں نہیں آنے دیا، خود ہی ایک ٹرے میں اس کے لیے کھانا لے کر آیا۔
بختیار نے جیل میں اور اس کے بعد پروین کے گھر میں بھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا لیکن رندھاوا کے گھر میں کھانا کھاتے ہوئے بھی اس کی توجہ کھانے کی لذت کی طرف نہیں گئی۔ اس کا دماغ اپنی غیر یقینی صورت حال میں الجھا رہا۔
''فروزاں کا کیا حال ہے؟'' اس نے کھانے کے دوران میں پوچھا۔ اس خیال سے اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ وہ کہیں کنور ثقلین سے شادی نہ کر بیٹھی ہو۔
''اب بھی اسی کے بارے میں سوچتے رہتے ہو۔'' رندھاوا افسردگی سے مسکرایا۔
''کیوں نہ سوچوں؟ وہ مجھے پسند نہیں کرتی لیکن وہ میری بیوی تو ہے۔''
''تم اسے طلاق دے چکے ہو یار!''
''تم بھی اسی کی طرح سوچ رہے ہو؟ نہیں رندھاوا، اس طرح طلاق نہیں ہوتی۔ مذاق نہیں ہوتا میاں بیوی کا رشتہ کہ جب چاہو کچے دھاگے کی طرح توڑ دو۔ یہ ایک عام رواج سا تو ہو گیا ہے لیکن...... چھوڑو، میں ابھی اس پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ......''
''وہ ان دنوں میں آرٹس کونسل نہیں گئی۔'' رندھاوا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس دوران میں خاص طور سے معلومات حاصل کی تھیں۔ غالباً وہ گھر تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ عبداللہ خان اس کے لیے بہت مغموم رہتے ہیں۔''
''کنور ثقلین؟''
''اس کے بارے میں بھی معلوم کیا تھا۔ اسے شبانہ کے قتل کے بعد کہیں نہیں دیکھا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ شبانہ کے قتل سے پہلے بیرون ملک چلا گیا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں گیا تھا۔ حالانکہ وہ سیاست میں قدم رکھ چکا ہے لیکن صحافیوں کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ اسے کسی سے اپنی جان کا خطرہ تھا اس لیے اس نے کچھ دنوں کے لیے ملک سے چلا جانا ضروری سمجھا۔''
یہ ساری باتیں الجھی ہوئی تھیں لیکن بختیار کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ فروزاں نے کسی سے شادی نہیں کی تھی۔
''تم نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیوں کی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔
''فروزاں کے بارے میں؟''
''ہاں۔''
رندھاوا چند لمحے چپ رہا، پھر اس نے بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس قتل کے معاملے میں ہر پہلو پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اسے اس صبح اپنی ضروری چیزیں لینے کا خیال کیوں آیا جس رات شبانہ قتل ہوئی۔''
بختیار حیرت سے بولا۔ ''تم کیا سوچ رہے ہو

رندھاوا؟''

''میں۔'' رندھاوا نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''فروزاں خود تو قتل نہیں کر سکتی لیکن وہ قاتل کی رازدار ہوسکتی ہے۔''

بختیار حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

رندھاوا نے بات جاری رکھی۔ ''اس نے باپ کی وجہ سے شادی کی تھی تم سے......! ممکن ہے کہ وہ تم سے جان چھڑانا چاہتی ہو تاکہ بعد میں اپنی خواہش کے مطابق شادی کرسکے۔''

بختیار مضطربانہ انداز میں کھڑا ہوگیا۔

''کھانا تو کھاؤ!'' رندھاوا بولا۔

''بس کھا چکا۔'' بختیار نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بڑی عجیب بات کی ہے رندھاوا۔''

''میں اور جمال ہر پہلو پر غور کررہے ہیں۔''

''جمال کون؟''

''میرا ایک دوست ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصے پہلے سی آئی ڈی میں آیا ہے۔ کوئی بڑا کام کرکے نمایاں ہونے کی دھن سوار ہے اس پر......! اسی لیے میں نے اس سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اگر وہ شبانہ کے اصل قاتل کا پتا لگانے میں کامیاب ہوجائے تو دھوم تو مچ جائے گی اس کی۔''

بختیار جو غور سے اس کی بات سن رہا تھا، آہستہ سے بولا۔ ''کیا تم اسے یہ بھی بتادو گے کہ میں آگیا ہوں۔''

''ابھی تو میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔''

''تم یا جمال آخر کیا سوچ رہے ہیں فروزاں کے بارے میں؟''

''شاید وہ اس شخص سے واقف ہو جس نے قتل کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی نے کسی سے مل کر شبانہ کو اس لیے قتل کروایا ہو کہ تم اس جرم میں پھنس کر سزا پاجاؤ اور اسے تم سے نجات مل جائے۔''

بختیار مضطرب ہوکر بولا۔ ''کیا وہ اس حد تک جاسکتی ہے؟''

''ضروری نہیں۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''ہمیں ہر امکان پر غور کرنا چاہیے۔ یہ جمال کا کہنا ہے۔ شاید فروزاں وہاں گئی ہی اس لیے ہو کہ شبانہ کی لاش دیکھنے کے بعد پولیس کو اطلاع دے لیکن یہ اتفاق ہے کہ اسے اندر داخل ہونے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ خون بہتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ وہی دیکھ کر اس نے پولیس کو فون کردیا۔''

''یقین نہیں آتا۔'' بختیار بڑبڑایا۔

''ابھی کسی بات پر یقین کرنا بھی نہیں چاہیے۔ فی الحال صرف امکانات کا جائزہ لینا ہے۔ جمال اس کے لیے بھی کوشاں ہے کہ کسی طرح شبانہ کے جاننے والوں کا ڈی این اے حاصل کرلے۔ اس طرح یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ شبانہ جس بچے کی ماں بننے والی تھی، اس کا باپ کون ہے۔ یہ امکان بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا باپ کنور ثقلین ہو اور اسی نے شبانہ کو قتل کروایا ہو۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار والی بات ہوسکتی ہے۔ اسے شبانہ سے اور فروزاں کو تم سے نجات۔''

''بڑی ہولناک باتیں کررہے ہو تم!''

''یہ قطعی ہولناک نہیں ہیں۔ تمھیں یہ اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ اس میں فروزاں کا نام بھی آرہا ہے۔''

بختیار نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کسی کا ڈی این اے حاصل کرنا آخر کیسے ممکن ہے؟ یہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ چرائی جائے...... اور کنور ثقلین...... تم بتارہے ہو کہ وہ یہاں ہے ہی نہیں۔''

''اگر کسی اور کے ڈی این اے سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکے تو پھر قوی امکان یہی ہوگا کہ شبانہ کے اس بچے کا باپ کنور ثقلین ہی ہوگا۔ ہم اس کا انتظار کریں گے۔ وہ کبھی تو لوٹے گا۔ اس کا سبھی کچھ یہیں ہے۔ اس کے لیے اسے آنا تو پڑے گا۔''

''کتنے لوگوں کا ڈی این اے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی آخر! شبانہ کے جاننے والوں کی کمی تو نہیں۔''

''ہاں کمی تو نہیں! اگر میں ان میں سے ایک نام لوں تو تم پھر اچھل پڑو گے۔''

''ایسا کون ہے؟''

''تمہارا خالہ زاد۔''

''آفتاب!'' بختیار چونک پڑا۔

''ہاں۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''مجھے اس کی اور شبانہ کی شناسائی کا علم تمہارے ولیمے کی تقریب میں ہوا تھا۔ وہ دونوں بہت بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتے نظر آئے تھے۔''

''ہاں۔'' بختیار نے اثبات میں سرہلایا۔ ''مجھے خود بھی تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی کہ وہ اور شبانہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''خالہ اور خالو کا کیا حال ہے؟ خالہ تو بہت مغموم ہوں گی۔''

''قدرتی بات ہے۔ وہ تمہیں آفتاب سے زیادہ

چاہتی ہیں۔ خالو کو بھی رنج تو ہوا ہے۔ تم نے اچھا کیا جو وہاں کا رخ نہیں کیا۔ جیل سے تمہارے فرار کے بعد پولیس کو خیال تھا کہ تم وہاں پہنچو گے پولیس نے دس بارہ دن تک وہاں کی کڑی نگرانی کی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ خفیہ طور پر اب بھی ہو رہی ہو۔"

"تمہارے دوست جمال کو تو معلوم ہو سکتا ہے۔"

"اگر وہ معلوم کرنا چاہے۔" رندھاوا نے جواب دیا "لیکن ہم دونوں ہی نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ پولیس کو خواہ مخواہ کیوں معلوم ہو کہ سی آئی ڈی کا کوئی افسر اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

بختیار اثبات میں سر ہلا کے کچھ سوچنے لگا۔

رندھاوا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "فروزاں سے ملنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟"

"سوچ تو رہا تھا لیکن...... تمہاری باتوں کے بعد......" بختیار نے اپنی بات پوری نہیں کی۔

"ہاں۔" رندھاوا نے کہا۔ "فی الحال اس کا خیال ذہن سے نکال دو اور اطمینان سے یہاں رہو۔"

"اطمینان سے!" بختیار پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر والے بھی ادھر اس وقت تک نہیں آتے جب تک میں نہ لاؤں۔ یہاں باتھ روم بھی ہے۔" رندھاوا نے باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "کل میں تمہارے لیے مناسب لباس بھی خرید لاؤں گا۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ تم نڈھال نظر آ رہے ہو۔"

"کھانے کے بعد واقعی خود کو نڈھال محسوس کر رہا ہوں۔"

"ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھا کر تم خاصے بدل گئے ہو لیکن مناسب ہوگا کہ یہ مناسب انداز میں ترشوائے جائیں۔ بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی مونچھوں کی وجہ سے تم کسی کی نظر میں مشکوک ہو سکتے ہو۔"

"کسی ہیئر ڈریسر کے پاس جانا بھی تو ٹھیک نہیں رہے گا۔"

"میں تمہیں کل دن میں تو نہیں لیکن کچھ اندھیرا پھیلنے کے بعد کسی فٹ پاتھی نائی کے پاس لے چلوں گا اور کل دن میں جب تمہارے لیے کپڑے لاؤں گا تو ایک چشمہ بھی خرید لاؤں گا۔ چشمے کی وجہ سے تم اور بدلے ہوئے نظر آؤ گے...... اب تم آرام کرو۔"

اس کمرے میں صوفہ سیٹ کے ساتھ ایک دیوان بھی تھا۔ کیونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لیے کمبل وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک طرف چھوٹے اسکرین کا ٹی وی بھی رکھا تھا۔

رندھاوا نے اسے آرام کرنے سے پہلے پانی کا فلاسک جگ اور گلاس لا کے رکھ دیا۔ ایک تکیہ اور چادر بھی لا دی جبکہ گرمی کے اس موسم میں چادر کی ضرورت نہیں تھی۔

بختیار جب لیٹا تو دیگر بہت سے خیالات کی طرح اس کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ ماضی میں وہ بھی کسی جمال کو جانتا تھا اور اس جمال سے اس کی قربت بھی رہی تھی۔ بختیار کے دماغ میں آنے والے دوسرے خیالات زیادہ گمبھیر تھے اس لیے جمال کا خیال ان خیالات میں دب گیا۔

دوسری صبح وہ معمول کے مطابق جلدی جاگا حالانکہ رات کو دیر سے سویا تھا۔

رندھاوا نے ناشتا اس کے ساتھ اسی کمرے میں کیا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا تھا کہ اس کا کوئی دوست بیرونی شہر سے آیا ہے اور چند دن وہیں رہے گا۔ اس دوران میں گھر کا کوئی فرد اس طرف نہ جائے۔

ناشتے کے دوران میں طے پانے والے پروگرام کے تحت رندھاوا صرف ایک گھنٹے کے لیے بینک گیا اور کوئی ایمرجنسی بتا کر چند دن کی چھٹی لے لی۔ جب وہ واپس لوٹا تو ان سب چیزوں سے لدا پھندا تھا جو بختیار کے لیے ضروری تھیں۔ ان میں ایک نیا موبائل فون بھی تھا جس کی سم اس نے اپنے ہی نام سے ایکٹی ویٹ کروائی تھی۔

"جمال نے آج ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے دو آدمیوں کا خون تو لے لیا ہے۔" اس نے کھانے کے دوران میں بتایا۔

بختیار سر جھٹک کر بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی بھی شخص اپنا خون دینے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا ہے جب تک اس پر قانون کا دباؤ نہ ہو۔"

"راہ چلتے کسی کے پن چبھو دینا کوئی مشکل کام ہے؟" رندھاوا مسکرایا۔

"کیا مطلب!"

"اور جب پن چبھے تو ہلکی سی سسکاری لے کر ادھر ادھر دیکھنے پر اس شخص کو معلوم بھی نہ ہو سکے کہ اسے پن کس نے چبھوئی تھی...... تو؟"

"تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو!"

"دراصل اب لا انفورسمنٹ ایجنسیوں میں کچھ آدمیوں کو اس کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔" رندھاوا نے بتایا۔ "ان کے لیے مخصوص قسم کی بہت چھوٹی سرنج بنوائی

جاتی ہیں۔ اس سرنج کے لگنے سے آدمی کو بس اتنا محسوس ہوتا ہے کہ اسے پن چبھی ہے۔ یہ کام کرنے والے کو بڑی پھرتی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اس کی ضرورت اسی لیے محسوس کی گئی کہ جس پر قانوناً دباؤ نہ ڈالا جا سکے، اس کا خون بھی لیا جا سکے۔''

''اوہ!'' بختیار کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

''مال کے محکمے میں بھی ایسی مہارت رکھنے والے موجود ہیں۔ انہی میں سے ایک کو جمال نے اپنے اعتماد میں لیا ہے۔''

اب بات بختیار کی سمجھ میں آگئی تھی۔

''جمال نے ایسے آدمیوں کی فہرست تیار کرلی ہے جن سے شبانہ بے تکلف تھی۔'' رندھاوا نے مزید بتایا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ اگر ان سب میں سے کوئی مطلوبہ شخص نہ ملا تو پھر وہ ان لوگوں کو بھی دیکھے گا جن سے شبانہ کے تعلقات بہ ظاہر رسمی سے نظر آتے ہیں۔''

دفعتاً بختیار کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''تمہارے اس دوست جمال کے والد کا کیا نام ہے؟''

''کیوں؟'' رندھاوا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں رات سے ہی سوچتا رہا ہوں کہ ماضی میں اس نام کا مجھ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ابھی تم سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ آٹھویں جماعت سے میٹرک تک ایک لڑکا جمال میرا کلاس فیلو تھا۔ اس سے میری خاصی بنتی تھی۔ پھر وہ پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد...... وہ جو کہتے ہیں نا کہ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل...... تو بس...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکول کے زمانے کی بہت سی باتیں یاد نہیں رہیں۔ میں اس جمال کو بھی بھول گیا۔ شاید وہ بھی مجھے بھول چکا ہوگا لیکن یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا دوست جمال وہی جمال ہوگا جو میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ اگر تم اس کے والد کا نام بتا دو تو بات واضح ہو جائے گی۔''

''مجھے اس کے والد کا نام نہیں معلوم۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی تصویر میرے موبائل میں موجود ہے۔''

''دکھاؤ۔'' بختیار نے بے تابی سے کہا۔

رندھاوا نے پہلے ہی اپنا موبائل نکال لیا تھا۔ اس نے بختیار کو تصویر دکھائی۔

''وہی۔'' بختیار پرجوش ہوگیا۔ ''یہ وہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ برسوں پرانی بات ہوگئی لیکن اس کے نقش و نگار بتا رہے ہیں کہ یہ وہی ہے۔ تم اس سے اس کے والد کا نام پوچھو۔ مجھے تو یہ وہی معلوم ہوتا ہے۔''

''نام تو میں پوچھ لوں گا لیکن اگر یہ وہی ہوا تو کیا تم اس سے ملو گے؟''

بختیار کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ سب کچھ میں نے ابھی نہیں سوچا۔ وہ اب ایک سرکاری آفیسر ہے اور میں جیل سے بھاگا ہوا ایک قیدی! میں یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اب میرے لیے اس کے جذبات کیا ہوں گے۔''

''نام تو آج میں کسی بہانے پوچھ لوں گا۔''

رندھاوا چپ ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ رندھاوا نے اسکرین پر نظر ڈالی اور تیزی سے بولا۔ ''یہ جمال ہے، میں اسپیکر آن کر دیتا ہوں۔ اس کی آواز سن لو۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد آواز میں بھی کچھ تبدیلی تو آتی ہے لیکن......''

دوسری مرتبہ گھنٹی بجی۔ رندھاوا نے بات ادھوری چھوڑ کر کال ریسیو کی۔ ''ہیلو جمال!'' اس نے کہا۔

''تم جس پر زیادہ شبہ کر رہے ہو، وہ تو آج آگیا ہے۔'' اسپیکر سے آتی ہوئی آواز بختیار نے بھی سنی۔

''کنور ثقلین؟'' رندھاوا نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔''

بختیار کا جسم سنسنا گیا۔

اسپیکر سے جمال کی آواز آرہی تھی۔ ''اس نے ایک صحافی کو فون کر کے بتایا ہے کہ وہ ایک نجی کام کے سلسلے میں نہایت خاموشی سے کہیں چلا گیا تھا مگر اس کی عدم موجودگی میں یہاں افواہیں پھیل گئیں کہ اسے کسی کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوگیا تھا جو قطعی غلط ہے۔ اس نے سختی سے اس بات کی تردید کی ہے۔''

''خیر! جو کچھ بھی ہو۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''اس کا ڈی این اے ٹیسٹ بہت ضروری ہے۔''

''وہ تو تم بتا چکے ہو۔ تمہیں اسی پر زیادہ شبہ ہے لیکن اس کے معاملے میں یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ جب سے اس نے سیاست میں قدم رکھا ہے، عام لوگوں میں گھل مل جانا اس نے چھوڑ دیا ہے۔ دو باڈی گارڈز ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔''

''کچھ دن ہوئے، میں نے اسے ایک تقریب میں دیکھا تھا۔'' رندھاوا کو بختیار کا ولیمہ یاد آگیا ہوگا۔ ''اس

وقت تو وہ اکیلا ہی تھا۔"

"بہ ظاہر اکیلا ہوگا۔ باڈی گارڈز قریب ہی کہیں ہوں گے۔ بہرحال اگر وہ عام قسم کی کسی تقریب میں شریک ہوتا ہے تو کام آسان ہوسکتا ہے ورنہ خاصی دشواری ہوگی، کوئی خاص طریقہ سوچنا پڑے گا۔"

"اب یہ تمہارا کام ہے کہ کیا کرو گے لیکن یہ بہت ضروری ہے۔"

"کچھ تو کر ہی گزروں گا۔ اس وقت تو تمہیں بس اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ آگیا ہے۔"

اس گفتگو کے بعد رندھاوا نے بختیار کی طرف دیکھا۔

"پہچانے؟"

"ابھی آواز کے بارے میں تو مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں ہوا ہے۔" بختیار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "دراصل میں اس کی آواز پر مکمل توجہ نہیں دے سکا۔ کنور ثقلین کی خبر سن کر اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا تھا۔"

"میں سمجھ گیا۔ تمہارا اتنا جذباتی ہوجانا بھی فطری بات ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو یار!...... وہ آج سامنے آیا ہے۔ اب ایک دو ہی دن میں تو فروزاں اس سے شادی نہیں کرلے گی۔"

"ہوسکتا ہے، فون پر ان کا رابطہ رہا ہو!"

"فون پر رابطے کا مطلب بھی یہ نہیں کہ بس اب دو ایک دن میں ان کی شادی ہوجائے گی۔ ذرا جذبات کے گرداب سے نکل کر سوچو۔"

"ہوں۔" بختیار پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا، پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ "تم سے جمال نے اس مسئلے پر بات نہیں کی کہ قاتل اپارٹمنٹ میں پہنچا کیسے؟ دروازہ تو اندر سے بولٹ تھا۔ مجھے یاد ہے، وہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر آئے تھے۔ جو بھی شبانہ کا قاتل ہے، وہ اندر کیسے پہنچا اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس کی آمد پر شبانہ نے دروازہ کھولا ہوگا تو سوال یہ ہے کہ اس کے جانے کے بعد دروازہ اندر سے کس نے بولٹ کیا؟"

"بات ہوئی تھی جمال سے۔" رندھاوا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پولیس نے تو شاید اس پہلو پر سوچا ہی نہ ہو کیونکہ انہوں نے تمہیں قاتل سمجھ لیا تھا لیکن جمال نے اگر میری بات پر مکمل یقین کرلیا ہے تو وہ اس پہلو پر ضرور غور کرچکا ہوگا لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" رندھاوا خاموش ہوا اور بختیار کو سوچ میں غرق دیکھ کر سوال کیا۔

"تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میں بھی اس پر غور کر کر کے تھک چکا ہوں۔"

"تو پھر یہ معما جمال ہی حل کرے گا۔"

"ہوں۔" بختیار نے پھر سر ہلا دیا۔

اسی دن شام کو رندھاوا اسے اپنی کار میں بٹھا کر ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں دو تین نائی فٹ پاتھ پر ایک کرسی ڈالے اور اس کے سامنے دیوار سے آئینہ لگائے گاہک کے منتظر رہتے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ وہاں سے لوٹ رہے تھے تو بختیار کی ڈاڑھی مونچھیں اور سر کے بال قاعدے سے ترشے ہوئے تھے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد رندھاوا نے اسے ایک ایسی ٹوپی بھی پہنا دی تھی جو کوہستانی علاقوں یا نہایت سرد رہنے والے شہروں کے لوگ عموماً پہنتے ہیں۔

"اب کسی کا باپ بھی تمہیں اس وقت تک شناخت نہیں کرسکتا جب تک تمہیں دیکھتے وقت اس کے ذہن میں یہ خیال نہ ہو کہ تم وہ مفرور قیدی ہوسکتے ہو۔" رندھاوا نے تبصرہ کیا تھا۔

بختیار نے کار کے عقب نما آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا، پھر تاریک شیشوں کا چشمہ لگا کر بھی دیکھا۔

"اب تو میں خود بھی نہیں پہچان پا رہا ہوں۔" بختیار نے کہا۔

"لیکن رات کے وقت یہ چشمہ نہیں لگایا جاسکتا۔"

"لگایا جاسکتا ہے۔" بختیار نے کہا۔ "لگاتے ہیں بعض لوگ جن کی ایک آنکھ مصنوعی ہوتی ہے یا آنکھوں میں کوئی اور خرابی ہوتی ہے۔"

"مگر ایسے لوگوں کی طرف لوگ متوجہ ضرور ہوتے ہیں۔" رندھاوا نے کہا۔ "لیکن ضرورت کیا ہے کہ تم رات کو باہر نکلو...... بلکہ یہ سب کچھ کرنا بھی محض احتیاط کا تقاضا تھا۔ تمہیں دن میں بھی باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک جمال کو کامیابی حاصل نہیں ہوتی، تم میرے گھر سے باہر قدم ہی نہ رکھو۔"

"شاید کسی وقت ضرورت پڑ ہی جائے۔ اچھا ہاں! تم نے کچھ سوچا؟ جمال کے والد کا نام؟"

"آج سارا وقت تمہارے ساتھ رہا ہوں۔ کل جاؤں گا اس سے ملنے، کسی ترکیب سے پوچھ ہی لوں گا۔ ترکیب ضروری ہے، ورنہ اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرے گا کہ میں نے اس کے باپ کا نام کیوں پوچھا۔"

"ٹھیک ہے۔ کل میں بھی......" وہ یک لخت چپ ہوگیا۔

''کل تم بھی......کیا مطلب؟''
''ہوں۔'' بختیار نے کھوئے کھوئے سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
''کل کیا؟'' رندھاوا نے دوبارہ پوچھا۔
''جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔'' بختیار نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا دماغ بہت الجھا ہوا ہے رندھاوا! تم اندازہ لگاؤ کہ میں کتنی غیر یقینی صورت حال میں سانسیں لے رہا ہوں۔''
''سب ٹھیک ہوجائے گا یار! سانچ کو آنچ نہیں۔''
بختیار چپ رہ گیا۔ جب وہ گھر پہنچے تو رندھاوا اسے کمرے میں چھوڑ کر اندرونی حصے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ کہہ گیا تھا کہ کپڑے تبدیل کرکے کھانے کی ٹرے لے کر آئے گا۔ بختیار نے خود کو کسی حد تک یکسو کرنے کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ وہ اپنا دماغ کسی طرف لگانا چاہتا تھا مگر اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار چینل بدلتا رہا اور پھر ایک نیوز چینل پر چند الفاظ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریموٹ گر گیا۔
''کنور ثقلین کو گولی ماردی گئی۔'' بریکنگ نیوز تھی۔
بختیار دم بہ خود بیٹھا سنتا رہا۔ خبر کے مطابق کنور ثقلین کسی کے ڈنر میں شرکت کے لیے ایک ہوٹل پہنچا تھا۔ جیسے ہی وہ ہوٹل کے سامنے اپنی کار سے اترا، ایک گولی اس کے سر میں پیوست ہوگئی۔ اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ اس کے باوجود اسے اسپتال لے جایا گیا تھا جہاں ڈاکٹروں نے اس کی موت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ کسی کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی۔ یہ صرف دس منٹ پہلے کا واقعہ تھا اس لیے ابھی تک پولیس کی طرف سے صرف اتنا کہا جاسکا تھا کہ ابتدائی تحقیقات کے بعد ہی اس سلسلے میں کچھ بتایا جاسکے گا۔
یہ خبر بختیار کے لیے اس اعتبار سے خوش کن ہوسکتی تھی کہ اب فروزاں اور کنور ثقلین کی شادی کا کوئی امکان نہیں رہا تھا لیکن خبر جب قتل کی ہو تو مقتول کے کسی بھی جاننے والے کے دماغ پر ہولناک اثرات تو مرتب ہوتے ہی ہیں۔
رندھاوا جب کھانے کی بڑی سی ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہوا، ٹی وی پر کوئی پروگرام چل رہا تھا لیکن بختیار کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔ اس کی نظریں خلا میں کسی غیر مرئی نقطے پر تھیں۔
رندھاوا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی آمد نے بھی بختیار کو بالکل ہوشیار نہیں کیا تھا۔ ''کیا بات ہے بختیار!''

چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس اپارٹمنٹ میں رہنے والے چھ ماہ قبل لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ کسی وجہ سے انہوں نے اپارٹمنٹ نہ تو بیچا تھا، نہ کرائے پر اٹھایا تھا۔ جمال نے کسی طرح ان کا لاہور کا پتا معلوم کیا اور اپنے ایک ماتحت کو لاہور بھیجا۔ اپارٹمنٹ کے مالک سے فون پر بات پہلے ہی کر لی گئی تھی۔ وہ شریف آدمی قانون سے تعاون کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو گیا تھا۔ جمال کا آدمی رات کی فلائٹ سے اس اپارٹمنٹ کی چابی لے آیا۔ جمال یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کا قفل کھولنے کے لیے چابی بنوا لیتا لیکن ایک قانونی راستہ موجود ہوتے ہوئے غیر قانونی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی جبکہ قاتل نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔''

بختیار تیزی سے بولا۔ ''قاتل اسی اپارٹمنٹ سے میرے اپارٹمنٹ میں آیا تھا؟''

''بالکل۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''اس کے ثبوت مل چکے ہیں۔ وہ اپارٹمنٹ بالکل خالی پڑا ہے۔ مطلب یہ ...... کہ سامان نام کی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ کئی جگہ مکڑیوں نے جالے تان لیے ہیں۔ فرش پر گرد ہے۔ اس پر جوتوں کے نشانات ملے ہیں جو بالکونی تک گئے ہیں۔ وہاں قاتل جوتے اتار کر بالکونی پر چڑھا تھا۔ وہاں سے تمہاری بالکونی تک ہاتھوں کے نشانات ملے ہیں۔''

''وہ نشانات......''

''کنور ثقلین کے ہیں یا نہیں، اس کی رپورٹ ابھی نہیں ملی ہے۔'' رندھاوا نے بختیار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام آج صبح ہی تو مکمل ہوا ہے، یا شاید جمال نے مجھے بتایا نہیں...... ویسے امکان یہ ہے کہ وہ نشانات کنور ثقلین کے نہیں ہوں گے۔ اگر اس معاملے میں اس کا ہاتھ ہے، تو بھی یہ کام اس نے کسی اور سے کروایا ہوگا۔''

''یہ قیاس تم نے کیوں کر لیا؟''

''کنور ثقلین ایک بہت بڑا گینگسٹر تھا۔''

بختیار چونک گیا۔

رندھاوا نے اثبات میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ ''کچھ عرصے پہلے خفیہ محکموں کو رپورٹ ملی تھی کہ انڈر ورلڈ کے دو بڑوں میں کچھ رسا کشی ہو گئی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ پرسوں رات وہ ایک پولیس مقابلے میں مارا جا چکا ہے۔ اب یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ وہ دوسرا آدمی کنور ثقلین تھا۔''

''اوہ!'' بختیار بول پڑا۔ ''گویا یہ افواہ نہیں، حقیقت تھی کہ کنور ثقلین کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا اور وہ اسی لیے غائب ہو گیا تھا اور اب جب اس کا دشمن مارا جا چکا ہے تو وہ سامنے آ گیا۔''

''لیکن کنور ثقلین کا اس حد تک مطمئن ہو جانا اس کی غلطی تھی۔ جمال کے خیال کے مطابق اسے گولی مارنے والا اس کے دشمن ہی کے گروہ کا کوئی آدمی ہوگا۔ جن مشتبہ عمارتوں کی بات خبروں میں آئی تھی، ان میں سے ایک عمارت کی چھت پر کچھ ایسے نشانات ملے ہیں جن سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کنور ثقلین پر گولی وہیں سے چلائی گئی تھی۔ وہاں کی منڈیر پر کچھ انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔ ان نشانات کو جرائم پیشہ افراد کے ان فنگر پرنٹس سے ملا کر دیکھا جائے گا جو پولیس کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔''

''یہ خبریں ابھی تک ٹی وی پر نہیں آئیں۔'' بختیار بڑبڑایا۔

''شاید اب آئیں۔'' رندھاوا نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ ''یہ خبر شاید ابھی چھپائی جائے کہ تمہارے اپارٹمنٹ میں بالکونی کے ذریعے داخل ہونے والے کے فنگر پرنٹس مل گئے ہیں۔ یہ خبر آنے سے وہ شخص چوکنا ہو جائے گا جس نے تمہارے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد شبانہ کو قتل کیا تھا۔''

بختیار بڑبڑایا۔ ''کم از کم یہ خبر تو آ جانا چاہیے کہ کنور ثقلین ایک گینگسٹر تھا۔''

''اس کے گھر پر بھی چھاپا مارا گیا ہے۔'' رندھاوا نے بتایا۔ ''اور وہاں سے کچھ معلومات حاصل ہو جانے کے بعد اور بھی دو تین جگہ ریڈ کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ثقلین آباد سے......''

رندھاوا نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ اور بختیار ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو بریکنگ نیوز کا اعلان کر رہا تھا۔

وہ بریکنگ نیوز ثقلین ہی کے بارے میں تھی کہ وہ ایک گینگسٹر تھا۔ اس خبر میں وہی سب باتیں تھیں جو بختیار کو رندھاوا سے معلوم ہو چکی تھیں، البتہ یہ بات خبروں میں نہیں آئی تھی کہ کسی عمارت کی چھت سے ملنے والے فنگر پرنٹس اور کچھ دوسرے شواہد ملنے کے باعث یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ کنور ثقلین کو وہیں سے گولی ماری گئی تھی۔

ان خبروں میں شبانہ کے قتل کے بارے میں کوئی بات نہیں تھی۔ ابھی تک کسی خبر رساں ادارے کو کہیں سے یہ

اشارہ نہیں ملا تھا کہ شبانہ کے قتل میں بھی کنور ثقلین کا ہاتھ ہونے کے امکان کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔

''اتنی خبر آجانا بھی میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔'' بختیار نے مسکرا کر کہا۔ ''اب فروزاں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ وہ جان لے گی کہ میں نے اسے کنور ثقلین کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے کہیں زیادہ کی بات ہے۔ اگر اس نے یہ خبر سن لی ہوگی تو اب وہ مجھ پر نہیں بگڑے گی۔ اب وہ مجھ پر یہ الزام نہیں لگا سکے گی کہ میں نے ہی کنور ثقلین کو بھی قتل کیا ہوگا۔''

''یہ الزام اس نے تم پر کب لگایا؟'' رندھاوا نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی جب تم گئے تھے تو میں نے اسے فون کیا تھا۔''

''کیا؟'' رندھاوا گھبرا گیا۔ ''کیا باتیں ہوئی تھیں اس سے؟''

''گھبرا کیوں رہے ہو؟ اس نے تمہیں نہیں، مجھے برا بھلا کہا تھا۔''

''بات کیا ہوئی تھی؟'' رندھاوا نے بے چینی سے پوچھا۔

''جانے کیوں پریشان ہو رہے ہو تم!'' بختیار نے سر جھٹکا اور پھر وضاحت سے وہ ساری باتیں بتا دیں جو فروزاں سے ہوئی تھیں۔

''یہ کیا غضب کر بیٹھے تم!'' رندھاوا نے سر تھام لیا اور پھر یکایک کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا۔''

''کیوں؟'' بختیار حیرت سے بولا۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' رندھاوا نے اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''گھر والوں سے کچھ کہہ دوں، پھر نکلتے ہیں یہاں سے!''

اس سے پہلے کہ بختیار کچھ کہتا، وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔

بختیار پریشانی سے ٹہلنے لگا۔ ٹی وی سے خبریں جاری تھیں مگر اب بختیار کی توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ ان خبروں کا تعلق کنور ثقلین سے نہیں تھا۔

رندھاوا واپس آیا تو بھی خاصا پریشان تھا۔

''آؤ۔'' اس نے بختیار کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''آخر......''

''بتاتا ہوں۔ پہلے یہاں سے تو نکلیں۔''

کار میں بیٹھنے کے بعد انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے رندھاوا بڑبڑایا۔ ''شکر ہے کہ ہمیں یہاں سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''

''کچھ بتاؤ تو...... آخر......''

''تم نے بڑی حماقت کی ہے فروزاں کو فون کرکے۔ اس نے ضرور پولیس کو اطلاع دے دی ہوگی کہ تم نے...... یعنی جیل سے مفرور قیدی نے اسے فون کیا تھا۔ قانون کو یہ معلوم کرنے میں مشکل پیش نہیں آئے گی کہ وہ موبائل کس کا ہے۔ میرا خیال ہے، میں نے تمہیں بتا بھی دیا تھا کہ اس موبائل کی سم میں نے اپنے نام سے ایکٹی ویٹ کروائی ہے۔''

''اوہ!'' بختیار کے منہ سے نکلا۔

''سب ریکارڈ ہوتا ہے موبائل کمپنیوں کے پاس...... لاؤ، موبائل مجھے دو۔'' وہ کار کی رفتار تیز کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ عام گزرگاہوں کے بجائے وہ راستے اختیار کرے جہاں ٹریفک برائے نام تھا۔

اس نے موبائل بختیار سے لیا۔

''آگے ایک گندا نالا ہے۔'' وہ بولا۔ ''موبائل اسی میں پھینک دوں گا۔ موبائل کمپنی یہ بھی بتا سکتی ہے کہ اس نمبر کا موبائل اس وقت کس علاقے میں ہے۔''

بختیار دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔

گندا نالا قریب آتے ہی رندھاوا نے موبائل اس میں پھینکا اور کار ایک شاہراہ کی طرف موڑ کر اس کی رفتار میں اضافہ کیا۔

''جو کچھ تم نے ابھی کہا ہے۔'' بختیار دھیمی آواز میں بولا۔ ''مجھے بھی اس کا علم تھا لیکن فروزاں سے بات کرنے کی بے تابی میں یہ سب کچھ میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ فروزاں پولیس کو اطلاع دے گی۔''

''اس نے لازماً دے دی ہوگی۔'' رندھاوا پریشان تھا۔ ''پولیس کسی وقت بھی میرے گھر پہنچ سکتی ہے۔ میں گھر والوں کو ہدایت کرکے آیا ہوں کہ اس کمرے کی اچھی طرح جھاڑ پونچھ اور صفائی کر ڈالیں۔ میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ سوچ سکتا ہوں، کوئی تدبیر کروں گا لیکن اگر اس کمرے سے تمہارے فنگر پرنٹس بھی پولیس کو مل گئے تو میں مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ اگر میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ سوچنے میں کامیاب نہ ہوا تو حوالات میرا مقدر بن جائے گی اور مجھے وہاں سے چھٹکارا صرف اسی صورت میں ملے گا جب تمہارا

معاملہ صاف ہو جائے گا۔''
''آئی ایم...... سوری...... رندھاوا۔'' بختیار بہت شرمندہ تھا۔
رندھاوا نے کار ایک شاپنگ پلازا کے سامنے پارک کی۔
''شکر ہے کہ پارکنگ کی جگہ مل گئی۔'' وہ بڑبڑایا۔
''اب کرنا کیا ہے؟'' بختیار بولا۔
''سب سے پہلے تو مجھے تمہاری فکر ہے۔'' رندھاوا نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔
بختیار بھی اتر آیا۔ رندھاوا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ایک گلی میں مڑا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔
''پولیس میری کار بھی تلاش کر سکتی ہے لہٰذا اس سے چھٹکارا بھی ضروری تھا۔''
''تو اب؟''
وہ بہت تیزی سے چل رہے تھے اس لیے رندھاوا جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا لیکن اس کے عمل سے جواب ظاہر ہو گیا۔ ان کی خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی دوسری شاہراہ پر مل گئی۔ رندھاوا نے اسے روک کر انگریزی میں کہا۔
''اس شہر کی سب سے خوبصورت جگہ کون سی ہے؟''
''میں انگریزی نہیں جانتا صاب!'' ڈرائیور نے جواب دیا۔
رندھاوا کے انگریزی بولنے کا سبب بختیار کی سمجھ میں اس وقت آیا جب ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد رندھاوا نے اس سے کہا۔ ''اب ہم انگریزی میں اپنی باتیں جاری رکھ سکتے ہیں۔'' پھر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک ہوٹل کا نام بتایا۔
''کیا اب ہوٹل میں قیام کرنا ہوگا؟'' بختیار نے انگریزی میں پوچھا۔
''نہیں۔ میں اس دوران میں تم سے باتیں بھی کرتا رہا ہوں اور سوچتا بھی رہا ہوں۔ پہلے مجھے ہوٹل ہی کا خیال آیا تھا لیکن وہ مناسب نہیں۔ اب تمہارے لیے سب سے بہتر جگہ تمہارا گھر ہی ہو سکتی ہے۔''
''اپارٹمنٹ؟'' بختیار چونکا۔
''فی الحال تو وہ سیل کر دیا ہے پولیس نے! میں اس گھر کی بات کر رہا ہوں جہاں تم نے زندگی گزاری ہے۔''
''یعنی خالہ کا گھر؟''
''ہاں۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں جہاں تم اس وقت تک روپوش رہ سکو جب تک تمہارے دامن سے یہ داغ ڈھل نہ جائے، اور مجھے امید ہے کہ یہ داغ بہت جلد ڈھل جائے گا۔''
''تم نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہاں کی خفیہ نگرانی شاید اب بھی ہو رہی ہو۔''
''مجھے جمال سے باتوں باتوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ نگرانی نہیں کی جا رہی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ تم اس شہر سے ہی بھاگ گئے ہو۔ تمہاری تصویر دوسرے شہروں کی پولیس کو بھیج دی گئی ہے۔''
بختیار نے متفکر انداز میں سر ہلایا، پھر رندھاوا کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ٹیکسی ڈرائیور کو تو تم نے ہوٹل کا نام بتایا ہے۔''
''وہاں سے ہم دوسری ٹیکسی کریں گے۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''
بختیار پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''تمہیں تو جمال کے محکمے میں ہونا چاہیے تھا۔'' پھر اس نے جلدی سے پوچھا۔ ''تم نے اس کے والد کا نام معلوم کیا؟''
''ہاں میں نے کسی بہانے سے اس کا شناختی کارڈ لے کر دیکھا تھا۔'' رندھاوا نے جواب دینے کے بعد جمال کے والد کا نام بتایا۔
''پھر تو۔'' بختیار جوشیلا ہو گیا۔ ''یہ وہی ہے۔ میرا کلاس فیلو۔''
''مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بختیار!'' رندھاوا نے کہا۔ ''اس کے مزاج میں فرض شناسی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس نے صاف صاف کہا تھا کہ رندھاوا، اگر تمہارا خیال غلط ثابت ہوا اور شبانہ کا قتل تمہارے دوست نے ہی کیا ہے تو میں تمہاری خاطر بھی تمہارے دوست کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' وہ مسکرایا۔ ''اسے قانون اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہے لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے مجھ سے یہ باتیں پہلی ملاقات میں کہی تھیں۔ اب تو دوسرے اپارٹمنٹ سے ملنے والے نشانات کی وجہ سے اس کو یقین ہو چکا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو لیکن جب تک تم بے گناہ ثابت نہیں ہو جاتے، تمہارا روپوش رہنا ضروری ہے۔ پولیس کو تمہارا سراغ ملے گا تو وہ تمہیں گرفتار کر کے رہے گی۔''
''خطرہ اب میری وجہ سے تمہارے لیے بھی ہے۔''
''میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا کر اپنا بھی کچھ بندوبست کروں گا۔''
''میرے ساتھ ہی رہو۔ خالہ، خالو، سبھی تمہیں

جانتے ہیں۔'' بختیار نے کہا۔ ''شاید آفتاب اس وقت گھر میں نہ ہو، بلکہ خالو بھی نہیں ہوں لیکن جب میں ان دونوں کو بتاؤں گا کہ تم اس معاملے میں میری مدد کر رہے ہو تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ تمہارے وہاں روپوش رہنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

''نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو، ایک بات میں تمہیں اور بتادوں۔ جمال نے مجھ سے کچھ کہا تو نہیں لیکن اسے شبہ تو ہوگیا ہے کہ تم میرے رابطے میں ہو۔''

''شبہ تو ہونا ہی چاہیے۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے اس نے میرے گھر کی نگرانی کروائی ہو اور وہ اب جان بھی چکا ہو کہ تم میرے ساتھ ہو لیکن اب وہ تمہارے لیے خطرہ نہیں بنے گا۔ میں نے ابھی کہا تھا نا کہ دوسرے اپارٹمنٹ سے ملنے والے نشانات کے باعث اب اسے یقین ہو چکا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو لہٰذا اب وہ اصل قاتل کے چکر میں ہوگا، جو کنور ثقلین کے گروہ کا کوئی شخص ہوسکتا ہے۔''

''یہ بھی معلوم ہوگیا تو فروزاں مجھ سے بہت شرمندہ ہوگی۔''

ان باتوں کے دوران میں سفر طے ہوگیا۔ ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رکی۔ دونوں اترے۔ رندھاوا نے کرایہ ادا کیا۔ پھر جب ٹیکسی دور جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئی تو دونوں ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔

''خالہ مجھے اس حلیے میں پہچانیں گی کیسے؟'' بختیار بڑبڑایا۔

''جب تم سر سے ٹوپی اور آنکھوں سے چشمہ اتار کر اپنی آواز بھی انہیں سنادو گے تو ان کا نہ پہچاننا ممکن ہی نہیں۔ تمہارا ناک نقشہ تو تبدیل نہیں ہوا۔ صرف سر کے بڑے بڑے بال اور ڈاڑھی مونچھیں اضافی ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ مجھ سے مل کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوں گی۔ ان کے ذہن میں تو یہی ہوگا کہ شبانہ کو میں نے قتل کیا ہے۔''

''احتیاطاً تم ابھی اپنا یہ حلیہ تبدیل نہ کرنا۔'' رندھاوا نے مشورہ دیا۔

بختیار کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا کہ خالہ نے اسے پہچان کر اپنے سینے سے تو لگالیا لیکن چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات بھی ابھرے۔

''یہ تم کیا کر بیٹھے ہو میرے بچے!'' وہ رندھی ہوئی سی آواز میں بولیں۔

بختیار نے ممکنہ حد تک خالہ کو یقین دلایا کہ وہ شبانہ کا قاتل نہیں ہے اور جلد ہی اصل قاتل کا پتا لگ جانے کا امکان ہے۔

خالو اور آفتاب گھر پر نہیں تھے۔ خالہ نے دونوں کو فون کیا کہ ایک ضروری کام ہے اس لیے وہ فوراً گھر آئیں۔ یہ مشورہ انہیں بختیار ہی نے دیا تھا کہ وہ انہیں اس کی آمد کے بارے میں نہ بتائیں۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ فون پر اس کا نام لیا جاتا۔

خالو نے جواب دیا کہ وہ آدھے گھنٹے میں آجائیں گے۔ آفتاب نے بھی جلد آنے کے لیے کہا۔ خالو آدھے گھنٹے میں آگئے۔ بختیار کو وہی سب کچھ خالو سے بھی کہنا پڑا جو وہ خالہ سے کہہ چکا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل نہیں کیا اور اس کی وجہ بھی خالہ اور خالو کو بتادی۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ان تینوں نے کھانا کھایا۔ آفتاب اس وقت تک نہیں آیا تھا۔

''وہ کبھی وقت پر آیا ہے جواب آئے گا۔'' خالہ ناخوش گوار انداز میں بڑبڑائی تھیں۔

کھانے کے بعد ان دونوں نے بڑی محبت سے بختیار کو آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ بختیار کو اس وقت آرام سے زیادہ تنہائی کی ضرورت تھی۔ وہ اس وقت صرف سوچنا چاہتا تھا اور اسے یہ خواہش بھی تھی کہ وہ دوبارہ فروزاں سے بات کرے۔ اسے یقین تھا کہ کنور ثقلین کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی۔ ممکن نہیں تھا کہ فروزاں بے خبر رہی ہو۔ اب وہ شرمندہ ہی ہوتی کہ اس نے کنور ثقلین کے بارے میں بتائی جانے والی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر بختیار کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ گزرے ہوئے سارے واقعات اس کے دماغ میں چکرانے لگے۔ حوالات میں گزرا ہوا وقت، جیل کے شب و روز، فرار، نواحی بستی میں نابینا آسیہ خالہ اور اس کی بیٹی کا گھر!

اچھی لڑکی ہے، بختیار نے پروین کے بارے میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ حالات ٹھیک ہونے کے بعد وہ آسیہ خالہ کے گھر ضرور جائے گا اور ان ماں بیٹی کی مالی امداد میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔

گھر میں تین ٹیلی فون تھے جن میں سے ایک بختیار کے کمرے میں بھی تھا لیکن اس نے فروزاں کو فون نہیں کیا۔ ایک تو یہ کہ احتیاط اب بھی ضروری تھی، دوسرے یہ کہ بختیار

اس حوالے سے بھی تذبذب کا شکار رہا کہ فروزاں اسے شبانہ کا قاتل تو اب بھی سمجھ رہی ہوگی۔

بستر پر لیٹے اور سوچتے ہوئے بختیار کو ایک گھنٹا گزرا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بختیار نہ صرف چونکا بلکہ اس کے جسم میں سنسناہٹ بھی پھیل گئی۔ اول تو اس کے شناساؤں کا حلقہ زیادہ نہیں تھا اور جو تھے ان سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس نمبر پر رنگ کریں گے۔ یہ نمبر خالہ اور خالو نے خود کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔

''تم جس کو چاہو، یہ نمبر بتانا۔ خالو نے اسی وقت کہہ دیا تھا جب وہ ٹیلی فون اس کے کمرے میں لگوایا گیا تھا۔

کئی گھنٹیاں بج چکی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھول کر خالہ اندر آئیں۔ ''فون کیوں نہیں اٹھا رہے ہو بیٹا!''

''آپ دیکھیں خالہ، کون ہے۔'' بختیار نے فکرمندی سے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے کال ریسیو کی تو کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔''

یہ بات سن کر خالہ کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ انہوں نے قریب آکر ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

پھر دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، وہ سن کر خالہ ہنس پڑیں اور پھر ریسیور بختیار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ''تمہارا دوست ہے رندھاوا۔''

بختیار نے بے اختیار ایک لمبی سانس لی۔ خالہ اور خالو کو وہ یہ تو بتا چکا تھا کہ اس سارے معاملے میں رندھاوا اس کی مدد کر رہا ہے۔

''ہیلو رندھاوا!'' بختیار نے ریسیور لے کر کان سے لگایا۔ ''میں سمجھا تھا، نہ جانے کس کا فون ہو، اس لیے ریسیور نہیں اٹھا رہا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات ہوگی جو تم نے فون کیا ہے۔''

''بات تو یقیناً خاص ہے۔'' رندھاوا کی آواز آئی۔ ''لیکن خالہ کو یکایک نہ بتا دینا۔ انہیں جان کر صدمہ ہوگا کہ آفتاب کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔''

''کیا!'' بختیار حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔

خالہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ہاں بختیار!'' رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''شروع سے مجھے اسی پر شبہ تھا۔ اب ثابت ہوگیا ہے شبانہ کا قتل اسی نے کیا تھا اور وہی شبانہ کے اس بچے کا باپ ہے جو اس دنیا میں نہیں آسکا۔''

''کیا کہہ رہے ہو!'' بختیار کی آواز کانپ گئی۔

''نہ جانے کیوں، میں بے چین تھا کہ تمہیں یہ اطلاع دے دوں۔ میں ایک گھنٹے بعد آکر تفصیل بتاؤں گا۔ ابھی میں جمال کے ساتھ ہوں۔ اس نے معلوم کرلیا تھا کہ تم میرے گھر میں تھے۔ تمہارا نام سن کر اسے بھی یاد آگیا ہے کہ اس کا کوئی کلاس فیلو بختیار بھی تھا۔ ممکن ہے کہ میرے ساتھ وہ بھی تم سے ملنے آئے۔''

''اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہے کہ......''

''آکر سب کچھ بتاؤں گا۔ اب تم اپنا حلیہ درست کرلو۔ ڈاڑھی مونچھوں کی ضرورت نہیں رہی۔''

''اچھا۔'' بختیار نے مردہ سی آواز میں کہا۔

اس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ خالہ بے چینی سے بول پڑیں۔ ''کیا بات ہے بختیار! کیا بتایا ہے رندھاوا نے؟''

جو کچھ رندھاوا نے بتایا تھا، وہ خالہ اور خالو، دونوں ہی کے لیے ایک صدمہ تھا۔ آفتاب کو کسی حد تک ناپسند کرنے کے باوجود انہیں اس سے محبت تو تھی۔ آخر پال پوس کر جوان کیا تھا۔ ان کا صدمہ فطری بات تھی۔

ایک بھانجا ناکردہ قتل کے جرم میں سزاوار ہوا اور دوسرا اسی قتل کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔

بختیار کے خالو معلومات حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہوگئے...... خالہ سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

ایک گھنٹے بعد رندھاوا آیا۔ بختیار نے اس دوران ڈاڑھی مونچھ صاف کر کے اپنا گھریلو لباس پہن لیا تھا۔

رندھاوا نے خالہ کو مختصر طور پر کچھ بتانے کے بعد کہا کہ تفصیلات کا علم شام تک ہوگا لیکن تنہائی میں بختیار سے کہا۔ ''خالہ سے وہ سب کچھ بتاتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا ورنہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ خالہ کو کل کے اخبارات سے معلوم ہوجائے گا یا خالو آئیں گے تو وہ بتا دیں گے۔ ممکن ہے کہ ٹی وی کی خبروں میں بھی بتا دیا جائے۔''

''تو تم سب کچھ جانتے ہو؟'' بختیار نے بے تابی سے پوچھا۔

''جمال نے بتایا ہے مجھے۔'' رندھاوا نے جواب دیا۔ ''اس نے سب سے پہلے جن دو آدمیوں کا خون حاصل کر کے ڈی این اے رپورٹ لی تھی، اس سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ شبانہ کے ہونے والے بچے کا باپ آفتاب ہی تھا۔ یہ رپورٹ ملنے کے بعد جمال کو بڑی حد تک یقین ہوگیا تھا کہ شبانہ کو قتل بھی اسی نے کیا ہوگا۔ بالکونی سے فنگر پرنٹس مل ہی چکے تھے۔ اس کے بعد جمال اس فکر میں تھا کہ کسی طرح آفتاب کے فنگر پرنٹس حاصل کرے۔ یہ کام بھی وہ کسی نہ کسی

طرح کر ہی لیتا لیکن آفتاب نے خود ہی اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اس نے آج اپنی کار ایک غلط جگہ پارک کر دی تھی۔ پولیس والوں نے اسے لفٹر میں اٹھا کے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا تھا۔ جمال کے آدمی آفتاب کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کی اطلاع جمال کو دی۔ جمال فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ آفتاب پولیس والوں کو کچھ دے دلا کے کار واپس لے آتا لیکن جمال نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ آفتاب نے اپنے ایک شناسا مجسٹریٹ تک دوڑ لگائی کہ اس کے ذریعے سے اپنی کار چھڑا لے۔ جمال نے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی کیونکہ اس دوران میں وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے اپنے محکمے کے فنگر پرنٹ سیکشن کے لوگوں کو بلوا کر ان سے کار کے اندر پائے جانے والے تمام نشانات کے پرنٹس بنوا لیے تھے۔ آفتاب اپنی کار لینے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ دوسری طرف جمال نے ان پرنٹس کے ساتھ بالکونی میں ملنے والے پرنٹس محکمے کے متعلقہ افسر کو دیے۔ اس نے تصدیق کر دی کہ وہ ایک ہی آدمی کے ہاتھ اور انگلیوں کے نشانات تھے۔ اس کے بعد جمال نے آفتاب کو گرفتار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں جب تمہیں یہاں چھوڑ کر گیا تھا، اس کے آدھے گھنٹے بعد آفتاب کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ کار میں اسی طرف...... میرا مطلب ہے تمہارے اسی گھر کی طرف آ رہا تھا۔''

''اسے خالہ نے فون کیا تھا کہ ایک ضروری کام ہے لہٰذا وہ فوراً گھر آئے۔'' متفکر بختیار نے کہا۔ ''خالہ بہت خوش تھیں، وہ چاہتی تھیں کہ خالو اور آفتاب فوراً جان لیں کہ میں گھر آ گیا ہوں۔''

''یہ بہت اچھا ہوا کہ آفتاب اس وقت گرفتار ہو گیا ورنہ وہ یہاں آ کر تم سے ملنے کے بعد کسی نہ کسی طرح پولیس کو اطلاع بھجوا دیتا کہ جیل سے فرار ہونے والا بختیار اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔''

''آخر اس نے مجھ سے کس بات کی دشمنی نکالی۔'' بختیار کی آواز بھرا گئی۔

''میرا خیال ہے کہ وہ خالو کی وراثت میں اکیلا حصے دار بننا چاہتا ہوگا۔ اس نے ایک طرف تو شبانہ سے نجات حاصل کی اور دوسری طرف تمہیں اس قتل میں پھنسوا دیا۔''

''لیکن یہ اس نے آخر کس طرح کیا؟''

''اب میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔'' رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''آفتاب سے واقفیت میری بھی تھی۔''

''کیا!'' بختیار حیرت سے بولا۔ مگر اس نے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور کہا۔ ''میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ اس نے آخر کس طرح کیا۔''

''وہی بتا رہا ہوں۔ ایک بات تم کو یہ بھی بتا دوں کہ میں شراب پیتا تو ہوں لیکن خود کبھی نہیں خریدتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کسی شراب فروش کے ساتھ دیکھا جائے۔ میں پیتا بھی کم ہوں، یہ تم جانتے ہو۔ میں نے آفتاب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے دس دن میں ایک بوتل مہیا کر دیا کرے۔ میں اسے ادائیگی کر دیا کرتا تھا۔ دراصل آفتاب سے میری پہلی ملاقات ایک محفل میں ہوئی تھی جہاں وہ شراب پی رہا تھا۔ میرے اور تمہارے تعلقات اس کے علم میں تھے اس لیے اس نے مجھ سے نہایت عاجزانہ درخواست کی تھی کہ بھائی کو نہ بتانا۔''

بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''گھر والوں کو اس کی ایک ایک حرکت کا علم ہے۔''

''یہ نہ کہو۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''وہ تو کنور ثقلین کے لیے بھی کام کرتا تھا۔''

بختیار حیرت زدہ رہ گیا۔

رندھاوا نے بات جاری رکھی۔ ''لیکن شبانہ کے معاملے میں شاید کنور ثقلین کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ دراصل سارے معاملات کلی طور پر ابھی جمال کے علم میں بھی نہیں ہیں۔ آفتاب سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہوگی۔ سارا معاملہ وضاحت کے ساتھ اسی وقت سامنے آئے گا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے لیے میں نے جو شراب مہیا کی تھی، وہ بھی آفتاب ہی سے لی تھی اور چونکہ تم نے زیادہ شراب کی بات کی تھی، اس کی وجہ سے آفتاب کو تعجب ہوا تھا۔ اس نے مجھے ٹٹولنے کے لیے تمہارا ذکر کیا تھا کہ تم فروزاں کے چلے جانے سے بہت ڈسٹرب ہو گئے۔ میں نہیں جانتا کہ فروزاں کی بات اسے کیسے معلوم ہوگئی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ فروزاں نے فون پر ثقلین کو بتایا ہو اور ثقلین سے آفتاب کو معلوم ہو گیا ہو۔ بہرحال اس نے مجھے باتوں میں ایسا گھیرا کہ میں اسے بتا بیٹھا کہ وہ شراب میں تمہارے لیے ہی لے رہا ہوں۔''

بختیار مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

رندھاوا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بتایا تھا نا کہ شبانہ کی آمد سے پہلے تمہارے پاس کسی کی کال آئی تھی لیکن دوسری طرف سے کوئی بولا نہیں تھا۔''

''ہاں۔''

''میرا خیال ہے کہ آفتاب ہی نے شبانہ سے وہ کال کروائی ہوگی۔ اس نے تمہاری آواز سے اندازہ لگا لیا ہوگا

کہ تم نشے میں دھت ہو چکے ہو۔ اس کے بعد ہی اس نے شبانہ کو تمہارے پاس بھیجا ہوگا۔''

''مگر کس لیے؟''

''فی الحال تو میں اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔ اس نے شبانہ کو پٹی پڑھائی ہوگی کہ وہ تمہارے پاس جائے اور تمہیں رجھانے کی کوشش کرے۔ اگر تم نشے کی وجہ سے بہک گئے تو شبانہ بعد میں تمہیں بلیک میل کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے شبانہ کو اور کوئی لالچ دیا ہو۔ جب تک آفتاب کا مکمل بیان سامنے نہیں آجاتا، یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ شبانہ بہرحال کوئی اچھی لڑکی نہیں تھی۔ کسی بھی قسم کے لالچ میں وہ آفتاب کی بات مان سکتی تھی۔'' رندھاوا رک کر سوچتا ہوا بولا۔ ''اس کے بعد آفتاب دوسرے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے تمہارے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ شبانہ کو چاقو سے ہلاک کرنے کے بعد اس نے تمہارا ہاتھ اس چاقو کے دستے پر جمایا ہوگا۔ تم اس وقت مدہوش تھے اس لیے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہوگا۔ اس طرح آفتاب نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے۔ شبانہ سے اپنی جان چھڑائی اور تمہیں اس کے قتل میں پھنسوا دیا۔ اب تم غالباً یہ اعتراض کر سکتے ہو کہ دوسرے اپارٹمنٹ کی چابی اس نے پہلے سے کیوں بنوالی تھی؟''

''ہاں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے۔''

''مجھے پھر کہنا پڑے گا کہ آفتاب کا بیان سامنے آئے گا، تبھی ہر بات کی وضاحت ہوگی۔ فی الحال تو میں اس معاملے میں بھی قیاس ہی کر سکتا ہوں۔ شاید اس نے تمہارے اپارٹمنٹ میں گھس کر خود ہی تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہو۔ بعد میں جب اسے تمہارے نشے کی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوسرا کھیل کھیل ڈالا۔''

بختیار اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

''اب جمال کا ایک پیغام بھی سن لو۔'' رندھاوا نے کہا۔ ''میرے ذریعے یہ پیغام تمہارے لیے ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ وہ بھی مجھ سے ملنے آئے گا۔''

''ابھی وہ آفتاب کے سلسلے میں بہت مصروف ہے۔ ایک آدھ دن بعد ملے گا تم سے! فی الحال تمہارے لیے اس کا پیغام یہ ہے کہ تم خود کو گرفتاری کے لیے پولیس کے سامنے پیش کر دو۔''

''کیوں؟'' بختیار تیزی سے بولا۔ ''اب تو اصل قاتل پکڑا جا چکا ہے۔''

''تم ایک مفرور قیدی اب بھی ہو۔ تمہارے بری ہونے کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی لیکن تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حوالات نہیں جانا پڑے گا تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں! جمال نے اب تک یہ بندوبست کر لیا ہوگا کہ ادھر تم اپنی گرفتاری دو، اور ادھر تمہاری ضمانت کرا لی جائے۔''

''گرفتاری دینا ضروری ہے؟'' بختیار پریشان ہو گیا تھا۔

''اس کے بغیر تم قانوناً ایک آزاد شہری نہیں بن سکتے۔ ضمانت کے بعد بھی تمہیں عدالت کے دو ایک چکر تو لگانا ہی پڑیں گے۔ اب اگر تم کہو تو میں فون پر جمال سے پوچھ لوں کہ اس نے تمہاری ضمانت کا بندوبست کر لیا یا نہیں۔''

''پوچھ لو۔'' بختیار نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات خالہ کے علم میں ابھی نہ آئے۔ میں انہیں پولیس اسٹیشن سے واپس آنے کے بعد بتادوں گا۔''

''یہ ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔''

''میں جلد از جلد فون پر فروزاں سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بہتر یہی ہے کہ پہلے اس مرحلے سے گزر لیا جائے۔''

''ہاں۔ اس کے بعد تم اسے فون کرنے کے بجائے اس سے ملنے بھی جا سکتے ہو۔''

''پہلے تو میں فون ہی کروں گا۔''

''جیسا تم چاہو۔'' رندھاوا نے کہا اور موبائل پر جمال کا نمبر ملانے لگا۔

بختیار بڑبڑایا۔ ''یہ آخری مرحلہ بھی طے کر ہی لیا جائے۔''

• ذرا دیر بعد وہ اور رندھاوا گھر سے روانہ ہوئے۔ خالہ سے رندھاوا نے بہانہ کیا تھا کہ وہ اسی معاملے کی چھان بین کے لیے جا رہا ہے۔ خالہ پریشان تھیں۔ ان حالات میں وہ اکیلی تھیں۔ خالو ابھی واپس نہیں لوٹے تھے مگر انہوں نے بختیار کو روکا نہیں۔

پولیس اسٹیشن پہنچنے، گرفتاری دینے اور وہیں موجود ایک مجسٹریٹ کے سامنے ضمانت ہونے کے بعد وہ رندھاوا کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے نکلا۔ جمال اس وقت بھی وہاں نہیں تھا مگر فون پر اس نے بتا دیا تھا کہ انتظامات مکمل ہیں لہٰذا بختیار قطعاً پریشان نہ ہو۔

پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد بختیار نے رندھاوا کے موبائل فون پر فروزاں کو اپنے نام سے ایک ایس ایم ایس کیا کہ وہ اسے کال کر رہا ہے۔ پھر اس نے فروزاں کے نمبر ملائے۔ اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ فروزاں شاید کال ریسیو نہ کرے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کال ریسیو کی گئی لیکن دوسری

طرف سے کچھ کہا نہیں گیا۔
''کیسی ہو فروزاں؟'' بختیار کا مخصوص جملہ اس کی زبان پر آ گیا۔
''ٹھیک ہوں۔'' فروزاں کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اور بہت شرمندہ ہوں تم سے......! فون پر تمہیں جانے کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔''
''بھول جاؤ وہ سب!'' بختیار نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''ڈیڈی کہاں ہیں؟''
''ظاہر ہے کہ وہ ابھی آفس ہی میں ہوں گے۔''
اس وقت چار بجے تھے۔
بختیار نے کہا۔ ''اچھا میں تم سے ملنے آرہا ہوں۔''
''کیا!'' فروزاں چونکی۔ ''تم جہاں بھی چھپے ہوئے ہو، وہاں سے نکلتے ہوئے تمہیں پولیس کا ڈر نہیں لگے گا؟''
''اب ڈرنے کا جواز ختم ہو چکا ہے۔ ابھی ابھی میری ضمانت ہو چکی ہے اور وہ اس لیے کہ وہ شخص گرفتار کیا جا چکا ہے جس نے واقعی شبانہ کو قتل کیا تھا۔''
''کیا......کیا کہہ رہے ہو تم!'' فروزاں حیرت زدہ تھی۔
''کل کے اخبارات سے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور شاید کسی نیوز چینل پر بھی یہ خبر آ جائے۔''
''اگر یہ خبر سچی ہے تو میں خوشی کا اظہار کروں گی۔''
''میں تم سے ملنے آرہا ہوں۔''
''اب کیا ضروری رہ گیا ہے ملنا!'' فروزاں کے لہجے میں افسردگی تھی۔ اس کے ذہن میں اب بھی یہی تھا کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔
بختیار نے فون پر کوئی بحث چھیڑنے کے بجائے کہا۔ ''ہم دوستوں کی حیثیت سے تو مل سکتے ہیں۔''
''اگر تم اصرار کر رہے ہو تو میں کہیں آجاتی ہوں۔ تم مت آؤ۔'' فروزاں کے دماغ میں جو خیال جم گیا تھا، وہ بس جم گیا تھا۔
بختیار نے ضد نہیں کی اور ایک لائبریری کا نام بتایا جہاں ملاقات کی جا سکتی تھی۔
اس پبلک لائبریری کا خیال بختیار کو کسی وجہ سے آ گیا تھا۔ اس نے رندھاوا کا موبائل اسے واپس کرنا چاہا لیکن اس نے نہیں لیا۔
''تمہیں جلدی ہے، تم جاؤ اور یہ لے جاؤ۔'' رندھاوا نے مسکرا کر کہا۔ ''میں خرید لوں گا دوسرا موبائل......! ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ اپنی پہلی فرصت میں اس کی سم بدلوا لینا اور اسے اپنے نام سے ایکٹی ویٹ کروانا۔''
بختیار پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک طرف اسے اپنی خواب جیسی رہائی اور فروزاں سے ملنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف یہ رنج کہ اس کے خالہ زاد بھائی آفتاب کا ایک گھناؤنا روپ اس کے سامنے آیا تھا۔
آدھے گھنٹے بعد وہ اور فروزاں لائبریری میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ فروزاں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ لائبریری کی لمبی میز کے گرد اس وقت چھ سات سے زیادہ افراد نہیں تھے جبکہ کرسیاں چالیس کے قریب تھیں۔
بختیار نے فروزاں کو ان حالات سے آگاہ کرنا شروع کیا جن سے وہ دوچار ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے آفتاب کے بارے میں وہ ساری باتیں بتائیں جو اسے رندھاوا سے معلوم ہوئی تھیں۔
فروزاں نے سب کچھ خاموشی سے سنا پھر وہ بختیار کے خاموش ہونے کے بعد ذرا سا رک کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''دنیا میں اب یہی ہو رہا ہے۔ اتنے قریب کے لوگوں کا خون بھی سفید ہو چکا ہے۔''
''کیا اب گھر چلیں؟'' بختیار نے ایک بار پھر وہ موضوع چھیڑنے کی کوشش کی جو اسے بہرحال چھیڑنا تھا۔
''میری بات کا یقین کرو اس طرح تمہیں طلاق نہیں ہوئی ہے۔'' بختیار نے زور دے کر کہا۔ ''اگر میں نے تمہیں خاموش کرانے کی خاطر ایسا جملہ کہہ دیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔''
''نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا میں زمانے کے رواج سے واقف نہیں؟''
''غلط رواج پڑ گیا ہے اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔''
''نہیں کر سکتے۔'' فروزاں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
بختیار اپنی کرسی سے اٹھا اور دو مختلف الماریوں سے تین کتابیں لا کے فروزاں کے سامنے کھولیں۔ ان میں سے دو صفحات کھولے جو طلاق کے حوالے سے تھے۔ وہ اس نے فروزاں کے سامنے رکھے۔
''ان تینوں کتابوں کے یہ صفحات پڑھ لو۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن تیسری کتاب ایک بہت بڑے عالم کی ہے۔''
فروزاں کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ اس کا دماغ بھی الجھا ہوا ہو گا جب وہ ان کتابوں کے صفحات

پڑھ رہی تھی۔
صفحات پڑھنے کے بعد وہ ہکلائی۔ ''یہ تو..... یہ تو.....''
''یہ ثبوت ہے نا میری بات کا۔'' بختیار بولا۔ ''اور اگر تم اسے بھی نہ مانو تو میں ایک ایسی کتاب بھی تمہارے سامنے رکھ سکتا ہوں جس سے بڑی کتاب دنیا میں کوئی نہیں۔''
''ضرورت نہیں اس کی۔'' فروزاں نے کہا لیکن وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''کیا ڈیڈی ان کتابوں سے مطمئن ہو سکیں گے۔''
''وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کشادہ ذہن رکھتے ہیں، یہ کتابیں ہی انہیں قائل کر دیں گی۔ یہاں فوٹو اسٹیٹ کا بندوبست ہے لیکن ڈیڈی کو دکھانے کے لیے میں یہ کتابیں بازار سے خرید لوں گا۔''
''تو کیا گھر چلیں۔'' فروزاں پہلی مرتبہ کسی قدر خوشی سے مسکرائی۔ ''ڈیڈی اب کچھ دیر میں گھر پہنچنے ہی والے ہوں گے۔''

جواب میں بختیار کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ بختیار نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رندھاوا تھا۔
''تم لائبریری ہی میں ہو؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔
''ہاں۔ کیوں؟''
''وہاں ٹی وی تو نہیں ہوگا۔''
''کم از کم میں نے تو لائبریریوں میں ٹی وی نہیں دیکھا۔''
''تو پھر تم نے خبریں بھی نہیں سنی ہوں گی۔''
''کوئی خاص خبر؟'' بختیار نے جلدی سے پوچھا۔
''کنور ثقلین کے حوالے سے ایک اور بات سامنے آئی ہے۔ میں کل رات ہی تمہیں کچھ باتیں تو بتانے والا تھا لیکن ٹی وی کی بریکنگ نیوز آنے کی وجہ سے میری بات مکمل نہیں ہو سکی تھی۔''

''اب کچھ بتاؤ گے بھی!'' بختیار تھوڑا سا جھنجلایا۔
''یہ تو میں کل رات ہی بتا دیتا کہ کنور ثقلین ایک ہوس پرست شخص تھا۔''

''اس بارے میں کچھ بات پہلے بھی ہو چکی ہے۔''
''کل رات یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ جو لڑکیاں تعلقات کی بنا پر اس کے ہاتھ نہیں لگتی تھیں، انہیں وہ اغوا کروا لیتا تھا اور جب اس کی ہوس پوری ہو جاتی تھی تو وہ ان لڑکیوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں غائب کرا دیتا تھا۔ کل رات بھی اس کی ہدایت پر اس کے آدمیوں نے ایک نواحی بستی سے ایک لڑکی کو اغوا کر کے اسے ایک ایسے بنگلے میں پہنچایا تھا جو کنور ثقلین اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ پولیس اس کے کئی ٹھکانوں پر ریڈ کر چکی ہے۔ اس بنگلے سے وہ لڑکی بھی برآمد کر لی گئی ہے جسے ثقلین آباد سے اغوا کیا گیا تھا۔ پولیس نے اس کا میڈیکل کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکی داغ دار ہے لیکن اس نے یہ بتانے سے صاف انکار کر دیا کہ اسے داغدار کس نے کیا تھا۔ وہ اس معاملے میں کنور ثقلین یا اس کے کسی آدمی کو بھی ذمے دار قرار نہیں دے رہی ہے۔ جس وقت کنور ثقلین کو گولی ماری گئی ہے، لڑکی کو اس سے آدھے گھنٹے پہلے اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے اس لڑکی کے اغوا کے بارے میں تو معلوم ہو چکا تھا لیکن یہ بات ٹی وی پر ابھی آئی ہے کہ اس لڑکی کا نام پروین ہے اور اس کی ماں کا نام آسیہ تھا۔''
''اوہ گاڈ!'' بختیار نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔
فروزاں الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
رندھاوا کہہ رہا تھا۔ ''تم نے جس گھر میں پناہ لی تھی، اس گھر کی مالکہ کا نام خالہ آسیہ اور لڑکی کا نام پروین بتایا تھا نا؟''
''ہاں۔'' بختیار کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔
''پروین کے اغوا ہونے سے خالہ آسیہ پر دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اسے اسپتال لایا گیا لیکن وہ بچ نہیں سکی۔ آج پروین اس کی لاش لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئی ہے۔ پولیس تو چاہتی تھی کہ اسے دارالامان بھیج دیا جائے لیکن وہ بضد ہے کہ اپنے گھر میں رہے گی کیونکہ اسے کسی کا انتظار کرنا ہے۔''
بختیار کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا۔ پروین نے اسے روانہ کرتے وقت کہا تھا۔ ''آیئے گا ضرور! آپ مجھے یاد رہیں گے۔ میں انتظار کروں گی۔''
''کیا یہ وہی پروین ہو سکتی ہے؟'' رندھاوا کی آواز بختیار کو کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔
بختیار موبائل بند کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔
''تم اپنی گاڑی پر آئی ہو نا؟'' اس نے فروزاں سے پوچھا۔
''ہاں، کیوں؟'' فروزاں بھی کھڑی ہو گئی۔
''مجھے فوراً کہیں جانا ہے، اور میرے پاس گاڑی بھی نہیں ہے۔''
''تو چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''
بختیار تیزی سے مڑا۔ فروزاں اس کے پیچھے چلی۔ بختیار اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ جو کتابیں اس نے نکالی تھیں، وہ اسے واپس بھی رکھنا چاہیے تھیں۔ اسی لیے لائبریرین اسے ناگوار انداز میں دیکھتا رہ گیا تھا۔
''گاڑی میں چلاؤں گا۔'' بختیار نے فروزاں سے

چابی لیتے ہوئے کہا۔
فروزاں نے خاموشی سے چابی اسے دے دی اور ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گئی۔
بختیار نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی تیزی سے دوڑا دی۔
''احتیاط سے۔'' فروزاں بولی۔
لیکن بختیار نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔
''تم پر اتنا جنون کیوں سوار ہوگیا ہے بختیار؟'' فروزاں پھر بولی۔ ''کیا بات معلوم ہوئی ہے تمہیں؟''
''بات۔'' بختیار کے ہونٹ کانپ گئے۔ ''قیامت کی بات معلوم ہوئی ہے۔''
''کچھ بتاؤ تو!''
بختیار لائبریری میں فروزاں کو بتا چکا تھا کہ جیل سے فرار ہونے کے بعد اس نے نواحی بستی کے جس مکان میں پناہ لی تھی، اس میں پروین اور اس کی بوڑھی ماں رہتی تھیں......اب اس نے فروزاں کو یہ بھی بتایا کہ رندھاوا سے اسے کیا اطلاع ملی تھی۔
''مگر......'' فروزاں بولی۔ ''تم کہہ رہے تھے کہ وہ بہت معصوم لڑکی تھی۔ آخر وہ داغدار کیسے ہوگئی؟''
''یقیناً کسی نے اس پر جبر کیا ہوگا۔'' بختیار نے غصے سے کہا۔ ''اس نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا لیکن میں اس سے پوچھ کر رہوں گا۔ میرا خیال ہے وہ مجھے بتانے سے ہچکچائے گی بھی نہیں۔ وہ مجھے بہت اچھا آدمی سمجھنے لگی تھی۔ شاید وہ مجھے بتا بھی دیتی لیکن غالباً تذبذب کا شکار رہی۔ اسی لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دوبارہ ضرور آؤں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اس دوران میں وہ مجھے حقیقت بتانے کی ہمت کر ہی لے گی۔''
''اس نے بتا بھی دیا تو تم کیا کر سکو گے؟''
''میں اس معصوم لڑکی کی خاطر وہ سب کچھ کر گزروں گا جو کر سکوں گا جس نے بھی اس پر جبر کیا ہے، میں اسے ہر قیمت پر مجبور کروں گا کہ اب وہ اس سے شادی بھی کرے۔''
فروزاں چپ ہوگئی۔
کار تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ بختیار کو ثقلین آباد کا راستہ معلوم نہیں تھا اور بس میں وہاں سے آتے وقت بھی وہ راستوں کا دھیان نہیں رکھ سکا تھا لیکن دو ایک لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہ ثقلین آباد پہنچ گیا۔
اگرچہ وہ گلی تنگ تھی لیکن بختیار کسی نہ کسی طرح کار آسیہ خالہ کے گھر کے قریب تک لے جانے میں کامیاب رہا۔ عین گھر کے سامنے وہ اس لیے نہیں پہنچ سکا کہ وہاں پاس پڑوس کے بہت سے لوگ موجود تھے۔
کار سے اتر کر لوگوں سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آسیہ خالہ کو دفن کر کے ابھی واپس لوٹے تھے۔
''پروین کہاں ہے؟'' بختیار نے ایک سے پوچھا۔
''آپ کون ہیں؟'' بختیار کو سر سے پیر تک دیکھا گیا۔
''آپ بس ایک احسان کیجیے مجھ پر!'' بختیار نے اپنی جھنجلاہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ''کسی طرح پروین تک یہ بات پہنچا دیجیے کہ بختیار آیا ہے۔''
وہ آدمی بختیار کے لہجے سے مرعوب ہو کر بولا۔ ''میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔''
ذرا دیر بعد ہی بختیار اور فروزاں، پروین کے سامنے تھے۔
گھر میں عورتیں بھی جمع تھیں لیکن پروین نے اس کمرے سے تمام عورتوں کو باہر نکال دیا تھا۔ وہ پلنگ پر اجڑی اجڑی سی بیٹھی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چہرہ، وہ خالی خالی نظروں سے بختیار اور فروزاں کو دیکھنے لگی۔
''مجھے ٹی وی سے سب کچھ معلوم ہوگیا ہے پروین!'' بختیار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، وہ کون ہے جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ میں اسے پاتال سے بھی نکال لاؤں گا۔''
''آپ کو یاد نہیں صاحب!'' پروین رو دینے والے انداز میں بولی۔ ''جب یہاں آپ بیمار پڑے تھے، آپ پر مدہوشی طاری ہوگئی تھی۔ کچھ ہوش نہیں رہا تھا آپ کو......! آپ نے کسی فروزاں کو تصور میں دیکھا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ فروزاں نہیں تھی صاحب! وہ میں تھی۔'' پروین کی نظریں جھک گئیں اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک گئے۔ ''میں بہت مچلی تھی صاحب!'' وہ کانپتی آواز میں بولی۔ ''مگر آپ نے مجھے نہیں چھوڑا اور......'' اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
بختیار پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اسے وہ سب کچھ یاد آگیا تھا جسے اس نے اپنا خواب سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی فروزاں کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔
لیکن معصوم پروین کی بربادی کا مداوا ہوگیا۔ کچھ ہی دن بعد اس کے نام ''پروین'' کے ساتھ ''بختیار'' کا اضافہ ہوگیا۔ پروین بختیار!
اور بختیار کی زندگی کا یہ آخری مرحلہ فروزاں کی خواہش سے طے پایا تھا۔



بعد از گناہ

ایچ اقبال

کچھ لوگوں کے خواب بالکل آگ کی طرح ہوتے ہیں... جس کی تعبیر پانے تک وہ جلتے ہی رہتے ہیں... ایک ایسی ہی دوشیزہ کا قصّہ... جس کی آنکھوں میں اونچے خواب سجے تھے... ان خوابوں کو پانے کے لیے اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی... خوش قسمتی سے اسے خوابوں کی تکمیل کے لیے ایک سہارا مل ہی گیا... آسودگی... فرحت اور مال و زر نے اسے اپنا اسیر کر لیا... مگر ان جلتے خوابوں کے لیے اپنے جسم کو دہکانا پڑتا ہے... اس زیاں اور کرب کا احساس اسے بہت تاخیر سے ہوا...

محبت اور اعتماد...... رشتوں اور جذبوں کے

ریزہ ریزہ ہو جانے کا عبرت اثر ماجرا......

سائرہ بوکھلاہٹ کے باعث ائرکنڈیشنڈ کوپے سے باہر نکل آئی تھی اور پھر اس نے فراٹے بھرتی ہوئی ٹرین سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے علم میں تھا کہ ٹرین نے کوپل پر سے گزرنا شروع کر دیا تھا اور پل کے نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ اسے ڈر نہیں تھا کہ وہ زمین سے ٹکرا کر اپنی ہڈی پسلی ایک کروا بیٹھتی...... اسے تیرنا...... آتا تھا۔

کچھ گہرائی تک جانے کے بعد اس نے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے تاکہ سطح آب پر ابھر سکے۔ اس کا سر جب پانی سے ابھرا تو اس نے ٹرین کے انجن کی آواز سنی۔ اپنے پانی میں شرابور بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے ٹرین کے انجن کی سیٹی سنی۔ اس وقت ٹرین کا آخری ڈبا پل پر سے گزر رہا تھا۔

سائرہ اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست نہیں کر پائی تھی کہ اس نے ایسی آواز سنی جیسے دریا میں کچھ گرا ہو لیکن وہ ''کچھ'' کیا تھا؟ یہ سائرہ سمجھ گئی تھی۔ وہ لاروش ہی ہو سکتا تھا جس نے اس کا سر پانی سے ابھرتے دیکھ کر خود بھی دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ سائرہ کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اگرچہ رات کا وقت تھا لیکن چاندنی اتنی تھی کہ سب کچھ مکمل طور سے اندھیرے میں چھپا ہوا نہیں تھا۔

لاروش کے کودنے کی آواز اس طرف سے آئی تھی جس طرف ٹرین جا رہی تھی اس لیے سائرہ نے مخالف سمت میں تیرنا شروع کر دیا۔ اسے ہر قیمت پر لاروش سے بچنا تھا۔ اس سے بچنے ہی کے لیے تو اس نے ٹرین سے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے باوجود اس نے زیادہ سے زیادہ تیزی سے تیرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی



تھی کہ لاروش بھی تیرنا جانتا ہوگا ورنہ وہ دریا میں نہ کودتا اور سائرہ کو نکل جانے دیتا۔

''جمشید...... جمشید! مجھے لاروش سے بچاؤ۔'' وہ دل ہی دل میں چیخی تھی لیکن اگر وہ کھل کر بھی چیختی تو اس کی آواز جمشید تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ تقریباً بیس میل دور اس قصبے میں تھا جس طرف ٹرین جا رہی تھی۔

سائرہ نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ تقریباً سو گز پیچھے اسے کوئی تیرتا ہوا دکھائی دیا جو لاروش ہی ہو سکتا تھا۔ وہ سائرہ کا پیچھا کر رہا تھا۔

سائرہ نے غوطہ لگایا اور زیرِآب تیرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح لاروش اندازہ نہیں لگا سکے گا کہ وہ کس طرف جا رہی تھی۔

لیکن سائرہ کا اس طرح سوچنا کچھ ایسا سودمند بھی نہیں تھا۔ وہ دریا کے جس کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی، وہاں دور تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ لاروش بھی وہاں پہنچ جاتا۔ بس یہ فرق پڑتا کہ جنگل میں وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر ہو سکتے تھے۔

اگر سائرہ دائیں بائیں مڑتی تو اسے دریا کی لمبائی میں تیرنا پڑتا اور زیادہ دیر تک تیرتے رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ممکن صرف یہی تھا کہ وہ جنگل میں پہنچ جائے اور وہاں کسی طرح لاروش سے دور ہونے کی کوشش کرے۔

لیکن یہ بات لاروش بھی سمجھ سکتا تھا کہ سائرہ جنگل ہی میں پہنچے گی۔

جب سائرہ کے لیے سانس روکے رکھنا مشکل ہو گیا تو وہ پھر سطحِ آب پر اُبھری۔ اپنے بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے اس نے عقب میں دیکھا۔ لاروش اس کے عین پیچھے تو نہیں لیکن بائیں جانب تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ بھی جنگل ہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''آج تم مجھ سے بچ نہیں سکو گی سائرہ!'' لاروش کی چیختی ہوئی آواز سائرہ کے کانوں تک مدھم ہو کر پہنچی۔

سائرہ نے سانس سنبھالنے کے بعد پھر غوطہ لگایا اور زیرِآب تیرتے ہوئے اپنا رخ تھوڑا سا بدلا۔ وہ چاہتی تھی کہ جنگل میں پہنچنے کے بعد اس کا اور لاروش کا درمیانی فاصلہ بڑھ جائے۔

چند منٹ بعد وہ ساحل پر پہنچ گئی۔ جہاں درختوں کی بہتات تھی۔ کچھ پرندے اس کی موجودگی محسوس کر کے اپنی اپنی آوازوں میں چیختے ہوئے شاخوں سے اُڑے۔

کچھ ایسا ہی تیس چالیس گز کے فاصلے پر بھی ہوا اور سائرہ سمجھ گئی کہ وہاں لاروش ہوگا۔

سائرہ ایک بہت چوڑے تنے کے درخت کی آڑ میں رک کر اپنی سانسیں درست کرنے لگی جو بُری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ اس کی جینز اور شرٹ بھی پانی میں شرابور تھیں۔

اس نے جینز میں اڑسا ہوا اپنا پرس نکالا۔ بوکھلاہٹ کے باوجود وہ کوپے سے نکلتے وقت اپنا پرس لینا نہیں بھولی تھی جس میں اس کا موبائل فون بھی تھا۔

فون پر وہ جمشید سے رابطہ کرسکتی تھی لیکن اسے اندیشہ تھا کہ پانی میں بھیگ کر اس کا موبائل ناکارہ ہو چکا ہوگا۔ محض ایک امید موہوم پر اس نے جینز میں اڑسا ہوا اپنا پرس نکالا۔

''سائرہ!'' لاروش کی مدھم آواز سائرہ کے کانوں تک پہنچی۔ ''اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو خود کو میرے حوالے کردو۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ تم کہاں چھپی ہوئی ہو لیکن میرے پاس آٹو میٹک گن بھی ہے جسے ایک چرمی کیس نے پانی سے بالکل محفوظ رکھا ہے۔''

سائرہ نے قدرے سکون محسوس کیا۔ آواز سے اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ لاروش کہاں تھا۔ وہ درخت کے تنے کی وجہ سے ایسی پوزیشن میں تھی کہ لاروش اسے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

سائرہ نے پرس کھولا۔ وہ نہایت قیمتی پرس اسے جمشید نے تحفے میں دیا تھا۔ اسی لیے وہ پرس کی اس خصوصیت سے ناواقف تھی کہ اس میں پانی نہیں جاسکتا تھا۔ جب اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا، تبھی اسے احساس ہوا کہ پانی کے چند قطرے، بھی پرس میں داخل نہیں ہو سکے تھے۔ اس کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ اس نے فوراً پرس نکالا۔

درخت کی چھاؤں میں ہونے کے باعث وہ چاندنی سے یکسر محروم اور مکمل اندھیرے میں تھی لیکن اس نے اندازے ہی سے اپنی ایک انگلی کو حرکت دی۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ سائرہ کو یقین تھا کہ اس نے کوئی غلط نمبر نہیں ملایا ہوگا۔ جلد ہی اس کی تصدیق بھی ہوگئی جب دوسری گھنٹی کے بعد ہی کال ریسیو کرلی گئی اور جمشید کی آواز سنائی دی۔

''کہاں ہو تم سائرہ؟'' جمشید نے تیزی سے پوچھا۔ ''میں نے ٹرین کو ایک منٹ تک رکوائے رکھا تھا لیکن......''

''میں خطرے میں گھر گئی ہوں جمشید۔'' سائرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''لاروش میرے پیچھے لگ گیا ہے۔''

''کیسے؟'' جلدی سے پوچھا گیا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں ٹرین میں ہی تھی لیکن لاروش سے بچنے کے لیے میں نے ٹرین کے باہر چھلانگ لگا دی تھی اس وقت ٹرین پُل پر سے گزر رہی تھی۔ میں دریا میں جاگری تھی۔ وہاں سے تیرتی ہوئی میں جنگل میں آگئی ہوں لیکن لاروش بھی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اس نے بھی ٹرین سے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ بھی جنگل میں آگیا ہے لیکن مجھ سے کچھ فاصلے پر ہے اور مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ میں ایک درخت کی آڑ میں ہوں لیکن وہ مجھے ڈھونڈ لے گا۔ اب اس نے ٹارچ بھی جلالی ہے۔ میں اس کی روشنی دیکھ رہی ہوں۔''

''یہ میں بعد میں پوچھوں گا کہ لاروش تمہارے پیچھے لگا کیسے، ابھی تو یہ بتاؤ کہ تم خود کو لاروش سے کتنی دیر تک چھپا سکتی ہو؟'' جمشید نے پوچھا۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔'' سائرہ اتنے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی کہ لاروش اس کی آواز نہ سن سکے۔

''اچھا میں پہنچتا ہوں وہاں۔'' جمشید نے کہا۔ ''اپنے فون کی گھنٹی بند کردو لیکن اسکرین پر نظر رکھو۔ میں کال کروں گا تو اسکرین چمکنے لگے گی۔''

''بیس میل کے فاصلے سے تم جلدی تو نہیں آسکتے جمشید۔'' سائرہ بہت پریشان تھی۔

''میں بہت جلد پہنچوں گا۔ تم بس کسی طرح لاروش کی نظروں میں آنے سے بچی رہو۔''

پھر اس سے پہلے کہ سائرہ مزید کچھ کہتی، دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔ جمشید بھی یقیناً عجلت کا شکار ہوگیا ہوگا۔

سائرہ نے فون ہاتھ میں ہی رکھا۔ اس دوران میں بھی اس کی نظر روشنی کی طرف تھی جو لاروش کی ٹارچ ہی کی وجہ سے ممکن تھی۔ اطمینان بخش پہلو یہ تھا کہ لاروش اس طرف نہیں آرہا تھا جہاں وہ درخت کی آڑ میں کھڑی تھی۔

''میں تمہیں ڈھونڈ ہی لوں گا سائرہ!'' لاروش کی آواز اس مرتبہ کچھ صاف سنائی دی۔ وہ سائرہ سے کچھ قریب تو ہوگیا تھا لیکن اس کے قدم دوسری طرف بڑھ رہے تھے۔

یہ سائرہ کے لیے اطمینان بخش بات تھی لیکن یکایک لاروش کا رخ تبدیل ہو۔ اب وہ اسی درخت کی طرف آرہا تھا جہاں سائرہ چھپی ہوئی تھی۔ سائرہ کا دل بڑی زور سے دھڑک اٹھا حالانکہ دھڑکنیں پہلے ہی کافی تیز تھیں۔

''تو تم یہاں کہیں چھپی ہوئی ہو!'' لاروش کی ہلکی سی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''پرندے تو اس درخت سے زیادہ اڑے تھے۔ سات آٹھ منٹ تک میں غلط سمت میں بڑھتا رہا تھا۔''

سائرہ کا اندازہ تھا کہ دس منٹ گزر چکے تھے۔

''اپنی زندگی چاہتی ہو تو سامنے آجاؤ سائرہ!'' لاروش کی آواز پھر سنائی دی۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے پاس آٹو میٹک گن ہے۔ میں ہر طرف گولیاں برسانا شروع کردوں گا۔ ماری جاؤ گی تم۔''

لیکن سائرہ کو احساس تھا کہ وہ محض دھمکی تھی۔ لاروش اسے ہر صورت میں زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ اسے جمشید کی محبوبہ کے جسم کی ہوس تھی۔ وہ اسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا تھا اور پھر اس قسم کی ساری تصویریں وہ جمشید کو بھیجتا۔

سائرہ نہیں جانتی تھی کہ لاروش جمشید کا دشمن کیوں بن گیا تھا۔ وہ ایک گینگسٹر تھا اور جمشید قومی اسمبلی کا رکن! ایک ایم این اے سے کسی گینگسٹر کو آخر کیا دشمنی ہوسکتی تھی؟ وہ جمشید کو کیوں نیچا دکھانا چاہتا تھا؟

''سمجھ گیا۔'' لاروش کی ہنسی قدرے توقف سے سنائی دی۔ ''تم کو اندازہ ہے کہ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ میں تو تمہیں اپنی آغوش کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔''

اس کے قدم آگے بڑھنے لگے۔ وہ درخت کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے رک کر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اب تو میں نے تمہیں پالیا ہے۔ درخت کی آڑ سے نکل آؤ۔''

اب بھی سائرہ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ برقی انداز میں جھپٹ کر درخت کی اس جانب آگیا جہاں سائرہ نے خود کو چھپایا ہوا تھا۔

''اوہ!'' لاروش کے انداز میں جھنجلاہٹ بھی تھی اور غصہ بھی کیونکہ سائرہ اب وہاں نہیں تھی۔ اس نے لاروش کو درخت کی طرف بڑھتے دیکھ کر ہی بہ آہستگی زمین پر لیٹ کر ایک اور درخت کی طرف رینگنا شروع کردیا تھا۔ وہ خاصے پیچھے کی جانب کے ایک درخت کی طرف بڑھی تھی۔ جب اس نے لاروش کی غصے میں بھری۔ ''اوہ'' سنی، اس وقت وہ درخت پر چڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ درخت حد درجہ گھنا تھا۔ سائرہ خود کو اس کی گھنی شاخوں میں چھپانا چاہتی تھی۔

''نہیں سائرہ!'' لاروش کی ہنسی پھر سنائی دی۔ ''آج تم بچ نہیں سکو گی مجھ سے۔ تم یقیناً یہیں تھیں۔ یہاں تمہارے پیروں کے نشان موجود ہیں۔''

سائرہ نے جب دریا میں تیرنا شروع کیا تھا تو سینڈل اس کے پیروں سے نکل گئے تھے لیکن اگر نہ نکلے ہوتے تو بھی لاروش کو سینڈل ہی کے نشان نظر آجاتے۔

''اور یہاں سے تم نے زمین پر رینگنا شروع کیا۔ میں تمہارے پنجوں کے نشان دیکھ سکتا ہوں۔''

اس نے اس درخت کی طرف بڑھنا شروع کیا جس پر سائرہ چڑھ رہی تھی۔ سائرہ نے درخت پر چڑھنے کا ارادہ ترک کردیا اور تیزی سے نیچے آگئی۔ اب وہ درخت کی گھنی شاخوں میں چھپ کر خود کو لاروش سے محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔

سائرہ کے پیر زمین سے لگے ہی تھے کہ فضا میں گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ سائرہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گڑگڑاہٹ کی وہ آواز ایک ہیلی کاپٹر کی تھی جو جنگل میں ایک طرف بڑھتے ہوئے اسپاٹ لائٹ زمین پر پھینک رہا تھا، جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔

سائرہ ہی کی طرح لاروش بھی ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ ہو کر کچھ بڑبڑایا تھا۔ سائرہ نہیں سمجھ سکی کہ اس کی بڑبڑاہٹ کیا تھی۔

اسپاٹ لائٹ کی وجہ سے یقین کیا جاسکتا تھا کہ ہیلی کاپٹر والوں کو کسی چیز کی تلاش تھی۔

''سائرہ!'' لاروش دانت پیستے ہوئے چیخا۔ ''تمہارے پاس موبائل فون ہوگا۔ تم ہی نے اسے اطلاع دی ہوگی۔ یہ ہیلی کاپٹر اسی شیطان کا ہے۔ آج میری آٹو میٹک اسے ہیلی کاپٹر سمیت جہنم رسید کردے گی۔''

سائرہ نہیں جانتی تھی کہ جمشید کسی ہیلی کاپٹر کا مالک بھی ہے لیکن یہ اس نے سمجھ لیا کہ لاروش کی بات غلط نہیں ہوسکتی۔ اسے جمشید کے بارے میں کچھ اور بھی معلوم ہوسکتا تھا۔

اب ہیلی کاپٹر ایک طویل راؤنڈ لے کر اسی طرف آرہا تھا جہاں سائرہ اور لاروش تھے۔

سائرہ نے چاہا کہ موبائل پر جمشید سے رابطہ کرے۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ اس کے موبائل کی اسکرین چمک رہی تھی اور جمشید کا نام بھی دکھائی دے رہا تھا۔

سائرہ نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

''ہاں جمشید!'' سائرہ کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

''تیسری بار رنگ کیا ہے تمہیں، پریشان ہوگیا تھا۔''

حقیقت یہی تھی کہ لاروش کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کے باعث وہ اپنے موبائل کی طرف سے کچھ غافل رہی تھی۔

''تم خیریت سے تو ہونا؟'' جمشید نے سائرہ کے بولنے سے پہلے ہی سوال کرڈالا۔

''ابھی تک تو خیریت ہی سے ہوں۔'' سائرہ نے جواب دیا۔ ''لاروش مجھ سے کچھ فاصلے پر ہے لیکن میں اس

کی نظر میں نہیں ہوں۔ یہاں ایک ہیلی کاپٹر دکھائی دے رہا ہے۔ لاروش کہہ رہا تھا کہ یہ تمہارا ہی ہیلی کاپٹر ہے۔''

''وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تم اپنی پوزیشن واضح کرو۔''

''کیا تم اسی ہیلی کاپٹر میں ہو؟'' سائرہ نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' جمشید نے جواب دیا اور اپنی بات دہرائی۔ ''اپنی پوزیشن واضح کرو۔''

''ہیلی کاپٹر اسی طرف آرہا ہے جس طرف ہم ہیں لیکن تم خطرے کی طرف بڑھ رہے ہو۔'' سائرہ نے جلدی سے کہا۔ ''لاروش کے پاس آٹومیٹک گن ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنانا چاہتا ہے جمشید!''

''یہ بتا کر تم نے بہت اچھا کیا سائرہ۔'' جمشید نے تیزی سے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں، کیا کیا جا سکتا ہے۔'' ''ابھی ہیلی کاپٹر تم دونوں سے کتنی دور ہے؟''

سائرہ اس سوال کا جواب اندازے ہی سے دے سکتی تھی اور اس نے اظہار بھی کر دیا کہ یہ اس کا اندازہ ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' جمشید کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اسپاٹ لائٹ بجھادی گئی۔

لاروش کچھ بڑبڑایا جو سائرہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

چاندنی رات میں ہیلی کاپٹر ایک ہیولے کے مانند نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنا رخ تھوڑا سا بدلا اور اپنی بلندی کم کرتا چلا گیا۔

''سائرہ!'' لاروش تیز لہجے میں بولا۔ ''تم نے موبائل پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ یہی بات ہے نا؟''

سائرہ بہ دستور خاموش رہی۔ اگر بولتی تو لاروش اندازہ لگا لیتا کہ وہ کہاں تھی!

''نہیں بولو گی!'' لاروش حقارت سے ہنسا۔ ''بہت چالاک ہو۔ یہ بھی نہیں بتاؤ گی کہ تمہارے عاشق نے جو پینترا بدلا ہے، اس کا مقصد کیا ہے؟''

سائرہ کو خاموش رہنا تھا، سو وہ خاموش رہی پھر اس وقت چونکی جب جنگل کی کئی سمتوں سے انجنوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ انجن کسی قسم کی جیپوں کے بھی ہو سکتے تھے۔

''بزدل!'' لاروش غرایا۔ ''مجھ اکیلے کو گھیرنے کے لیے اپنے غلاموں کو بھی لایا ہے۔''

سائرہ سمجھ گئی کہ اگر ان گاڑیوں میں آنے والے جمشید ہی کے آدمی تھے تو وہ لوگ یقیناً وہ ہوں گے جو جمشید کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہوں گے۔ جمشید بہت بڑا جاگیردار تھا، ایم این اے تو وہ گزشتہ الیکشن میں جیت کر پہلی بار بنا تھا۔

''میں اب جاتا ہوں سائرہ!'' لاروش کی آواز سنائی دی۔ ''آج تم بچ گئیں لیکن بکرے کی ماں زیادہ عرصے تک اپنی خیر نہیں...... '' وہ تیزی سے ایک جانب بڑھتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کے آخری دو ایک الفاظ سائرہ کو سنائی بھی نہیں دیے۔

ہیلی کاپٹر کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سائرہ کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ اسے جنگل میں کس جگہ اتارا جا سکا ہوگا۔

لاروش تیزی سے ایک جانب بڑھتے ہوئے موبائل فون پر کسی سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ چاندنی میں اس کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں وہ آٹومیٹک گن سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ بات اس نے محض دھمکی دینے کے لیے نہیں کہی تھی۔

گاڑیوں کے انجنوں کا شور اب کافی قریب آچکا تھا۔ سائرہ کا خیال تھا کہ جمشید موبائل فون کے ذریعے ان کی رہنمائی کر رہا ہوگا کیونکہ گاڑیاں اسی طرف آرہی تھیں جہاں سائرہ کھڑی تھی۔

تیزی سے ایک طرف جاتا ہوا لاروش اب سائرہ کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سائرہ جہاں تھی، وہیں کھڑی رہی۔ اسے گاڑیوں کے قریب آنے کا انتظار تھا۔ وہ لوگ جمشید کی ہدایت کے مطابق اس کے کام آتے اور اسے اس وحشت ناک جنگل سے نجات مل جاتی۔

یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہیلی کاپٹر کہاں غائب ہو گیا؟ دفعتاً وہ ایک نئی قسم کی آواز سن کر چونکی جو اس کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ آواز پر شبہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ موٹر سائیکل کی ہوگی۔

اب سائرہ آواز ہی کی سمت دیکھتی رہی اور جلد ہی اس کا خیال درست ثابت ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل ہی تھی۔ اس کی طرف دیکھنے کے باوجود وہ موبائل کی طرف سے غافل نہیں تھی۔ اس نے اسکرین چمکتی دیکھی تو فوراً کال ریسیو کی۔

''ہاں جمشید!'' اس نے کہا۔

''تم اور لاروش اس وقت کس پوزیشن میں ہو؟'' جمشید نے پوچھا۔

''میں جس درخت کی آڑ میں کھڑی تھی، وہیں کھڑی ہوں لیکن لاروش ایک جانب بھاگ گیا ہے۔''

''بھاگ کر جائے گا کہاں، اسے تین طرف سے گھیرا

جارہا ہے اور چوتھی طرف دریا ہے۔ اچھا خیر! درخت کے نیچے ہونے کی وجہ سے تم تاریکی میں ہی ہو گی۔ وہاں سے ہٹ کر چاندنی میں آجاؤ تاکہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔''

''ایک موٹر سائیکل میری طرف بڑھ رہی تھی جواب خاصے فاصلے پر رکی ہوئی ہے۔''

''تم سے موبائل فون پر بات کرنے کے لیے روکی ہے میں نے موٹر سائیکل۔''

سائرہ چونکی۔ ''موٹر سائیکل پر تم ہو؟''

''ہاں، بس اب تم چاندنی میں آجاؤ۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

سائرہ نے کال ریسیو کرتے وقت موٹر سائیکل کو رکتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اب اسے حرکت میں آتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ درخت کے سائے سے باہر چاندنی میں آگئی۔ اسے تعجب بھی تھا کہ اس جنگل میں جمشید کے پاس موٹر سائیکل کہاں سے آگئی؟

آخر موٹر سائیکل اس کے قریب آرکی۔

''چلو بیٹھو۔'' جمشید نے ہیلمٹ اتارتے ہوئے سائرہ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

سائرہ نے جلدی سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم سیدھے چلے آرہے تھے۔ اگر لاروش یہاں ہوتا تو تمہیں گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔''

''میں بلٹ پروف ہوں۔''

''اوہ...... تبھی...... اچھا یہ موٹر سائیکل کہاں سے آگئی؟''

''ابھی دیکھ لینا۔''

موٹر سائیکل جنگل کے اونچے نیچے راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ سائرہ نے راہ میں دو لینڈ کروزر اور ایک جیپ بھی حرکت میں دیکھی۔

''آج تمہارے تحفے نے بچائی ہے میری جان۔''

''کیسا تحفہ؟''

''تم نے جو پرس دیا تھا، اسی میں میرا موبائل فون بھی تھا۔ پانی پرس میں داخل نہیں ہوسکا ورنہ موبائل بیکار ہو جاتا۔''

''ہاں۔'' جمشید نے جواب دیا۔ ''واٹر پروف پرس ہے وہ۔''

جلد ہی موٹر سائیکل ایک جگہ رکی۔ سائرہ نے وہاں ہیلی کاپٹر دیکھا جو زمین سے خاصا قریب رہتے ہوئے فضا میں معلق تھا۔ اس کے دروازے سے ایک سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔

''چڑھ جاؤ اوپر!'' جمشید نے سائرہ سے کہا جو موٹر سائیکل سے اُتر چکی تھی۔

ہیلی کاپٹر خاصا بڑا تھا۔ جمشید نے سائرہ کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا، پھر خود چڑھا۔ سائرہ نہیں جان سکی کہ موٹر سائیکل کس طرح اوپر لائی جاسکی۔ سیڑھی سے تو لائی نہیں جا سکتی تھی لیکن سائرہ نے اس بارے میں سوال نہیں کیا۔ اسے اپنے کپڑوں کا خیال آگیا تھا جو زمین پر رینگنے کی وجہ سے بہت خراب ہوچکے تھے۔

''میرا سامان ٹرین ہی میں رہ گیا۔'' وہ بولی۔

''کپڑے بھی تھے۔''

''کپڑوں کے علاوہ کوئی خاص چیز تو نہیں تھی؟''

''کوئی اہم چیز نہیں تھی۔''

''تو بھول جاؤ سب۔''

''میں جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں، یہ تو خراب......''

''تمہارے کچھ کپڑے حویلی میں بھی ہیں۔ تم پچھلی بار آئی تھیں تو کچھ کپڑے بھول گئی تھیں۔ یاد ہے؟''

''تم نے یاد دلایا تو یاد آگیا ہے۔ اب لاروش کا کیا ہوگا؟''

''اس کی موت نے دعوت دی ہے جو وہ یہاں پہنچا۔ میرے آدمیوں سے بچ کر نہیں نکل سکے گا۔''

''تم نے مجھے اتنی عجلت میں کیوں بلایا؟''

''ایک ضروری کام تھا جو کل رات تک کے لیے ٹل گیا۔''

''کیا کام ہے؟''

''کل ہی بتاؤں گا۔''

سائرہ نے بحث نہیں کی اور ہیلی کاپٹر کے اندر کا جائزہ لینے لگی۔ ہیلی کاپٹر تین حصوں میں تقسیم تھا۔ پچھلے حصے میں کچھ سامان تھا۔ جن میں موٹر سائیکل بھی تھی۔ اگلے حصے میں پائلٹ اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا آدمی بھی تھا۔ درمیانی حصے میں سائرہ اور جمشید تھے۔

''میں پہلی بار تمہارے ہیلی کاپٹر میں بیٹھی ہوں۔'' سائرہ بولی۔

''اتفاق ہے۔ تم متعدد بار حویلی آئی ہو لیکن یہ اتفاق پہلی بار ہوا ہے اور ہاں! سب انسپکٹر جاوید کی کیا خبر ہے؟''

سائرہ ہنس پڑی۔ ''وہ بے چارہ اب بھی میرے لیے چکر لگاتا رہتا ہے۔''

''بچ کر ہی رہنا اس سے۔''

''بظاہر تو وہ شریف ہی لگتا ہے۔ معمولی سے گھر میں رہتا ہے۔ کار بھی نہیں ہے اس کے پاس! اس کا مطلب ہے کہ رشوت خور بھی نہیں ہے۔''

''اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں یہ لوگ۔''

''دفع کرو، کوئی اور بات کرو۔''

''ہم پہنچ گئے۔'' جمشید نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

ہیلی پیڈ حویلی کے وسیع احاطے ہی میں تھا جہاں ہیلی کاپٹر اُترا۔

سائرہ اور جمشید ہیلی کاپٹر سے نکلے ہی تھے کہ جمشید کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جمشید نے حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''یس؟''

پھر دوسری طرف سے کچھ سن کر اس کا چہرہ اس طرح بگڑا جیسے اسے غصہ آ گیا ہو۔ اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم بھی رک گئے تھے۔ اس کی وجہ سے سائرہ کو بھی رکنا پڑا۔ وہ غور سے جمشید کو دیکھنے لگی۔

''لعنت ہے تم لوگوں پر!'' جمشید نے کچھ توقف سے کہا اور پھر دوسری طرف کی کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور زیرِلب کچھ بڑبڑاتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔

''کیا ہوا؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''لاروش بچ نکلا۔''

''ارے!'' سائرہ کے منہ سے نکلا۔ ''تم تو کہہ رہے تھے کہ اسے تین طرف سے گھیرا گیا ہے اور چوتھی طرف دریا ہے۔''

''وہ دریا ہی اس کے لیے راہِ فرار بنا۔ وہ تیرتا ہوا کافی آگے نکل گیا تھا جب میرے آدمیوں کی نظر اس پر پڑی۔ وہ ایک لانچ پر سوار ہو رہا تھا۔ ایک تو چاندنی رات، دوسرے لانچ پر بھی روشنی تھی۔ اسے بہ آسانی پہچان لیا گیا تھا۔''

''تو پھر اس پر فائر کھولا جا سکتا تھا؟''

''گولیاں تو برسائی گئیں لیکن لانچ گولیوں کی رینج سے باہر تھی۔'' جمشید نے جواب دیا پھر بولا۔ ''بس ذرا دیر ہوئی اس معاملے میں! اگر اس کی اطلاع اسی وقت مل جاتی جب تم میرے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو رہی تھیں تو میں ہیلی کاپٹر دریا ہی کی طرف لے جاتا۔ لانچ کو بچ کر نہیں نکلنے دیتا لیکن اب دیر ہو چکی ہے۔ وہ نہ جانے کہاں سے کہاں جا چکی ہو گی۔ اگر میں لانچ تک پہنچ بھی جاؤں تو قوی امکان ہے کہ چالاک لاروش اس سے پہلے ہی ساحل پر کسی جگہ اتر گیا ہو گا۔ اسے اندیشہ تو ہو گا کہ میں ہیلی کاپٹر میں اس کے پیچھے آ سکتا ہوں۔''

وہ دونوں اس وقت حویلی میں داخل ہو چکے تھے۔

''لانچ کہاں سے آ گئی وہاں؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''وہ کہیں زیادہ دور نہیں ہو گی۔ لاروش نے اس سے موبائل فون پر رابطہ کیا ہو گا۔ تم مجھے بتا چکی ہو کہ وہ بھاگتے بھاگتے فون پر کسی سے رابطہ کر رہا تھا۔ لاروش جیسے مخالفوں کو بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس نے فون کر کے جیپ یا لینڈ کروزر ساحل پر اس جگہ بلوا لی ہو گی جہاں وہ اترا تھا۔ اس کے وسائل محدود نہیں ہیں سائرہ۔''

''لانچ کو ہی تباہ کر دیتے۔''

''اس طرح معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ صرف لاروش کو ختم کر کے کسی جگہ دفن کر دیا جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ لانچ کی تباہی کی بات پھیل سکتی تھی جس سے میری ایم این اے کی حیثیت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔''

''کتنے ہی ایم این اے اور ایم پی اے اس قسم کے کاموں میں ملوث ہیں۔'' سائرہ نے کہا۔ ''جانی دشمن کو ختم کرنا میں کوئی جرم نہیں سمجھتی، ہاں البتہ یہ تم نے ٹھیک کہا کہ لانچ کی تباہی تمہارے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ لاروش تمہارا دشمن کیوں ہو گیا ہے؟''

''اب کل ناشتے پر بات ہو گی۔'' جمشید نے ایک کمرے کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔ ''اب تم کپڑے تبدیل کر کے آرام کرو۔''

جس دروازے پر رکا گیا تھا، وہ سائرہ کے لیے ہی مخصوص تھا۔ وہ جب بھی آتی تھی، اسی کمرے میں سوتی تھی جس کی آرائش میں جمشید نے کوئی کمی نہیں اٹھا رکھی تھی۔

''اچھا، شب بہ خیر۔'' سائرہ نے کہتے ہوئے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

''شب بہ خیر۔'' کہتا ہوا جمشید آگے بڑھا۔ دوسرا دروازہ اس کی خواب گاہ کا تھا۔

ان دونوں کمروں کے بیچ میں بھی ایک دروازہ تھا جہاں سے وہ دونوں ایک دوسرے کے کمروں میں جا سکتے تھے۔ جمشید نے نہ جانے کہاں سے مزدوروں کو بلا کر وہ درمیانی دروازہ بہت خفیہ طور پر بنوایا تھا۔ حویلی کے ملازمین بھی اس سے بے خبر تھے۔ خاندان کی عورتیں بھی اس سے

لاعلم تھیں۔ ان کے لیے حویلی کا دوسرا حصہ مخصوص تھا۔ کسی کو بھی مردانے حصے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ملازمین کے لیے بھی ان کمروں میں داخلہ ممنوع تھا ورنہ درمیانی دروازہ ان کے علم میں آجاتا۔ وہ جمشید اور سائرہ کو بھی باتیں کرتے دیکھتے تھے تو ٹی وی لاؤنج، ڈائننگ روم یا مردانہ حصے کے لان میں۔

ملازمین نے انہیں کبھی ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ سائرہ بھی کوئی ایم این اے ہوگی جس سے جمشید کے مراسم ہیں۔

یہ تو سائرہ ہی جانتی تھی کہ حقیقت کیا تھی۔

وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی جو صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔ وہ جب بھی آتی تھی، اُسے کمرا صاف ستھرا ہی ملتا تھا اور وہ سمجھ ہی سکتی تھی کہ ایسا کرنے والا جمشید کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ کپڑے بدلنے سے پہلے اس نے شاور لیا اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی تھا کہ جمشید نے اسے اتنی عجلت میں کیوں بلایا تھا۔ وہ اس وقت رات کا کھانا کھا کر چائے پی رہی تھی جب جمشید کا فون آیا تھا۔

”فوراً حویلی پہنچو!“ اس نے کہا تھا۔

”یعنی کل صبح؟“

”نہیں، ابھی، فوراً روانہ ہوجاؤ۔ ہوائی اڈا تو یہاں ہے نہیں، ٹرین سے آجاؤ۔ میں نے معلوم کرلیا ہے۔ ایک میل ٹرین پون گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہونے والی ہے۔“

”لیکن تمہارے قصبے کے اسٹیشن پر صرف پسنجر ٹرین رکتی ہے۔“

”یہ میل بھی کرے گی لیکن چند سیکنڈ کے لیے۔ تم دروازے پر ہی رہنا۔ ساتھ میں صرف ایک اٹیچی کیس لانا تاکہ فوراً اترنے میں کوئی قباحت نہ ہو۔“

”اچھا میں آتی ہوں۔ تیار ہی بیٹھی تھی ذرا شاپنگ کرنا ہے۔“

”بس روانہ ہوجاؤ۔“ جمشید نے رابطہ منقطع کردیا۔

سائرہ کو روانگی میں پندرہ منٹ لگے تھے۔ اٹیچی کیس میں کچھ کپڑے رکھ کر وہ باہر کار میں جا بیٹھی تھی۔ اٹیچی کیس شوفر اٹھا لایا تھا۔ سائرہ عموماً خود ہی ڈرائیو کرتی تھی لیکن اس وقت شوفر کو ساتھ لینا اس لیے ضروری تھا کہ اسٹیشن سے وہی کار واپس لاتا۔

☆☆☆

سائرہ کے والدین کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب وہ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ مجبوراً اسے اپنے رشتے کے ایک ماموں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ وہ ماموں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اسے ملازمت کی تلاش بھی تھی۔ اس سلسلے میں اس کے سامنے یہ مسئلہ بھی رہا کہ اس نے سیکنڈ ایئر بھی کلیئر نہیں کیا تھا۔ بے روزگاری کے دور میں اس نے ملازمت کے لیے بہت دھکے کھائے۔ محض اپنی خوب صورتی اور اچھی انگریزی بولنے کی صلاحیت کے باعث اسے ایک ریسپشنسٹ کی جاب مل گئی۔

کالج کے زمانے ہی سے جاوید نامی ایک نوجوان اس کا دیوانہ بنا رہا تھا لیکن سائرہ نے اسے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ جب وہ ملازمت کے سلسلے میں سرگرداں تھی تو جاوید نے اسے پولیس میں آنے کا مشورہ دیا تھا جو اس نے ٹھکرا دیا تھا اور ان دنوں وہ سب انسپکٹر بن چکا تھا جب سائرہ ریسپشنسٹ بنی۔ اس کے بعد سے، جاوید نے ہوٹل کے چکر بھی لگانے شروع کردیے تھے۔ وہ کچھ اداس بھی نظر آنے لگا تھا۔ سائرہ نے اس کی پروا نہیں کی تھی لیکن اسے اس سے نفرت بھی نہیں تھی، ہاں ہمدردی ضرور تھی کہ وہ اسی کا اسیر بن کر کیوں رہ گیا تھا، خوب صورت لڑکیوں کی کوئی کمی تو نہیں تھی۔

یہی جملہ اس نے جاوید سے کہہ بھی دیا تھا۔

”ہاں۔“ جاوید نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔ ”لیکن خوب صورتی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ تم میں کوئی اور ہی بات ہے جو مجھے اچھی لگی لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ بات کیا ہے۔“

”وہ بات کچھ بھی ہو، یہ مناسب نہیں کہ تم دوسرے تیسرے دن ریسیپشن پر آکر مجھ سے اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرو۔ ہوٹل کے بعض افراد کی آنکھوں میں مجھے اب شکوک نظر آنے لگے ہیں۔“

”ایک شعر سنو! میں کیا کہوں کہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا..... میں کیا کروں کہ تجھے دیکھنے کی عادت ہے۔“

”یہ عادت مجھے رسوائی میں دھکیل دے گی۔“ سائرہ کے انداز میں تھوڑی سی بے رخی تھی۔

”اچھا۔“ جاوید نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”اگر یہ بات ہے تو اب میں کبھی ریسیپشن پر نہیں آؤں گا۔ کہیں دور ہی سے تمہیں دیکھ لیا کروں گا۔“

”میں شکرگزار رہوں گی۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جاوید نے ریسیپشن پر آنا چھوڑ دیا۔ وہ جاوید کو کبھی کافی شاپ میں جاتے دیکھتی اور کبھی وہ

لابی میں بیٹھا نظر آتا۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ جب سائرہ ڈیوٹی پر پہنچی تو جاوید صدر دروازے ہی پر کھڑا نظر آیا ہے۔ سائرہ اسے نظرانداز کرتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوگئی۔

دراصل سائرہ کے خوابوں میں ایک ایسا شہزادہ بسا ہوا تھا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہوٹل کی ملازمت میں وہ بہت خوش تھی کیونکہ وہاں بہت بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے۔ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اچھی پوزیشن کے لوگ...... ان میں سے کوئی بھی اسے اچھا لگتا تھا تو وہ اسے حسرت سے دیکھتی رہتی تھی اور سوچتی تھی کہ شاید وہی اس کے سپنوں کا شہزادہ بن جائے۔

اتفاقاً وہ ایک روز ڈیوٹی کے وقت سے آدھے گھنٹے پہلے ہی ہوٹل پہنچ گئی اور کاؤنٹر کے باہر ہی کھڑی رہ کر اس ریسپشنسٹ سے باتیں کرنے لگی جس کی ڈیوٹی اب ختم ہونے والی تھی۔

''پلیز!'' ایک مردانہ آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا اور اسے پہچان بھی گئی۔ وہ ایم این اے جمشید تھا۔ سائرہ اسے اکثر ٹی وی کے ٹاک شوز میں دیکھتی رہی تھی۔

''میں آپ سے ہی مخاطب ہوا تھا۔'' وہ پھر بولا۔

''فرمایئے۔'' سائرہ نے دھڑکتے دل سے کہا کیونکہ جمشید اسے ٹاک شوز میں بھی اچھا لگتا تھا۔

''آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کچھ وقت دے سکیں گی؟''

سائرہ جس لڑکی سے باتیں کر رہی تھی، وہ ایک اور شخص کی طرف متوجہ ہوگئی تھی جو ہوٹل کے بارے میں کسی قسم کی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''جی کہیے۔'' سائرہ نے جمشید سے کہا۔

''کھڑے کھڑے بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کافی شاپ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

سائرہ نے گھڑی دیکھی۔ ''میری ڈیوٹی شروع ہونے میں پچیس منٹ رہ گئے ہیں۔ میں یہاں......''

''میں جانتا ہوں کہ آپ یہاں ملازم ہیں۔'' جمشید نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''کئی بار دیکھ چکا ہوں آپ کو۔''

''میں بس اتنا ہی وقت دے سکوں گی۔'' سائرہ نے کہا۔

''پچیس منٹ بہت ہیں، آیئے۔''

''چلیں۔''

وہ جمشید کے ساتھ کافی شاپ میں جا بیٹھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہوگئی تھیں کیونکہ جمشید خود اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''آپ کیا پینا پسند کریں گی؟'' جمشید نے پوچھا۔

''اس وقت آپ مجھے ہوٹل کی نمائندہ سمجھیں۔ آپ مہمان ہیں۔ آپ کیا پسند کریں گے۔''

جمشید دھیرے سے ہنسا۔ ''مجھے یہاں کا فالودہ بہت پسند ہے۔ موسم بھی ان دنوں گرمیوں کی طرف مائل ہے۔''

''فالودہ مجھے بھی پسند ہے۔'' سائرہ نے کہا اور اشارے سے ویٹر کو بلا کر اس سے فالودے کے لیے کہا۔ ''ذرا جلدی لانا۔''

ویٹر سر ہلا کر چلا گیا۔

جمشید بولا۔ ''میں نے اب تک آپ سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔''

''ضرورت نہیں اس کی۔'' سائرہ نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اکثر آپ کو ٹی وی پر دیکھ چکی ہوں۔''

''اور میں آپ کو ریسپشن پر کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ ایک بار آپ کی ایک ساتھی نے آپ کو نام لے کر پکارا تھا۔ اس لیے آپ کو بھی اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا نام سائرہ ہے ناں؟''

''آپ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے تھے؟'' سائرہ نے اسے جیسے یاد دلایا۔

''پہلے تو میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ریسپشن پر آپ کو ذرا سی بھی فرصت ملتی ہے تو آپ اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتی ہیں۔ یہ کام صرف باخبری کے لیے کرتی ہیں یا آپ کو جرنلزم یا سیاست سے دلچسپی ہے؟''

''جرنلزم سے تو بالکل نہیں، لیکن قومی سیاست سے تو ہر باشعور کو دلچسپی ہونی چاہیے۔''

''تو پھر اپنے سیاست دانوں کے بارے میں بھی آپ کوئی رائے رکھتی ہوں گی؟''

''یقیناً'' سائرہ نے کہا۔ ''آپ کو اور چند کو چھوڑ کر کوئی اچھے کردار کا مالک نہیں۔''

''خوشی ہوئی کہ آپ میرے بارے میں اچھی رائے رکھتی ہیں۔''

''کیا آپ کو مجھ سے بس اسی قسم کی باتیں کرنی ہیں؟''

''باتیں کرنے کا تو بس ایک بہانہ تھا آپ بیٹھنے کا۔''

''کیا مطلب؟''
''بس دل چاہا تھا کہ آپ سے دوستی کرلوں۔''
''اوہ!'' ایک بار پھر سائرہ کا دل زور سے دھڑکا۔
''کیا آپ میری دوست بننا پسند کریں گی؟''
''جی...... یہ تو...... یہ تو...... مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ہو گا۔ آپ ایک ایم این اے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آپ بہت بڑے جاگیردار بھی ہیں جبکہ میں ایک معمولی ریسپشنسٹ......''
''میں ایسی باتوں کا قائل نہیں، اور پھر......'' وہ مسکرایا۔ ''آپ بھی دولت مند تو ہیں نا۔''
''میں؟'' سائرہ کی مسکراہٹ میں تعجب تھا۔
''ہاں۔'' جمشید مسکراتا رہا۔ ''حسن کی دولت ہے آپ کے پاس۔''
''یہ تو کوئی دولت نہیں۔'' سائرہ نے کہا۔ ''حسین لڑکیاں تو بہت ہوں گی اس شہر میں۔''
''آپ میں کوئی اور ہی بات ہے۔''
''کوئی اور بات کیا؟''
''یہ میں بھی نہیں جانتا لیکن کوئی خاص بات ضرور ہے آپ میں۔''
''آپ تو شاعری کرنے لگے۔'' سائرہ کے دل کی دھڑکنیں بدستور تیز تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اب اس کا خواب پورا ہو جائے گا۔
''آپ کا جسم......'' جمشید کچھ بے باک ہوا۔ ''غیر معمولی طور پر سڈول ہے۔''
تو یہ خواہش پیدا ہوئی ہے اس کے دل میں، سائرہ کے ذہن میں آیا۔
اسی وقت ویٹر فالودہ لے کر آ گیا۔
''آپ جیسی لڑکی پر یہ معمولی ملازمت زیب نہیں دیتی۔''
''لیکن اچھی ملازمتوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ میں نے سیکنڈ ایئر بھی کلیئر نہیں کیا۔''
''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض جگہ ڈگریوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آپ انگریزی بہت اچھی بولتی ہیں۔ میں نے ایک بار آپ کو بولتے ہوئے سنا تھا۔ یہ کوالٹی تو اکثر ایم اے کرنے والوں کے پاس بھی نہیں ہوتی۔'' جمشید نے وضاحت سے جواب دیتے ہوئے فالودے کا گلاس اٹھا لیا۔
''میں یہی سوچ رہی تھی کہ آپ شروع کریں تو میں بھی......'' سائرہ نے بھی فالودے کا گلاس اٹھایا۔
''سمجھ رہی ہیں نا آپ؟'' جمشید بولا۔
''ڈگری کے بغیر کیسے بات بن سکتی ہے؟'' سائرہ نے پوچھا۔
''آپ کوئی سی بھی ڈگری چاہیں، میں آپ کو دلوا دوں گا۔''
''میں جعلی ڈگری سے بہت ڈرتی ہوں۔''
''وہ تو میں نے بس ایک بات کہہ دی۔ آپ کو کسی بڑی ڈگری کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ صرف اپنے حسن کی بدولت کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہیں۔''
''وہ کیسے؟''
جمشید فالودے کے گھونٹ جلدی جلدی لے رہا تھا۔
''بتاؤں گا آپ کو پھر کسی وقت...... ابھی تو میں بھی ذرا جلدی میں ہوں۔ دوسری منزل کے کمرے میں کوئی صاحب ہیں، ان سے اپوائنٹ منٹ ہے میرا۔''
''پھر بھی۔'' سائرہ کو عجلت ہو گئی۔ ''کوئی اشارہ تو دیں آپ۔''
''آپ اپنے سیلولر فون کا نمبر بتائیں۔'' جمشید نے کہا۔ ''اب میں آپ سے فون پر بات کرسکوں گا۔ پھر کہیں مل بیٹھیں گے۔'' بات ختم کر کے جمشید نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔
''نہیں۔'' سائرہ بول پڑی۔ ''آپ بل ادا نہیں کریں گے۔ میرے مہمان ہیں آپ۔''
''جو مزاج یار میں آئے۔'' جمشید نے ہنس کر پہلے سے زیادہ بے تکلفی برتی۔
''میرا نمبر لکھ لیجیے۔'' سائرہ نے کہا۔
جمشید نے اپنا قیمتی اسمارٹ فون نکالا۔ سائرہ نے اپنا نمبر بتایا۔ جمشید نے وہ لکھ لیا۔
''اب آپ مجھے ایک مس کال دے دیں۔'' سائرہ نے کہا۔ ''میں بھی وہ نمبر آپ کے نام سے محفوظ کرلوں۔ اجنبی نمبروں کی کال میں اکثر ریسیو نہیں کرتی۔''
جمشید نے مس کال دے دی۔
سائرہ نے اپنے پرس سے اپنا اسمارٹ فون نکالا جو بہت کم قیمت کا تھا۔
''شکریہ۔'' سائرہ نے کہا۔ ''یہ میں ابھی محفوظ کیے لیتی ہوں۔''
''مجھے اجازت دیجیے۔'' جمشید کھڑا ہوا۔ ''میں جلد ہی فون کروں گا۔''

''میں منتظر رہوں گی۔''

جمشید چلا گیا۔ سائرہ نے اس کا نمبر اس کے نام کے ساتھ محفوظ کیا اور پھر کرسی سے اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف جانے لگی۔ اس کی ڈیوٹی کا وقت اب قریب تھا۔

جس ساتھی سے اس کی بے تکلفی تھی، اس نے سائرہ کو آنکھ ماری اور اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں بولی۔

''ذرا محتاط رہنا۔ یہ لوگ بھونرے ہوتے ہیں۔ رس چوسا اور اڑ گئے۔''

سائرہ ہنس کر رہ گئی۔ اس نے اپنے دل میں کہا تھا۔

''بھونرے کے پر کترے بھی جا سکتے ہیں۔''

'لیکن یہ آسان بھی نہیں ہوگا۔' اس نے سنجیدگی سے یہ بھی سوچا تھا۔

اس دن جب وہ ڈیوٹی ختم کر کے گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہی تھی تو جاوید کو دیکھ کر چونک گئی جو تیزی سے قریب آ کر اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''ہوشیار رہنا جمشید سے۔'' وہ بولا۔ ''یہ لوگ عیاش ہوتے ہیں۔ وقتی طور پر کسی کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

یہ تقریباً اسی قسم کی بات تھی جو ہوٹل میں سائرہ کی ساتھی اس سے کہہ چکی تھی۔

''تم شہر کے اندیشے میں دُبلے نہ ہو۔'' سائرہ نے منہ بنایا۔

''اگر تم نے میری بات نظر انداز کی تو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ جمشید کے بارے میں پولیس کو بھی کچھ شبہات ہیں۔''

''اب دوسرا اینگل بھی آزما رہے ہو؟'' سائرہ کا منہ بنا رہا۔

''کاش تم مجھے غلط نہ سمجھتیں۔'' جاوید نے ٹھنڈی سانس لی۔

''دیکھو جاوید!'' سائرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس دوران میں بہت کچھ جان چکی ہوں تمہارے بارے میں۔ محکمۂ پولیس میں شاید ہی کوئی تم سے زیادہ شریف اور ذمّے دار آفیسر ہو لیکن میں اپنی زندگی شرافت چاٹنے میں نہیں گزار سکتی۔''

''بڑے خواب دیکھ رہی ہو؟'' جاوید نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔

''خواب بڑے ہی دیکھنے چاہئیں۔'' سائرہ نے کہا۔

وہ بس اسٹاپ پر پہنچ کر رک گئی تھی۔ وہاں چند افراد اور تھے۔ سائرہ ان سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہوئی تھی تاکہ اس کی اور جاوید کی باتیں کسی اور کے کانوں میں نہ پڑ سکیں۔

''بڑے خواب بعض اوقات گہرائی میں بھی گرا دیتے ہیں۔'' جاوید نے بحث جاری رکھی۔

اسی وقت وہ بس آ رکی تھی جس میں سائرہ کو جانا تھا۔ وہ جاوید کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر بس میں سوار ہو گئی۔

اس رات جب وہ بستر پر لیٹی تو اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ دماغ میں خیالات کا ایک ہجوم رہا۔ دماغ کے ایک گوشے میں یہ سوال بھی سرسرا رہا تھا کہ سنہرے مستقبل کے لیے کیا اسے کوئی سودا کرنا ہوگا؟

وہ بہت دیر سے سوئی لیکن صبح عادت کے مطابق وقت پر جاگی۔ اس ہفتے اس کی ڈیوٹی دن ہی کی تھی۔ صبح نو بجے ہوٹل پہنچنا ہوتا تھا۔

ڈیوٹی سنبھالنے کے بعد وہ اپنے فرائض میں مصروف رہی لیکن اس کی نظریں صدر دروازے کی طرف بھی اٹھتی رہیں لیکن جس وجہ سے اٹھتی رہیں، اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس نے بس جاوید کو دیکھا جو کافی شاپ سے نکل کر اس کے کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتا چلا گیا تھا۔

ڈیوٹی ختم کر کے وہ ہوٹل سے نکلی تو اس کے چہرے پر مایوسی کا تاثر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بس اسٹاپ پر جا رکی۔ یہ خیال اس نے رکھا تھا کہ جاوید اس کے تعاقب میں نہ ہو۔

وہ بس میں سوار ہوئی اور قلیل وقفے سے بس چل پڑی۔ پھر پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے موبائل فون نے اس کے پرس میں گویا پھڑپھڑانا شروع کیا۔ اس نے موبائل پرس سے نکالا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کال جمشید کی ہو۔ اس کی یہ خواہش پوری بھی ہو گئی جب اس نے اسکرین پر جمشید کا نام اور اس کی تصویر دیکھی۔ اس کے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

''ہیلو۔'' سائرہ نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''ہاں، سائرہ...... اگلا اسٹاپ میکڈونلڈ کے قریب ہے۔ وہیں اتر جانا بس سے۔'' سائرہ نے جمشید کی آواز پہچان لی۔

''تو کیا میکڈونلڈ میں......''

''فون پر زیادہ بات نہیں۔'' جمشید جلدی سے بولا۔ ''تمہارے ساتھ اور خواتین بھی بیٹھی ہوں گی۔ بس جو کہا ہے، وہ کرو۔''

''ٹھیک ہے۔'' سائرہ نے کہا۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

سائرہ جو ہوٹل میں جمشید کے نظر نہ آنے کی وجہ سے کسی حد تک مایوسی کا شکار ہوئی تھی، اس کے روئیں روئیں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

میکڈونلڈ کے قریبی اسٹاپ پر وہ بس سے اتر گئی۔ میکڈونلڈ تک پہنچنے کے لیے سڑک پار کرنا ضروری تھا لیکن ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے دو تین منٹ رکنا پڑا۔ پھر وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف پہنچی ہی تھی کہ اس نے گولیاں چلنے کے دھماکے سنے۔ پے در پے گولیاں چلی تھیں لیکن یہ اندازہ لگانا سائرہ کے لیے مشکل تھا کہ گولیاں کہاں چلی تھیں۔ صرف دھماکے سن کر اندازہ لگانا مشکل ہی ہوتا ہے۔

ان آوازوں کی وجہ سے سراسیمگی سی پھیلی۔ لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر جانے لگے۔ کسی کا انداز تو دوڑنے کا سا تھا۔

''میکڈونلڈ کے دروازے پر فائرنگ ہوئی ہے۔'' کوئی آدمی چیختا ہوا سائرہ کے قریب سے ہی دوڑتا ہوا نکل گیا۔

سائرہ ٹھٹک کر رک گئی۔ آوازیں مشکل سے دو سیکنڈ تک سنائی دی تھیں۔ پھر سائرہ نے ایک موٹر سائیکل دیکھی جس پر دو سوار تھے جن کے چہروں پر ہیلمٹ تھے۔ انہی میں سے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اس سے کچھ ہوائی فائر کیے گئے جن کا مقصد لوگوں کو ڈرانا ہی ہوسکتا تھا۔

فوراً ہی ایک اور موٹر سائیکل بھی اِدھر ہی سے آئی۔ اس پر بھی دو آدمی سوار تھے اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی جس نے پے در پے کئی شعلے اگلے۔ ان کا نشانہ پہلے نکل جانے والی موٹر سائیکل کی طرف تھا۔

بوکھلائی ہوئی سائرہ نے بجلی کے ایک کھمبے سے ٹیک لگا لی تھی ورنہ اِدھر سے اُدھر دوڑتے ہوئے لوگوں میں سے کوئی اس سے ٹکرا جاتا۔

پہلی موٹر سائیکل ابھی سائرہ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ سائرہ نے دیکھا کہ وہ موٹر سائیکل سوار کے قابو میں نہیں رہی تھی اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک دکان میں جا گھسی تھی۔

پھر وہاں آگ لگ گئی۔ شاید موٹر سائیکل کے پیٹرول کی ٹینکی پھٹ گئی ہو۔

اب بھاگتے ہوئے کچھ لوگوں کا رخ میکڈونلڈ کی طرف اور کچھ کا رخ آگ کی لپیٹ میں آئی ہوئی دکان کی طرف تھا۔

سائرہ پریشان تھی کہ کیا کرے۔ اگر وہ میکڈونلڈ کی طرف جاتی تو ہجوم میں پھنس جاتی۔

موبائل کی گھنٹی نے اسے چونکایا۔ اس نے جلدی سے پرس کھول کر موبائل نکالا۔ کال جمشید کی تھی۔

''یہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے سائرہ!'' اس نے کہا تھا۔ ''اب کل ملاقات ہوگی۔ فی الحال تو تم یہاں سے نکلو اور اپنے گھر پہنچو۔''

''ہوا کیا ہے یہ؟'' سائرہ متجسس تھی۔

''کیا تم نے گولیاں چلنے کی آوازیں نہیں سنیں؟''

''وہ تو سنی ہیں لیکن......''

''بس اپنے گھر جاؤ اب۔'' جمشید نے اس کی بات بھی کاٹی اور رابطہ بھی منقطع کردیا۔

سائرہ نے موبائل پرس میں رکھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سڑک پر تو ٹریفک جام ہوچکا تھا۔ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے تھے لیکن ٹریفک جام ہونے کے سبب ان کا میکڈونلڈ جانا مشکل نظر آرہا تھا۔



دھیان

ماں نے بیٹے سے پوچھا۔ ''بیٹا سلطان صلاح الدین ایوبی کون تھا؟''

''پتا نہیں!'' بیٹے نے عجب بے نیازی سے جواب دیا۔

''بیٹا! اپنی کتابوں پر دھیان دیا کرو...... تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ماضی میں ہمارے اسلاف کون اور کیسے تھے؟''

''ممی!'' لڑکے نے ترکی بہ ترکی سوال کیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ پنکی آنٹی کون ہیں؟''

''نہیں...... اس سوال کی کیا تک ہے؟''

''ممی! ہمیں ماضی کے بجائے حال میں رہنا چاہیے...... پنکی آنٹی سامنے رہتی ہیں اور وہ بہت خوب صورت اور ہنس مکھ ہیں۔ آپ کو ڈیڈی پر دھیان دینا چاہیے ورنہ کسی دن وہ پنکی آنٹی کے ساتھ کہیں دور چلے جائیں گے۔ ڈیڈی ان کے دوست ہیں۔''

ساؤتھ سٹی سے ارسلان شاہ کا انکشاف

سائرہ کو اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح ایک قریبی گلی تک پہنچی جس سے گزرنے کے بعد ایک چوڑی سڑک تھی، وہاں سائرہ کو ایک رکشا مل گیا۔ وہاں بسیں بھی چل رہی تھیں لیکن سائرہ کو علم نہیں تھا کہ وہاں سے کون سی بس اس کو اپنے گھر تک پہنچا سکتی تھی۔

''آج کچھ دیر ہوگئی بیٹا!'' وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کے ماموں نے کہا۔

''جی ہاں، ایک جگہ گولیاں چلنے لگی تھیں۔ ٹریفک جام ہوگیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے آسکی ہوں۔''

ماموں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے ہمارے شہر کو۔ روز ہی اس قسم کی کوئی خبر سننے کو ملتی ہے۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھولو۔ چائے بنا رہی ہیں تمہاری ممانی۔''

''جی۔'' سائرہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ باتھ روم کا رخ کرنا چاہتی تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

جمشید ہی ہوگا، سائرہ کو خیال آیا لیکن اس بار اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اسکرین پر ایک اجنبی نمبر چمک رہا تھا۔ سائرہ نے منہ بنا کر فون آف کردیا۔ وہ اجنبی نمبروں سے آنے والی کال بہت کم ریسیو کرتی تھی۔ اس وقت اس کا ذہن بھی الجھا ہوا تھا کیونکہ فائرنگ اس جگہ ہوئی تھی جہاں جمشید تھا۔

سائرہ نے موبائل ایک طرف رکھ کر پرس دوسری طرف ڈالا۔ پھر وہ باتھ روم کی طرف بڑھی ہی تھی کہ موبائل سے ''میسج'' کا گانگ بجا۔ سائرہ اس کی پروا کیے بغیر باتھ روم میں چلی گئی۔ اس وقت پھر موبائل فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ وہ فوراً باتھ روم سے نکل کر اس خیال سے فون کی طرف لپکی کہ جمشید کا فون ہوگا لیکن پھر وہی نمبر دکھائی دیا۔ سائرہ نے منہ بناتے ہوئے کال ریسیو کی۔

''ہیلو!'' اس کے لہجے میں غصہ تھا۔

''میں نے ابھی میسج کیا تھا کہ میں کال کررہا ہوں۔'' جاوید کی آواز آئی۔

''لیکن کیوں کررہے ہو؟'' سائرہ غصے سے بولی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جمشید سے دور رہو۔ وہ مشکوک شخص ہے۔ ذرا دیر پہلے میکڈونلڈ کے سامنے اس کی کار پر فائرنگ کی گئی ہے۔''

''اس کی کار پر فائرنگ؟'' سائرہ چونکی۔

''ہاں۔'' جاوید نے کہا۔ ''اور فائر کسی پر خواہ مخواہ نہیں کیا جاتا۔''

''فائرنگ کس نے کی؟''

''ایک موٹر سائیکل پر دو آدمی سوار تھے۔ انہی میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اس کا تعاقب ایک اور موٹر سائیکل نے کیا۔ وہ غالباً جمشید کے باڈی گارڈ ہوں گے۔ ان کی فائرنگ سے بھاگنے والی موٹر سائیکل کا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ وہ بے قابو ہوکر فٹ پاتھ پر چڑھی اور ایک دکان میں گھس گئی۔ پیٹرول کی ٹینکی پھٹنے کی وجہ سے آگ بھی لگ گئی۔''

''جانی نقصان بھی ہوا ہوگا؟'' سائرہ اب سنجیدہ ہوگئی تھی۔

''بس جانی نقصان نہیں ہوا۔ مالی نقصان زیادہ ہوا ہوگا۔ فائر بریگیڈ بروقت نہیں پہنچ سکی تھی۔ دو اور دکانیں بھی لپیٹ میں آگئی تھیں لیکن تمہیں ان باتوں سے غرض رکھنے کے بجائے جمشید کی بات کرنی چاہیے۔''

سائرہ نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''موٹر سائیکل جلی تھی تو اس کے سوار......''

''وہ بہت بُری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ پولیس کی حراست میں ہیں۔''

''اور جس موٹر سائیکل سے ان دونوں پر فائرنگ کی گئی تھی؟''

''وہ دونوں غائب ہوگئے ہیں لیکن جمشید......''

''جمشید بھی زخمی ہوا ہوگا؟''

''یعنی تمہیں اس کی اطلاع مل چکی ہے کہ وہ فائرنگ کی زد پر نہیں آیا تھا۔ فون کیا ہوگا اس نے تمہیں؟''

سائرہ نے جھلائے ہوئے انداز میں رابطہ منقطع کیا اور جمشید کا نمبر ملانے لگی۔

''ہیلو!'' جمشید کی پُرسکون آواز آئی۔ ''تم گھر پہنچ گئی ہونا؟''

''ہاں، اور مجھے یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ فائرنگ تمہاری کار پر کی گئی تھی۔''

دوسری طرف سے طویل سانس لینے کی آواز آئی۔

''اتنی جلدی تمہیں یہ خبر کیسے مل گئی؟''

''جاوید نے فون کرکے بتایا تھا'' سائرہ نے جواب دیا۔ ''اس سے میری کچھ جان پہچان ہے۔ پولیس میں ہے وہ۔''

''تو اس نے تمہیں یہ اطلاع دینا کیوں ضروری سمجھا؟''

"ملاقات ہوگی تو بتاؤں گی۔ تمہاری آواز سے ظاہر ہورہا ہے کہ تم مطمئن ہو۔"

"میں فائرنگ سے محفوظ رہا ہوں۔ میرا ڈرائیور کچھ زخمی ہوا ہے۔ اسے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔"

"تم بالکل پریشان بھی نہیں معلوم ہورہے ہو؟"

"پریشان ہونے سے کیا ہوگا سائرہ؟" جمشید نے کہا۔ "ان دنوں اس قسم کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"لیکن کوئی دشمنی تو ہوتی ہے! تمہاری دشمنی کس سے ہے؟"

"سیاسی پارٹیاں اس قسم کی حرکتیں کرواتی ہی رہتی ہیں۔ انہی میں سے کوئی ہوگی۔"

"تم نے مجھ سے کیوں چھپایا تھا کہ تم پر فائرنگ ہوئی ہے؟"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پریشان ہو...... ملاقات ہونے پر بتا دیتا۔ میں دو ایک گھنٹے بعد ہی تم سے ملوں گا۔"

"رات کے وقت میرا نکلنا مشکل ہوگا۔ ماموں سوالات کی بوچھاڑ کردیں گے۔"

"خیر، تو پھر کل تم جب ڈیوٹی آف کروگی تو ملوں گا۔"

"ضرور ملنا۔"

جمشید پھر ہنسا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم میرے لیے اتنی پریشان ہو۔"

اسی وقت باہر سے سائرہ کے ماموں کی آواز آئی۔

"چائے پی لو آکر سائرہ۔"

"اچھا کل ملوں گی۔" سائرہ نے جلدی سے کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔ پھر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس چکر میں اسے منہ دھونے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔

دوسرے دن ڈیوٹی کے دوران میں بھی اس کا ذہن منتشر ہی رہا۔ اخبار میں بھی وہ اس فائرنگ کی خبر پڑھ چکی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی ساتھی بھی اس بارے میں باتیں کرنے لگی تھی۔

ڈیوٹی ختم کرکے وہ ہوٹل سے نکلی اور اِدھر اُدھر نظر دوڑاتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف بڑھی۔ وہ بس اسٹاپ تک نہیں پہنچی تھی کہ عقب سے ایک کار آکر اس کے قریب آرکی۔

"آؤ سائرہ...... جلدی!" جمشید کی آواز سنائی دی۔

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے شیشے تاریک تھے۔ سائرہ کو متوجہ کرنے کے لیے اس نے شیشہ تھوڑا سا کھولا تھا پھر جب سائرہ نے اسے دیکھ لیا تو اس نے شیشہ بند کرلیا۔

سائرہ نے ہچکچاتے ہوئے کار کی طرف قدم بڑھائے۔ پچھلا دروازہ کھول دیا گیا۔ سائرہ نے کار میں قدم رکھا۔ سائرہ کے بیٹھنے کے بعد اس نے خود ہی دروازہ بند کیا۔ کار حرکت میں آگئی۔

"خوش آمدید۔" جمشید نے سائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس کی شخصیت یقیناً غیر معمولی تھی۔ گزشتہ روز ہی اس پر گولیاں چلائی جاچکی تھیں لیکن وہ مطمئن تھا۔

سائرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ بس مسکرا دی۔

"آج سے تم میری خفیہ نائب ہو۔" جمشید بولا۔ "یعنی غیر معمولی کاموں کے لیے میری سیکریٹری۔ تمہاری تنخواہ......" اس نے اتنی کثیر رقم کی بات کی جو سائرہ کی ہوٹل کی تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی۔ سائرہ کا سارا جسم سنسنا گیا۔

سائرہ نے جلدی سے شوفر کی طرف دیکھا جس کا صرف سر دکھائی دے رہا تھا۔

"اسے بھول جاؤ۔" جمشید بولا۔ "میرے سب ملازمین کو تم گونگا سمجھو، یہ جو کچھ سنتے ہیں، ان کی زبان پر کبھی نہیں آتا، اگر بات میرے حوالے سے ہو۔"

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" سائرہ نے پوچھنے کی ہمت کی۔

"کل تم اپنے ہوٹل سے بھی مستعفی ہوجاؤ گی اور اپنے ماموں کا گھر بھی چھوڑ دوگی۔"

"گھر کیسے چھوڑوں گی؟" سائرہ نے حیرانی سے کہا۔

"میرا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہے۔"

ایک فائل جمشید کی گود میں تھی۔ وہ اس نے اٹھا کر سائرہ کی طرف بڑھائی۔ "یہ دیکھ لو۔"

سائرہ نے فائل کھولی اور اس میں جو کچھ پڑھا، اسے پڑھ کر دم بہ خود رہ گئی۔ شہر کی ایک مشہور عمارت کی پہلی منزل کا ایک فلیٹ اس کے نام سے خریدا گیا تھا۔

سائرہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اتنے قیمتی اپارٹمنٹ میں رہنے کا۔

"فی الحال۔" جمشید بولا۔ "میں تمہیں وہی دکھانے لے جارہا ہوں۔ کل تم کسی وقت بھی وہاں منتقل ہوسکتی ہو۔ میں نے کل کی بات اس لیے کی کہ تمہیں گھر سے اپنا کچھ ذاتی سامان تو لینا ہوگا نا، ورنہ تم آج بھی اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہوسکتی ہو۔"

سائرہ کو اپنا سر چکراتا ہوا سا لگا۔ اسے یہ خیال تو آچکا تھا کہ جمشید غالباً اس کا جسمانی قرب چاہتا ہے لیکن اس قرب کے لیے اتنا بڑا سرمایہ......؟ اس سرمائے سے تو وہ درجنوں حسین قربتیں حاصل کرسکتا تھا۔

''کیا سوچنے لگیں؟'' جمشید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' سائرہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''اتنا سب کچھ آپ میرے لیے کیوں کررہے ہیں؟''

''اپنے سے جڑی... تمام خاص شخصیتوں کے لیے میں یہ سب کچھ کرتا ہوں۔'' جمشید نے کہا۔ ''آخر آج سے تم میری سیکریٹری ہو اور میری سیکریٹری کا اسٹیٹس اتنا تو ہونا ہی چاہیے۔ کل سے تمہارے پاس کار بھی ہوگی اور شوفر بھی لیکن اگر تم اسے خود ڈرائیو کرنا چاہتی ہو تو شوفر بس کار کی دیکھ بھال کے لیے ہوگا۔''

''شاید میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔''

''تعبیر بھی آج ہی دیکھ لو گی۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ سائرہ نے تعبیر دیکھ لی۔ اس قیمتی اپارٹمنٹ کی آرائش بھی بہت شاہانہ تھی۔

''یہ تمہارا بیڈ روم ہے۔'' جمشید اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ ''اس اپارٹمنٹ میں پانچ کمرے ہیں جن میں سے تین تم استعمال کرسکتی ہو۔ باقی دونوں کمروں میں چار ملازمین رہتے ہیں۔ بیڈ سوئچ کا بٹن دبا کر تم اپنے خصوصی ملازم کو طلب کرسکتی ہو۔ تمہاری طلبی کے بغیر کسی کے قدم تمہارے زیرِ استعمال کمروں میں نہیں آسکتے۔ اور ہاں۔'' اس کا ہاتھ سائرہ کی طرف بڑھا۔ ''یہ ہیں اپارٹمنٹ کی چابیاں۔ تم چاہو تو کہیں جاتے وقت اپارٹمنٹ مقفل بھی کرسکتی ہو۔ ملازمین کی آمد و رفت کا راستہ دوسرا ہے۔''

چابیاں لیتے ہوئے سائرہ کا ہاتھ نمایاں طور پر لرز رہا تھا۔

اسی وقت جمشید نے چاروں ملازمین کو بھی وہیں بلا لیا۔ ان میں ایک شوفر، ایک خانساماں، ایک گھر کی صفائی کرنے والا اور چوتھا بازار سے سامان لانے کے لیے تھا۔ جمشید نے ان چاروں کے نام بھی بتائے اور سائرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان چاروں سے کہا۔ ''یہ تمہاری مالکہ ہیں۔''

ان چاروں نے سائرہ کو سلام کیا۔

''تم ایک ٹیکسی لے آؤ۔'' جمشید نے ایک ملازم سے کہا اور باقی کو رخصت کرکے سائرہ سے کہا۔ ''مناسب یہی ہے کہ تمہیں میرے ساتھ زیادہ نہ دیکھا جائے۔ اس وقت تو میرا تمہارے ساتھ آنا ضروری تھا لیکن یہاں سے تم ٹیکسی میں جاؤ۔''

''میں پاگل نہ ہوجاؤں۔'' سائرہ بڑبڑائی۔

جمشید دھیرے سے ہنس دیا۔ ''کیوں؟ یہ خیال کیوں آیا؟''

''میں یہی محسوس کررہی ہوں جیسے یہ سب کچھ ایک خواب ہو اور جب آنکھ کھلے گی تو میں خود کو بہ دستور محرومیوں میں گھرا جان کر پاگل ہوسکتی ہوں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا جب تک میں زندہ ہوں۔'' جمشید نے سائرہ کو ایسی پیار بھری نظروں سے دیکھا کہ اس کا دل دھڑک اٹھا اور اس کے ذہن میں وہی خیال ابھرا جو ایک بار پہلے بھی ابھر چکا تھا جسے مسترد کرنے کے لیے بھی ایک بات اس کے ذہن میں آئی تھی۔

جلد ہی ٹیکسی آگئی اور وہ وہاں سے رخصت ہوئی۔ جمشید اسے چھوڑنے کے لیے باہر نہیں آیا تھا۔

اس رات سائرہ دیر تک سوچتی رہی کہ گھر چھوڑنے کے سلسلے میں ماموں، ممانی سے کیا کہے گی۔

صبح ناشتا کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ماموں جان! مجھے ایک بڑی فرم میں بہت بڑی پوسٹ مل گئی ہے۔ گھر تو آج ہی مل جائے گا اور شاید کار بھی۔''

''ماشاء اللہ۔'' ممانی جان بول پڑیں۔ ''تم نے تو بہت اچھی خبر سنائی، مبارک ہو۔''

''ہمیں اپنے گھر کب بلاؤ گی؟'' ماموں جان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جلد ہی ماموں جان!'' سائرہ نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

اس طرح سائرہ کی یہ مشکل حل ہوگئی کہ وہ گھر کیسے چھوڑے گی۔ اپنے کپڑے سمیٹ کر اس نے ایک سوٹ کیس میں بند کیے، اس کا کل سامان ہی یہ تھا۔ پھر وہ خود ہی ٹیکسی لائی اور ہوٹل روانہ ہوگئی۔ راستے میں اس نے موبائل فون پر جمشید سے رابطہ کیا۔

''میں ابھی تو ہوٹل جارہی ہوں۔ اخلاقاً اور اصولاً مجھے آج تو ڈیوٹی کرنی چاہیے۔ جاتے ہی استعفیٰ دے دوں گی اور آج کی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد پہنچ جاؤں گی اس اپارٹمنٹ میں۔ میرے پاس صرف ایک سوٹ کیس ہے۔ بہت زیادہ سامان نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔تم اصول کی پابندی کرو۔'' جمشید نے ہنس کر کہا۔ ''رات کا کھانا اپنی پسند سے بنوا لینا۔ خانساماں بہت پھرتیلا ہے اور ہر قسم کے کھانے بنانا جانتا ہے۔ کھانا کھانے میں بھی آؤں گا اور کھانے کے وقت سے ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے۔ اور ہاں، چیک کیش کروالیا؟''

''ہوٹل پہنچنے سے پہلے بینک پر ہی رکوں گی۔'' سائرہ نے کہا۔

''گڈ......اچھا۔'' جمشید نے دوسرا لفظ الوداعی انداز میں کہا اور پھر رابطہ بھی منقطع کردیا۔

سائرہ گھر سے کچھ جلدی اسی لیے نکلی تھی کہ چیک کیش کروا کر اپنے بینک میں جمع بھی کروا سکے۔ چیک وہ اپنے بینک میں جمع بھی کروا سکتی تھی لیکن وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اتنی بڑی رقم اپنے ہاتھوں میں دیکھے گی تو کیا محسوس کرے گی۔ اتنی بڑی رقم اس نے کبھی اپنے ہاتھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

چیک کیش کروا کے اس نے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس کی۔

پھر اپنے بینک میں رقم جمع کرا کے ہوٹل پہنچی۔ اس کے استعفے سے ہوٹل کی انتظامیہ میں خاصی ہلچل ہوئی کیونکہ اسے ہوٹل کی سب سے اچھی ریسپشنسٹ سمجھا جاتا تھا۔

ڈیوٹی ختم کر کے وہ ہوٹل سے اپارٹمنٹ پہنچ گئی اور اس شام سے اس کی نئی زندگی کا آغاز اور ''باقاعدہ'' آغاز رات کو ہوگیا جب جمشید بستر پر اس کے ساتھ تھا۔

وہ رات اسے ہمیشہ یاد رہتی تھی اور اس وقت بھی اسے اس رات کا خیال آرہا تھا جب جمشید اسے لاروش سے بچا کر اپنی حویلی لے آیا تھا۔

☆☆☆

جمشید سے سائرہ کی رفاقت کو اب خاصا عرصہ گزر چکا تھا اور اس دوران میں اسے جاوید سے کچھ معلومات بھی حاصل ہوئی تھیں۔ جاوید کے بیان کے مطابق لاروش ایک بہت بڑا اور خطرناک اسمگلر تھا جس کی جمشید سے کچھ دشمنی تھی۔ اس دشمنی کا سبب جاوید بھی نہیں جانتا تھا ورنہ ضرور بتا دیتا۔

لاروش سے بھی سائرہ اور جمشید کے تعلق کی بات چھپی نہیں رہی تھی۔ جب وہ ایک خطرناک گینگسٹر تھا تو اس نے جمشید کی ہر بات سے باخبر رہنے کے لیے خاصا بڑا جال بچھا رکھا ہوگا۔

ایک مرتبہ اس نے سرعام بھی سائرہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ لوگوں نے اسے بچا لیا تھا۔ سائرہ اس بات سے بعد میں واقف ہوئی تھی کہ وہ لوگ اس کے باڈی گارڈ تھے جن کو جمشید نے سائرہ سے خفیہ رکھا تھا۔

''آخر کیوں؟'' سائرہ نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تم نے میرے لیے باڈی گارڈز کیوں ضروری سمجھے؟''

''اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ تمہیں پامال کر کے مجھ سے انتقام لے گا۔''

''آخر کس بات کا انتقام لینا چاہتا ہے وہ تم سے؟''

''چلو آج میں تمہیں بتا ہی دیتا ہوں۔'' جمشید نے طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ اپنے گینگ کے لیے میری پشت پناہی چاہتا ہے۔''

''کیوں؟ مقصد؟''

''کبھی کبھی اس کے کچھ آدمی گرفتار ہوجاتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں ان گرفتار شدگان کے لیے جیل میں آسانیاں فراہم کرواؤں۔ میں بہت بارسوخ ایم این اے ہوں سائرہ! میں یہ کام کروا بھی سکتا ہوں لیکن میں نے انکار کردیا تھا۔ بات کھل جاتی تو مجھے خاصی رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا۔''

''تو صرف اس بات پر اتنی دشمنی؟'' سائرہ نے حیرت سے کہا۔ اسے جمشید کے جواب پر یقین بھی نہیں آیا تھا۔

''دو ایک باتیں اور ہیں جو تمہیں مناسب وقت پر معلوم ہوجائیں گی۔'' جمشید، سائرہ کو اسی قسم کے جوابات سے ٹال دیا کرتا تھا۔

حویلی کے بیڈ پر لیٹی سائرہ کے دماغ میں یہ اور کچھ دوسرے خیالات بھی چکرا رہے تھے کہ درمیانی دروازہ کھلنے کی آواز سن کر سب خیالات منتشر ہوگئے۔ اندر آنے والا جمشید ہی تھا۔ بوتل وہ ہمیشہ ساتھ ہی لاتا تھا۔

سائرہ کے لیے اب یہ کوئی نئی بات نہیں رہی تھی اور اس نے ایک چمکیلی زندگی کے لیے یہ سمجھوتا اس لیے بھی کیا تھا کہ وہ اپنی دوشیزگی تو تیرہ سال کی عمر میں ہی کھو چکی تھی۔ اسکول کی لائبریری میں موقع پا کر ایک لڑکے نے اسے دبوچ لیا تھا اور وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی لیے اس نے سوچا تھا کہ اب اگر کوئی دوسرا مرد بھی اس کی زندگی میں آتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

''یہ لوگ لڑکیوں کو بس کھلونا سمجھتے ہیں۔'' سائرہ کو اپنی ہوٹل کی ساتھی کی یہ بات خوب یاد تھی اور اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ جمشید کی جان نہیں چھوڑے گی۔ اگر جمشید نے کبھی اسے کھلونا سمجھ کر توڑ ڈالنا چاہا تو آسانی سے کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ سائرہ نے اس کا بندوبست اس طرح کیا تھا

کہ اپنے شہر کے اپارٹمنٹ کی خواب گاہ میں ایک خفیہ کیمرا لگا لیا تھا۔ وہاں اس کی جو راتیں جمشید کے ساتھ گزرتی تھیں، وہ کیمرا اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ وہ ان وڈیوز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی اگر جمشید اسے کبھی چھوڑنا چاہتا۔

لیکن اکثر اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ صرف ہوس کے لیے کوئی شخص اتنا سرمایہ کیوں لگا سکتا ہے؟ اس سرمائے سے تو وہ بے شمار لڑکیوں کو اپنے بستر کی زینت بنا سکتا تھا۔

تو پھر؟ کیا جمشید اسے واقعی شدت سے چاہنے لگا تھا، اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا؟

لیکن اگر ایسا تھا تو وہ اس سے شادی کرنے پر رضامند کیوں نہیں ہوتا تھا؟ سائرہ دو تین بار اس سے یہ بات چھیڑ چکی تھی اور ہر بار جمشید نے اسے ''مناسب وقت'' کی بات کر کے ٹال دیا تھا۔

اس رات بھی جب جمشید تھک کر لیٹ گیا اور سونے کے موڈ میں نظر آیا تو سائرہ نے محبت آمیز انداز میں اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر یہ بات چھیڑی۔

''پھر وہی!'' جمشید مسکرایا۔

''آج میرا موڈ کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ آج میں تمہیں ٹالنے نہیں دوں گی۔''

''اچھا۔'' جمشید سنجیدہ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ وہ کبھی اتنی زیادہ نہیں پیتا تھا کہ دماغی طور پر معطل ہو جائے۔

''بتاؤ!'' سائرہ نے اسے اکسایا۔

''جان سکتی ہو کہ میں نے تمہیں اچانک کیوں بلایا ہے؟''

''میں کیسے جان سکتی ہوں؟''

''تو کل شام تک انتظار کرو۔ کل ہی بتاؤں گا تمہیں کہ میرے لیے تمہیں کیا کام کرنا ہے۔ جب تم وہ کام کر کے لوٹو گی تو میں تمہیں شادی کے بارے میں بتا دوں گا۔''

سائرہ چونکی۔

جمشید نے بات آگے بڑھائی۔ ''میں تمہیں آج ہی بھیجنا چاہتا تھا لیکن لاروش کی وجہ سے تمہیں یہاں پہنچنے میں اتنی تاخیر ہو گئی کہ آج تمہارا جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اب یہ کام کل ہی ہو سکے گا۔''

''کہیں جانا ہو گا مجھے؟'' سائرہ نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کہاں؟''

''یہ بھی کل ہی بتاؤں گا۔''

''ابھی بتاؤ۔'' سائرہ نے ضد کی۔

''بس اب بحث نہ کرو۔'' جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ بند کر دیے۔ اپنی اس حرکت سے اس کا ''موڈ'' پھر بن گیا اور اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی تھکے ہوئے انداز میں لیٹا۔

صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ اس طرح ملازمین اسے اسی کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھتے۔

اس سے دوبارہ ملاقات ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کرتے ہوئے ہوئی۔ سائرہ نے اسے ناشتا کرنے میں عجلت کا شکار دیکھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟'' سائرہ پوچھ بیٹھی۔

''مجھے جلد سے جلد کہیں جانا ہے۔ واپسی شام تک ہو گی۔ تم قصبے میں گھوم گھام لینا۔ انٹرنیٹ سے بھی دل بہلا سکتی ہو۔''

سائرہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ جمشید کو کیا واقعی کسی ضروری کام سے جانا ہے؟ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اس طرح وہ سائرہ کے سوالات سے بچنا چاہتا تھا۔

اس کے رخصت ہونے کے بعد سائرہ خواب گاہ میں جا کر بستر پر لیٹی رہی۔ اس نے فی الحال نہ تو قصبے میں گھومنے کا ارادہ کیا نہ لیپ ٹاپ کی طرف توجہ دی۔ جمشید کی بات نے اس کا دماغ خاصا الجھا دیا تھا۔ یہ اس کے لیے خاصی پیچیدہ سی بات تھی کہ جمشید اسے کہیں بھیجنا چاہتا تھا اور بھیجنے کے طریقے میں پراسراریت تھی۔ اسے کل بھیجا جانا تھا لیکن اسے دیر ہو گئی تھی۔

دیر؟

سائرہ کے لیے یہ بہت گمبھیر سوال تھا۔ دیر کس وجہ سے ہوئی تھی؟ کوئی ٹرین چھوٹ گئی تھی یا کوئی جہاز اپنے وقت پر اڑ گیا تھا؟

اسی نوعیت کے کئی سوال اس کے دماغ میں اس حد تک چکرائے کہ اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ اس نے گھڑی دیکھی تو چونک گئی۔ ان خیالات میں اس کے تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ وہ باتھ روم چلی گئی۔ شاور لینے سے اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ پھر اس نے خاصا وقت انٹرنیٹ پر گزارا پھر جب رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہوا تو جمشید کا فون آ گیا۔

''تم کھانا کھا لو جانِ من۔'' جمشید نے کہا۔ ''مجھے

ابھی کچھ دیر اور لگے گی۔"

دیر...... دیر...... سائرہ کا دماغ جھنجھنا سا گیا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔ "تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گی۔"

"اچھا!" جمشید نے اس کے لہجے کی ضد محسوس کر لی۔ "ٹھیک ہے، لیکن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کرلوں گی۔" سائرہ نے کہا۔

"اوکے۔" جمشید کا جواب تھا اور پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

آخر جب دس بجے جمشید آیا تو بھی اس کے انداز میں عجلت تھی۔ اس نے فوری طور پر کھانا لگوایا۔

کھانے کے دوران میں وہ بولا۔ "سائرہ!...... معاملہ دراصل یہ ہے کہ میری اربوں کی جائداد خلیجی ریاستوں میں ہے جن کے بارے میں تفتیش شروع ہونے والی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تفتیش کا آغاز ہونے سے پہلے ہی میں اس معاملے کو کچھ اور رنگ دے دوں۔ میں نے اس سلسلے میں ایک بہت بڑے وکیل کی خدمات نہ صرف دبئی میں حاصل کی ہیں بلکہ یہاں بھی۔"

"اربوں کی جائداد؟" سائرہ کے منہ سے نکلا۔

"غلط نہ سمجھو، وہ جائداد میرے جائز پیسے کی ہے۔"

"پھر تمہیں تفتیش سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"بات کچھ اور ہے۔" جمشید نے طویل سانس لی۔ "میری ایک بیوی بھی ہے سائرہ! میں تم سے شادی کا معاملہ اسی لیے ٹالتا رہا ہوں کہ مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینا ہے تاکہ وہ میرے اور تمہارے معاملے میں کوئی گڑبڑ نہ کر سکے۔"

"یہ اندازہ تو مجھے تھا کہ تم شادی شدہ ہو لیکن جائداد کی بات کرتے کرتے تم نے موضوع ہی بدل دیا۔"

"موضوع نہیں بدلا ہے میں نے۔" جمشید نے کہا۔ "میری بیوی بہت خفیہ طور پر وہ ساری جائداد اپنے نام کروانا چاہتی ہے جس کے بعد وہ مجھ سے طلاق مانگے گی۔ طلاق تو میں بھی اسے دینا چاہتا ہوں لیکن اس نے میری جائداد ہڑپ کرنے کے لیے جو خفیہ تیاری کی ہے، مجھے اس کا علم ہو گیا ہے۔ میں اپنی جائداد بچا کر ہی اسے طلاق دینا چاہتا ہوں۔"

"تم مجھے اس معاملے میں......"

"پوری بات سنو۔" جمشید نے کہا۔ "میرے یہاں کے اور دبئی کے وکیل نے مل کر کچھ کام کیے ہیں۔ کچھ قانونی کتابیں یہاں کے وکیل نے جمع کی ہیں اور کچھ فائلیں میں نے مرتب کروائی ہیں۔ وہ سب ایک چرمی تھیلے میں بند تیار ہیں۔ تمہیں وہ تھیلا ہی لے کر ایک لانچ کے ذریعے یہاں سے جانا ہے۔ لانچ تمہیں خلیج کی ایک ریاست تک پہنچائے گی۔ میرا وکیل وہاں تمہارا منتظر ہوگا۔ تھیلا تم اس کے حوالے کر دینا۔ لانچ تمہیں واپس لے آئے گی۔ لانچ تک پہنچنے کا ایک خاص وقت ہے۔ کل تمہیں اتنی دیر ہو گئی تھی کہ لانچ اپنے خاص مقام سے کسی اور طرف چلی گئی ہوگی لیکن آج وقت ہے کہ تم اس تک پہنچ جاؤ گی۔ تمہیں بس کھانا کھانے کے فوراً بعد روانہ ہونا ہے۔"

جمشید کی ان باتوں سے سائرہ کا دماغ چکرا گیا۔ اسے سب کچھ بہت الجھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"تم خود کیوں نہیں چلے جاتے وہ تھیلا لے کر؟" سائرہ کے منہ سے نکلا۔

"پرسوں سے بجٹ اجلاس شروع ہوا ہے۔ اسی سلسلے میں میری پارٹی کی دو میٹنگز ہو چکی ہیں اور میں نہیں جانتا کہ تیسری میٹنگ کب شروع ہوگی۔ وہ کسی وقت بھی ہو سکتی ہے اور مجھے فوری طور پر طلب کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں سے کسی وقت بھی نہیں ہٹ سکتا۔ آج بھی میں قصبے سے اسی لیے گیا تھا کہ اجلاس میں شرکت کرنی تھی اور پھر فوراً ہی پارٹی نے ایک میٹنگ بھی کر ڈالی۔ مجھے اس میں بھی شریک ہونا پڑا اسی لیے میں نے تم کو فون کیا تھا کہ کھانا کھالو۔"

سائرہ محسوس کر رہی تھی کہ جمشید کے بیان میں جھول تھے لیکن وہ کوئی وکیل تو تھی نہیں کہ نکتہ بہ نکتہ سوال کر سکتی تاہم اس نے اتنا ضروری کہہ دیا۔ "مجھے تمہاری یہ باتیں مکمل معلوم نہیں ہو رہیں۔ تم مجھ کو سب کچھ نہیں بتا رہے ہو۔"

جمشید نے ایک طویل سانس لی۔ "بہت ذہین ہو تم میری جان! واقعی میں نے دو ایک باتوں کی وضاحت نہیں کی لیکن میرے جواب سے تم پھر چڑ جاؤ گی۔ مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا تمہیں میری جان! مجھ پر اعتماد کرو۔ تمہارا ہی بھلا ہوگا اس میں! یہ میں اب بھی نہیں بتا سکوں گا کہ کیا بھلا ہوگا۔"

"سوچ سوچ کر میرا سر درد سے پھٹ جائے گا۔" سائرہ اپنی پیشانی رگڑنے لگی۔

جمشید اپنی کرسی سے اٹھ کر سائرہ کے قریب آیا، اسے کرسی سے اٹھا کر اپنے گلے لگا کے پیار کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں جب اس مہم کا انجام معلوم ہوگا تو بہت خوش ہو گی۔"

''لانچ میں میرے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا؟''

''صرف لانچ چلانے والا۔ یہاں سے بھی میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، میرا ایک ملازم جائے گا جو لینڈ کروزر چلائے گا۔ وہ بھی تمہیں اس وقت اکیلا چھوڑ دے گا جب دریا سے تمہارا فاصلہ دس منٹ کا رہ جائے گا۔ وہاں سے تم خود ڈرائیو کروگی۔ یہ مت سوچنا کہ تمہیں راستے کا علم کیسے ہوگا۔ جہاں تم لینڈ کروزر میں اکیلی رہ جاؤ گی تو تمہیں بالکل سیدھا جانا ہوگا۔ جب تم وہاں پہنچ جاؤ گی تو وہاں تمہیں میرا ایک آدمی ملے گا۔ وہ میرے ان آدمیوں میں سے ایک ہے جنہیں تم جانتی ہو۔ وہ تمہیں لانچ میں سوار کرا کے واپس آجائے گا۔ بس اب روانگی کے لیے تیار ہوجاؤ۔''

''تیاری کیا کرنی ہے؟''

''کچھ نہیں۔ تم معقول لباس میں ہو۔ میں بس وہ چرمی تھیلا لا کر دیتا ہوں تمہیں۔ وہ خاصا وزنی ہے اس لیے میرا ایک ملازم ہی اسے لینڈ کروزر تک لے جائے گا۔ دریا پر بھی میرا آدمی اسی لیے ہوگا کہ تھیلا اٹھا کر گاڑی میں پہنچا دے۔''

سائرہ کا سر بہت گھوما ہوا اب بھی تھا۔ جمشید تیزی سے چلتا ہوا ڈائننگ روم سے چلا گیا تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے جمشید کی واپسی کے لیے تین منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ایک ملازم بھی تھا جو تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے انداز سے سائرہ نے سمجھ لیا کہ وہ تھیلا بہت زیادہ بھاری نہیں تھا تاہم اتنا بھاری ضرور تھا کہ سائرہ اسے بہ مشکل اٹھا سکتی۔

''چلو!'' جمشید نے سائرہ سے کہا۔

سائرہ اٹھی اور ان دونوں کے ساتھ چلتی ہوئی حویلی سے باہر نکلی۔ لینڈ کروزر وہاں موجود تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور بھی تھا۔

ملازم نے تھیلا لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تاکہ سائرہ بیٹھ سکے۔

''گڈ لک!'' جمشید نے کہتے ہوئے سائرہ کی پشت پر ہلکا سا دباؤ اس طرح ڈالا کہ وہ گاڑی کے قریب ہو جائے۔

''میری رگوں میں خون نہیں، خوف دوڑ رہا ہے جمشید!'' سائرہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''ذرا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر جگہ تمہاری حفاظت کا بندوبست کردیا گیا ہے۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔''

سائرہ لینڈ کروزر میں بیٹھ گئی۔ انجن دو تین لمحے پہلے اسٹارٹ کردیا گیا تھا۔ لینڈ کروزر اس کے بیٹھتے ہی حرکت میں آگئی۔

براؤن تھیلے میں ''زپ'' لگی ہوئی تھی۔ وہ سائرہ کے پہلو میں رکھا ہوا تھا۔ سائرہ کے جی میں آئی کہ وہ ''زپ'' کھول کر دیکھے کہ تھیلے میں کچھ بھرا ہوا ہے لیکن یہ خیال اس نے یہ سوچ کر اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ عقب نما آئینے میں ڈرائیور اس کی یہ حرکت دیکھ سکتا ہے جو شاید مناسب نہ ہو۔

لینڈ کروزر کبھی پکے اور کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ اس نے کئی موڑ بھی کاٹے۔

تھیلا کھول کر دیکھنے کے معاملے میں سائرہ خاصی متجسس تھی۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی۔

''ڈرائیور!'' اس نے پکارنے کے انداز میں کہا۔

''یس میڈم!'' ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آئینے کا رخ ذرا دیر کے لیے ایسا کردو کہ مجھے اس میں اپنا چہرہ نظر آسکے۔ میں اپنے بال ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔''

''اوکے میڈم!'' ڈرائیور نے آئینے کا زاویہ تبدیل کیا۔

سائرہ اپنا کنگھا پہلے ہی نکال چکی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے بالوں کی ایک لٹ درست کرتے ہوئے دایاں ہاتھ تھیلے کی طرف بڑھایا۔

آئینے کا زاویہ اب ایسا تھا کہ ڈرائیور کو اس کی یہ حرکت نظر ہی نہیں آسکتی تھی۔

سائرہ نے آہستگی سے زپ کھولنا چاہی لیکن وہ نہیں کھلی۔ سائرہ نے کچھ زیادہ زور لگایا۔ زپ اب بھی نہ کھلی۔ سائرہ نے خاصی طاقت صرف کردی لیکن زپ نہیں کھلی۔

کیا اس میں بھی کوئی لاک ہے؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔

ایک بار پھر زور لگانے کے بعد سائرہ نے اپنا ہاتھ تھیلے سے ہٹا لیا اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ آئینے کا زاویہ اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرلے۔ کنگھا اس نے پہلے ہی رکھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے آئینے کا زاویہ بدلا۔

'یہ کوئی خاص قسم کی زپ ہے۔' سائرہ سوچنے لگی، اسے کھولنے کا کوئی خاص طریقہ ہوگا۔

اسی وقت اس کے موبائل پر میسج آیا۔ اس نے جلدی سے موبائل آن کیا اور جاوید کا نام دیکھ کر اس کا منہ بن گیا،

تاہم اس نے میسج کھولا۔ کئی سطری میسج تھا۔
''لانچ تک پہنچنے سے تمہیں گریز کرنا ہوگا سائرہ ورنہ نیول پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔ ان کو اطلاع دی جا چکی ہے کہ تم ایک بیگ میں کروڑوں ڈالرز لے کر خلیج کی کسی ریاست کی طرف جا رہی ہو۔''
سائرہ کا دل دھک سے رہ گیا اور اس کی نظر بے اختیار اس تھیلے کی طرف گئی جسے بیگ بھی کہا جا سکتا تھا۔
میسج کی آخری سطر یہ تھی۔ ''میں نے تمہیں فون اس لیے نہیں کیا کہ گھنٹی کی آواز ڈرائیور بھی سن لے گا۔''
سائرہ کا سارا جسم سنسنا گیا۔ وہ جاوید کا مزاج جانتی تھی۔ وہ اتنا بڑا اور اتنا خطرناک جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے جاوید کو میسج کیا۔ ''تم ایک خطرناک جھوٹ بول رہے ہو۔''
جاوید نے کچھ توقف سے دوسرا میسج کیا۔ ''میں تم سے جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میری بات کا یقین کرنے کے لیے تم بیگ کھول کر دیکھ سکتی ہو۔ اس میں ایک مخصوص زپ لگی ہوئی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم زپ کس طرح کھول سکتی ہو۔''
میسج کی سطریں اور بھی تھیں جو سائرہ نہیں پڑھ سکی کیونکہ گاڑی کی رفتار تیزی سے کم ہوئی تھی۔ سائرہ نے فوراً ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''میں گاڑی روک رہا ہوں میڈم!'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''یہاں سے صرف آپ کو جانا ہے۔ اب کوئی موڑ نہیں ہے۔ سیدھا جانا ہوگا آپ کو۔''
راستے کے دائیں بائیں ریت اور پتھر کے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔
''تم یہاں سے واپس کیسے جاؤ گے؟'' سائرہ نے پوچھا۔
''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ پندرہ منٹ بعد ایک گاڑی یہاں آئے گی اور مجھے لے جائے گی۔'' ڈرائیور نے جواب دیتے ہوئے لینڈ کروزر روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا اور دروازہ کھولنے کے لیے اس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔
''اب آپ آگے آ جائیے، ڈرائیونگ سیٹ سنبھالیے۔''
سائرہ کے خیال کے مطابق اسے بہترین موقع مل رہا تھا۔ جب وہ گاڑی میں تنہا رہ جاتی تو جاوید کو فون کر کے بھی بات کر سکتی تھی۔ اسے بس کچھ آگے جا کر یہ کام کرنا پڑتا۔ اس نے باقی میسج پڑھے بغیر موبائل فون بند کر دیا۔
ڈرائیور دروازہ کھول کر گاڑی سے اُترا۔
وہ اُترا ہی تھا کہ ایک دھماکا ہوا جو گولی چلنے کا تھا۔ ڈرائیور تیورا کر گرا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گولی اسی کے لگی تھی لیکن کہاں لگی تھی، یہ سائرہ نہ دیکھ سکی۔ دھماکا ہوتے ہی وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑی تھی۔ وہ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتی تھی کہ گولی کس طرف سے چلائی گئی تھی اور یہ سمجھنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ گولی چلانے والا کون تھا۔
سائرہ کو اس بارے میں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملا کیونکہ پھر پے در پے ہونے والے دھماکوں نے اس کا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گولیاں بہت تسلسل سے چلنے لگی تھیں۔ ڈرائیور کے بعد یہ گولیاں چلنے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ دو گروہوں میں تصادم ہو گیا تھا۔
لینڈ کروزر کی سیٹیں ایسی تھیں کہ ان کے درمیانی خلا سے گزر کر سائرہ ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچ سکتی تھی۔ اضطراری طور پر اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ فائرنگ کے اس علاقے سے جلد از جلد نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ فوراً گاڑی حرکت میں لائی اور اسی وقت دھماکوں کے ساتھ لینڈ کروزر کے کئی ٹائر پھٹ گئے۔ اس کا امکان ہی نہیں رہا کہ سائرہ وہاں سے فرار ہو سکتی۔
وہ گاڑی سے اُتر کر ہی کسی طرف بھاگ سکتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی، باہر سے ہی کسی نے دروازہ کھولا۔
وہ چار ہاتھ تھے جنہوں نے سائرہ کو گھسیٹ کر گاڑی سے اُتار لیا۔ چار ہاتھوں کا مطلب یہ تھا کہ وہ دو آدمی تھے۔ سائرہ نے خود کو چھڑانے کے لیے مزاحمت کی لیکن دو طاقتور آدمیوں کے سامنے ایک نہیں چلی۔ پھر اس نے ان دونوں میں سے ایک کی ایسی کراہ سنی جیسے اسے گولی لگی ہو۔
دوسرے آدمی نے سائرہ کے سر پر کوئی وزنی چیز ماری۔ اسے تارے نظر آ گئے اور وہ تارے اندھیرے میں ڈوبتے چلے گئے۔

☆☆☆

جب سائرہ کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک روشن کمرے میں بستر پر پڑا پایا۔ وہیں لاروش بھی ٹہل رہا تھا۔ سائرہ کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا۔
''اب کیا حال ہے اسمگلر کی اسمگلر محبوبہ؟''
سائرہ اپنے سر کے ایک حصے میں درد محسوس کر رہی تھی۔ غالباً اس کے سر پر اسی جگہ چوٹ ماری گئی تھی۔ اس درد کے باوجود سائرہ جلدی سے اُٹھی تو اسے چکر آ گیا۔ اس

نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے پر اتنے جھٹکے سے نہیں اٹھنا چاہیے ورنہ یہی حالت ہوتی ہے۔'' لاروش نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

سائرہ سر تھامے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا بایاں ہاتھ سر پر بھی گیا جہاں گومڑا تو پڑا ہوا تھا لیکن سر پھٹا نہیں تھا حالانکہ ضرب خاصی شدید لگی تھی۔

''یہ بستر جس پر تم لیٹی ہوئی تھیں۔'' لاروش بولا۔ ''اور اب بیٹھی ہوئی ہو، یہ بستر بہت نرم و گداز ہے۔ اس پر تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا مجھے بہت اچھا لگے گا۔''

اب سائرہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس کے بعد۔'' لاروش نے بات جاری رکھی۔ ''میری تمہاری تصویریں تمہارے اسمگلر عاشق کو بھیجی جائیں گی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ تمہارا عاشق واشق کچھ نہیں ہے۔ اس نے تمہیں بس آلۂ کار بنایا تھا۔ اسمگلنگ کروانی تھی اسے تم سے۔''

سائرہ نے اب اسے گھور کر دیکھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ لاروش نے پہلے بھی اسمگلنگ کی بات کی تھی۔

''یہ بیگ لے کر جا رہی تھیں نا تم؟'' لاروش نے ایک طرف اشارہ کیا۔

سائرہ نے اس طرف دیکھا۔ وہاں میز پر ڈالرز کی گڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہیں وہ بیگ بھی تھا جسے خالی کر لیا گیا تھا کیونکہ اب وہ پچکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سائرہ نے اس کا وہ حصہ بھی دیکھا جسے چاقو یا کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا تھا۔ اس کی زپ لاروش یا اس کے آدمیوں سے بھی نہیں کھلی ہوگی۔

''میں اسمگلر نہیں ہوں۔'' سائرہ آہستہ سے بولی۔

''یہ بیگ لے کر کون جا رہا تھا؟'' لاروش کا انداز چبھتا ہوا سا تھا۔

''میں نہیں جانتی تھی کہ اس بیگ میں کیا ہے؟''

''چلو مان لیتا ہوں تمہاری بات۔'' لاروش نے کہا۔ ''تم کو وہ بے خبر رکھ کر تمہیں آلۂ کار بنا رہا ہوگا۔ اس نے بہت پیسا خرچ کیا ہے تم پر۔ وہ اپارٹمنٹ ہی غالباً ایک کروڑ کا ہے مگر اس پیسے کی ان ڈالرز کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یہ کروڑوں ہیں۔ ابھی میں نے گنے نہیں۔ آٹھ نو کروڑ تو ہوں گے ہی جو اب میرے ہیں۔ جمشید اب ہاتھ مل رہا ہوگا۔ اس نے وہاں تمہاری حفاظت کے لیے اپنے آدمیوں کو تو مامور کیا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہوگا کہ میرے گینگ کی طاقت اس کے آدمیوں سے زیادہ ہے۔''

اب سائرہ اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تو یہ اسمگلنگ کا معاملہ ہے جس میں تم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو۔''

''بالکل یہی بات ہے، لیکن بات صرف اسمگلنگ کی نہیں، اس نے میرے کچھ آدمی گرفتار کرا دیے تھے۔ خیر! اب اسے مزہ آیا ہوگا۔ تصویریں دیکھ کر اور مزہ آئے گا۔''

لاروش، سائرہ کی طرف بڑھا۔ وہ یک لخت بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس جھٹکے سے بھی اسے ہلکا سا چکر آ ہی گیا تھا۔

''میرے قریب مت آؤ۔'' سائرہ تیزی سے بولی۔

''اس سے تمہارے لیے کیا فرق پڑے گا گڑیا!'' لاروش نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔ ''تم جمشید کی بیاہتا تو ہو نہیں، اس کی داشتہ ہو۔ اب اگر تم خود کو میرے حوالے بھی کر دو گی تو...... میں اپنی بات دہراؤں گا۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔ فرق پڑے گا تو جمشید کے لیے پڑے گا۔ تصویریں دیکھ کر قیامت گزرے گی اس پر۔''

حقیقت بھی یہی تھی کہ سائرہ نے ایک بے حد آسودہ زندگی حاصل کرنے کے لیے اپنا آپ جمشید کے لیے وقف کر دیا تھا اور اس سے پہلے بہت کم عمری میں بھی اسکول کے ایک لڑکے نے اس کی دوشیزگی داغ دار کر دی تھی لیکن وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اب بھی خود پر صرف جمشید کا حق سمجھ رہی تھی حالانکہ اب یہ بھی ظاہر ہو چکا تھا کہ جمشید کی زندگی بظاہر ہی عزت سے گزر رہی تھی۔ بہ حیثیت اسمگلر وہ اس عزت کا سزاوار نہیں تھا۔

اس وقت جاوید کی باتیں بھی اس کے دماغ میں چکرانے لگی تھیں۔ اس نے اسے جمشید سے دور رکھنا چاہا تھا لیکن ایک پُرآسائش زندگی کے لیے اس نے جاوید کی باتیں نظرانداز کر دی تھیں۔

لاروش اس کی بات پر آگے بڑھتے ہوئے رک گیا تھا لیکن اس کے قدم پھر آگے بڑھے۔ ''دیکھو گڑیا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں باندھ کر بستر پر ڈال دیا جائے۔ پھر تم مجھے نہیں روک سکو گی لیکن اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں جتنا جمشید نے کیا تھا۔ آج سے تم میری محبوبہ بن جاؤ اور جمشید کو ذلیل کرنے میں میری معاون بنو۔ میں اس کی وہ عزت خاک میں ملانا چاہتا ہوں جو اس نے ایم این اے کی حیثیت سے حاصل کی ہے۔ مجھے جلدی سے بتا دو کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے۔ میرا اگلا قدم تمہارے

فیصلے کے مطابق اٹھے گا۔‘‘

اب وہ سائرہ کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ سائرہ ایک طرف سرکتے سرکتے دیوار سے جا لگی تھی۔ لاروش نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے لیکن اس کے انداز میں سختی نہیں تھی۔ ’’جلدی فیصلہ کرو۔‘‘ وہ بولا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں بھی جنسی بھوک چمک رہی تھی۔

’’مجھے کچھ وقت تو دو سوچنے کے لیے۔‘‘ سائرہ کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

’’کیا سوچو گی؟‘‘

’’اگر میں نے مزاحمت نہ کی تو یہ جمشید کے ساتھ دھوکا ہوگا، بے وفائی ہوگی، کیا مجھے یہ کرنا چاہیے؟‘‘

لاروش ہنسا۔

’’تمہیں اب صرف میرا ساتھ دینا چاہیے۔ میرے ساتھ رہو۔ میرے ساتھ تفریح گاہوں میں نظر آؤ تا کہ وہ حسد کی آگ میں جل سکے۔‘‘

’’مجھے کچھ وقت دو سوچنے کے لیے۔‘‘

’’کتنا وقت؟‘‘

’’اب تو رات ختم ہونے والی ہے۔‘‘ سائرہ نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے شام تک کی مہلت دو۔‘‘

’’تم اب میرے قبضے میں ہو اس لیے میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے اتنا وقت نہیں دے سکتا۔ کچھ وقت بھی اس لیے دوں گا کہ میں تمہیں تمہاری مرضی سے اپنی آغوش میں لے سکوں۔ اس معاملے میں جبر مجھے پسند نہیں ہے۔ میں ابھی اس کمرے سے جا رہا ہوں لیکن صرف آدھے گھنٹے بعد واپس آ جاؤں گا۔ تم اپنا جواب تیار رکھنا۔‘‘ وہ مڑا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

’’سوچنے کے لیے آدھا گھنٹا کم ہے۔‘‘ سائرہ جلدی سے بولی۔

لاروش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سائرہ نے ایسی آواز بھی سنی جیسے دروازہ باہر سے بند کیا گیا ہو۔

سائرہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھکے تھکے سے انداز میں بستر کی طرف بڑھی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نظر ڈالرز پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی جاوید کی باتیں اور اس کا میسج بھی یاد آیا۔ میسج میں اس نے بتایا تھا کہ نیول پولیس اسے گرفتار کرنے کے لیے اس کی تاک میں ہے۔ اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ جمشید نے اسے صرف اپنے مقصد کے لیے اسے داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر وہ گرفتار ہو جاتی تو اس کے لیے ثابت کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ ان ڈالرز سے بے خبر تھی اور اس سے وہ سب کچھ جمشید نے کروایا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے پہلی بار اس کے دل میں جمشید کے لیے منفی جذبات ابھرے اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی وہ عورت بھی جاگی جو آسودہ زندگی کی خاطر مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننا نہیں چاہتی۔ جمشید کی حد تک بات قابلِ برداشت تھی لیکن اس کے بعد لاروش کی داشتہ بننے کے لیے اس کے دل و دماغ آمادگی کی طرف مائل نہیں تھے۔ اس طرح وہ واقعی کھلونا بن کر رہ جاتی۔ لاروش کی جگہ کوئی اور بھی لے سکتا تھا۔

یہ اندازہ تو اسے تھا کہ وہ اب لاروش کی ہوس سے بچ نہیں سکتی تھی لیکن اس نے یہ ضرور طے کر لیا کہ وہ اپنی مرضی سے خود کو لاروش کے حوالے نہیں کرے گی۔

اگر اس کے پاس موبائل ہوتا تو وہ جاوید سے ضرور رابطہ کرتی۔ وہ اس کے پاس نہیں تھا لہٰذا وہ لاروش ہی کے قبضے میں ہونا چاہیے تھا۔

موبائل کو بھول کر وہ سوچنے لگی کہ جب وہ لانچ کے لیے دریا کی طرف سرگرمِ سفر تھی تو جاوید کے بھیجے جانے والے میسجز سے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ پھر کیا ہوا؟ کیا وہ فائرنگ کے ہنگامے میں دیکھ نہیں سکا کہ اسے اغوا کر کے... کہاں لے جایا گیا ہے؟

جمشید کے آدمیوں کے بارے میں تو بس یہ بات طے تھی کہ وہ لاروش کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے یا فرار ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں جمشید کو بھی علم نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس وقت لاروش کے قبضے میں کہاں تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ بہت ہی بھرپور انداز میں لاروش کے اس ٹھکانے پر حملہ آور ہوتا۔ اسے سائرہ کی پروا ہوتی یا نہ ہوتی لیکن اسے اپنے کروڑوں ڈالرز کی فکر تو ہونی ہی چاہیے تھی۔

سائرہ اس خیال سے روہانسی ہو گئی کہ یہاں اس کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا لیکن پھر اسے اس خیال نے بھی سہارا دیا کہ ایسے کاموں میں دیر سویر بھی تو ہو سکتی ہے! اس خیال کے ساتھ ہی اس کی نظر دیوار گیر کلاک پر گئی۔ لاروش نے آدھے گھنٹے کا وقت دیا تھا اور وہ وقت گزرنے میں ایک ڈیڑھ منٹ رہ گیا تھا۔ سائرہ کے دماغ میں ایک خیال کی لہر اٹھی اور وہ دروازے کی طرف لپکی۔ وہ دروازہ اندر سے بولٹ کر دینا چاہتی تھی۔ اس طرح کچھ اور وقت گزر جاتا۔ دروازہ توڑنے

میں لاروش کو کچھ وقت لگتا۔ ممکن تھا کہ اتنی دیر میں جاوید پولیس فورس کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا۔

یہ..... ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات تھی اور سائرہ نے اس تنکے ہی کا سہارا لینا چاہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ باہر سے دروازہ کھولا گیا۔ سامنے لاروش تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''خوب۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم میرا استقبال کرنے کے لیے دروازے پر آئی ہو۔''

''کتے!'' سائرہ نے دانت پیسے اور وہاں سے بھاگ نکلنے کے لیے لاروش کو دھکا دیا لیکن وہ اتنی طاقتور نہیں تھی کہ لاروش کو گرادیتی یا اسے کم ازکم کچھ پیچھے دھکیل دیتی۔ لاروش کا بس ایک قدم پیچھے ہٹا تھا اور اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

سائرہ کی وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی ناکام رہی لاروش نے اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو وہاں لاروش کے تین آدمی اور تھے۔

''کتیا!'' لاروش نے بھی دانت پیسے اور سائرہ کو گھسیٹتا ہوا کمرے کے اندر بستر تک لے گیا۔ اس کے تینوں آدمی بھی اندر آگئے تھے۔ لاروش نے ہی انہیں اندر بلایا ہوگا۔

سائرہ مچل رہی تھی لیکن لاروش کی گرفت سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''سنبھالو اسے۔'' لاروش نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ''اور بستر پر باندھ دو اسے جس طرح میں کہوں یعنی بے لباس کردو۔''

سائرہ کو ان تینوں کی طرف دھکیل دیا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد سائرہ بستر پر چت لیٹی اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ اوپر کرکے کسی چیز سے باندھ دیے گئے تھے۔ اسی طرح دونوں ٹانگیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ ایک چرمی پٹی اس کے پیٹ پر اس طرح باندھی گئی تھی کہ اس کی پیٹھ بستر سے چپکی ہوئی تھی۔

تینوں آدمی ایک طرف کھڑے اس طرح لاروش کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے اس کے اگلے حکم کے منتظر ہوں۔

''بس جاؤ۔'' لاروش نے ہاتھ ہلا کر ان سے کہا۔ ''ایک گھنٹے بعد میں اسے تمہارے حوالے کردوں گا۔ اسے یہ عزت راس نہیں آئی کہ صرف میری داشتہ بن کر رہے۔'' وہ بھوکی نظروں سے سائرہ کے جسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بے بسی سے سائرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لاروش اسے بازاری طوائف بنا دینا چاہتا تھا۔

لاروش ان تینوں کے پیچھے پیچھے گیا اور ان کے باہر نکلنے کے بعد دروازہ بند کرکے مڑا اور سائرہ کو حقارت سے دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

''مجھے معاف کردو لاروش۔'' سائرہ گڑگڑائی۔ ''مجھے کسی اور کے حوالے مت کرنا۔''

''جو حرکت تم نے کی ہے، تمہیں اس کی سزا تو......''

ایک فائر کی آواز سے لاروش کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ چونکا صرف وہی نہیں تھا، سائرہ بھی چونکی تھی لیکن اس کے چونکنے میں خوشی بھی تھی۔ اسے گمان ہوا تھا کہ اس کے لیے کوئی مدد آگئی تھی جسے ختم کرنے کی کوشش بھی شروع ہوگئی تھی۔ پے در پے گولیاں چلنے لگی تھیں۔ بات صاف ظاہر تھا کہ دو فریقوں میں مقابلہ شروع ہوگیا تھا۔

''جمشید۔'' لاروش نے دانت پیسے اور دروازے کی طرف لپکا۔ باہر نکل کر وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

سائرہ دل ہی دل میں جمشید کی کامیابی کے لیے دعا مانگنے لگی تھی۔ لاروش کی طرح اسے جاوید کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق جاوید اتنا طاقتور ہوتا تو لاروش کو اسے اغوا کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی۔

گولیاں لگ بھگ پندرہ منٹ تک چلتی رہیں اور پھر ان کی شدت میں کمی آنے لگی۔ یہاں تک کہ سناٹا چھا گیا جو ان دھماکوں کے بعد سائرہ کو بڑا پُرہول محسوس ہوا تھا۔

جمشید کامیاب رہا ہوگا، سائرہ کے دل نے کہا۔ لاروش مارا جاچکا ہوگا یا اس نے فرار ہوجانے ہی میں اپنی عافیت جانی ہوگی۔

بڑی زور سے کمرے کا دروازہ کھلا اور لاروش کو اندر آتا دیکھ کر سائرہ کا دل بیٹھ گیا۔ جمشید نے ایک بار پھر شکست کھائی تھی۔

لاروش کے دائیں گال سے خون کی ایک باریک سی لکیر بہہ رہی تھی۔ یقیناً کوئی گولی اس کے گال سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری ہوگی۔

''کھولو اسے۔'' لاروش نے اپنے ساتھ آنے والے دو آدمیوں کو حکم دیا۔ ''ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔ فائرنگ کی آوازیں باہر تک گئی ہوں گی۔ پولیس ضرور اس طرف متوجہ ہوگی۔''

دونوں آدمیوں نے بڑی تیزی سے سائرہ کو آزاد کردیا۔ اسی وقت ایک آدمی تیزی سے اندر آیا۔

''پولیس آگئی ہے باس۔'' اس نے پریشان لہجے میں لاروش کو اطلاع دی۔ ''وہ لوگ ایم این اے سے بات

کررہے ہیں۔"

پولیس کی اطلاع سنتے ہی لاروش نے ایک بار پھر دانت پیسے اور سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جانے لگا۔

"تم تینوں بھی آؤ۔" اس نے باقی تینوں آدمیوں سے کہا۔ "ہم نکل جائیں گے یہاں سے۔"

سائرہ نے خود کو لاروش سے چھڑانا چاہا لیکن لاروش کے قدم ایک راہداری میں آگے بڑھتے رہے۔ سائرہ فرش پر گر گئی۔ لاروش اسے بیدردی سے گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے جاتا رہا۔

"اس طرف ایک خفیہ دروازہ ہے۔" لاروش نے اپنے تینوں آدمیوں سے کہا۔ "ہم اس طرف سے نکل جائیں گے۔" پھر اس نے پوچھا۔ "تمہارے باقی پانچوں ساتھی مارے گئے؟"

"ہاں باس۔" جواب دیا گیا۔ "لیکن جمشید کے سارے آدمی مارے گئے، وہ بار کے قریب تھے۔"

"ان میں جمشید بھی ہوگا؟"

"نہیں، جمشید نہیں آیا تھا۔"

"بزدل۔" لاروش کے لہجے میں حقارت اور نفرت تھی۔

پھر ایک دھماکا ہوا، بلکہ کئی دھماکے ہوئے لیکن وہ گولیاں چلنے کے دھماکے نہیں تھے۔ اوپر کسی جگہ سے کئی افراد سامنے ہی کود پڑے تھے۔ ان کے جسموں پر پولیس کی وردیاں تھیں۔ انہی میں جاوید بھی تھا۔ اس سے پہلے کہ لاروش یا اس کے ساتھی کوئی ہتھیار نکالتے، کود کر سامنے آنے والے ان چاروں پر ٹوٹ پڑے۔

"اسے صرف میں ماروں گا۔" جاوید نے لاروش کے فلائنگ کک مارتے ہوئے بڑے غصے سے کہا۔

لاروش راہداری کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس وقت سائرہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

لاروش نے دیوار سے ٹکرانے کے بعد اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ جاوید نے اس پر جست لگائی اور اسے فرش پر گرا کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے لاروش پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا ہو۔

سائرہ پلٹ کر اس کمرے کی طرف بھاگی جہاں سے اسے لے جایا جا رہا تھا۔ کمرے میں گھس کر وہ اپنا لباس پہننے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں تھے۔ وہ اس وقت اپنی دانست میں بہت ذلیل ہوئی تھی۔ اسے بہت سے افراد نے برہنہ دیکھا تھا۔ لاروش اور اس کے آدمی تو تھے ہی، لیکن پولیس والوں نے بھی دیکھا تھا جن میں جاوید بھی تھا۔

کپڑے پہن کر وہ پھر اس جگہ پہنچی جہاں معرکہ ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ لاروش اور اس کے ساتھی پٹ پٹ کر بے حال ہو چکے تھے۔ لاروش کا چہرہ تو خون میں نہایا ہوا تھا۔

"کاش میں ایک پولیس آفیسر نہ ہوتا۔" جاوید، لاروش کی گردن دباتے اور دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تو نے ایک لڑکی کو ذلیل کیا ہے۔ معافی مانگ اس سے۔" جاوید نے لاروش کو سائرہ کے قدموں میں گرا دیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سائرہ لباس پہن کر واپس آ گئی تھی۔

لاروش کی حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ وہ فرش پر پڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ سائرہ نے بڑے زور سے اس کے سر پر ٹھوکر ماری۔ لاروش الٹ گیا۔

"مارتی رہو اسے سائرہ!" جاوید ہانپ رہا تھا۔ "جب تک یہ بے ہوش نہیں ہو جاتا، اسے مارتی رہو۔"

سائرہ نے بڑی نفرت سے لاروش کے ایک اور ٹھوکر ماری۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے تھے۔ بس چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔

اس وقت تک لاروش کے ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئی تھیں۔

پولیس کے کچھ اور آدمی بھی وہاں آ گئے۔ ان میں ایک ڈی ایس پی بھی تھا۔ اس نے جاوید کو کہتے سنا۔

"اسے مارتی رہو سائرہ، مارتی رہو۔"

سائرہ نے ایک اور ٹھوکر ماری۔

"جاوید!" ڈی ایس پی زور سے بولا۔ "کیا تماشا بنا رہے ہو؟ ہتھکڑیاں لگاؤ اسے۔"

"یہ اسی قابل ہے سر کہ......" جاوید نے کچھ کہنا چاہا۔

ڈی ایس پی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں ایک ذمے دار پولیس آفیسر کا کردار ادا کرنا چاہیے جاوید...... قانون تمہیں اس پر تشدد کی اجازت نہیں دیتا۔ ویسے بہت تشدد تو ہو ہی چکا ہے۔ میں ان لوگوں کی حالت دیکھ رہا ہوں۔"

جاوید نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ اپنے آفیسر کے سامنے بے بس تھا۔ ورنہ اس کی خواہش تو شاید یہ ہو کہ سائرہ ہی سے لاروش کے ٹکڑے کروا ڈالے۔

☆☆☆

پولیس نے کروڑوں ڈالرز بھی اپنی تحویل میں لے لیے۔

اس سارے معاملے میں سائرہ کا کردار غیر اہم نہیں تھا لہٰذا اسے تمام قانونی کارروائیوں میں شامل رکھا گیا۔ اس نے

بھی پولیس سے بھرپور تعاون کیا۔ اپنا بیان ریکارڈ کرواتے وقت اس نے کوئی بات بھی جھوٹ نہیں کی۔ یہ تک نہیں چھپایا کہ لاروش نے اسے برہنہ کروایا تھا اور اسے اپنا کھلونا بنانا چاہا تھا۔

اس ساری کارروائی کے درمیان سائرہ سوچتی رہی تھی کہ جمشید کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن ایسا نہیں تھا۔ ایسے بہت سے شواہد پولیس کو مل چکے تھے کہ وہ جمشید کو عدالت میں تو گھسیٹ ہی سکتی تھی۔ جن لوگوں نے اس ایم این اے کے گھر پر حملہ کیا تھا جو لاروش کا سہولت کار تھا، وہ تو اسی رات گرفتار کر لیا گیا حملہ آوروں کے پاس جو موبائل فون تھے، ان سے ان کا جمشید سے تعلق ظاہر ہو چکا تھا۔ سائرہ بھی اس کے خلاف بیان دے چکی تھی۔ وہ فوری طور پر قانون کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا تھا لیکن عدالت میں اسے اس معاملے سے اپنی لاتعلقی ثابت کرنے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے لیکن اس کے بچنے کا امکان نہیں تھا۔

سائرہ بھی فوری طور پر پولیس کی حراست سے نہیں نکل سکتی تھی لیکن اس معاملے میں اس کا بیان اور جاوید کی کوششیں رنگ لائیں اور اسے اس ضمانت پر چھوڑ دیا گیا کہ اس مقدمے کے دوران میں وہ شہر نہیں چھوڑے گی۔

اس سارے معاملے میں نہ صرف صبح ہو چکی تھی بلکہ دن کے دس بجنے والے تھے۔ سائرہ کو اس کا موبائل واپس مل چکا تھا جو لاروش ہی کے پاس تھا۔

''چلو اب تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔'' جاوید نے اس سے کہا۔

''گھر؟'' سائرہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''کہاں ہے میرا گھر؟''

''بظاہر تو وہی اپارٹمنٹ ہے جو تمہیں جمشید نے دیا تھا۔'' جاوید نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لعنت بھیجتی ہوں اب میں اس زندگی پر۔'' سائرہ نے نہایت تیز لہجے میں کہا۔ ''اور پھر...... وہاں جمشید کے ملازم ہیں، وہ اب مجھ سے کیا برتاؤ کریں گے؟ کیا جمشید بے خبر رہا ہوگا کہ میں نے اس کے خلاف بیان دیا ہے؟ وہ بہت بارسوخ ہے جاوید...... پولیس اسٹیشن میں بھی اس کا کوئی نہ کوئی خیر خواہ ہوگا۔''

''ہوں۔'' جاوید نے سر ہلایا۔ ''بات تو غلط نہیں کہہ رہی ہو۔ تم واپس اپنے ماموں کے گھر چلی جاؤ۔''

''نہیں۔'' سائرہ نے نظریں جھکا لیں۔ ''اب میں وہاں کس طرح جا سکتی ہوں۔ جو کچھ ہو چکا ہے، وہ آج کے اخبارات میں تو نہیں لیکن کل کے اخبارات میں آ سکتا ہے۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ اخبارات میں میرا نام نہ آنے دو۔''

''نہیں سائرہ!'' جاوید نے مایوسانہ انداز میں کہا۔ ''میں اتنا بااثر نہیں ہوں۔''

''تو پھر میں جا کر کسی ٹرین کے آگے آ جاتی ہوں۔'' سائرہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ایسی باتیں نہ کرو۔'' جاوید نے جلدی سے کہا۔

''پھر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟'' سائرہ کی آواز رندھ گئی۔

''میں فی الحال تو تمہارے رہنے کا بندوبست کسی ہوٹل میں کرائے دیتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے گھر اس لیے نہیں لے جا سکتا کہ میں اکیلا رہتا ہوں۔ میرے گھر والے اپنے آبائی پنڈ میں رہتے ہیں۔ اگر وہ لوگ یہاں ہوتے تو میں تمہیں ضرور اپنے گھر لے چلتا۔''

سائرہ تلخی سے بولی۔ ''یہ کہو کہ ایک بدنام ہونے والی لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنے کا تمہارے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔''

''ہرگز ایسا نہیں ہے۔'' جاوید نے زور دے کر کہا۔ ''لیکن ماضی میں تم میرے بارے میں جو کچھ سوچتی رہی ہو، وہ سب......''

''نہیں۔'' سائرہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں نے تمہارے کردار پر کبھی شک نہیں کیا۔ میری بڑی بھیانک غلطی یہ ہے کہ میں نے ایک مصنوعی زندگی کا خواب دیکھا اور اس کی وجہ سے جمشید......''

''چھوڑو جمشید کی بات۔'' اس مرتبہ جاوید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اگر تم میرے گھر میں رہنے کے لیے تیار ہو تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔''

''تو لے چلو مجھے۔''

''کار نہیں ہے میرے پاس، بس ایک موٹر سائیکل ہے اور ایک فلیٹ بھی چھوٹا سا ہے۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم راشی پولیس آفیسر نہیں ہو۔''

''تو آؤ۔''

ان دونوں میں یہ باتیں پولیس اسٹیشن کے احاطے میں ہوئی تھیں۔ جاوید نے احاطے میں کھڑی ہوئی ایک موٹر سائیکل کی طرف قدم بڑھائے۔

''تمہیں وہاں پہنچنے میں دیر بہت ہو گئی تھی۔ یہ سراغ لگانے میں دیر لگی ہوگی کہ مجھے اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہے؟''

''نہیں۔'' جاوید نے جواب دیا۔''اس کا علم تو ہو گیا تھا لیکن ایک ایم این اے کے گھر پر چڑھ دوڑنا۔ پولیس کے لیے آسان نہیں تھا۔ پھر رات بھی خاصی ہو چکی تھی۔ اس کے گھر کا سرچ وارنٹ حاصل کرنا خاصا دشوار ثابت ہوا۔ اسی میں دیر بھی ہوئی۔'' وہ موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔

سائرہ اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت یہ محسوس کر رہی تھی جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو جس کا تسلسل اب بھی جاری تھا۔ وہ بھی گمان بھی نہیں کر سکی تھی کہ وہ ایک دن جاوید کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل پر سوار ہو گی۔

جاوید کے گھر پہنچنے تک راستے میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔

فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد جاوید نے کہا۔''تین کمروں کا فلیٹ ہے۔ ان میں سے دو کمرے خواب گاہ کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ دوسرا کمرا اس لیے ہے کہ میری والدہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آ جاتی ہیں۔ ایک آدھ ہفتہ رہ کر چلی جاتی ہیں۔ فی الحال اسی کمرے کو تم اپنی خواب گاہ سمجھو۔''

سائرہ نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

جاوید نے اسے مذکورہ کمرے میں پہنچا کر کہا۔''تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔ اچھی طرح نیند لے لو۔''

''جاگے ہوئے تو تم بھی ہو۔''

''لیکن میں چند گھنٹے سے زیادہ آرام نہیں کر سکوں گا۔ چار بجے مجھے پھر پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔ نوکری تو نوکری ہوتی ہے۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''جاگی ہوئی تو میں ہوں لیکن نیند شاید جلدی نہ آئے۔''

سائرہ کا خیال درست ثابت ہوا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک سو نہیں سکی۔ گزرے ہوئے سارے واقعات تو اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے لیکن وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے ماموں کو تو کیا، کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کوئی بھی اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جس کے سہارے وہ زندگی گزار سکتی۔

موت......صرف موت!

یہ مقدمہ ختم ہونے کے بعد، جمشید کو سزا جب سنائی جا چکی ہوگی تو وہ کسی طرح خودکشی کر لے گی۔

چند دن بعد ہی مقدمہ عدالت میں آ گیا اور خاصے عرصے تک چلتا رہا۔ جمشید نے اپنی ضمانت قبل از گرفتاری پہلے ہی کرا لی تھی لیکن آخر وہ دن آ کر رہا جب جمشید کو سزا سنا دی گئی۔

اس سارے عرصے میں سائرہ نے ضرورت کے وقت عدالت جانے کے علاوہ فلیٹ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ جاوید کے لیے کھانے اور ناشتے کا بندوبست اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا جبکہ اس سے پہلے جاوید ہی اپنے لیے سب کچھ کیا کرتا تھا۔

مقدمہ ختم ہونے کے بعد سائرہ نے جاوید سے کہا۔

''تم نے میرا بہت خیال رکھا۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ اب مقدمہ ختم ہو چکا۔ عدالت مجھے بری کر چکی ہے۔ اب تم بھی مجھے بری کر دو۔''

''کیا مطلب؟''

''اجازت دو مجھے۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

''جہاں قسمت لے جائے۔''

''کل تک رک جاؤ۔ والدہ آ رہی ہیں۔ وہ تم سے ایک سوال کریں گی۔ انہیں جواب دینے کے بعد تم اپنی مرضی سے فیصلہ کر لینا۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ وہ مجھ سے کیا سوال کریں گی؟''

''جانتا ہوں۔''

''تو بتا دو مجھے۔ میں کل تک جواب سوچ لوں گی، بتاؤ، کیا سوال ہوگا؟''

جاوید خفیف سا مسکرایا اور بولا۔''وہ تم سے پوچھیں گی کہ تمہیں ان کا بیٹا شوہر کی حیثیت سے قبول ہوگا یا نہیں۔''

''جاوید!'' سائرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا تم اس لڑکی کو قبول کر لو گے جو بہت عرصے تک ایک شخص کی داشتہ رہ چکی ہے؟''

''سائرہ!'' جاوید نے جذباتی انداز میں کہا۔''مجھے تم سے محبت ہے، تمہارے جسم سے نہیں۔''

سائرہ ہکا بکا سی رہ گئی۔ یہ بات اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھی پھر اس کی آنکھوں میں آنسو ڈگمگانے لگے۔

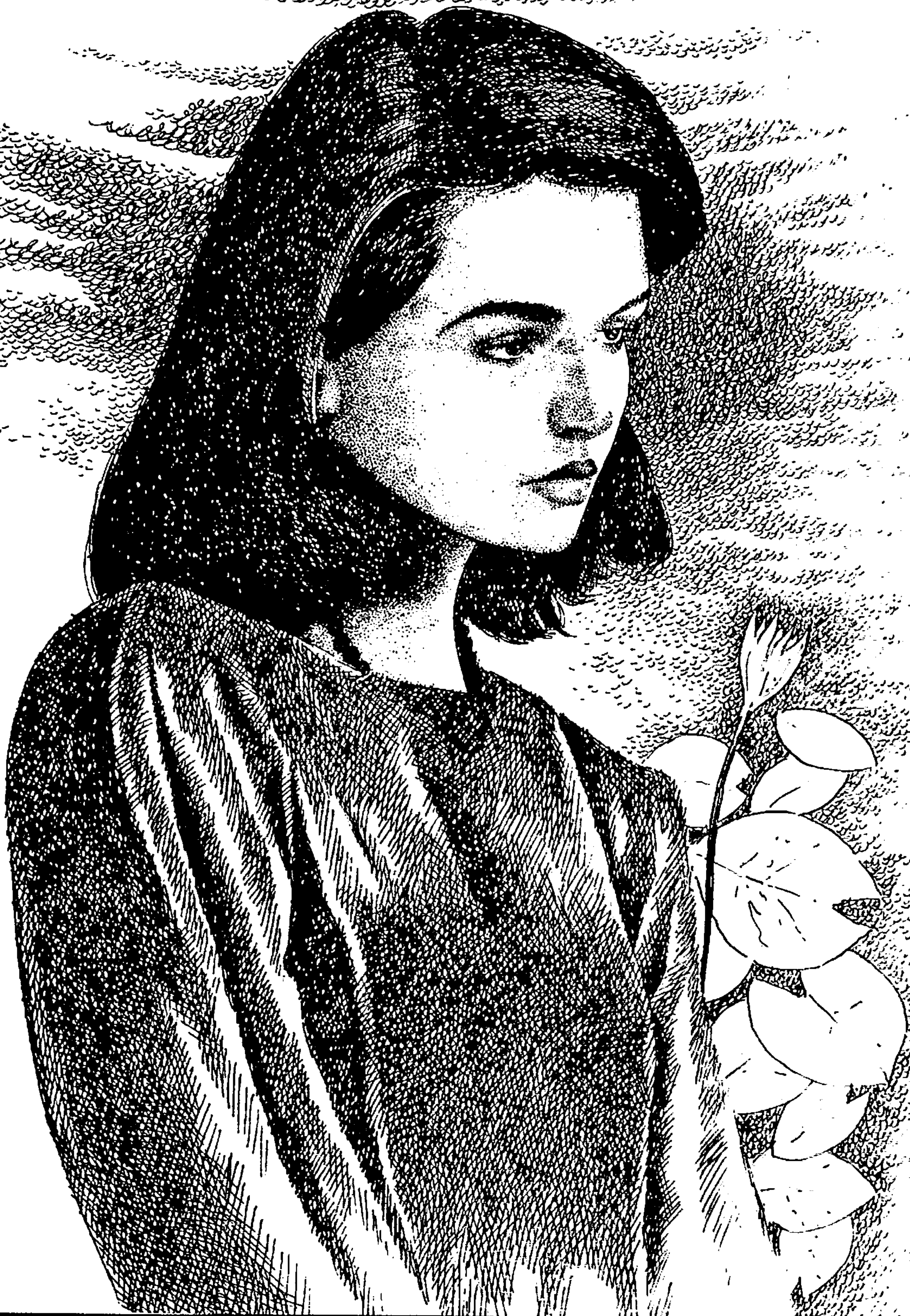
''نہیں۔'' جاوید نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔''میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ زندگی بھر تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا۔''

سائرہ اتنی جذباتی ہوئی کہ جاوید کے سینے سے لگ گئی۔

اور پھر جاوید نے اسے ساری زندگی اپنے سینے سے لگائے رکھنے کی قسم کھا لی۔



پدم اتع اقبال



ماہین اس وقت چھ یا سات سال کی ہونے والی تھی جب میں نے اسے پہلی مرتبہ ڈانٹا۔ مجھے اس سے محبت ہی اتنی تھی کہ اسے ڈانٹنا ڈپٹنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ تو میں اس وقت ایک الجھن میں تھی کہ ماہین کی کسی ضد پر اسے ڈانٹ بیٹھی لیکن جب ماہین کی آنکھوں میں آنسو آئے تو میں تڑپ گئی۔ میں نے اسے اپنے کلیجے سے لگالیا۔

"سوری......! سوری بیٹا۔ بس......بس اب رونہیں...... معاف کردو نا اپنی مما کو...... بس چپ ہو جاؤ نہیں تو مما بھی رونے لگے گی۔ آئی ایم سوری میری جان...... ہم شام کو چلیں گے شاپنگ کرنے۔ جو چاہو خرید لینا...... ٹھیک ہے نا؟"

میری باتوں اور میرے رویے سے ماہین کے آنسو تو رک گئے لیکن چہرے کی اداسی فوری طور پر دور نہیں ہوسکی۔ اسے عادت جو نہیں تھی میری ڈانٹ سننے کی۔ وہ تو میرے لاڈ پیار کی عادی تھی۔ میں نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ مجھے اس سے اتنی محبت تھی کہ میں اس کے چہرے پر اداسی بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اسے اپنی گود میں اٹھاتے ہوئے کہا تھا "چلو، تمہارا منہ دھلا کر میں تمہیں وہی کپڑے پہنا دیتی ہوں جو تمہیں پسند ہیں۔"

اسے گود میں لیے ہوئے میں دروازے کی طرف مڑی تو ٹھٹک گئی۔ دروازے میں اکمل کھڑا تھا۔ سنجیدگی اور ملال کی کیفیت تھی اس کے چہرے پر غالباً اس نے وہ سب کچھ دیکھا اور سنا تھا جو چند لمحے پہلے ڈرائنگ روم میں ہو چکا تھا۔ اسے بھی دکھ ضرور ہوا ہوگا کہ میں نے ماہین کو ڈانٹا تھا۔ ماہین سے اس کی چاہت کچھ کم نہیں تھی مجھ سے......اور کبھی کبھی تو مجھے یہ گمان بھی ہوتا تھا کہ ماہین کو وہ مجھ سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔

ماہین کو گود میں لیے، میں اکمل کو نظر انداز کرتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل جاتی لیکن وہ بول پڑا "غلطی تو میری تھی فرزانہ اور غصہ اتار دیا آپ نے ماہین پر۔ اس وقت مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں ماہین کا مجرم ہوں۔"

"ارے نہیں اکمل!" میں نے بات ختم کرنے کی کوشش کی "کوئی غلطی نہیں تھی آپ کی۔ خوامخواہ نہ جانے کیا کہہ بیٹھی تھی میں آپ سے۔"

لیکن میں سراسر جھوٹ بول رہی تھی۔ واقعہ یہی تھا کہ جب میں نے ماہین کو ڈانٹا، اس وقت اکمل ہی کی ایک حرکت پر جھلائی ہوئی تھی۔ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ اس کا چھوٹا موٹا سہو بھی میری جھنجلاہٹ کا سبب بن جاتا تھا۔

میں ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈروم میں گئی۔ ماہین کو باتھ روم میں لے جا کر اس کا منہ دھلایا، اس کے کپڑے تبدیل کرائے اور اس سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کرتی رہی اور آخر ماہین کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا۔

شام کو میں اسے شاپنگ کرانے لے گئی۔ اس نے ضد کر کے اکمل کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس کی ضد کی وجہ سے مجھے چپ رہ جانا پڑا تھا ورنہ میں چاہتی نہیں تھی کہ اکمل ہمارے ساتھ کہیں آیا جایا کرے۔

شاپنگ کے بعد جب ہم لوٹے تو ماہین بہت خوش تھی۔ کھانے کی میز پر بھی وہ چہکتی رہی۔ اسے خوش دیکھ کر اکمل بھی بھول گیا تھا کہ میں اس کی ایک معمولی سی غلطی پر کتنی بری طرح گرجی برسی تھی۔

کھانے کے بعد ہم کچھ دیر لاؤنج میں بیٹھے۔ عام بچوں کی طرح ماہین کو بھی کارٹون موویز دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اکمل سے کارٹون کی ایک سی ڈی لگوائی اور دیکھتے ہوئے خوب ہنستی، قہقہے لگاتی رہی۔ اکمل ایسے موقعوں پر اس کا ساتھ دیتا تھا اور میں ان دونوں کی اس یگانگت سے اتنا گھبراتی تھی کہ میری گھبراہٹ، جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ میری اس کیفیت کو اکمل نے بھی محسوس کر لیا تھا اس لیے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس قسم کے ماحول کو زیادہ برقرار نہ رکھا کرے۔ آدھے گھنٹے بعد ہی اس نے ماہین سے کہا کہ اب باقی سی ڈی وہ دوسرے دن دیکھے اور اب جا کر سو جائے۔

میری بہ نسبت اکمل کی بات ماہین زیادہ مانتی تھی جس سے مجھے خوف محسوس ہوتا تھا اور وہ خوف بھی میری جھنجلاہٹ کا سبب بنتا تھا۔

لاؤنج سے میں ماہین کو لے کر اپنے بیڈروم میں آ گئی اور اکمل اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ ماہین کی عادت تھی کہ لیٹنے کے بعد وہ جلد ہی سو جاتی تھی چنانچہ وہ سو گئی لیکن میں جاگتی رہی۔ ایسا اب اکثر ہونے لگا تھا۔ میں اکمل کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ اکمل اور ماہین کی محبت نے مجھے بے حد تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر چند اپنے چھوٹے سے خوب صورت بنگلے کی میں بلاشرکت غیرے مالک تھی اور اکمل سے کہہ سکتی تھی کہ وہ میرے گھر سے چلا جائے لیکن جب بھی میں نے یہ ارادہ کیا، میرے ضمیر پر بوجھ بڑھ گیا۔

آخر اکمل باپ تھا ماہین کا......!

باپ کو اس کی بیٹی سے دور کر دینا اچھی بات نہ ہوتی، اور اب مسئلہ یہ بھی تھا کہ ماہین اس سے بہت اٹیچ ہو چکی تھی۔ وہ اکمل سے جدائی برداشت نہیں کر پاتی۔ اسے بہت صدمہ پہنچتا جس سے وہ بیمار بھی ہو سکتی تھی اور یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ اسے ذرا سی بھی تکلیف ہو۔ مجھ سے غلطی یہ

ہوئی تھی کہ میں نے یہ قدم سال بھر پہلے نہیں اٹھایا تھا' لیکن کبھی کبھی میں سوچتی تھی کہ سال بھر پہلے بھی یہ اقدام میرے لیے مشکل ہوتا۔ اس ایک سال میں اکمل سے ماہین کی محبت بہت بڑھ گئی تھی لیکن سال بھر پہلے بھی ان دونوں کی انسیت کچھ کم نہیں تھی۔ ماہین کو صدمہ اس وقت بھی ہوتا اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ پاتی۔

دوسری صبح ماہین جب اسکول چلی گئی تو مجھے نازلی سے ملنے کا خیال آیا۔ جب بھی میرا دماغ زیادہ بوجھل ہوتا تھا' میں اسی سے ملنے چلی جاتی تھی۔ اس کا گھر زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ مشکل سے دس منٹ کی ڈرائیو تھی اور پھر مجھے یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھر پر نہیں ہوگی۔ وہ ڈاکٹر تھی لیکن دو سال پہلے اس نے کسی وجہ سے اپنا کلینک بند کر دیا تھا۔ وجہ کیا تھی؟ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ نہ نازلی نے بتایا تھا' نہ میں نے اس سے پوچھنے کی ضرورت سمجھی تھی۔ بس اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ ماں بننے کے بعد اس نے کلینک چلانے میں دشواری محسوس کی ہوگی۔ اس کے لیے کوئی مالی مسئلہ تو رہا نہیں تھا۔ اس کے شوہر ایک پرائیویٹ ادارے میں شراکت دار تھے جس سے اچھی آمدنی ہوتی تھی۔

جب میں اس کے گھر پہنچی تو میری توقع کے مطابق وہ موجود تھی۔ اس نے ملازم سے چائے بنانے کے لیے کہا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑی تھیں لیکن جلد ہی اس نے مجھے ٹوک دیا۔

''تم مجھ سے بات کرنے آئی ہو اکمل کے بارے میں اور چھیڑ دی ہیں دوسری باتیں۔''

میں نے ایک طویل سانس لی ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو نازلی۔ دراصل اب تم سے اکمل کی بات کرتے ہوئے مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہونے لگی ہے۔ تم آخر سوچتی تو ہوگی کہ میں جب بھی تم سے ملتی ہوں' یہی مسئلہ لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔''

''بے شک! میں اس سے انکار تو نہیں کروں گی۔ یہ خیال آتا تو ہے مجھے لیکن مجھے تمہاری مجبوری کا بھی احساس ہے۔ اکمل کے بارے میں کوئی بات تم صرف مجھ سے ہی کر سکتی ہو۔ اپنے اس راز میں کسی اور کو شریک نہیں کر سکتیں۔

اس موضوع پر ہماری بات ذرا دیر کے لیے رک گئی کیونکہ ملازم چائے لے کر آ گیا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو نازلی چائے بنانے لگی اور میں نے کہا۔

''میں سوچ رہی ہوں نازلی کہ یہ گھر چھوڑ دوں' کسی دور دراز علاقے میں کوئی اور مکان لے لوں...... یا پھر یہ شہر ہی چھوڑ کر چلی جاؤں۔''

''کوئی نئی بات ہو گئی کیا؟''

''بات تو پرانی ہی ہے۔ میرے اور اکمل کے ساتھ رہنے پر آس پاس کے لوگ سرگوشیاں تو شروع ہی میں کرنے لگے تھے لیکن اب بات سرگوشیوں سے آگے بڑھ گئی ہے۔ جملے بازیاں میرے کانوں تک پہنچنے لگی ہیں۔''

نازلی نے متفکر انداز میں سر ہلاتے ہوئے چائے کی پیالی مجھے دی اور کہا ''یہ اندیشہ تو میں نے شروع ہی میں ظاہر کر دیا تھا فرزانہ...... ابتدا میں لوگ سرگوشیاں ہی کرتے ہیں اور جوابی ردِعمل سامنے نہیں آتا تو ان کی ہمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔''

''میں کبھی رہی بھی تو نہیں اس پوزیشن میں کہ جوابی ردِعمل کا اظہار کرتی۔''

''وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ یہ سب کچھ ہوگا۔''

''اسی لیے میں گھر بدلنا چاہتی ہوں۔''

''تم نے شاید صرف گھر بدلنے کے بارے میں سوچ لیا ہے' اس سے زیادہ نہیں سوچا۔''

''اس سے زیادہ......؟ کیا مطلب......؟''

''تم یہاں سے کہیں اور جا کے رہو گی تو کیا اکمل نہیں ہوگا تمہارے ساتھ؟''

''وہ تو ہوگا' اور اس کی وجہ تم جانتی ہو۔''

''تو پھر کیا فائدہ ہوگا گھر بدلنے سے؟ تم جہاں بھی جاؤ گی' لوگوں کا یہ سوال تو سامنے آئے گا کہ اکمل تمہارا کون ہے' وہ کیوں رہتا ہے تمہارے ساتھ؟ ہم مغربی معاشرے میں تو رہتے نہیں ہیں کہ تم دوست کہہ کر بات ختم کر دو۔''

میں چپ رہ گئی۔ میرے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ نازلی نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ میں نے صرف گھر بدلنے کی بات سوچی تھی' یہ خیال مجھے نہیں آیا تھا کہ اکمل کی وجہ سے لوگوں کی جملے بازیوں کا سامنا تو مجھے ہر جگہ کرنا پڑے گا۔

میں نظریں جھکائے خاموشی سے چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

''اس مسئلے کا حل صرف ایک ہے فرزانہ' صرف ایک!'' نازلی نے کہا۔

''وہی پرانی بات!'' میں پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''ان حالات میں وہی ایک مشورہ دیا جا سکتا ہے تمہیں...... اور میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی تمہیں کوئی اور مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔''

''میرا دل نہیں مانتا نازلی!''

''میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ دل کی بات نہیں ہے۔''

میں نے حیرت سے نازلی کی طرف دیکھا ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''بس خیال ہے یہ میرا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم خوف زدہ ہو...... ٹھہرو! پہلے مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔ ہوسکتا ہے کہ شعوری طور پر تم خوف زدہ نہ ہو لیکن تمہارے لاشعور میں ضرور ہے یہ خوف کہ تمہارا راز نہ کھل جائے۔''

میں نے ایک طویل سانس لی ''تم لاشعور بیچ میں لے آئیں تو اب میں کیا بحث کروں۔''

''بحث نہ کرو' بس یہ سوچو کہ تمہارے اس اقدام کے بعد وہ راز کھل بھی گیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''فرق پڑ تو سکتا ہے نازلی۔'' میرے لہجے میں تشویش تھی۔

''مجھے تو یقین ہے کہ پھر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں اگر تم نے میرے مشورے پر عمل نہ کیا اور تمہارا راز کھل گیا تو فرق پڑ سکتا ہے۔''

نازلی کی اس بات نے مجھے خوف زدہ کردیا۔ میں ہنس پڑی' لیکن میری ہنسی میں بھی خوف تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا ''تم مجھے ڈرا رہی ہو نازلی۔''

''اگر تم میری اس بات سے ڈر گئیں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے۔ خود تمہارے ذہن میں بھی ہے یہ خیال۔''

مجھے ایک بار پھر خاموش ہوجانا پڑا۔ نازلی کی یہ بات بھی غلط نہیں تھی۔

اس دن نازلی ایسی ہی باتیں کرتی رہی کہ میرے دل و دماغ کا بوجھ اور بڑھ گیا اور ان باتوں میں مجھے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوسکا۔ وہ تو نازلی ہی نے مجھے چونکایا ''کیا آج ماہین کو لینے نہیں جاؤ گی؟''

میں نے گھڑی دیکھی' ''اوہ' گاڈ......!'' میرے منہ سے نکلا اور میں جلدی سے کھڑی ہوگئی' ''اچھا ہوا تم نے بروقت یاد دلا دیا۔ مجھے تو وقت کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔''

میں فوراً نازلی کے گھر سے روانہ ہوگئی۔

یہ معمول تھا کہ ماہین کو لینے کے لیے تو اسکول کی بس آتی تھی لیکن اسے اسکول سے لینے میں ہی جایا کرتی تھی۔

اس دن میں نے خلافِ معمول زیادہ تیز ڈرائیونگ کی۔ حالانکہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن نازلی کے اچانک خیال دلانے کی وجہ سے شاید میرے اعصاب پر یہ خیال سوار ہوگیا تھا کہ مجھے دیر ہوگئی تھی۔

تیز ڈرائیونگ کی وجہ سے میں جلد ہی ماہین کے اسکول پہنچ گئی۔ چھٹی ہونے میں اس وقت دس منٹ باقی تھے۔ میں نے اپنی کار ایک طرف کھڑی کی۔ بوریت کے دس منٹ تو گزارنا ہی تھے۔

یکایک میں چونک پڑی۔ میں نے کچھ فاصلے پر اکمل کو دیکھا تھا اور غالباً اس نے بھی میری کار یا مجھے دیکھ لیا تھا اور خود کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ ماہین کے اسکول کے پاس دیکھا تھا اور ذہن میں کچھ ایسے خیالات آئے تھے کہ مجھے اکمل پر شدید غصہ آ گیا تھا۔ میں کار سے اتر پڑی۔ میں وہیں اسی وقت اکمل سے نہ جانے کیا کچھ کہہ بیٹھتی لیکن اکمل غائب ہوگیا اور شاید اچھا ہی ہوا۔ سربازار میری گرما گرمی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی اور اچھا خاصا تماشا بن جاتا۔

اسکول کی چھٹی ہوئی اور بچے باہر آ کے ان کاروں کی طرف دوڑ پڑے جو انہیں لینے آئی تھیں۔ اسی طرح ماہین بھی دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور اسے کار میں بٹھانے سے پہلے میں نے اسے بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ میرا یہ ردِّعمل میرے ان خیالات کی وجہ سے تھا جو اکمل کو وہاں دیکھ کر میرے دماغ میں چکرائے تھے۔

میں ماہین کو لے کر روانہ ہوئی اور سوچتی رہی کہ آج میں اکمل سے کس طرح پیش آؤں۔

اکمل کسی اچھی جگہ ملازمت کرتا تھا لیکن میں نے یہ جاننے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تھی کہ وہ کہاں کام کرتا تھا البتہ اس کی ملازمت کے سلسلے میں یہ الجھن مجھے ہمیشہ لاحق رہی تھی کہ اس کی چھٹی دوپہر کو کیوں ہوجاتی تھی۔ میں جب ماہین کو لے کر گھر پہنچتی تھی تو وہ بھی گھر پہنچ چکا ہوتا تھا۔ میں' وہ اور ماہین ساتھ ہی لنچ کیا کرتے تھے۔

اس دن بھی جب میں گھر پہنچی تو وہ موجود تھا۔ ماہین اس سے لپٹ گئی اور وہ اسے پیار کرنے لگا لیکن مجھ سے نظریں چراتا رہا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ میں اسے ماہین کے اسکول کے پاس دیکھ چکی تھی۔

معمول کے مطابق لنچ ہم نے ساتھ ہی کیا اور اکمل بدستور مجھ سے آنکھیں چراتا رہا۔ لنچ کے بعد میں ماہین کو بیڈ روم میں لے گئی۔ ماہین اس وقت ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے سوجایا کرتی تھی۔ جب وہ سوگئی تو میں کمرے سے نکلی۔ میں خاصے غصے میں تھی۔ میں نے اکمل کے بیڈ روم کے دروازے پر جا کے دستک دی۔

اندر سے اکمل کی آواز آئی ''کون......؟''

''میں ہوں۔'' میری آواز میں غصے کی لرزش تھی۔
کمرے میں قدموں کی آہٹ ہوئی جو دروازے کی طرف آرہی تھی پھر دروازہ کھل گیا۔ اکمل میرے سامنے کھڑا تھا۔
''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔ ڈرائنگ روم میں آیئے؟'' میں نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر مڑ گئی۔ میرے قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں جا کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور چند لمحے بعد اکمل کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر میں نے نظریں دوسری طرف پھیرلیں۔
اکمل قریب آ کر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ میں اسے گھورنے لگی اور پھر چند لمحے بعد بولی ''میں آپ کی اس حرکت کا مقصد پوچھ سکتی ہوں۔'' میرے لہجے میں بہت تلخی تھی۔
اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا' کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ سکا اور نظریں پھر جھکالیں۔
''آپ وہاں روزانہ جاتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔
وہ خاموش رہا اور اس کی نظریں جھکی رہیں۔
میں پھر بولی' اور اس مرتبہ میرے لہجے میں پہلے سے زیادہ تیزی تھی ''آپ کی خاموشی کا مطلب یہ اعتراف ہے کہ میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں' آپ وہاں روز جاتے ہیں اور اس کا مقصد ایک ہی ہوسکتا ہے۔ آپ کی خواہش ہے کہ میں کبھی وہاں دیر سے پہنچوں اور آپ کو میری عدم موجودگی میں بھی ماہین سے ملنے کا موقع مل جائے۔''
''نہیں۔'' اس نے بے تابانہ نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا ''ایسی کوئی بات نہیں ہے فرزانہ۔ آپ غلط سوچ رہی ہیں۔''
''پھر آپ وہاں کیوں جاتے ہیں۔''
قدرے رک کر اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا ''بس ایک خوف مجھے وہاں لے جاتا ہے۔''
''خوف؟''
''جی ہاں...... خوف...... پتا نہیں کیوں' مجھے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ آپ کو کہیں کسی دن وہاں پہنچنے میں دیر نہ ہوجائے اور ماہین کو پریشان ہونا پڑے۔ یہ یقین تو آپ کو بہرحال ہوگا کہ میں ماہین سے بہت محبت کرتا ہوں۔''
''دراصل آپ کچھ اور چاہتے ہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا ''ماہین سے تنہائی میں مل کر آپ اسے میرے خلاف ورغلانا چاہتے ہیں۔''
اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ''یہ...... یہ آپ کس طرح سوچ رہی ہیں فرزانہ؟''
''میں بالکل ٹھیک سوچ رہی ہوں۔''
''بخدا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ آپ کی ممتا پر کبھی کوئی آنچ آئے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ماہین کو آپ کتنی شدت سے چاہتی ہیں۔ اس کے لیے آپ کی تڑپ کا مجھے خوب اندازہ ہے۔''
''میں اس معاملے میں کوئی بھی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ بس خیال رکھیے گا کہ آئندہ آپ ماہین کے اسکول کا رخ نہیں کریں گے۔''
وہ میرا منہ تکتا رہ گیا۔ میں اسے گھورتی رہی' پھر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ میں سیدھی اپنے بیڈروم میں پہنچی۔ ماہین بے خبر سو رہی تھی۔ میں اس پر جھک گئی۔ میں اس وقت شدید جذباتی ہورہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے اور میں ماہین کی پیشانی چوم کر بڑبڑائی تھی ''تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا ماہین۔ کوئی نہیں چھین سکتا۔ کوئی نہیں۔''
میں ماہین کے قریب لیٹ کر اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو خشک کرنے لگی تھی' اور گزرے ہوئے وقت کی کتاب کے اوراق میرے دماغ میں پھڑپھڑانے لگے تھے۔ میں جب بھی تنہائی میں کچھ جذباتی ہوا کرتی تھی تو ماضی کے واقعات میرے دماغ میں ضرور چکرانے لگتے تھے۔ کوئی نہ کوئی واقعہ میرے سامنے اس طرح آجاتا تھا جیسے وقت اپنے آپ کو دہرا رہا ہو۔

☆☆☆

جمشید سے میری شادی ''لو میرج'' تھی یا نہیں؟
اس سوال کا جواب ''ہاں'' میں بھی دیا جاسکتا ہے اور ''نا'' میں بھی۔ اس کا اثباتی جواب اس لیے ہے کہ جمشید نے مجھے دیکھا تھا اور مجھے بے تحاشا پسند کرنے لگے تھے اور پھر وہی پسندیدگی ''محبت'' اور پھر ''شدید محبت'' میں بدل گئی تھی جبکہ میں نے انہیں شادی سے پہلے صرف ایک بار دیکھا تھا جب وہ میرا رشتہ لے کر میرے گھر آئے تھے۔
میں ان دنوں اپنے والدین کے ساتھ حیدرآباد میں رہا کرتی تھی۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ والد ایک معمولی سی ملازمت کرتے تھے مگر انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو' یعنی مجھے بہتر سے بہتر تعلیم دلانے کی کوشش کی تھی۔ میں ان دنوں بی اے کے پہلے سال کی طالبہ تھی جب میرے لیے جمشید کا رشتہ آیا۔
جمشید کو ایک ''سیلف میڈ'' انسان کہا جائے تو غلط نہیں

ہوگا۔ بہت کم عمری میں ان کا کوئی سرپرست نہیں رہا تھا۔ انہوں نے ملازمتیں کی تھیں اور اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا اور ان دنوں وہ کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ تعلیم مکمل ہونے میں دو سال کا عرصہ باقی تھا جب انہیں کسی وجہ سے حیدرآباد جانا پڑا اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ مجھ پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ میرا تعاقب کرکے انہوں نے میرا گھر بھی دیکھ لیا اور طے کر بیٹھے کہ اپنی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی مجھ سے شادی کرلیں گے۔

یہ شادی جمشید کے ایک دوست اور اس کے والد کی وجہ سے طے ہوسکی۔

گوکہ اس وقت جمشید کی مالی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی لیکن میرے والد کے لیے یہ بہت خوشی کی بات تھی کہ ان کا ہونے والا داماد کچھ عرصے بعد ڈاکٹر بن جاتا۔

اس وقت میری تعلیم بھی نامکمل تھی لیکن میری والدہ شدید علیل تھیں۔ ان کے زندہ رہنے کا امکان تقریباً ختم ہوچکا تھا اس لیے میرے والد نے فیصلہ کیا کہ میری شادی ان کی زندگی ہی میں ہوجائے۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ ہر غریب گھر کی لڑکی اپنی محرومیوں کا ازالہ چاہنے کے لیے اپنے خوابوں میں کسی شہزادے کو بسائے رکھتی ہے لیکن میرے ساتھ ایسا ہی تھا اور چونکہ میں خوب صورت بھی تھی اس لیے مجھے یقین سا تھا کہ ایک دن کوئی شہزادہ آئے گا اور مجھے بیاہ لے جائے گا۔

جمشید سے شادی ہوئی تو میرا وہ خواب بکھر گیا۔ میں ان کی بیوی بنی تو کراچی آکر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں بس گئی جو میرے گھر سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھا۔ بس صرف یہ ایک آس رہ گئی تھی کہ جمشید ڈاکٹر بن جائیں گے تو میری زندگی میں وہ انقلاب آجائے گا جس کی مجھے تمنا تھی۔

''پارٹ ٹائم جاب'' کرکے میڈیکل کے اخراجات پورے کرنا ہی آسان نہیں ہوتا لیکن جمشید شادی بھی کر بیٹھے تھے۔ پارٹ ٹائم جاب پر ایک اور فرد کا بھی بوجھ بڑھ جائے تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے' اس کا اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہیں۔ میں ان حالات میں بہت چڑچڑی ہوجاتی لیکن جمشید کی محبت نے مجھے بہت سہارا دیا۔

وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتے تھے اور ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ کہانیوں کی یہ بات سچ کر دکھائیں کہ میرے لیے آسمان کے تارے توڑ لائیں۔

جمشید کی محبت کے باعث مجھے سہارا تو ملا لیکن ان کی ''دوراندیشی'' کی وجہ سے مجھے ایک اور دھچکا لگ گیا۔ جمشید چاہتے تھے کہ جب تک وہ ڈاکٹر بن کر اپنی مالی پوزیشن مستحکم نہ کرلیں' میں ماں نہ بنوں...... لیکن میں جس طرح شہزادوں کے خواب دیکھا کرتی تھی' اسی طرح میری یہ خواہش بھی تھی کہ شادی کے بعد میں جلد از جلد ماں بن جاؤں۔ بچے مجھے ہمیشہ ہی سے بہت پیارے لگتے تھے۔

حالات کو دیکھتے ہوئے جمشید کی دوراندیشی بہت اچھی بات تھی لیکن میں حالات سے سمجھوتا کرنے پر خود کو آمادہ نہ کرسکی۔ بس یہ فیصلہ کیا میں نے کہ میں بھی ملازمت کرلوں اور ماں بننے تک اپنی تنخواہ کی ایک ایک پائی پس انداز کرتی رہوں۔

بیوی اگر محبوبہ بھی ہو تو کوئی شوہر اس کی بات نہیں ٹال سکتا لہٰذا جمشید بھی میری بات مان گئے لیکن انہوں نے یہ ضرور کہا کہ اس زمانے میں ملازمت ملنا آسان نہیں ہوتا۔

''لگن سچی ہو تو سب آسان ہوجاتا ہے۔'' میں نے کہا تھا۔

لیکن یہ ''کتابی بات'' ہر معاملے میں کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ وہ تو اتفاق سے جمشید کا ایک دوست کام آگیا۔ وہ جمشید کے ساتھ پڑھتا تھا اور ایک دولت مند باپ کا بیٹا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے اس کے باپ کی کمپنی میں ملازمت مل گئی لیکن چونکہ میں نے بی اے بھی نہیں کیا تھا اس لیے مجھے کسی اچھی تنخواہ کی ملازمت نہیں ملی۔ میں نے اسی کو غنیمت جانا کیونکہ اسی کی وجہ سے جمشید نے اپنی یہ دوراندیشی فراموش کردی تھی کہ مجھے ابھی ماں نہیں بننا چاہیے۔

پھر ایک سال گزر گیا لیکن میرے ماں بننے کا کوئی امکان نظر نہیں آیا۔ مجھے تشویش ہوگئی۔ میں سوچنے لگی کہ شاید میں ماں نہیں بن سکتی یا جمشید میں باپ بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ میں نے اس موقع پر ضروری سمجھا کہ ہم دونوں اپنا میڈیکل چیک اپ کروائیں۔

جمشید نے میری اس سوچ کو ہنسی میں اڑا دینا چاہا ''کمال کرتی ہو تم بھی۔'' انہوں نے کہا تھا ''شادی کے صرف ایک سال بعد اتنی مایوسی اچھا خاصا پاگل پن ہے۔''

''پاگل پن ہی سہی لیکن چیک اپ تو کروانا پڑے گا۔'' میں اڑ گئی۔

جمشید کو یہاں بھی میرے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ہم نے اپنا چیک اپ کروایا۔ رپورٹس آئیں اور ان سے جو دھچکا مجھے لگا' اس سے زیادہ جمشید کو لگا۔ رپورٹس کے مطابق مجھ میں کوئی ''خامی'' نہیں تھی لیکن جمشید میں باپ بننے کی صلاحیت نہیں تھی۔ انہیں اپنا علاج کرانے کی ضرورت تھی اور غلط یا صحیح'

مجھے ڈاکٹروں کی بات سے یہ شبہ ہوا تھا کہ جمشید کے علاج کے سلسلے میں وہ کچھ پرامید نہیں تھے۔

اسے میں نے اپنی زندگی کا ایک اور المیہ سمجھا۔ میں اتنی جھنجلائی کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی۔

''کیوں سر کھپاؤں میں اپنا۔'' میں نے چیخ کر جمشید سے کہا تھا ''جب وہ نہیں ہوسکتا جو میں چاہتی تھی تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے بسوں میں دھکے کھانے کی۔''

وہ پہلا موقع تھا جب جمشید جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکے۔ کیونکہ نگیٹیو رپورٹ ان کی تھی اس لیے وہ چور سے بن گئے۔

وہ مجھ سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ان کی دل جوئی کرتی' انہیں سنبھالا دینے کی کوشش کرتی لیکن میں نے اس کے خلاف کیا جس سے جمشید بہت پژمردہ ہوئے۔ مجھے اس وقت کم از کم یہی سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی اس ذہنی کیفیت کا اثر ان کی تعلیم پر بھی پڑسکتا ہے لیکن میں نے کچھ بھی نہیں سوچا اور تنہائیوں میں اپنی ''بدنصیبوں'' پر آنسو بہانے لگی۔

ایک آدھ مہینہ اس طرح گزرا اور پھر میں نے صبر کرلیا کہ ماں بننا میرے مقدر میں نہیں۔

''لیکن زندگی تو ڈھنگ سے بسر ہوجائے۔'' میں نے جمشید سے کہا ''یہ دو چھوٹے چھوٹے کمرے...... یہ تو کا بک ہیں جن میں میرا دم گھٹتا ہے۔''

اس وقت جمشید کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ مجھ سے پوچھ سکتا تھا کہ اپنی پچھلی زندگی تم نے کس محل میں گزاری ہے' لیکن جمشید نے مجھ پر طنز کا یہ تیر نہیں برسایا بلکہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی ''چند مہینے رہ گئے ہیں فرزانہ۔ میرا رزلٹ تمہارے لیے خوشیوں کا پیغامبر ہوگا پھر کچھ عرصہ ہاؤس جاب کرنے کے بعد میری زندگی میں جو تبدیلی آئے گی' میں اس کا ایک ایک لمحہ تمہارے قدموں میں نچھاور کردوں گا۔ مجھے اب تمہارے لیے ہی جینا ہے فرزانہ...... میری زندگی' میرا سب کچھ ہو تم!''

مگر ان محبت بھری باتوں نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ میں اداس رہنے لگی۔ مایوسی کا غلبہ بڑھنے لگا۔ مجھے بار بار یہ خیال بھی آنے لگا کہ شاید جمشید فیل ہوجائیں گے اور میری زندگی اندھیروں میں رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑوں ہی کی طرح گزرے گی۔

بہت کم دنوں میں میری مایوسی اتنی بڑھی کہ میں نے خودکشی کا فیصلہ کرلیا۔ میں اپنی باقی زندگی اس طرح گزارنے کے لیے تیار نہیں تھی جیسی زندگی اپنے والدین کے گھر میں گزار چکی تھی۔ میں نے مختلف میڈیکل اسٹورز سے خواب آور گولیاں خرید کر جمع کیں۔ میری ذہنی کیفیت کچھ عجیب ہی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ خودکشی سے پہلے جمشید کے نام جو خط لکھوں گی' اس میں انہیں جی بھر کے برا بھلا کہوں گی لیکن جب کچھ لکھنے کا وقت آیا تو میری کیفیت بدل گئی۔ شاید ایسا ہی ہوتا ہے کہ انسان جب خود کو زندگی کے آخری لمحوں میں سمجھ لے تو وہ جذباتی ہوجاتا ہے' کچھ سچائیاں بھی اسے دکھائی دینے لگتی ہیں اور ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ جمشید کی محبت کا مجھے شدت سے احساس ہوا۔ میں پھوٹ پھوٹ کے رودی لیکن خودکشی کرنے کے سلسلے میں میرا فیصلہ اٹل رہا۔ جب میرے آنسو تھمے تو میں خط لکھنے بیٹھی۔ وہ خط میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ میں نے اس میں لکھا۔

ڈیئر جمشید......! آپ بہت اچھے ہیں' بہت ہی اچھے لیکن یہ احساس مجھے اس وقت ہو رہا ہے جب میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن سکتی ہوں۔ اس وقت مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میری موت سے آپ بہت دکھی ہوں گے لیکن میں بس یہی کہہ سکتی ہوں کہ مجھے معاف کردیجیے گا۔ آپ کی محبت کا شدید احساس ہو رہا ہے مجھے لیکن میں اب بالکل بکھر چکی ہوں۔ زندہ رہنے کی خواہش دم توڑ چکی ہے۔ اپنے خوابوں پر میں اب اور ماتم نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے کہ میں اگر ماں بن جاتی تو زندگی سے ناتا توڑنا میرے لیے محال ہوتا لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کروں۔ اسی لیے قدرت نے میرے ماں بننے کا امکان بھی نہیں رہنے دیا۔ اب اور کیا لکھوں' بس اب جارہی ہوں۔ آپ سے بہت کڑوی باتیں کرتی رہی ہوں میں۔ ہوسکے تو مجھے معاف کردیجیے گا۔ میں اپنے مزاج سے یا اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ میں اس طرح سسک سسک کر اپنی باقی زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس سے بہتر ہے کہ میں موت کی آغوش میں چلی جاؤں۔

بدنصیب' فرزانہ!

یہ خط لکھ کر میں نے ایک ایسی جگہ رکھا کہ جمشید آئیں تو ان کی نظر اس پر فوراً پڑ جائے۔ اس کے بعد میں نے پانی سے وہ ساری خواب آور گولیاں کھالیں جو میں نے جمع کی تھیں۔ اس کے بعد میں بستر پر لیٹ گئی۔ اس وقت جمشید کو کالج گئے' صرف آدھا گھنٹا گزرا تھا اس لیے میں سمجھ رہی تھی کہ جب تک وہ کالج سے لوٹیں گے' میرا قصہ ختم ہوچکا ہوگا۔

جلد ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں جذبات سے لرزتی آواز میں بڑبڑائی ''خدا حافظ جمشید...... خدا حافظ......!''

مگر انسان اپنی مرضی سے شاید کبھی نہیں مر سکتا۔ اس دن شہر میں اچانک کوئی ایسا بڑا ہنگامہ ہوا تھا کہ اسکول اور کالج وغیرہ کھل ہی نہیں سکے تھے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ جمشید ایک گھنٹے بعد ہی گھر لوٹ آئے تھے۔ میں اس وقت گہری نیند میں جا چکی تھی۔ جمشید میری حالت دیکھ کر بالکل نہیں گھبرائے۔ فوری طور پر انہوں نے یہ سمجھا کہ مجھے اتفاق سے بے وقت نیند آ گئی ہے۔ حقیقت کا علم تو انہیں خط پڑھ کر ہوا جو میں نے رکھا ہی ایسی جگہ تھا کہ وہ اسے فوراً دیکھ لیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ میں آج بھی زندہ ہوں۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک کلینک میں تھی۔ اس کلینک کے ڈاکٹر سے جمشید کی دوستی کب اور کن حالات میں ہوئی تھی، وہ میں بعد میں بیان کروں گی۔ اسی دوستی کی وجہ سے جمشید مجھے اس کلینک میں لے گئے تھے۔ اگر وہ مجھے کہیں اور لے جاتے تو مجھ پر پولیس کیس بن سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے فوری طور پر میرے معدے کی صفائی کر ڈالی تھی اور مجھے ڈرپ لگا دی تھی جس میں شاید کسی قسم کی دوائیں بھی شامل ہوں۔

اپنی ''نئی زندگی'' میں، میں نے سب سے پہلے جمشید کو دیکھا جو میرے شانے پر سر رکھے ہوئے زار و قطار رو رہے تھے۔

شام تک میں اس قابل ہو چکی تھی کہ جمشید مجھے گھر لے آئے۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں زندہ ہوں اور جمشید میرے لیے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑ بڑا رہے تھے ''نہیں فرزانہ...... ہرگز نہیں...... تمہیں میرے لیے زندہ رہنا ہے اور اب تم کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی نہیں گزارو گی۔ مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، میں اب تمہیں وہی زندگی دوں گا جو تم گزارنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں ہر آسائش مہیا کروں گا۔''

میں اس وقت قیاس بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جمشید کیا سوچ رہے تھے۔ میں نے ان کی باتوں کو پاگل پن کی بڑبڑاہٹ سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

جمشید اس خیال سے خوف زدہ تھے کہ میں دوبارہ خودکشی کی کوشش نہ کر بیٹھوں۔ رات کو وہ بہت دیر تک جاگتے رہے۔ وہ شدید جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ مجھ سے قسمیں لیتے رہے کہ میں اب اپنی زندگی سے کھیلنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ ادھر مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ انسان اپنی مرضی سے نہیں مر سکتا۔ لہٰذا میں دوسری کوشش کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے قسمیں کھا کر انہیں اطمینان بھی دلا دیا ورنہ دوسرے دن شاید وہ کالج بھی نہیں جاتے۔ انہیں یہ ڈر لگا رہتا کہ میں تنہائی میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔

جمشید کی کالج سے واپسی تک میں نے وقت اس طرح گزارا کہ زیادہ تر سکتے کی سی حالت میں بیٹھی، دیوار یا چھت کو تکتی رہی۔ مجھے خواب سا لگ رہا تھا کہ ایک دن پہلے میں خودکشی کی کوشش کر چکی تھی۔

جمشید جب آئے تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھے زندہ دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے قسمیں کھانے کے باوجود ان کا وہ دن شدید گھبراہٹ میں گزرا تھا۔ انہوں نے کہا۔

''کل ہفتہ ہے۔ حیدر آباد چلے چلتے ہیں۔ اتوار کی شام کو آ جائیں گے۔ ذرا دل بہل جائے گا تمہارا۔''

لیکن میں نے ان کی تجویز میں دلچسپی نہیں لی۔ شادی کے بعد میں اپنے گھر والوں سے ملنے دو چار بار ہی گئی تھی۔ میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ ان سے ملنے کو۔ کبھی کبھی تو میرے دماغ میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ میرے والدین سوتیلے تھے جنہوں نے میری شادی کر کے مجھے جہنم میں جھونک دیا تھا، اور وہ بھی میری اس کیفیت کو بھانپ گئے تھے اس لیے صرف دو مرتبہ ہی مجھے دیکھنے کراچی آئے تھے۔ میری شادی کے وقت میری والدہ اتنی علیل تھیں کہ ان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں رہا تھا لیکن شادی کے چند ماہ بعد ہی ان کی طبیعت سنبھلتی چلی گئی تھی اور اب تو وہ بالکل ٹھیک تھیں۔

ایک مرتبہ میں اپنی والدہ سے بڑے تلخ لہجے میں یہ تک کہہ چکی تھی کہ وہ بیمار ہوئی ہی اس لیے تھیں کہ اس بہانے میرے بوجھ سے نجات پا لیں، اور میری والدہ اس بات پر میرا منہ تکتی رہ گئی تھیں۔

دن گزرتے رہے۔ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور مجھے کسی تبدیلی کی توقع تھی بھی نہیں۔ میری خودکشی کی کوشش والے دن جمشید جو کچھ کہتے رہے تھے اسے میں نے شروع ہی میں ''پاگل کی بڑ'' سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن ایک ماہ بعد میں اس وقت دم بخود رہ گئی جب جمشید نے ہزار ہزار کے دس نوٹ میرے قدموں میں ڈال دیے۔ وہ اس وقت اتنے خوش نظر آ رہے تھے جیسے انہوں نے ساری دنیا کے پھول جمع کر کے میرے قدموں میں ڈال دیے ہوں۔

''یہ...... یہ کہاں سے آئے؟'' میں اٹک اٹک کر بولی۔

''چوری کی، ڈاکا ڈالا، قتل کیا، کچھ بھی کیا، وعدہ تو پورا کر دیا اپنا۔'' جمشید کا انداز ایسا تھا جیسے خوشی سے جھوم رہے ہوں۔

''پلیز..... ٹھیک ٹھیک بتایئے جمشید!'' میں نے کہا۔
وہ اس طرح اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے جیسے مجھے ٹالنے میں انہیں مزہ آرہا ہو لیکن جیسے ہی انہیں شک ہوا کہ اب میرا موڈ خراب ہو جائے گا' وہ سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تین دوستوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک کاروبار شروع کیا تھا اور غالباً میری خوش قسمتی سے پہلے ہی مہینے میں اتنا فائدہ ہوا کہ ہر پارٹنر کے حصے میں دس دس ہزار روپے آئے تھے۔

اس معاملے میں نازلی بھی ان کے ساتھ تھی جو بعد میں میری دوست بن گئی۔ اصولاً تو مجھے ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن ہزار ہزار کے دس نوٹوں کی مہک شاید اتنی تیز تھی جس نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ شاید وہ صلاحیت سلب ہوتی ہی چلی گئی۔ جمشید کالج سے آ کر ایک گھنٹے بعد ہی چلے جاتے تھے اور پھر ان کی واپسی گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی لیکن ان کی اس مصروفیت کے نتیجے میں روپے کی بارش بڑھتی ہی چلی گئی۔ دوسرے ہی مہینے میں انہوں نے ایک صاف ستھرا' تین کمروں کا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ جمشید کالج جاتے تو میں شاپنگ کے لیے نکل جاتی۔ صرف ایک سال بعد ہم ایک چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہو گئے۔ جمشید نے میرے لیے ایک چھوٹی سی کار بھی خرید لی اور مجھے ڈرائیونگ سکھا کر لائسنس بھی دلوا دیا۔ وہ خود بس سے ہی کالج جاتے رہے۔ ساری ''خوشیاں'' وہ صرف میرے لیے جمع کر رہے تھے۔
امتحانات ہوئے تو انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی جس کے بعد ہاؤس جاب کا مرحلہ آ گیا۔
''اس کے بعد میں اپنا کلینک کھول لوں گا فرزانہ۔''
ایک دن شاپنگ کر کے گھر لوٹتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا ''یہ سب کچھ تمہاری محبت کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ میں تو ڈاکٹر بننے تک سوچتا بھی نہیں کہ اس شہر میں روپیا کمانے کے مواقع بہت آسانی سے مل جاتے ہیں اور اگر آدمی ہوشیاری سے کام کرے تو بے تحاشا بھی کما سکتا ہے۔''
میں تو ایک آسودہ زندگی کے نشے میں سرشار تھی۔ میں نے اس وقت بھی ان سے نہیں پوچھا کہ بے تحاشا روپیا کمانے کے لیے انہوں نے کیا کاروبار کیا ہے۔ میں اس وقت اسی طرح سوچتی تھی کہ روپیا کمانا مرد کا کام ہے اور... روپیا وہ کس طرح کماتا ہے' اس سے عورت کو کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔
ہاؤس جاب کے دوران بھی جمشید کی مصروفیت جاری رہی۔ وہ گیارہ بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹتے تھے۔ اب انہوں نے اپنے لیے بھی ایک کار خرید لی تھی۔
ایک رات میں ان کے انتظار میں ٹہل رہی تھی اور اس رات بارہ بجے بھی بج چکے تھے۔ وہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب آئے۔ ان کی گود میں ایک گٹھری تھی اور ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے مجھے خواب گاہ میں لے گئے اور جب بستر پر انہوں نے گٹھری کھولی تو میری سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔
وہ ایک نوزائیدہ بچی تھی۔
میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا لیکن اس وقت میرے چہرے پر یقیناً بے شمار سوالات ہوں گے جو جمشید نے پڑھ بھی لیے ہوں گے مگر انہوں نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور اشارہ کر کے بولے ''اس کا خیال رکھنا۔ میں ابھی آیا۔''
انہوں نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور باہر نکل گئے۔ ان کی واپسی بہت جلدی ہوئی۔ وہ بس اپنی کار تک گئے تھے اور اس میں سے میڈیکل باکس نکال کر لائے تھے۔
''میں نے اسے مصنوعی طور پر سلا دیا تھا تاکہ کوئی اس کے رونے کی آواز سن کر میری طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ اب مجھے اس کی دیکھ بھال میں شاید ساری رات گزارنا پڑے۔''
جمشید نے خوف سے لرزتی آواز میں مجھے بتایا اور اپنے چہرے کا پسینہ پونچھ کر میڈیکل باکس میں سے دوائیں وغیرہ نکالنے لگے۔

☆☆☆

اس رات مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جمشید نے ایک مجرمانہ کاروبار کیا تھا جس میں ان کے ساتھ ان کے کالج کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی شامل تھے۔ ان دونوں کے علاوہ شہر کا ایک ایسا ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ شامل تھا جسے پریکٹس میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس کا کلینک بمشکل ہی چل رہا تھا لیکن پہلے بھی اس نے جمشید سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنے پیشے کو کچھ غیر قانونی کاموں سے منسلک کر دے تو اس پر دولت کی بارش ہو سکتی ہے لیکن وہ کچھ بزدل آدمی تھا جو وہ کام شروع نہ کر سکا۔ میں اسے ''شریف'' اس لیے نہیں کہوں گی کہ وہ اس ناجائز کام کا خواہش مند بہرحال تھا' بس خوف کی وجہ سے وہ سب کچھ نہیں کر رہا تھا۔ جب میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی تو جمشید مجھے اسی ڈاکٹر کے کلینک میں لے گئے تھے۔
اسی ڈاکٹر کی باتوں کی روشنی میں جمشید نے اپنے کالج کے دو دوستوں سے بات کی تھی۔ ان دونوں دوستوں میں

ایک لڑکی نازلی تھی۔

ڈاکٹر نے جمشید سے جس کام کی بات کی تھی وہ کام تھا غیر قانونی ابارشن!

ملک کے اس سب سے بڑے شہر میں اس کام کی بہت گنجائش ہے۔ معاشرے کی خرابیوں نے اس کام کے لیے بہت بڑا میدان ہموار کرلیا ہے اور جب سے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے بہت ابتدا میں یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ جنم لینے والا بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی' یہ کام اور زیادہ پھیل گیا ہے۔ جو لوگ لڑکی کی پیدائش سے گھبراتے ہیں' وہ فوراً ابارشن کرا دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اس ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا کرتے تھے۔

جب جمشید نے اپنا تین رکنی گروپ بنالیا تو اس ڈاکٹر نے کمیشن پر ان کے لیے کام شروع کردیا۔ جو لوگ اس ڈاکٹر سے رابطہ کیا کرتے تھے' وہ انہیں ایک فلیٹ کا پتا بتا دیا کرتا تھا جو جمشید اور اس کے ساتھیوں نے کرائے پر لے لیا تھا۔ اسی فلیٹ کے ایک کمرے میں انہوں نے آپریشن تھیٹر بنالیا تھا لیکن جو لوگ اپنی متوقع بیٹیوں کو ختم کرانا چاہتے تھے' وہ انہیں اپنے گھر بھی بلالیا کرتے تھے۔

نازلی گائنا لوجسٹ کی حیثیت سے بھی کام کرتی تھی۔ لوگوں کے گھروں پر جاکر بچے کی پیدائش کے سلسلے میں وہ جمشید اور اس کے ساتھی سے بھی مدد لیا کرتی تھی۔

ابتدا میں ان لوگوں کا ''کام'' صرف ڈاکٹر کے بھیجے ہوئے لوگوں کی وجہ سے چلا لیکن پھر غیر قانونی ابارشن کرانے والی لڑکیوں یا ان لڑکیوں سے متعلقہ لڑکوں نے اپنے دوستوں کو بھی پتا بتانا شروع کردیا جس سے جمشید اور اس کے ساتھیوں پر روپے کی بارش ہونے لگی۔

جس رات جمشید گھبرائے ہوئے گھر آئے' اس رات نازلی انہیں ایک ڈیلیوری کیس کے سلسلے میں ایک عورت کے گھر لے گئی تھی جس کا نام شمسہ تھا اور جس کا شوہر زاہدی چند ماہ سے کینیڈا گیا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے شمسہ کو نہایت معقول رقم ماہانہ بھیجتا رہتا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ رہنے کا معقول بندوبست کرنے کے بعد وہ اپنی بیوی کو بھی کینیڈا بلالے گا۔

''ڈیلیوری کیس'' کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے لیکن جمشید وغیرہ کے لیے وہ غیر قانونی کام اس لیے تھا کہ ہاؤس جاب مکمل کرنے سے پہلے وہ پریکٹس شروع نہیں کرسکتے تھے پھر اس کام میں دوسری گڑبڑ یہ ہوئی کہ ان کی ناتجربہ کاری کے باعث کیس بگڑ گیا جس میں بچی تو پیدا ہوگئی لیکن شمسہ دنیا سے سدھار گئی۔

جمشید' نازلی اور اس کے ساتھی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ شمسہ کے گھر سے بھاگ نکلے لیکن انہیں یہ خیال ضرور آیا کہ اگر انہوں نے نوزائیدہ بچی کو وہیں بے آسرا چھوڑ دیا تو وہ بھی مر جائے گی۔ یہ احساس نازلی کو زیادہ شدت سے ہوا تھا لیکن وہ غیر شادی شدہ لڑکی تھی اس لیے بچی کو اپنے والدین کے گھر لے جاتی تو اس کے لیے جواب دہی مشکل ہوجاتی۔ اسی قسم کا کچھ مسئلہ جمشید کے دوست کے ساتھ بھی تھا لہٰذا یہ ذمے داری جمشید پر آپڑی کہ وہ اس بچی کو اپنے ساتھ لے جائے۔

یہ سب کچھ جاننے کے بعد خوف سے میری حالت غیر ہوگئی لیکن جمشید نے خود کو کسی نہ کسی طرح اس حد تک سنبھال لیا تھا کہ میری ڈھارس بندھا سکے۔

''اس وقت تمہیں میرا ساتھ دینا ہے فرزانہ!'' جمشید نے مجھ سے کہا تھا ''ہمیں کسی طرح بھی یہ معاملہ راز میں رکھنا ہے ورنہ میرا کیریئر ختم ہوجائے گا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ میں بھی پھانسی کے پھندے تک یا عمر قید ہونے کی صورت میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاؤں گا۔''

جمشید بڑی مشکل سے مجھ کو سنبھال سکے اور ہم دونوں منصوبہ بناتے رہے کہ زندگی کے اس سب سے کٹھن اور خطرناک مرحلے سے کس طرح گزرا جاسکتا ہے۔

ہمارے سامنے سب سے پہلا مسئلہ تو گھر کی ملازمہ تھی جو اس وقت تو سو رہی تھی لیکن دوسری صبح اٹھنے کے بعد اگر وہ بچی کے رونے کی آواز سن لیتی تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اس خطرے کو اس طرح ٹالا گیا کہ میں نے ملازمہ کو فجر کے وقت اٹھا کر اسے چھٹی دے دی۔ اس سے کہا یہ گیا تھا کہ میری والدہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اس لیے میں فوری طور پر حیدرآباد جارہی ہوں اور یہ مناسب نہیں ہوگا کہ وہ میری عدم موجودگی میں میرے شوہر کے ساتھ گھر میں رہے۔

ملازمہ کا گھر قریب ہی ایک غریب بستی میں تھا چنانچہ وہ چلی گئی۔ میں نے اس کی واجب تنخواہ کے علاوہ کچھ روپے اور بھی دے دیے تھے اور کہا تھا کہ جب میں حیدرآباد سے واپس آؤں گی تو اسے بلالوں گی۔

پروگرام سچ مچ یہی تھا کہ میں اس بچی کو لے کر حیدرآباد اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں اور ان پر ظاہر کروں کہ میں ہی اس بچی کی ماں ہوں۔ وہ میری اس بات پر یقین بھی کرلیتے کیونکہ میں بہت دن سے حیدرآباد نہیں گئی تھی اور وہ لوگ بھی مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ رہی یہ بات کہ اگر میں ماں بننے والی تھی تو میں نے انہیں پہلے سے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی تو یہ سوال کھڑا ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ والدین سے میرے تعلقات خوشگوار تھے ہی نہیں لہٰذا سوچا

جا سکتا تھا کہ میں نے انہیں اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔
لیکن اب ان کے پاس جانے کی وجہ یہ ظاہر کرنا تھی کہ جمشید سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔
اس سارے منصوبے کے تحت مجھے صبح کی روشنی سے پہلے حیدر آباد روانہ ہو جاتا تھا مگر عین وقت پر یہ خیال ذہن میں آیا کہ بچی نوزائیدہ تھی۔ میرے والدین یہ کیسے یقین کر لیتے کہ میں بچی کی پیدائش کے فوراً بعد کراچی سے چل پڑی تھی۔
''تمہیں کم از کم ایک ہفتے تو رکنا ہوگا۔'' جمشید نے مجھ سے کہا ''لیکن اس ایک ہفتے میں ہم ظاہر یہی کریں گے تم یہاں نہیں ہو۔ میں تمہیں یہاں لاک کر کے جایا کروں گا۔ بچی کے لیے جو ضروری اشیاء ہیں وہ میں کسی نہ کسی طرح آج ہی جمع کر دوں گا۔''
میں اس وقت بچی کو اپنی گود میں لیے ہوئے تھی اور مجھے بڑی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ طمانیت کے اس احساس کی وجہ میری یہ خواہش تھی کہ میں شادی کے بعد جلد از جلد ماں بننا چاہتی تھی لیکن قدرت کو یہ منظور ہی نہیں تھا۔
''تمہارے یہاں رہنے کی وجہ سے ضروری ہے کہ اس ملازم کو بھی چھٹی دے دی جائے جو دن میں آتا ہے۔'' جمشید نے کہا ''وہ نو بجے کے قریب آئے گا۔ اسے میں یہ کہہ کر چھٹی دے دوں گا کہ تمہاری عدم موجودگی میں مجھے کسی ملازم کی ضرورت ہی نہیں۔''
میں کسی نہ کسی حد تک خوف زدہ اس وقت بھی تھی۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ''ہم یہ ساری منصوبہ بندی تو کر رہے ہیں جمشید لیکن...... '' میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وسوسوں میں گھر گئی۔
''لیکن کیا؟'' جمشید نے بے تابی سے پوچھا۔
''کیا پولیس کو کچھ پتا نہیں چلے گا؟''
''اس بارے میں تو میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا فرزانہ۔ ہم بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ خدا ہمیں معاف فرمائے اور مجھے اس جرم کی سزا سے بچا لے۔
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ''یہ آپ کیا کر بیٹھے ہیں جمشید۔''
''میں نے جو کچھ بھی کیا فرزانہ تمہاری محبت میں کیا۔ اب کم از کم تمہیں تو ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔''
اور ادھر میں سوچ رہی تھی کہ جمشید کے بعد تو خود میں بھی کہیں کی نہ رہوں گی۔
''میں تمہارے ساتھ ہوں جمشید!'' میں نے اپنی آواز میں مضبوطی پیدا کرنی کی کوشش کی تھی۔
''تو پھر ہم ضرور اس مشکل سے نکل جائیں گے۔''
''تمہارے ساتھیوں پر کیا گزر رہی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔
''نازلی تو یقیناً بہت نروس ہوگی لیکن میرا دوست کافی باہمت ہے۔ وہ ابھی اپنے گھر نہیں گیا ہوگا۔ اسے کچھ ایسا بندوبست کرنا ہے کہ پولیس کو اس فلیٹ کا سراغ نہ مل سکے جو ہم نے کرائے پر لے رکھا تھا اور کل دن میں وہ اس فلیٹ سے وہ سارا سامان بھی نکال دے گا جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ وہاں کسی ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر بنا رکھا تھا۔''
''تم فون پر اس سے بات تو کرو۔ موبائل تو ہوگا اس کے پاس۔''
''موبائل تو ہے لیکن ہم نے احتیاطاً یہ طے کیا ہے کہ کچھ دن تک ایک دوسرے سے بالکل رابطہ نہ کریں۔''
''فون پر تو کوئی حرج نہیں ہے۔''
''حرج تو ہے فرزانہ۔'' جمشید نے زور دے کر کہا ''ہو سکتا ہے اس وقت اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو جب میں اسے فون کروں اور وہ نہ جانے کون ہو۔ میرا نمبر بھی اس کے موبائل فون پر آ جائے گا اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہم ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ اسی طرح اسے یا نازلی کو بھی مجھے فون کرتے وقت یہ اندیشہ ہو سکتا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ احتیاط کرنا چاہتے ہیں فرزانہ۔''
رات بھر تو ہم جاگے ہی تھے لیکن ملازمہ کو چھٹی دینے کے بعد بھی باتیں کرتے رہے اور صبح ہو گئی۔ بچی جاگی تو رونے لگی۔ اسے چپ کرانے کے لیے میں نے اسے تھوڑا سا شہد چٹایا اور دودھ میں تین چوتھائی پانی ملا کر اسے وہ بھی پلایا۔
نو بجے ملازم آیا تو اسے جمشید نے چھٹی دے دی۔ اس کے بعد جمشید بھی چلے گئے اور گھر باہر سے مقفل کر گئے۔
اس دن کا اخبار آ گیا تھا لیکن اس میں اس عورت کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی جس کی بچی اس وقت میری گود میں تھی۔
دراصل پولیس کو اس کا علم بہت دیر سے ہوا تھا اس لیے وہ خبر شام کے اخبارات میں آ گئی جو جمشید لیتے ہوئے آئے تھے۔ وہ بچی کے لیے دودھ اور کچھ کپڑے وغیرہ بھی خرید لائے تھے۔ جب تک وہ لوٹے نہیں تھے میرا کلیجا خوف سے کانپتا رہا تھا۔
جب دو دن گزر گئے اور کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تو ہمیں تھوڑا بہت سکون ملا۔ اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے ہمیں بس یہ

معلوم ہوتا رہا تھا کہ پولیس ان لوگوں کا سراغ لگانے میں اب تک ناکام رہی تھی جو شمسہ کی موت کے ذمے دار تھے۔ شمسہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ بھی سامنے آچکا تھا کہ شمسہ ماں بنی تھی لہٰذا پولیس کو اس بچے کی بھی تلاش تھی اور اخبارات میں یہ سوال اٹھایا جا رہا تھا کہ شمسہ کی موت کے ذمے داروں نے بچہ کیوں غائب کر دیا؟

اس سلسلے میں قیاس آرائیاں بھی ہو رہی تھیں اور میں خدا کا شکر ادا کرتی رہی تھی کہ صحیح قیاس آرائی ایک بھی نہیں تھی۔

پھر ایک ہفتہ گزر گیا تو ہمیں مزید اطمینان ہوا۔ آٹھویں دن جمشید نے نازلی اور اپنے دوست سے بھی ملاقات کی۔ دوست نے اسے بتایا تھا کہ اس نے کرائے کے فلیٹ میں کوئی ایسی چیز نہیں رہنے دی تھی جس سے ان کا سراغ لگ سکے۔ ویسے ابھی تک تو پولیس اس فلیٹ تک پہنچی بھی نہیں تھی۔

''اب وقت آگیا ہے کہ تم اس بچی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔'' جمشید نے مجھ سے کہا ''تم زیادہ عرصے تک تو اس بچی کے ساتھ قیدی کی طرح زندگی نہیں گزار سکتیں۔''

میں ایک بار پھر شدید خوف زدہ ہو گئی۔ اگر کوئی مجھے اس بچی کو لے جاتے دیکھ لیتا اور اسے شبہ ہو جاتا تو کیا ہوتا لیکن میرے اس اندیشے کو جمشید نے سمجھا بجھا کر دھیما کیا۔

نویں دن میں علی الصباح اس بچی کو لے کر ایک بس کے ذریعے حیدرآباد روانہ ہوئی۔ بس کے اڈے تک مجھے چھوڑنے کے لیے جمشید بھی آئے تھے اور مجھے بس میں سوار کرتے وقت اس طرح میرا شانہ تھپکا تھا جیسے میری ڈھارس بندھائی ہو۔

بس کا سفر میرے لیے قیامت کا سفر بن گیا۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے اس طرح گزرے جیسے دو ڈھائی صدیاں گزر گئی ہوں۔ جب بھی کسی کی نظر مجھ پر یا بچی کی طرف اٹھتی تھی، میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔

حیدرآباد پہنچ کر میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچی۔ میری گود میں بچی کو دیکھ کر میری والدہ حیران رہ گئیں۔

''یہ بچی کس کی لے آئیں؟'' وہ حیرت سے بولیں۔

میں نے پیشانی پر بل ڈالے ''کس کی بچی کیا مطلب......؟ میری بچی ہے یہ......''

''تمہاری بچی!'' میری والدہ' نانی بننے کے خیال سے اتنی خوش ہوئیں کہ بچی کو میری گود سے لے لیا لیکن پھر میری طرف دیکھ کر کچھ خفگی سے بولیں ''جب تم ماں بننے والی تھیں تو تم نے ہمیں اطلاع تک دینا ضروری نہیں سمجھا۔''

''اب بھی اطلاع نہ دیتی۔'' میں نے اپنا لہجہ اپنے ماضی کے رویے کے مطابق رکھا ''وہ تو مجبوراً آنا پڑا ہے مجھے یہاں۔ آخر کہاں سر چھپاتی میں......؟ جمشید سے جھگڑا ہو گیا ہے میرا...... لیکن میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گی' ملازمت کر کے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پال لوں گی۔''

میری والدہ میرا منہ تکتی رہ گئیں۔ میرے تند و ترش لہجے کو نظر انداز کرنا میرے والدین نے اپنا معمول بنالیا تھا۔

جب والد کام سے لوٹے تو والدہ نے انہیں بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''ایسا کیا جھگڑا ہو گیا ہے کہ چند دن کی بچی کو لے کر یہاں آنا پڑ گیا۔''

میں نے انہیں ایک فرضی جھگڑے کی کہانی سنا دی جو میں نے اور جمشید نے مل کر سوچی تھی۔

''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے کہ تم نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔'' والد نے کہا۔

''میرے لیے تو ہے۔ اگر انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں اب نہیں رہوں گی ان کے ساتھ۔''

''وہ یہاں بتانے آئے گا کہ وہ تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہے یا نہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''میں ہی انہیں فون کر کے پوچھتی رہوں گی۔ یہاں تو فون ہے نہیں لیکن ایک پی سی او یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

میرے والد نے بات زیادہ آگے نہیں بڑھائی اور بچی کو انہوں نے بھی پیار کیا۔ وہ تو اسے اپنی نواسی ہی سمجھ رہے تھے۔

شام کو میں بچی کو والدہ کی گود میں چھوڑ کر پی سی او گئی۔ جمشید سے یہ طے ہو چکا تھا کہ میں انہیں کس وقت فون کیا کروں گی۔

فون پر میں نے انہیں گھر کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولے ''مجھے امید بندھ گئی ہے فرزانہ کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے آج یہاں لوگوں سے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تم ماں بننے والی ہو اس لیے اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہو۔ جب تم بچی کو لے کر یہاں آؤ گی تو لوگ اسے ہماری بیٹی ہی سمجھیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے کہا اور پھر میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی ''ابا نے اس بچی کا نام ماہین رکھا ہے۔''

''نام تو اچھا ہے۔'' جمشید کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ خاصے مطمئن تھے۔

اور دو چار باتیں کر کے میں گھر لوٹ آئی۔ دس ہزار روپے میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی اور والدہ کو بھی اس

جمشید ہنس پڑے ''ہاں! تمہاری بیٹی کو...... میں خوش ہوں کہ اس بہانے تمہاری ممتا کے جذبے کو سکون مل گیا۔''

میں نے محبت سے ماہین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اس کی پرورش میں اس طرح کروں گی جیسے یہ میری ہی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔''

''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں فرزانہ۔ آج کے بعد یہ بات بھی اپنی زبان پر نہ لانا کہ ماہین تمہاری کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی۔''

''کل آپ کے دوست جو آرہے ہیں۔ باتیں تو ہوں گی اس بارے میں۔''

''کل میں انہیں بھی سمجھا دوں گا کہ یہ ذکر پھر کبھی نہ چھیڑیں...... اور کل تو ہوں گی ہی یہ باتیں۔ بہت دن بعد ہم کچھ اطمینان سے ملیں گے۔''

میں سر ہلا کے چپ ہوگئی اور سوچتی رہی کہ ساری زندگی یہ بات ماہین سے بھی تو چھپانا ہوگی۔

دوسرے دن نازلی اور جمشید کا دوسرا ساتھی گھر آئے۔ ان دونوں سے وہ میری پہلی ملاقات تھی اور وہ دونوں بھی مجھ سے پہلی بار ملے تھے۔ جمشید نے ہم تینوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ جمشید کے دوست کا نام ارسلان تھا۔

نازلی مجھ سے بہت جلدی بے تکلف ہوگئی۔ وہ بہت دیر تک ماہین کو بھی اپنی گود میں لیے بیٹھی رہی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی۔

''اس رات کی یادیں تو آج بھی میرا کلیجا ہلا دیتی ہیں۔'' اس نے مجھ سے کہا ''بس ضمیر مطمئن ہے کہ ہم نے شمسہ کو نہیں مارا لیکن قانون تو ہمیں اس کا قاتل ہی کہے گا۔ اگر کبھی یہ راز کھل گیا تو جانے کیا ہو۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''پتا ہے فرزانہ؟ ہم تینوں نے ایک قسم کھائی ہے۔''

''کیا!'' میں نے پوچھا۔

''خدانخواستہ اگر کبھی ہم سے کوئی ایک قانون کی نظر میں آگیا تو وہ پولیس کو باقی دونوں کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا اور اگر ہم میں سے دو پکڑے گئے تو وہ اپنے تیسرے ساتھی کا نام اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔'' ٹھنڈی سانس لے کر۔ ''ہاں اگر تینوں ہی پکڑے گئے تو اور بات ہے!''

''یہ باتیں نہ کرو نازلی...... میرا تو دل بیٹھنے لگا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' نازلی کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی ''یہ باتیں واقعی خوف زدہ کر دینے والی ہیں۔ میں نے ابھی کہا تھا نا تم سے...... اس رات کی یادیں آج بھی میرا کلیجا ہلا دیتی ہیں۔''

''تو یاد ہی کیوں کرو وہ باتیں۔''

''یادوں پر انسان کا اختیار کہاں ہوتا ہے فرزانہ۔ یہ تو وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی کم ہوتی ہیں...... اور کم ہوئی بھی ہیں اتنے دن میں۔''

''وہ باتیں کرنا تو چھوڑ ہی دو۔'' میں نے اپنے تئیں نازلی کو سمجھایا لیکن دراصل مجھے خود ہی ڈر لگ رہا تھا ان باتوں سے۔

نازلی دھیرے سے ہنس کر چپ ہوگئی۔

جمشید اپنے دوست ارسلان کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اسی لیے ڈرائنگ روم میں مجھے اور نازلی کو تنہائی میں کافی دیر باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ ہم میں ایسی باتیں بھی ہوئیں جو کسی مرد کی موجودگی میں نہیں ہوسکتی تھیں۔ نازلی نے مجھے اپنے معاشقے کے راز میں بھی شریک کرلیا جو کالج ہی کے کسی لڑکے سے چل رہا تھا۔

جب ارسلان اور جمشید ڈرائنگ روم میں آئے تو ارسلان، جمشید سے کہہ رہا تھا ''کم از کم اس معاملے میں تو تمہیں اور نازلی کو فکرمند ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

جمشید نے سر ہلایا اور پھر مجھ سے کہا ''اب کھانا لگاؤ فرزانہ!''

میں چونک سی گئی کیونکہ میرا ذہن اس بات میں الجھ گیا تھا جو ارسلان نے جمشید سے کہی تھی۔ آخر ایسا کیا معاملہ تھا جس کے لیے نازلی اور جمشید کو فکرمند نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مجھے اس بارے میں جمشید سے بات کرنے کا موقع اس وقت ملا جب نازلی اور ارسلان چلے گئے۔

''دراصل اس فلیٹ کے بارے میں بات ہو رہی تھی جہاں ہم نے ایک آپریشن تھیٹر بھی بنایا تھا۔'' جمشید نے میرے سوال کے جواب میں کہا ''وہ ارسلان نے ہی کرائے پر حاصل کیا تھا۔ میں اور نازلی سامنے نہیں آئے تھے۔ اس فلیٹ کا مالک اگر کسی کو بھی پہچان سکتا ہے تو صرف ارسلان کو...... اور ابھی تو اس سلسلے میں ارسلان بھی فکرمند نہیں۔ پولیس اس فلیٹ تک پہنچ ہی نہیں سکی۔''

''چلیں چھوڑیں۔'' میں نے کہا ''نازلی سے بھی کہہ چکی ہوں کہ وہ اس بارے میں اب کوئی بات ہی نہ کیا کرے۔''

''اور میں نے ارسلان کو سمجھا دیا تھا، اور اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ نازلی کو بھی سمجھا دے۔ اب ہمارے حق میں بہتر ہے کہ ان واقعات کا ذکر بھی ہماری زبانوں پر نہ آئے۔''

''ہاں...... بس......'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا

NOVEMBER.2004 SUSPENSE

''اب ہم دونوں بھی کوئی ایسی بات نہیں کیا کریں گے۔''

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد جمشید نے ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید کر کلینک بنوانا شروع کر دیا۔ ''ناجائز آمدنی'' سے اتنا روپیا جمع ہو چکا تھا کہ کلینک کے سلسلے میں کسی سے قرض ادھار نہیں کرنا پڑا اور نہ جمشید کو ملازمت کی ضرورت پیش آئی۔

جمشید کا باقاعدہ ڈاکٹر بن جانا میرے لیے حد درجہ باعث مسرت تھا۔ ایک تو اچھی آمدنی، اچھی زندگی اور پھر ماہین کی وجہ سے میرے ممتا کے جذبے کو بھی بڑی حد تک تسکین مل گئی تھی اس لیے میرے مزاج کا چڑچڑاپن بھی ختم ہو گیا۔ والدین سے میرے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔

نازلی سے میری دوستی خاصی بڑھ گئی تھی۔ میں نے اس کی شادی کے ہنگاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شادی کے بعد ان دونوں میاں بیوی نے بھی اپنا کلینک کھول لیا لیکن نازلی ڈاکٹر بننے کے باوجود پریکٹس جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کی سوچ کا انداز یہ تھا کہ ماں بننے کے بعد اگر عورت کے لیے کوئی مجبوری نہ ہو تو اسے صرف اپنے گھر پر توجہ دینا چاہیے۔ اس کا فیصلہ تھا کہ جب بھی وہ ماں بنی، پریکٹس چھوڑ دے گی۔

دوسری طرف ارسلان نے پریکٹس شروع ہی نہیں کی۔ وہ ذہنی طور پر بے حد منتشر ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ ہوا کہ وہ اپنے خاندان کی جس لڑکی سے محبت کرتا تھا، اس سے اس کی شادی نہیں ہو سکی۔ دونوں گھروں کے تعلقات بہت کشیدہ تھے۔ ارسلان نے بھی طے کر لیا کہ وہ کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کرے گا اور دوسری طرف اس لڑکی نے بھی اپنے والدین کو فیصلہ سنا دیا کہ وہ ارسلان کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم بھی رہی لیکن اس کے والدین بھی اڑے رہے کہ وہ اس کی شادی ارسلان سے نہیں کریں گے چنانچہ اس ذہنی انتشار میں ارسلان اگر پریکٹس شروع بھی کرتا تو شاید ناکام رہتا۔

اب میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ قدرت کے سبھی معاملات نہایت طے شدہ ہوتے ہیں۔ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ ارسلان کے ساتھ اسے بھی ایک دردناک انجام سے دو چار ہونا پڑے۔

ماہین کی چوتھی سالگرہ کو چند مہینے گزر چکے تھے جب مجھے جمشید کے ساتھ ایرپورٹ جانا پڑا۔ جمشید کا کوئی دوست اور اس کی بیوی کچھ عرصے کے لیے امریکا جا رہے تھے۔ میری ان دونوں سے کوئی خاص راہ و رسم نہیں تھی لیکن جمشید کی وجہ سے مجھے بھی ایرپورٹ جانا پڑا۔

اور وہی وہ دن تھا جب میں نے اکمل کو پہلی بار دیکھا۔ دوست اور اس کی بیوی کو رخصت کرنے کے بعد جب میں اور جمشید ایرپورٹ کی عمارت سے نکلے تو ماہین میری گود میں تھی۔

کار پارکنگ کے حصے کی طرف جانے کے لیے میں اور جمشید جب سڑک پار کرنے والے تھے تو جمشید یکایک ٹھٹک کر رکے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک شخص کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے پھر میں نے بھی اس شخص کو دیکھا۔ وہ ایک اچھا سوٹ اتنی بے پروائی سے پہنے ہوئے تھا کہ وہ برا لگ رہا تھا۔ اس کے بال بھی منتشر تھے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر بس یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ مالی طور پر بہتر حالات ہونے کے باوجود وہ شخص کسی پریشانی یا صدمے کا شکار تھا۔

وہی شخص اکمل تھا اور وہ بھی جمشید کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور پھر اس کے قدم جمشید کی طرف بڑھے۔

''کون ہے یہ!'' میں اس طرح بڑبڑائی جیسے جمشید سے سوال کر رہی ہوں۔

اس وقت اکمل کی طرف دیکھتے ہوئے جمشید بھی مسکرا پڑے۔ اکمل اب قریب آ گیا تھا۔ جمشید اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے ''تمہیں اس کا رنج نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے تمہیں پہلے پہچانا۔''

اس کے بعد ان دونوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ اکمل نے اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس ایک طرف رکھ دیا تھا۔

''اتنے برسوں بعد بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔'' اکمل نے کہا ''مجھے واقعی اس کا رنج نہیں کہ میں نے تمہیں بعد میں پہچانا۔ رنج تو اس کا ہے کہ میں نے تمہیں بعد میں پہچانا حالانکہ تم بہت زیادہ نہیں بدلے جبکہ میں بہت بدل گیا ہوں۔''

''یہ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟'' جمشید نے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''میں نے نہیں...... قدرت نے بنائی ہے میری یہ حالت۔'' اکمل کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ آئی، پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

''یہ تمہاری بھابی ہیں۔'' جمشید نے تعارف کرایا ''اور فرزانہ...... یہ میرا دوست اکمل ہے۔ میٹرک تک ہم نے ایک ہی اسکول میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد......''

اکمل نے ماہین کی طرف دیکھتے ہوئے جمشید کی بات کاٹی ''اور یہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''ہاں۔'' جمشید نے ہنس کر کہا ''ماہین نام ہے اس کا...... ابھی یہ غنودگی میں ہے ورنہ تمہیں سلیوٹ کرتی۔ فوجی انداز میں سلام کرنے کا شوق ہے اسے۔ خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کہیں باہر گئے ہوئے تھے کیا؟''

''ہاں جمشید۔ میں تو کئی سال باہر رہنے کے بعد اب یہاں آیا ہوں مستقل طور پر۔''

''اکیلے ہو؟'' جمشید نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' اکمل عجیب سے انداز میں ہنسا ''وقت کا فیصلہ تو انسان کو ماننا ہی پڑتا ہے۔''

''یہاں قیام کہاں ہوگا تمہارا؟'' جمشید نے پوچھا۔

''ابھی یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سفر میں کچھ دوسرے خیالات گھیرے رہے۔ اکیلے آدمی کے لیے اس کی اہمیت بھی کہاں ہوتی ہے کہ وہ سر کہاں چھپائے گا۔ کوئی سرائے، کوئی ہوٹل، کوئی ٹھکانا مل ہی جاتا ہے ایک جان کو تو......''

''اگر یہ بات ہے تو میرے ساتھ چلو۔'' جمشید نے اس کا بازو پکڑا۔

''ارے نہیں جمشید......کوئی ہوٹل......''

''کیوں ہوٹل؟'' جمشید نے اس کی بات کاٹی ''جب گھر ہے تو اس کی ضرورت کیا ہے۔''

اکمل تو گریز کرنا چاہتا تھا لیکن جمشید کے اصرار نے اسے بے بس کر دیا۔

میں کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اکمل کو جمشید نے اپنے برابر میں بٹھایا تاکہ بے تکلفانہ باتوں کا سلسلہ آسانی سے جاری رہ سکے۔

کار جب پارکنگ لاٹ سے نکلی تو اکمل نے سر گھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آپ کے لیے پریشانی کھڑی کی ہے جمشید نے۔''

''ارے نہیں!'' میں اخلاقاً مسکرائی ''مہمان کی وجہ سے پریشانی کیسی؟''

''کبھی کوئی مہمان، بلائے جان بن جائے تو؟'' اکمل نے کہا۔

اور اس وقت میرے سان گمان میں بھی نہیں آسکا کہ اکمل نے بڑی سچی بات کہی تھی۔

اس کے بعد اکمل اور جمشید کی باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسکول کے زمانے میں وہ دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ میٹرک کے بعد اکمل اپنے باپ کے ساتھ لاہور چلا گیا تھا۔ اس کے باپ کوئی سرکاری ملازمت کرتے تھے اور ان کا کراچی سے ٹرانسفر ہوگیا تھا۔ لاہور جانے کے سال بھر بعد ان کا انتقال ہوگیا اور حالات کچھ ایسے ہوئے کہ اکمل نہایت پریشانی میں گھر گیا، اور اسی پریشانی کے باعث جمشید سے اس کی خط کتابت بھی کم ہوتی چلی گئی۔ گزشتہ چھ سال سے تو وہ دونوں بے خبر ہی تھے کہ کون کہاں تھا۔

ان دونوں میں اسکول کے زمانے کی باتیں زیادہ ہوئیں اور اتنی دیر میں گھر آگیا۔

کار سے اترتے وقت اکمل نے مجھ سے کہا ''اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

جمشید ہنس کر بولے ''میں فرزانہ کو سمجھا دوں گا کہ یہ تمہاری کسی بات کا کبھی برا نہ مانے۔''

''دراصل۔'' اکمل نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی ''میں نے کبھی اپنے کسی دوست کی بیوی کو بھابی نہیں کہا، ہمیشہ نام سے ہی مخاطب کیا ہے۔ جانے کیوں......؟ مجھے بس یہی اچھا لگتا ہے کہ......''

جمشید نے پھر اس کی بات کاٹی ''اور یقیناً اچھا لگنا بھی چاہیے۔ آج کل کی رشتے داریوں سے بہتر ہے کہ انسان ایک دوسرے کے دوست رہیں اور جب ایک دوسرے کا نام لیا جائے تو دوستی کا ماحول خود بخود بن جاتا ہے۔''

اکمل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آپ نے جواب نہیں دیا؟''

''میں نے تو جمشید سے ہمیشہ اتفاق کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

یہ میں نے سراسر جھوٹ بولا تھا لیکن اخلاقاً میں یہی جواب دے سکتی تھی۔

پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

''شادی کیوں نہیں کی اب تک؟'' جمشید نے اکمل سے پوچھا۔

''کی تو تھی؟'' اکمل نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' جمشید نے تعجب سے کہا۔

اکمل نے ٹھنڈی سانس لی ''وہ بے وفا نکلی!''

''ارے!'' جمشید سنجیدہ ہوگیا ''سوری یار......شاید یہ بات نہیں چھیڑنا چاہیے تھی مجھے۔''

NOVEMBER.2004 SUSPENSE

دھیرے سے ہنس کر ''چلو آئندہ نہ چھیڑنا۔ واقعی بہت دکھ ہوتا ہے مجھے۔''

میں اس وقت ڈرائنگ روم سے اٹھ گئی۔ ماہین میرے شانے سے لگے لگے سو چکی تھی۔ میں نے بیڈ روم میں جا کر اسے لٹایا۔

بنگلے میں ایک کمرا ہم نے ''گیسٹ روم'' کے طور پر ''ڈیکوریٹ'' کیا تھا۔ اکمل اس کمرے کا پہلا مہمان بنا۔

سوتے وقت میں نے جمشید سے کہا ''کیا یہ مناسب ہے کہ کسی اجنبی کو اپنے گھر میں ٹھہرایا جائے۔''

جمشید ہنس پڑے ''ارے...... کیا کہہ رہی ہو تم...... ہماری باتوں سے اندازہ نہیں ہوا تمہیں...... ارے چھ سال تک ساتھ پڑھا ہے ہم نے۔''

''اور چھ سال تک ایک دوسرے سے دور بھی رہے ہیں۔''

''تو اس سے کیا؟''

''چھ سال بہت ہوتے ہیں جمشید۔ بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں انسان میں...... اور وہ تبدیلیاں بری بھی ہوتی ہیں۔''

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اکمل بہت اچھا انسان ہے۔''

''اس یقین کی وجہ؟''

''جب اس نے پہلی بار تمہاری طرف دیکھا تھا تو میں نے سمجھ لیا تھا۔''

''وہ کیسے؟''

''کوئی جب پہلی بار کسی عورت کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی پہلی ہی نظر اس کی شخصیت کو پوری طرح اجاگر کر دیتی ہے...... اور تمہیں تو یہ بات مجھ سے پہلے سمجھ لینا چاہیے تھی۔ عورت کی حس اس معاملے میں مرد کی حس سے بھی زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔''

''انسان میں صرف یہی ایک برائی تو نہیں ہوتی کہ وہ عورتوں کو بری نظر سے دیکھے؟ کچھ اور خرابیاں بھی ہوتی ہیں انسان میں۔''

''میں تمہاری عدم موجودگی میں بھی اس سے بہت دیر تک باتیں کر چکا ہوں۔ وہ مجھے بہت اچھا انسان لگا ہے...... اور بہت دکھی بھی ہے۔''

''اپنی بے وفا بیوی کی وجہ سے؟''

''شاید ایسا ہی ہو لیکن میں نے یہ ذکر پھر نہیں چھیڑا۔''

''کیا بے وفائی کی ہوگی اس کی بیوی نے؟''

''اب یہ تو وہی جانے۔ شاید کسی وقت خود ہی کچھ بتائے۔''

''کب تک یہاں رکھنا ہے اسے؟''

''اتنی بیزار کیوں لگ رہی ہو فرزانہ۔ دو چار دن میں وہ خود ہی کہے گا جانے کے لیے۔ اب ہم خود تو نہیں کہہ سکتے نا اس سے کہ وہ کل ہی چلا جائے۔ اچھا اب سو جاؤ۔ رات کافی ہوگئی ہے۔''

جمشید نے سوتی ہوئی ماہین کو پیار کیا۔ سونے سے پہلے ماہین کو پیار کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا جیسے وہ سچ مچ ان کی بیٹی ہو۔ ماہین جیسی پیاری بچی پر پیار تو کسی کو بھی آسکتا تھا اور پھر ہمارے ساتھ تو وہ ساڑھے چار سال گزار چکی تھی۔ اتنے عرصے میں تو جانوروں سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر ماہین نے پہلی مرتبہ اکمل کو دیکھا۔

''یہ تمہارے انکل ہیں بیٹا۔'' جمشید نے اس سے کہا۔

ماہین نے اکمل کو بڑی سنجیدگی سے سلیوٹ کر ڈالا اور اکمل دھیرے سے ہنس پڑا ''بہت پیاری بچی ہے تمہاری جمشید...... لیکن ہے بہت سنجیدہ!''

''ارے ایسی نہیں ہے جیسی اس وقت نظر آرہی ہے۔ یہ تو پہلی بار تمہیں گھر میں دیکھ رہی ہے اس لیے ہے سنجیدہ۔''

میں نے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ''سب سے زیادہ بے تکلف تو یہ نازلی سے ہے۔''

''شروع سے ہی دیکھ رہی ہے نا یہ نازلی کو۔''

''یہ نازلی کون ہے؟'' اکمل پوچھ بیٹھا۔

''میرے ساتھ پڑھی ہے۔'' جمشید نے جواب دیا ''سال بھر پہلے وہ بھی ماں بن چکی ہے۔ ماں بننے کے بعد اس نے پریکٹس چھوڑ دی۔ فرزانہ کی بہت اچھی دوست بن گئی ہے۔''

''تم کلینک کس وقت جاتے ہو؟'' اکمل نے پوچھا۔

''دس بجے تک پہنچتا ہوں۔ کیوں؟'' جمشید نے کہا' پھر ہنس کر بولے ''میرے ساتھ تم بھی چلو گے کلینک؟''

''نہیں' وہ...... میں سوچ رہا تھا کہ...... اچھا خیر چھوڑو......! میں ٹیکسی کر لوں گا۔''

''کیا فضول بات کر رہے ہو۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟ چھوڑتا جاؤں گا میں تمہیں اور اگر تمہیں...... وہاں دیر لگے تو واپس بھی لے آؤں گا۔ میں ایک بجے آتا ہوں کلینک سے!''

''پہنچنا تو مجھے بھی دس بجے ہے لیکن اتنی دیر شاید نہ لگے۔''

"تو ٹھیک ہے۔ واپس آجانا تم ٹیکسی سے۔ جانا کہاں ہے؟"

"پولیس ہیڈکوارٹر۔" اکمل نے جواب دیا۔

یکایک مجھے ایسا لگا جیسے میرے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی ہو۔ میں نے ایک دم جمشید کی طرف دیکھا۔ جمشید بھی سنجیدہ ہوگئے تھے۔ دراصل جب سے ماہین ہمارے ساتھ تھی، ہم دونوں میاں بیوی کا یہی حال ہوگیا تھا، پولیس کا نام ہی سن کر ہم چونک جاتے تھے۔

"پولیس ہیڈکوارٹر کیوں؟" جمشید نے اکمل سے پوچھا۔

"یونہی...... کسی سے ملنا ہے۔"

"کوئی پرانا دوست؟"

"دوست تو نہیں...... ہاں البتہ...... شناسا کہا جاسکتا ہے۔" اکمل نے جواب دیا اور پھر جیسے وہ بات ٹالنا چاہی "کلینک صرف اسی وقت جاتے ہو؟"

"نہیں!" جمشید نے جواب دیا "دو گھنٹے کے لیے شام کو بھی جاتا ہوں۔ چھ بجے سے آٹھ بجے تک۔"

"کہاں پر ہے کلینک......؟ میرا مطلب ہے...... اگر تم مجھے چھوڑنے گئے تو......؟"

"کوئی فرق نہیں پڑے گا اس سے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کراچی کے حالات آج کل کیسے چل رہے ہیں؟"

مجھے ایسا لگا جیسے اکمل نے جان بوجھ کر پولیس ہیڈکوارٹر کی بات ختم کی ہو۔ میں خاصی پریشان ہوگئی۔ ذہن اتنا الجھا کہ میں اکمل اور جمشید کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دے سکی، اور جب وہ دونوں چلے گئے تو میں بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ یہ عین ممکن تھا کہ اکمل اپنے کسی شناسا سے ملنے گیا ہو لیکن میرے ذہن میں پریشان کن سوال ابھرنے لگے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اکمل کا ائرپورٹ پر ملنا اتفاق نہ ہو، وہ کسی منصوبے کے تحت ہم سے ملا ہو اور صرف یہ اتفاق ہو کہ جمشید اور وہ اسکول کے زمانے کے ساتھی تھے۔ آج کل وہ محکمہ پولیس میں ہو اور ہم پر کسی وجہ سے شبہ ہوجانے کے باعث ہم سے ملا ہو۔ پولیس ہیڈکوارٹر کا ذکر کرکے شاید اس نے ہم میاں بیوی کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کی ہو۔ اس موقع پر جمشید نے تو خود کو بڑی حد تک قابو میں رکھا تھا لیکن میں ذہنی طور پر ان دونوں کے ساتھ نہیں رہی تھی۔ اس لیے سوچ رہی تھی کہ اکمل اگر پولیس میں تھا تو یقیناً اس نے میری تبدیلی کو محسوس کرلیا ہوگا۔

مجھے خیال آیا کہ جمشید کو کلینک فون کروں لیکن جمشید ہی کی اس بات نے مجھے ڈرادیا کہ اس قسم کی باتیں فون پر کرنا خطرناک ہوسکتا ہے۔

جمشید جب کلینک سے لوٹے تو بھی میں خلفشار میں مبتلا تھی اور جمشید کے چہرے پر بھی خوشگوار تاثرات نہیں تھے۔ انہوں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "اکمل نہیں آیا ابھی؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا اور بے چینی سے کہا "یہ کیا چکر ہوسکتا ہے جمشید؟"

جمشید شاید میری ڈھارس بندھانے کے لیے مسکرائے "پریشان تو خیر میں بھی ہوں فرزانہ لیکن یہ خیال بھی ہے مجھے کہ شاید ہماری پریشانی کی وجہ صرف دل کا چور ہے۔ یہ محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے کہ پولیس ہیڈکوارٹر میں اکمل کا کوئی شناسا ہو اور اکمل اخلاقاً...... یا شاید وقت گزاری کے لیے اس سے ملنے چلا گیا ہو۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، اکمل آگیا۔ وہ ٹیکسی سے آیا تھا۔ اس نے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "میں تمہارے کلینک سے ہوتا ہوا آیا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر تمہیں کسی مریض کی وجہ سے دیر ہوگئی تو پھر تمہارے ساتھ ہی آجاؤں گا۔ کلینک کے چوکیدار نے مجھے بتایا کہ تم صرف دو منٹ پہلے نکل گئے تھے۔" پھر اس نے غور سے ہماری طرف دیکھا "کیا بات ہے......؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو تم دونوں!"

"ارے نہیں!" جمشید ہنس کر بولے "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

اور میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

"میرا پولیس ہیڈکوارٹر جانا بیکار نہیں رہا۔" اکمل نے کہا "ایک خوشگوار سی اطلاع ملی ہے مجھے وہاں سے۔"

"کیا مطلب؟" جمشید بولے۔

ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اکمل نے جواب دیا "ابھی واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ تم دونوں کو اپنی بیوی کی بے وفائی کا قصہ سناہی دوں۔ تم دونوں شاید سوچ رہے ہوگے کہ میری بیوی کی بے وفائی کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ میں پولیس سے بھی رابطہ کیے ہوئے ہوں۔ خاصی الجھن ہوگی تم دونوں کو۔"

"نہیں کوئی ایسی خاص الجھن تو نہیں لیکن...... ایک احساس ضرور تھا مجھے۔ تم کم از کم مجھے تو بتادیتے کہ تمہاری بیوی نے کیا بے وفائی کی۔"

"چلو اب بتادیتا ہوں۔" اکمل کچھ افسردہ نظر آیا "بے وفائی کا مطلب تم دونوں نے غلط ہی سمجھا ہوگا۔ دراصل اسے بے وفا میں اس لیے کہتا ہوں کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے

NOVEMBER.2004 SUSPENSE 306

جمشید!"

میں نے اور جمشید نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اکمل ہم دونوں کی طرف دیکھے بغیر کھوئے کھوئے سے انداز میں کہنے لگا "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے قتل کہوں یا کچھ اور..... لیکن یہ طے ہے کہ شمسہ کی موت طبعی نہیں تھی۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میرا دل بڑی زور سے اچھلا ہو۔ اس عورت کا نام شمسہ ہی تھا جو ماہین کو جنم دیتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھی، لیکن اسی وقت مجھے یہ بھی یاد آیا کہ جمشید نے مجھے شمسہ کے شوہر کا نام زاہدی بتایا تھا۔

میں نہیں جانتی کہ جمشید پر کیا گزری ہوگی لیکن اکمل ہم دونوں کے جذبات سے بے خبر اپنی کہانی سناتا رہا "ہماری شادی کوئی سات سال پہلے ہوئی تھی۔ میرے مالی حالات اس وقت اچھے نہیں تھے۔ یوں سمجھ لو کہ وہ میری جدوجہد کا زمانہ تھا۔ شادی کے کافی دن بعد مجھے ایک اچھا موقع ملا۔ میرے ایک دوست نے مجھے کینیڈا میں ایک اچھی ملازمت دلادی۔"

میرے دل کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہوگئیں۔ شمسہ کا شوہر بھی کینیڈا ہی میں رہتا تھا۔

اکمل نے اپنی بات جاری رکھی "میں اور شمسہ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے کہ یہ جدائی ہم دونوں ہی کو بہت شاق گزری لیکن حالات کے جبر سے تو انسان لڑ نہیں سکتا۔ مجھے کینیڈا جانا ہی پڑا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک آدھ سال بعد شمسہ کو بھی وہاں بلالوں گا۔ اس وقت تو یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ ہم دونوں اب ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔" اکمل نے ٹھنڈی سانس لی اور اس طرح خاموش ہوگیا جیسے خیالات میں کھو کر ہم دونوں کو بھی فراموش کر بیٹھا ہو۔

کچھ توقف کے بعد جمشید نے کہا "تمہاری کہانی بڑی دردناک معلوم ہوتی ہے اکمل!"

جمشید کے بولتے ہی اکمل اچانک چونک سا گیا۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہاں جمشید..... اس درد نے مجھے آج تک بے چین رکھا ہے۔ خیر..... تو جب کینیڈا میں مجھے ایک ہی مہینا گزرا تھا جب شمسہ کے ایک خط میں مجھے یہ خوش خبری سننے کو ملی کہ میں باپ بننے والا تھا۔ میں اس وقت شمسہ سے ملنے کے لیے تڑپ گیا، لیکن ملازمت کا کنٹریکٹ ایسا تھا کہ میں آ نہیں سکتا تھا۔ میں بس اتنا ہی کرسکتا تھا کہ اپنی تنخواہ کے علاوہ میں نے اپنے دوست سے بھی قرض لے کر شمسہ کو ایک معقول رقم بھیج دی اور اسے بڑا لمبا چوڑا خط لکھا کہ وہ اپنی صحت کا اور آنے والے مہمان کا ہر طرح سے خیال رکھے..... اور اس کے بعد بھی میں ہر مہینے سے زیادہ رقم بھیجتا رہا۔"

زاہدی.....؟ اکمل.....؟ زاہدی.....؟ اکمل.....؟

یہ دونوں نام اس وقت میرے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔

اکمل کہتا رہا "جانے کیوں..... شمسہ کو اسپتال کے نام سے ہی خوف آتا تھا۔ بچے کی پیدائش بھی وہ گھر پر ہی چاہتی تھی۔ اس نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ کرلیا تھا، لیکن یہ بات اس نے مجھ سے چھپائی تھی۔ مجھے تو اس نے یہی لکھا تھا کہ اس نے کسی میٹرنٹی ہوم سے رابطہ کرلیا ہے۔ دراصل وہ مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ بچے کی پیدائش بھی گھر پر ہی چاہتی تھی۔"

جمشید اس وقت شاید بڑی ہمت کر کے بول سکے ہوں گے "کیا موت کا سبب بچے کی پیدائش تھی؟"

"شاید کچھ ایسا ہی تھا۔" اکمل پھر گم صم نظر آیا "شمسہ نے ایک ملازمہ رکھ لی تھی جو صبح آ کے گھر کے کام کاج کر جایا کرتی تھی۔ اسی ملازمہ نے شمسہ کو مردہ پایا تو وحشت سے چیخنے چلانے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر آس پاس کے لوگ جمع ہوگئے اور پھر پولیس کو اطلاع دی گئی پھر شمسہ کے پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوسکا کہ اس کی موت رات کو گیارہ اور ایک کے درمیان کسی وقت ہوئی تھی اور اس نے مرنے سے پہلے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔"

"وہ بچہ کہاں ہے؟" میں بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"یہ بھی آج تک معلوم نہیں ہوسکا۔" اکمل نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "آج تک یہ بھی راز ہے کہ ڈلیوری کیس کس نے کیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میری بچی بھی غائب ہوگئی تھی۔"

"بچی؟" جمشید نے پوچھا۔

"ہاں۔" اکمل نے سر ہلایا "دراصل میرے کہنے پر شمسہ نے الٹرا ساؤنڈ کرایا تھا اور مجھے لکھا تھا کہ وہ ایک بچی کو جنم دے گی۔ اس بچی کے لیے میں آج بھی بہت بے قرار ہوں جمشید!" اکمل کی آواز بھرّا گئی "کاش وہ زندہ ہو اور کبھی میں اسے پالوں۔ وہ میری شمسہ کی آخری نشانی ہے۔"

جمشید اور میں اس وقت دم بخود سے بیٹھے تھے۔

"پولیس نے کینیڈا میں مجھے اطلاع دی تھی۔" اکمل نے بتایا "کمپنی نے مجھے بمشکل چند دن کی چھٹی دی تھی۔ میں آیا تھا یہاں..... اور رو دھو کر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ملازمت سے تو کوئی دلچسپی رہی نہیں تھی لیکن اگر میں واپس نہ

جاتا تو میرے دوست کے لیے کچھ پریشانی ہوجاتی جو کینیڈا ہی میں تھا اور جس نے مجھے ملازمت دلائی تھی۔'' اکمل ایک بار پھر خیالات میں کھو گیا۔

''واقعی اکمل!'' جمشید نے کچھ توقف سے کہا ''تمہارے ساتھ واقعی بہت ٹریجڈی ہوئی...... لیکن ابھی تم پولیس ہیڈ کوارٹرکس سے ملنے گئے تھے؟''

''ایک پولیس افسر ہے۔ سب لوگ اسے اجمیری کہتے ہیں۔ ویسے تو پولیس یہ کیس ختم کرچکی ہے لیکن اجمیری پر یہ بھوت آج تک سوار ہے کہ وہ کسی طرح اس کا سراغ لگالے کہ میری شمسہ کی موت کا ذمے دار کون تھا۔ وہ اس سلسلے میں مجھ سے بھی خط کتابت کرتا رہا ہے۔ اس کے اس جنون ہی کی وجہ سے مجھے بھی اس سے لگاؤ ہو گیا ہے۔ اسی لیے اب جبکہ میں مستقل طور پر یہاں آ گیا ہوں۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس سے ملاقات کروں...... اور یہ اچھا ہی ہوا۔''

''ہاں۔'' جمشید نے کہا ''تم نے ابھی کہا تھا کہ تمہیں وہاں سے کوئی خوشگوار اطلاع ملی ہے۔''

اکمل نے اثبات میں سر ہلایا' پھر کہا ''اجمیری کو کل ہی ایک اہم سراغ ملا ہے۔ اسے ایک فلیٹ کا پتا لگا ہے جو کرائے پر لے کر بڑے پراسرار انداز میں استعمال کیا جارہا تھا اور میری شمسہ کی موت کے بعد ہی وہ لوگ غائب ہوگئے جو وہ فلیٹ استعمال کررہے تھے۔''

یکباری میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر تیز ہوگئیں۔

''اس فلیٹ کا مالک اب بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔'' اکمل نے بتایا ''اس نے وہ ایگریمنٹ بھی کہیں ضائع کردیا ہے جو فلیٹ کرائے پر دیتے وقت کیا گیا تھا اور اب اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے جس شخص کو فلیٹ دیا تھا' اس کا نام کیا تھا۔''

میں نے کچھ' معمولی سا سکون محسوس کیا کہ فلیٹ کے مالک کو ارسلان کا نام یاد نہیں رہا تھا۔

''لیکن......'' اکمل نے میرا سکون پھر ختم کیا ''فلیٹ کے مالک کا دعویٰ ہے کہ وہ شخص اگر اس کے سامنے آئے تو وہ اسے پہچان ضرور لے گا۔''

''اس وقت تو شاید کچھ بات بن جائے۔'' جمشید نے کہا۔

مجھے اندازہ ہے کہ یہ کہتے وقت جمشید کی حالت کیا ہوگی۔

''دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' اکمل نے ٹھنڈی سانس لی۔

جمشید نے پوچھا ''یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ فلیٹ پراسرار انداز میں استعمال کیا جارہا تھا؟''

''اس کی گواہ ایک بوڑھی پارسی عورت ہے۔'' اکمل نے جواب دیا ''اس اپارٹمنٹ کی اس منزل پر دوسرے فلیٹ میں وہی رہتی تھی۔ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا لڑکا آٹھ سال سے دبئی میں ملازمت کررہا ہے۔ وہ پارسی عورت اب اکیلی ہی رہتی ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ اس فلیٹ کو پراسرار انداز میں استعمال کیا گیا تھا۔ دن میں وہاں کوئی نہیں ہوتا تھا لیکن شام کے بعد وہاں تین افراد آتے تھے جن میں ایک لڑکی بھی تھی۔''

اس وقت مجھ سے تو بولا ہی نہیں جارہا تھا اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ جمشید کے اعصاب بہت مضبوط تھے۔ انہوں نے پوچھا ''وہ عورت ان تینوں کو دیکھے تو پہچان سکتی ہے؟''

''نہیں۔'' اکمل نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''اس کی بصارت ختم ہو چکی ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ اس وقت جمشید کو بڑا سکون ملا ہوگا۔

''اب بس آخری امید ایک ہی ہے۔'' اکمل نے کہا ''فلیٹ کا مالک بس اسی شخص کو پہچان سکتا ہے جس نے فلیٹ کرائے پر حاصل کیا تھا۔''

''لیکن وہ شخص سامنے آئے...... تب نا۔''

''ہاں۔'' اکمل نے سر ہلایا ''اب دیکھو اجمیری کیا کرتا ہے۔ یہ تو پولیس والے ہی سوچ سکتے ہیں کہ وہ کس سراغ سے کس طرح مزید سراغ پاسکتے ہیں۔''

پھر جمشید کچھ دیر تک اجمل سے ہمدردی کی باتیں کرتے رہے' پھر انہوں نے مجھ سے کھانا لگانے کے لیے کہا۔

کھانے کے بعد جب اکمل اپنے کمرے میں آرام کرنے چلا گیا تو مجھے اور جمشید کو باتیں کرنے کا موقع ملا۔

''یہ کیا ہے جمشید۔'' میں روہانسی ہوگئی تھی ''آپ نے تو اس آدمی کا نام زاہدی بتایا تھا۔''

''میرا دماغ بھی چکرایا ہوا ہے فرزانہ۔'' جمشید نے متفکر لہجے میں کہا ''بس نام ہی کا فرق ہے۔ باقی ساری باتیں تو وہی ہیں۔ میں اب بہت زیادہ فکرمند ارسلان کے لیے ہوں۔ اسے اس خطرے سے جلد از جلد آگاہ کرنا ضروری ہے۔''

''آگاہی سے انہیں کیا حاصل ہوگا؟''

''میں تو اسے مشورہ دوں گا کہ وہ ملک چھوڑ کر چلا جائے۔''

''ان کی شادی کا جھگڑا جو چل رہا ہے۔''

''ارسلان کو سوچنا تو پڑے گا۔''

''میرا تو دل بیٹھا جارہا ہے۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔''

''ہمت سے کام لو فرزانہ۔''

''بہت بڑی غلطی کی ہے آپ نے اکمل کو یہاں لا کر۔''
''اور میرا خیال ہے کہ یہ بہت اچھا ہوا۔''
''وہ کیسے؟''
''ہمیں ایک تو یہ معلوم ہو گیا کہ اجمیری نام کا کوئی پولیس افسر اب بھی اس کیس کی تحقیق کر رہا ہے اور یہ بھی پتا چل گیا کہ ارسلان خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اب ارسلان کو ہوشیار تو کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں اکمل کو نہ لاتا تو ہمیں یہ بات ہرگز معلوم نہ ہوتی۔

جمشید کی یہ بات غلط نہیں تھی۔ اکمل کو لانے سے اتنا فائدہ تو ہوا تھا۔

میں نے ماہین کی طرف دیکھا جو ایک ''گڑیا'' سے کھیل رہی تھی اور اس ڈرامے سے بے خبر تھی جس کا ایک کردار وہ خود بھی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے کہا ''اگر ماہین مجھ سے چھن گئی تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے گا جمشید۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے فرزانہ۔'' جمشید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''اس سے پہلے تو مجھے کسی انجام سے دو چار ہونا پڑے گا۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
لیکن حقیقت تو وہی تھی جو جمشید نے کہی تھی۔
شام کو جمشید جب کلینک گئے تو اکمل بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کلینک میں بیٹھ کر کہیں گھومنے نکل جائے گا اور کلینک بند ہونے کے وقت واپس کلینک پہنچ جائے گا۔

ساڑھے چار سال بعد اچانک ہمارے گھر پر پریشانی کا دروازہ کھل گیا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انجام کار کیا ہوگا۔ یہ معما بھی خاصا پریشان کن تھا کہ شمسہ کا شوہر کوئی زاہدی تھا یا اکمل؟

کلینک بند کروا کے جمشید گھر لوٹے تو اکمل ان کے ساتھ تھا۔

رات کے کھانے کے کچھ دیر بعد جمشید، اکمل کے ساتھ گیسٹ روم میں چلے گئے۔ انہوں نے چپکے سے مجھے بتایا تھا کہ وہ اکمل کو اور ٹٹولنے کی کوشش کریں گے، اس طرح شاید کوئی اور اہم بات معلوم ہو سکے۔
اور بات معلوم بھی ہوئی۔
دو گھنٹے بعد جب جمشید اپنے کمرے میں آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا ''زاہدی اور اکمل کا معما تو حل ہو گیا۔''
''کیسے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''اکمل ہی زاہدی ہے۔''
''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟''
''سنو تو سہی...... ! دراصل اکمل نے ان دنوں کے سارے اخبارات اپنے پاس رکھ چھوڑے ہیں جب وہ شمسہ کی موت کے بعد کراچی آیا تھا۔ اس نے مجھے وہ اخبارات دکھائے تھے۔ ان میں زاہدی ہی نام ہے۔ جب میں نے استفسار کیا تو اکمل نے بتایا کہ اسکول کے زمانے کے بعد، بلکہ اپنے والد کی موت کے بعد اس نے باپ کے نام کی رعایت سے اپنے نام میں زاہدی کا اضافہ کر لیا تھا۔ اپنا نام اکمل زاہدی لکھنے لگا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے جاننے والوں میں زاہدی ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اخبارات میں بھی اس کا یہی نام چھپا تھا۔''

''حد ہو گئی۔'' میرے منہ سے نکلا ''اس معمے نے تو بہت بری طرح الجھا دیا تھا۔''

''اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ ماہین کا باپ اکمل ہی ہے۔'' جمشید نے کہا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے ''دیکھو فرزانہ...... برا مت ماننا۔ ایک بات میں ضرور کہوں گا۔ ہمارے حالات اپنی جگہ لیکن اکمل ایک بدنصیب باپ تو ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے بے قرار ہے اور نہیں جانتا کہ بیٹی تو اس کے سامنے ہے۔''
''بس کھلنے نہ پائے یہ راز۔'' میری آواز بھرا گئی۔
جمشید چند لمحے کچھ سوچتے رہے، پھر میری طرف دیکھ کر بولے ''میں ارسلان سے بھی مل آیا ہوں۔''
''کب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''کلینک سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ بہانہ یہ کیا تھا کہ کسی مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔''
''پھر؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔
''ظاہر ہے۔ ارسلان بھی پریشان ہو گیا یہ سن کر۔''
''اکمل کے بارے میں سب کچھ بتا دیا آپ نے اسے؟''

''یہ سب کچھ بتانا تو ضروری تھا نا فرزانہ۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ احتیاطاً نازلی کو بھی بتا دے۔ وہ کل کسی وقت جائے گا نازلی سے ملنے، لیکن اس کے بعد......'' جمشید رک کر بولے ''میں نے اس سے کہا ہے کہ فی الحال ہم تینوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے رابطہ ختم کر لیں اور اس وقت تک ایک دوسرے سے نہ ملیں جب تک ضروری نہ ہو۔''
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
دوسرے دن کھانے کی میز پر اکمل نے اشارتاً کہا کہ

NOVEMBER.2004 SUSPENSE 310

اب اسے اپنے رہنے کا کچھ بندوبست کر لینا چاہیے لیکن جمشید نے اسے اس طرح ڈانٹ دیا جیسے بڑی محبت سے ڈانٹا ہو ''کوئی ضرورت نہیں ہے یہ بات سوچنے کی...... بس...... اب ہمارے ہی ساتھ رہنا ہے تمہیں۔''

اکمل نے ہلکی سی مسکراہٹ کی ساتھ میری طرف دیکھا ''سنا آپ نے......؟ میں نے تو ایرپورٹ سے یہاں آتے ہوئے مذاقاً ہی کہا تھا کہ بعض مہمان بلائے جان بن جاتے ہیں لیکن یہ جمشید تو خود ہی مجھے بلائے جان بنانے پر تیار ہو گیا ہے۔''

میں نے مسکرا کر بات ٹال دی لیکن مجھے غصہ آیا تھا جمشید پر۔ میں تو یہی مناسب سمجھ رہی تھی کہ اب ہمیں اکمل سے چھٹکارا پا لینا چاہیے۔

لیکن بعد میں جمشید نے مجھے سمجھایا ''اب اس کا ہمارے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے فرزانہ۔ اس کی وجہ سے ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ پولیس افسر...... کیا نام...... ہاں...... اجمیری...... اس کی جو بھی منصوبہ بندی ہوگی، وہ ہمیں اکمل سے معلوم ہوتی رہے گی۔''

''کیا یہ ضروری ہے کہ وہ اکمل کو ہر بات بتائے؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ اکمل کو بے خبر نہیں رکھے گا۔ آج شام بھی وہ اجمیری سے ملنے جا رہا ہے۔ جب میں کلینک جاؤں گا تو اسے پولیس ہیڈ کوارٹر چھوڑتا ہوا جاؤں گا۔''

میں جمشید کی بات رد نہیں کر سکی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا جیسے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔

شام کو جمشید کلینک گئے تو اکمل ان کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر گیا۔ وہاں سے وہ کہیں گھوم گھام کر کلینک کے بند ہوتے وقت وہاں پہنچ گیا تھا اور جمشید کے ساتھ ہی گھر آیا تھا۔

رات کو جمشید نے پر تشویش لہجے میں کہا ''اب دیکھو...... اکمل کے یہاں رہنے سے ایک اور بات معلوم ہوئی نا۔''

''کیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''اجمیری یہ کوشش کرنا چاہتا ہے کہ اگر کہیں سے آنکھوں کا ڈونیشن مل جائے تو وہ اس پارسی عورت کے لگوا دے۔''

''یا خدا!'' میرے منہ سے نکلا ''اگر اس عورت کو آنکھیں مل گئیں تو تم اور نازلی بھی خطرے میں پڑ سکتے ہو۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے اسے آنکھیں تو مل جائیں، اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے پھر یہ بھی کم از کم میں تو یقین نہیں کر سکتا کہ وہ اتنے عرصے بعد مجھے یا نازلی کو یا ہم دونوں میں سے کسی کو شناخت کر سکے گی۔''

''ہوشیار تو رہنا پڑے گا اس کی طرف سے۔''

''اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ اکمل ہمارے ساتھ رہے۔ ابھی کلینک سے آتے ہوئے بھی اس نے یہ بات چھیڑی تھی لیکن میں ٹال گیا۔ اب کل سے وہ کوئی ملازمت تلاش کرنے میں لگ جائے گا۔ میرا خیال ہے ملازمت اسے آسانی مل بھی جائے گی۔ کینیڈا کی ملازمت سے خاصا تجربہ حاصل ہوا ہے اسے...... اور ہاں...... ایک بات بتانا بھول گیا۔ کلینک میں ارسلان کا فون آیا تھا۔''

''ارے۔'' میں چونکی ''طے تو شاید یہ ہوا تھا کہ آپ تینوں ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں رہیں گے اور فون پر تو......''

''فون پر اس نے معاملے کی کوئی بات ہی نہیں کی۔ بس یہ بتایا کہ وہ دو تین دن کے اندر میڈیکل کے کسی شعبے میں اسپیشلائز کرنے کے لیے امریکا جا رہا ہے۔''

''اور وہ لڑکی جس سے اس کی شادی نہیں ہو پا رہی۔''

''لڑکی سے بات کر لی ہے اس نے۔ وہ ہفتہ دس دن بعد چپکے سے، میرا مطلب ہے، اپنے والدین کو بتائے بغیر امریکا پہنچ جائے گی اور وہاں وہ دونوں شادی کر لیں گے۔''

میں نے سوچتے ہوئے کہا ''یہ اچھا ہے کہ ارسلان یہاں سے چلا جائے۔''

لیکن میری یہ خواہش اس طرح پوری ہوئی کہ ارسلان دنیا ہی سے چلا گیا۔ وہ جس طیارے سے امریکا جا رہا تھا، وہ کریش ہو گیا۔ اس کی موت سے اس کی محبوبہ پر کیا گزری؟ یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن جمشید اس کے لیے بہت افسردہ رہے اور ان کی افسردگی کچھ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی ختم ہوئی۔

اب میں پھر اپنی بات دہراؤں گی کہ قدرت کے معاملات نہایت طے شدہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی شادی اسی لیے نہیں ہو سکی تھی کہ قدرت اس لڑکی کو زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اگر ان دونوں کی شادی ہو جاتی تو ارسلان اسے بھی ساتھ لے جاتا اور اس کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہو جاتی۔

بعد میں کسی طرح ارسلان کو پتا چلا تھا کہ اس لڑکی نے اپنے والدین کی خواہش کے مطابق کسی سے شادی کر لی تھی۔ یہ مجھے کبھی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ ارسلان کی محبت بھلا کر اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنا سکی ہوگی یا نہیں۔

انہی دنوں میں اکمل کو ملازمت بھی مل گئی تھی۔ صبح وہ جمشید سے بھی پہلے گھر سے جانے لگا۔ اجمیری اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا لیکن ابھی اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کے آثار دکھائی دے رہے تھے لیکن جمشید کی یہ بات مجھے

کا خیال ہے کہ وہ عورت ایک ہفتے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی اور اس مریضہ نے وصیت کی ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کی آنکھیں کسی کو دے دی جائیں۔ اب اجمیری یہ کوشش کر رہا ہے کہ وہ آنکھیں اس پارسی عورت کو مل جائیں۔''

اس وقت نہ جانے کیوں' میرے ساتھ جمشید بھی ذرا دیر کے لیے چپ رہ گئے۔

''ارے!'' وہ ہم دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' جمشید نے جلدی سے کہا اور خوامخواہ ہنسنے لگے۔

اکمل نے ٹھنڈی سانس لی ''ابھی مجھے ایسا لگا...... جیسے تم دونوں نہیں چاہتے کہ میری بیوی کی موت کے ذمے داروں کا پتا لگ سکے۔''

''ارے نہیں اکمل!'' جمشید پھر جلدی سے بولے ''ہم آخر ایسا کیوں چاہیں گے؟''

''تم دونوں یہ سن کر ایک دم چپ ہوگئے تھے کہ اس پارسی عورت کی بصارت واپس آنے کا ایک امکان پیدا ہوا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے اکمل۔ دراصل یہ بات بہت دن بعد اچانک سامنے آئی۔ ہم تو مایوس سے ہوگئے تھے اس کی طرف سے۔''

''خیر چھوڑو!'' مجھے ایسا لگا جیسے اس نے مسکرانے کی کوشش کی ہو۔

پھر رات کو ہم لوگ جب کھانے کی تیاری کر رہے تھے اور اکمل اور جمشید نے کرسیاں سنبھال بھی لی تھیں تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کال مجھے ریسیو کرنا پڑی۔

''ہیلو!''

دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی ''میرا نام اجمیری ہے۔ کیا اکمل صاحب سے بات کرسکتا ہوں؟''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''جی ہاں۔'' شاید میری آواز بھی لرز گئی ''ابھی بلاتی ہوں۔''

پھر میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آواز دی ''آپ کا فون ہے اکمل!''

اکمل نے کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھتے ہوئے پوچھا ''یہاں کا نمبر تو میں نے صرف اجمیری کو دیا ہے۔''

''وہی ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

ریسیور اکمل کو دے کر میں ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے اجمیری سے اکمل کی باتیں سننے کے خیال سے ہی ڈر لگتا تھا۔ جب میں ڈائننگ ٹیبل کے قریب پہنچی تو جمشید مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سوال تھا لیکن میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی۔

اکمل جلد ہی بات ختم کرکے ہماری طرف آیا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ میں تو اس وقت اس سے کوئی سوال کرنے کی ہمت کر ہی نہیں سکتی تھی لیکن جمشید نے پوچھ لیا۔

''اجمیری کا فون تھا؟''

''ہاں۔'' اکمل نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ماہین کی طرف دیکھا جو اس وقت جمشید کی گود سے میری گود میں آگئی تھی۔

''کوئی خاص بات؟'' جمشید نے پوچھا۔

اکمل نے ٹھنڈی سانس لی ''وہ پارسی عورت بلڈ پریشر کی مریضہ تھی۔ ابھی اس کی موت کی اطلاع ملی ہے اجمیری کو۔''

یہ جواب سن کر مجھے ایسا لگا جیسے مجھ پر سے پہاڑ جیسا کوئی وزن اتر گیا ہو۔

''بہت مایوس تھا اجمیری!'' اکمل نے بتایا۔

''گویا آخری امید بھی ختم ہوئی۔'' جمشید نے کہا۔

''ہاں۔'' اکمل نے کہا ''اور اب میری خواہش ہے کہ اجمیری کو اور کوئی سراغ نہ ملے۔''

''کیوں؟'' میں بول پڑی۔

''امیدیں جو بندھتی اور ٹوٹتی رہی ہیں' ان سے' مجھے لگتا ہے کہ میرے اعصاب پر بھی اثر پڑا ہے۔ یہ معاملہ اب مکمل طور سے دب جائے تو اچھا ہے۔ جو کچھ ہوگیا' اسے اب میں صبر کرلینا چاہتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ اب میں شمسہ کو بھول جاؤں۔''

''لیکن...... کیا اپنی بیٹی کو بھی بھول سکو گے؟'' جمشید نے پوچھا۔

''بیٹی کو؟'' اکمل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ماہین کی طرف دیکھا ''ایک پیاری سی بیٹی مجھے یہ جو مل گئی ہے۔ اب میں خود کو یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ یہی میری گمشدہ بیٹی ہے۔''

اس وقت میرے دل کی جو حالت ہوئی تھی' وہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ شاید اس وقت میرے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا ہو۔

جمشید نے ہنس کر کہا ''چلو بھئی اب کھانا تو شروع کرو۔''

کھانا شروع کیا گیا اور پھر اجمل نے خود ہی موضوع گفتگو بدل دیا۔

NOVEMBER.2004 SUSPENSE

رات کو سوتے وقت میں اور جمشید اس موضوع پر باتیں کرنے لگے۔

میں نے کہا ''میرا تو دماغ جھنجھنا گیا تھا جب اس نے میری ماہین کی طرف دیکھ کر یہ بات کہی تھی۔''

''دل تو میرا بھی دھڑک گیا تھا لیکن پھر میں نے خود کو مطمئن کرلیا۔ اس نے ایسے ہی کہہ دی تھی وہ بات۔ واقعی اب اس بے چارے کے اعصاب ٹوٹنے لگے ہوں گے۔ بار بار امید بندھے اور ٹوٹ جائے تو قیامت گزر تی رہتی ہے آدمی پر۔''

''آپ اسے شادی کا مشورہ کیوں نہیں دیتے؟''

''کیا مطلب؟''

''وہ دوسری شادی کرلے تو اس کا ذہنی انتشار ختم ہوسکتا ہے۔''

جمشید نے سوچتے ہوئے کہا ''بات تو ٹھیک سوچی ہے تم نے۔ کسی وقت موقع دیکھ کر چھیڑوں گا میں اسے؟''

شاید یہ مشورہ دیتے وقت میرے ذہن میں کسی جگہ یہ بات بھی تھی کہ شادی کرنے کے بعد تو اکمل ہمارے گھر سے چلا ہی جائے گا۔

گزشتہ راتوں کی بہ نسبت اس رات میں کچھ زیادہ سکون سے سوئی۔ مجھے یہ احساس ہوگیا تھا کہ اب سب خطرات ٹل چکے تھے۔

لیکن اب جو کچھ ہونے والا تھا، اس سے میں یکسر بے خبر تھی۔ زندگی کا ایک بہت اذیت ناک لمحہ سر پر آچکا تھا اور میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ انسان کی اس بے خبری کو کیا کہا جائے؟ شاید یہ ایک اچھا ہی نظام ہے قدرت کا ورنہ آنے والے سانحات سے باخبری تو انسان کی جان پہلے ہی سے آدھی کردے۔

اگلے روز رات کے کھانے کے بعد پروگرام بنا کہ تھوڑی دیر باہر گھوما جائے اور آئس کریم بھی کھائی جائے۔ ماہین اس پروگرام سے بہت خوش ہوئی اور اسے خوش دیکھ کر اکمل تو کھلا کھلا نظر آنے ہی لگتا تھا۔

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھوم کر جمشید نے ایک جگہ کار روکی۔ ان دنوں وہاں آئس کریم کی ایک بہت اچھی اور ڈیکوریٹڈ دکان کھلی تھی۔ اب تو شاید وہ بند ہوچکی ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم باہر نکلے۔ کار سڑک کے پار کھڑی تھی۔

''تم یہیں رکو فرزانہ!'' جمشید نے کہا ''میں کار گھما کے ادھر لاتا ہوں۔''

میں رک گئی۔ ماہین میری گود میں تھی۔ اس نے اکمل کا ہاتھ پکڑلیا۔

''آپ بھی یہیں رہیں اکمل انکل!''

اکمل ہنس کر رک گیا لیکن پھر فوراً ہی چونکا۔ ایک جانب سے ایک بہت تیز رفتار ٹرک اچانک اس سڑک پر مڑا تھا۔ میرے منہ سے یہ دیکھ کر چیخ نکل گئی کہ جمشید اس ٹرک کی زد میں آسکتے تھے۔

''جمشید!'' اکمل چیختا ہوا جمشید کی طرف دوڑا۔

اور پھر سب کچھ جیسے ایک ساعت میں ہوگیا۔ ایک منحوس ساعت جو مجھے بیوہ کرگئی۔ اکمل نے جس طرح جمشید کو بچانے کی کوشش کی تھی، اسے دیکھتے ہوئے ہر شخص نے بعد میں یہی کہا کہ اکمل نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جمشید کو اسپتال جانا بھی صرف اس لیے نصیب ہوا کہ پولیس تو ''پوسٹ مارٹم'' کے لیے جیسے بے قرار رہتی ہے ورنہ انہیں اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سڑک پر ان کا سر پھٹ گیا تھا اور بھیجا باہر نکل کر بکھر گیا تھا۔

☆☆☆

شادی کے سات ساڑھے سال بعد بیوگی کا داغ عورت کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، اس کا اندازہ عام لوگ کر ہی نہیں سکتے۔

جمشید کی موت نے اکمل پر بھی اتنا اثر کیا تھا کہ اسے چپ سی لگ کر رہ گئی تھی۔ مجھ سے اس کی بہت کم بات ہوتی تھی۔ صرف ماہین سے باتیں کرتے وقت اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی تھی۔

جمشید کی موت پر ماہین بھی ''ہائے ابو ہائے'' کہہ کر بہت روئی اور تڑپی تھی لیکن وہ بہرحال بچی تھی۔ اسے نسبتاً جلد قرار آگیا اور اس کی ایک وجہ اکمل بھی تھا جو اسے بہلانے کی حتی الامکان کوششیں کرتا رہتا تھا۔

اس دوران میں نازلی بھی مجھ سے ملنے اور میرا غم بٹانے آتی رہی اور اس نے مجھے ایک بار پھر یاد دلایا کہ وہ اکمل کے سلسلے میں مجھے کیا مشورہ دے چکی تھی۔

جمشید کی موت کے دو ماہ بعد میں نے اکمل کو تنہائی میں یہ اشارہ دیا کہ جمشید کے بعد اب اس کا میرے ساتھ رہنا شاید مناسب نہیں ہوگی۔

''میں سمجھتا ہوں فرزانہ!'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''میں خود بھی اس بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ بس ماہین کی محبت میرے پیر جکڑے رہی ورنہ جاچکا ہوتا اب تک لیکن آپ سے ایک وعدہ لے کر ضرور جاتا۔''

''کیسا وعدہ؟''

''آپ مجھے اور ماہین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا نہیں کریں گی اور مجھے اجازت دیں گی کہ میں کبھی کبھی اس سے ملنے آجایا کروں۔''

''اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

دراصل میں اس معاملے کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میں ماہرین اور اکمل کی ملاقاتیں کم کرتی چلی جاؤں گی۔ مجھے صرف اکمل ہی کی محبت کا نہیں بلکہ ماہین کی محبت کا خیال بھی تھا جو وہ اکمل سے کرنے لگی تھی۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کا کام بتدریج ہی ہوسکتا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور اکمل نے اسی وقت اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا جو گزرے ہوئے عرصے میں اس اٹیچی کیس سے کہیں زیادہ ہوگیا تھا جو اس وقت اکمل کے ہاتھ میں تھی جب وہ کراچی آیا تھا۔

ماہین کو میں اس وقت اکمل کے کمرے میں نہیں جانے دینا چاہتی تھی لیکن جب وہ ضد کرتے کرتے روہانسی ہونے لگی تو میں خود اسے لے کر اکمل کے کمرے میں گئی۔ وہ مجھ سے انگلی چھڑا کر اکمل کے پاس جاکے اس سے لپٹ گئی اور اس سے پوچھنے لگی ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں انکل!''

اکمل نے اسے بہت قاعدے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ وہاں سے جارہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ماہین سے جدا ہوجائے گا لیکن ماہین تو اسی بات پر تڑپ گئی کہ اکمل اسے چھوڑ کر جارہا تھا۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا کہ اکمل نہیں جائے گا اور اگر جائے گا تو وہ بھی اس کے ساتھ جائے گی اور مجھے بھی لے جائے گی۔

مجھے اس کے چیخنے چلانے پر غصہ آگیا اور میں نے اسے ڈانٹا تو وہ بے تحاشا رونے لگی۔ اکمل نے اسے چپ کرانے کی، سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور زیادہ رونے لگی اور اس وقت اکمل کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے جو اس نے ماہین سے چھپانے کی کوشش کی اور رومال سے اپنی آنکھیں خشک کر کے مجھ سے کہا ''اسے کمرے میں لے جاکر سلانے کی کوشش کیجئے ورنہ یہ روتی ہی رہے گی۔''

اس وقت ماہین نے یہ ضد شروع کر دی کہ اکمل بھی ساتھ چلے۔ غالباً اسے ڈر تھا کہ وہ میرے ساتھ کمرے میں گئی تو اکمل چلا جائے گا۔

میں نے اسے گود میں لیا تو پریشان ہوگئی۔ اتنی سی دیر میں وہ ایسا بلک بلک کر روئی تھی کہ اسے حرارت ہوگئی تھی۔ اب اس کی بات نہ مانی جاتی تو اس کی طبیعت اور خراب ہوسکتی تھی۔ مجھے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ وہ پہلا موقع تھا جب اکمل میرے ساتھ میرے کمرے میں گیا۔ ماہین کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ بستر کے ایک طرف اکمل اور دوسری طرف میں بیٹھ گئی۔ ماہین کو بڑی مشکل سے چپ کرایا جاسکا لیکن وہ سوئی نہیں اور لیٹے لیٹے اکمل کا ہاتھ پکڑے رہی۔

میں پریشان تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال سے کس طرح نکلا جائے۔ اکمل نے میری پریشانی اور بڑھا دی۔ اس نے مجھ سے کہا ''کسی ڈاکٹر کو فون کر دیجئے۔''

''کیوں؟'' میں چونکی۔

''ماہین کا بخار تیز ہوتا جارہا ہے۔'' اکمل نے بتایا۔

میں نے جلدی سے ماہین کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور گھبرا گئی۔ ماہین کا بخار خاصا بڑھ چکا تھا۔ نازلی نے اگر پریکٹس نہ چھوڑی ہوتی تو میں اسی کو بلاتی لیکن فون میں نے اسے ہی کیا اور وہ اپنے شوہر ڈاکٹر اسلم کے ساتھ خود بھی آگئی۔

ڈاکٹر اسلم نے بخار کی وجہ پوچھی۔ نازلی نے اسے اکمل کی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ اکمل، میرے مرحوم دوست جمشید کا دوست تھا اور ماہین اس سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔

ڈاکٹر اسلم نے فوری طور پر تو ماہین کو ایک انجکشن لگایا اور پھر ایک پرچے پر دوائیں لکھ کر دیں ''یہ فوراً منگا لیجئے۔''

میں نے ملازم کو دوائیں دینے کے لیے دوڑا دیا۔ دوائیں آنے تک ڈاکٹر اسلم نے رکنا ضروری سمجھا۔ دوائیں آگئیں تو وہ ماہین کو دی گئیں۔ ان دونوں میں کچھ ایسے اثرات بھی تھے کہ ماہین کو نیند آگئی۔

نازلی نے اپنے شوہر کو رخصت کر دیا اور خود میرے پاس ماہین کے بستر کے قریب بیٹھی رہی۔ اکمل یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کرے گا۔

نازلی نے مجھ سے کہا ''پہلے تم جاکے اکمل سے مل لو۔ شاید وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں یہاں ماہین کے پاس بیٹھی ہوں۔''

نازلی نے جو کچھ کہا تھا، مجھے اس سے اتفاق تھا۔ اکمل یقیناً مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے کمرے میں گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے ایک کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔ شاید اسے خیال نہیں ہوگا کہ میں فوراً آجاؤں گی۔ وہ فوراً اٹھ کر باتھ روم میں گیا اور منہ دھو کے اپنا حلیہ درست کر کے باہر نکلا، لیکن افسردگی اس کے چہرے پر اب بھی تھی۔

''ماہین اب سو رہی ہے۔'' اس نے مجھ سے نظریں

دنیاوی مسائل رُوحانی مشورے

رُوحانی اسکالر محمد علی قادری دنیاوی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اللہ تعالیٰ کے ناموں سے پیش کرتے ہیں

حج کی سعادت

قادری صاحب! تقریباً 30 سال سے حج اور عمرہ کرنے کی کوشش میں تھا ۔لیکن ہر دفعہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہو جاتی تھی۔ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے مجھے ''یَابَاسِطُ یَاغَنِیُّ'' پڑھنے کو بتایا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ ربیع الاول کے مہینے میں عمرہ ادا کر لیا۔ اب حج کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کی اجازت چاہیے کہ وظیفہ اور کب تک جاری رکھوں؟

(شہریار خان۔ راولپنڈی)

☆ لوح کو حفاظت سے رکھیں۔ وظیفہ پڑھتے رہیں۔ انشاء اللہ حج کی سعادت جلد حاصل ہوگی۔

ذہنی کمزوری

قادری صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا ذہن بہت کمزور ہے کوئی بات یاد نہیں رہتی اور جسم بھی دبلا پتلا ہے براہ کرم میری پریشانی کا حل بتا دیں شکر گزار رہوں گا؟

(شاہد صدیقی۔ شکارپور)

☆ بیٹا آپ ''یَاحَسِیبُ یَاقَوِیُّ'' ایک ہزار دفعہ ہر جمعرات نماز عشاء کے بعد پڑھا کریں۔ یہ عمل سات جمعرات تک پڑھیں اللہ تعالیٰ آپ کو شفاء عطا کرے گا۔

میرے دوست کی مدد کریں

قادری صاحب! میں بہت غریب تھا میں ہر وقت اپنے حالات بدلنے کی ترکیبیں سوچا کرتا تھا میں نے آپ کو اپنا مسئلہ بتایا آپ نے نقش تسخیر خاص بنا کر دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس بونڈ کی پرچیاں تھیں جو لگ گئیں اس سے مجھے کافی مالی فائدہ ہوا اور میرے حالات بدل گئے۔ آپ میرے دوست کو بھی نقش بنا کر دے دیں تاکہ اس کے بھی حالات بدل جائیں۔

(فاروق خان۔۔۔ کراچی)

جواب: اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے حالات صحیح ہو گئے۔ آپ اپنے دوست کو کہیں کہ ملاقات کر کے نقش حاصل کر لیں۔

شادی ہو چکی ہے

شاہ صاحب! میں نے اپنی بچی کی شادی کیلئے نقش مراد چاندی بنوائی تھی ۔اس کی شادی ہو چکی ہے۔ میرے ایک بڑے بھائی ہیں ان کی تین بیٹیاں ہیں مگر ان کے رشتے نہیں آتے آپ میرے بھائی کو بھی نقش بنا کر دیں کہ ان کی بیٹاں بھی اپنے گھر کی ہو جائیں۔

(صلاح الدین، بلوچستان)

☆ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی بیٹی کی شادی ہو گئی۔ آپ اپنے بھائی کو کہیں کہ وہ خط لکھ کر نقش منگوا لیں۔

لوح مراد چاندی

قادری صاحب! میں نے اپنی شادی کیلئے لوح مراد چاندی بنوائی تھی۔ اللہ کا کرم ہے شعبان میں نکاح ہو گیا۔ رمضان کے بعد رخصتی ہو گی۔ اب بتائیں لوح کا کیا کروں؟

(آصف جمال، مورو)

☆ بیٹا نکاح مبارک ہو۔ رخصتی ہونے تک لوح کو حفاظت سے رکھیں۔

ملائے بغیر دھیمی آواز میں کہا ''کیا مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میرا مطلب ہے...... کیا میں چلا جاؤں۔''
میں جو پہلے ہی ہر پہلو پر سوچ چکی تھی' آہستہ سے بولی ''نہیں...... جب وہ جاگے گی اور آپ کو نہیں پائے گی تو اس کی حالت پھر خراب ہو جائے گی۔ ابھی آپ یہاں سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔''
''میں بس یہی پوچھنا چاہتا تھا۔''
میں واپس اپنے کمرے میں پہنچی۔ نازلی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اکمل سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔
نازلی نے تفکر آمیز لہجے میں کہا ''یہ بہت برا ہوا ہے۔ میں نے جمشید کی زندگی ہی میں تمہیں مشورہ دیا تھا کہ اکمل سے جان چھڑا لو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت بھی اکمل اور ماہین ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن جمشید کی موجودگی کی وجہ سے ماہین کو سنبھالنا آسان ہو جاتا۔''
''شاید ایک غلطی ہو گئی ہے مجھ سے۔''
''وہ کیا؟''
''آج اتوار ہے۔ اکمل کو کسی ایسے دن رخصت کرنا چاہیے تھا جب ماہین اسکول میں ہو۔''
''نہیں...... اس سے کچھ نہیں ہوتا۔'' نازلی نے جواب دیا ''ابھی جب تم اکمل سے ملنے گئی تھیں تو فون پر اسلم سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے میرے اس اندیشے کی تصدیق کی ہے کہ اب اکمل اور ماہین کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بہت مشکل نظر آ رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بلا کی محبت کرنے لگے ہیں۔ اکمل بچہ نہیں ہے اس لیے خود پر قابو پا سکتا ہے لیکن ماہین کے لیے یہ شاید ممکن نہ ہو۔ اگر اس کی لاعلمی میں بھی اکمل نے یہ گھر چھوڑا تو ماہین کچھ ایسی ہی حالت سے دوچار ہو سکتی ہے۔''
میں روہانسی ہو گئی ''میں کیا کروں نازلی؟''
''ابھی اکمل کو یہیں رہنے دو۔ اس کی موجودگی ہی میں یہ کوشش کرو کہ ان دونوں کی محبت میں کمی واقع ہو سکے۔''
میں چپ ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہو گا۔
''اچھا میں اب چلوں گی۔'' نازلی نے کہا ''اسلم نے فون پر کہا تھا کہ میں جلدی آ جاؤں۔ انہیں کسی سے ملاقات کے لیے جانا ہے اور وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ...... معاف کرنا' میں اس وقت تمہیں چھوڑنے باہر تک نہیں جا سکوں گی۔''
''اس تکلف کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم ماہین کے پاس رکو اور ہاں...... دوا وقت پر دیتی رہنا...... اور اگر چار گھنٹے کے اندر اندر بخار نہ اترے تو مجھے فون کر دینا۔ میں اسلم کو لے کر آ جاؤں گی۔''
میں نے سر ہلا دیا اور اسے چھوڑنے کے لیے بس کمرے کے دروازے تک گئی۔ اس کے بعد بستر پر ماہین کے قریب ہی لیٹ گئی اور دیر تک روتی رہی۔ کئی دن بعد جمشید مجھے بڑی شدت سے یاد آئے۔
دو گھنٹے بعد ماہین بیدار ہوئی۔ اس کا بخار کافی کم ہو گیا تھا۔ جاگتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد پوچھا ''انکل کہاں ہیں؟''
میں نہیں چاہتی تھی کہ ماہین کے دل میں کوئی اندیشہ پیدا ہو اور اس کی سنبھلتی ہوئی طبیعت پھر بگڑ جائے اس لیے میں نے اکمل کو بلا لیا۔ ماہین کو اس وقت دوا بھی دینا تھی۔ اس کی ضد پر دوا اسے اکمل نے کھلائی۔
''آپ یہاں سے گئے نا تو...... میں تو مر جاؤں گی۔'' ماہین نے کہا اور میرا کلیجا ہل گیا۔
اکمل نے ماہین کی پیشانی چومی اور جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''نہیں ماہی...... میں نہیں جاؤں گا' لیکن ایسی غلط بات اب اپنی زبان پر کبھی نہ لانا۔ میں ناراض ہو جاؤں گا تم سے۔''
ماہین اس وقت بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرائی تھی۔
دو گھنٹے بعد خود نازلی نے فون کیا اور میں نے اسے بتایا کہ ماہین کو اب بخار نہیں ہے۔
''اسلم کا بھی یہی خیال تھا۔'' نازلی نے جواب دیا ''ماہین کے بخار کی وجہ ایسی تھی کہ بخار زیادہ دیر تک رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔''
دو ایک باتوں کے بعد نازلی نے فون بند کر دیا۔
☆☆☆
وقت پھر اسی طرح گزرنے لگا جس طرح گزر رہا تھا لیکن میری ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی کہ میں اکمل اور ماہین کی محبت کم کر سکتی۔ میرے رویے کو محسوس کرتے ہوئے اکمل تو یہ کوشش کرنے لگا تھا کہ ماہین سے بہت زیادہ قریب نہ ہو لیکن ماہین خود ہی اس سے لپٹی چپٹی رہتی تھی جسے روکنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب میں اکمل سے کبھی جان نہیں چھڑا سکوں گی۔
پھر آس پاس رہنے والوں کی سرگوشیاں بھی میرے

کانوں تک پہنچنے لگیں۔ میں ان لوگوں کو برا بھلا بھی نہیں کہوں گی۔ یہ واقعی ایک معیوب بات تھی کہ جمشید کی موت کے بعد بھی اکمل میرے گھر میں رہ رہا تھا۔

اس سارے دورانیے میں میرے والدین کا آنا جانا بھی رہا تھا لیکن اس کا تذکرہ میں اس لیے نہیں کر رہی ہوں کہ میری کہانی سے ان لوگوں کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

اس دن کے بعد اکمل نے بھی یہ ذکر نہیں چھیڑا کہ اسے میرے گھر سے چلا جانا چاہیے۔ نتیجہ یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ میں کچھ چڑچڑی ہوتی چلی گئی۔ اپنے مزاج کی اس تبدیلی کی وجہ سے میں اکمل سے بہت سخت لہجے میں بات کر جاتی تھی لیکن اس نے کبھی ایسا تاثر نہیں دیا کہ اس نے میری بات کا برا مانا تھا۔ غالباً اس نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میری... چڑچڑاہٹ کی وجہ کیا تھی۔ آس پاس کے لوگوں کی جو سرگوشیاں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کے کانوں تک نہ پہنچ رہی ہوں۔

پھر بات اور آگے بڑھی۔ لوگوں نے اب آتے جاتے جملے کسنا بھی شروع کر دیئے۔ انہی حالات میں ایک بار میں نازلی کے گھر گئی تھی اور پھر ماہین کے اسکول کے پاس اکمل کو بھی دیکھا تھا۔

یہ باتیں میں شروع ہی میں لکھ چکی ہوں۔ یہ باتیں جمشید کی موت کے لگ بھگ ایک سال بعد کی ہیں۔ اس دوران میں نازلی کئی مرتبہ مجھے یہ مشورہ دے چکی تھی کہ میں اکمل سے شادی کر لوں تو لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے اور اس دن بھی اشاروں میں اس نے یہ بات کہی تھی لیکن اکمل سے شادی کرنے پر میرا دل آمادہ تھا' نہ دماغ۔

ایک سال سے اکمل نے کوئی دوسری ملازمت کر لی تھی جہاں سے اسے دوپہر کو ہی چھٹی مل جاتی تھی۔ اسی لیے اسے ماہین کے اسکول جانے کا موقع ملنے لگا تھا لیکن اس کے بعد وہ کبھی ماہین کے اسکول نہیں گیا۔ میں نے کئی مرتبہ یہ بات چیک کرنے کی کوشش کی تھی اور آدھے گھنٹے پہلے ماہین کے اسکول پہنچی تھی۔

یا اگر اکمل اس کے بعد بھی جاتا رہا ہو تو مجھے اس کا علم نہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ میرے دل و دماغ میں یہ بات گھر کرنے لگی کہ میرے مسئلے کا حل واقعی صرف وہ ہے جو نازلی نے تجویز کیا تھا۔ یعنی اکمل سے شادی!

لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے دل و دماغ کو اس کے لیے پوری طرح آمادہ کر سکتی' مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف

ہوا۔ ابتدا میں تو اکمل کے سر میں صرف درد رہنے لگا تھا لیکن جلد ہی یہ بات سامنے آ گئی کہ اس کے دماغ میں رسولی ہو گئی تھی۔

میں کیونکہ ان دنوں خود کو اکمل سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے یہ بات معلوم ہونے پر میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔

چند دن بعد اکمل نے مجھے بتایا ''ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب مجھے اسپتال میں ایڈمٹ ہو جانا چاہیے۔''

''تو کیا...... آپریشن......؟'' میں اٹک اٹک کر بولی۔

''رسولی کا اور کوئی علاج بھی کہاں ہے فرزانہ!'' اکمل نے جواب دیا۔

یہ جواب دیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ اپنی زندگی اتنے خطرے میں پانے کے باوجود وہ مسکرا رہا تھا۔

اور پھر اکمل ایک بہت بڑے اسپتال میں داخل ہو گیا۔ ملازمت وہ چھوڑ چکا تھا لیکن پیسے کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔

اسپتال کا اتنا بڑا کمرا لیا گیا تھا کہ میں اور ماہین بھی وہاں رہ سکتے تھے۔ ماہین سال بھر میں خاصی سمجھ دار ہو چکی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے اکمل انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ علاج کے لیے اسپتال آئے ہیں۔

صبح میں اسے اسکول چھوڑ آتی اور دوپہر کو لے آتی۔ گھر جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ میں ہر وقت اکمل کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں اس سے شادی کرنے کے لیے آمادہ ہو چکی تھی۔ اسے بس انسانی ہمدردی ہی کہنا چاہیے۔ اس نے بہرحال میرے گھر میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا اور بہرحال میری ماہین کا باپ وہی تھا۔

کبھی کبھی میں سوچتی، اس آپریشن سے اکمل ممکن ہے زندہ نہ بچ سکے، تو پھر کیوں نہ میں اس پر وہ راز افشا کر دوں جو اب تک اس سے چھپائے رہی تھی۔ اچھا تھا اگر مرنے سے پہلے اسے معلوم ہو جاتا کہ ماہین اسی کی بیٹی تھی۔

لیکن وہ سب کچھ کہنے کی مجھے ہمت نہیں ہو سکی۔

ایک دن میں ماہین کو اسکول سے لے کر اسپتال پہنچی تو میں نے ایک وکیل کو اکمل کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔

''یہ...... وکیل صاحب کیوں آئے تھے؟'' میں نے اکمل کے قریب جا کر تعجب سے پوچھا۔

اکمل نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''بیٹھیے...... کچھ بتانا ہے آپ کو۔''

میں کرسی پر بیٹھ گئی لیکن ماہین بستر پر چڑھ کر اکمل کے بازو پر لیٹ گئی۔

''فرزانہ!'' اکمل نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا ''یہاں آنے کے بعد میں نے جو ملازمتیں کیں، ان کا مقصد وقت گزاری کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ پیسے کی میرے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ کینیڈا میں رہ کر میں نے بہت کمایا تھا لیکن خرچ کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ شمسہ کے بغیر زندگی کی ساری رعنائیاں میرے لیے بالکل پھیکی پڑ چکی تھیں۔ وہاں میں نے جو کچھ کمایا تھا، وہ آج بھی محفوظ ہے۔'' اکمل نے سرہانے سے ایک فائل نکال کر میری طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کاغذات ہیں کچھ جو میں نے وکیل سے تیار کروائے ہیں۔ انہیں آپ اطمینان سے پڑھ لیجیے گا۔ میں آپ کو زبانی بتائے دیتا ہوں کہ میں نے اپنا سارا روپیا ماہین کے نام کر دیا ہے۔''

''جی!'' میں چونک گئی۔

''جی ہاں۔'' اکمل مسکرا رہا تھا ''میں جانتا ہوں کہ جمشید نے بہت کچھ چھوڑا ہے لیکن میری خواہش ہے کہ......'' اکمل کی آواز بھرا گئی ''میرا یہ روپیا بھی ماہین کی شادی پر خرچ کر دیا جائے۔''

اس وقت میں بھی جذباتی ہو گئی ''آپ اپنا یہ ارمان ضرور پورا کر لیجیے گا لیکن یہ کیا ضروری تھا کہ آپ وہ سب کچھ ابھی سے ماہین کے نام کر دیں۔ آپریشن کے بعد آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''نہیں فرزانہ!'' اکمل نے مسکراتے ہوئے کہا ''میں نے ڈاکٹروں کی باتوں سے اندازہ لگا لیا ہے کہ آپریشن کی کامیابی کا امکان برائے نام ہے اور میرا دل بھی کہہ رہا ہے کہ میں اب بچوں گا نہیں۔''

ماہین کے ہاتھ میں اس وقت کارٹون کی ایک کتاب تھی اس لیے وہ ہماری باتیں نہیں سن رہی تھی۔

''ناامید ہونا تو اچھی بات نہیں ہے۔'' وہ پہلا موقع تھا جب میں اکمل کے لیے روہانسی ہو گئی۔

''اور حقیقت سے آنکھیں نہ ملانا بزدلی ہے۔'' اکمل نے فائل کی طرف اشارہ کیا ''یہ میں نے آج ہی اس لیے تیار کروا لیے کہ تھوڑی دیر بعد مجھے آپریشن کے لیے لے جایا جانے والا ہے۔''

''ارے!'' میرے منہ سے نکلا ''یہ کب معلوم ہوا آپ کو۔''

''مجھے کل ہی معلوم ہو گیا تھا لیکن میں نے آپ کو نہیں بتایا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ اس وقت تک آپ ماہین کو لے کر اسکول سے آ جائیں گی۔''

''آپ کو کل ہی بتانا چاہیے تھا۔'' میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑ جاتا فرزانہ..... خوامخواہ آپ کی ایک رات بے چینی میں کٹتی۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ جب سے میں اسپتال آیا ہوں، مجھ سے آپ کا رویہ بہت بدل گیا ہے۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھنے لگا ہوں کہ آخری وقت میں آپ کا لہجہ میرے لیے ہمدردانہ ہو گیا ہے۔''

اس وقت میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے نظریں جھکا کر کہا ''میں اپنے سابقہ رویے پر معافی چاہتی ہوں۔''

وہ دھیرے سے ہنسا ''بس تو پھر سمجھ لیں کہ..... سارے شکوے مٹ گئے، سارا گلہ جاتا رہا۔''

میری آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے اور مجھے جلدی سے اپنا رومال نکالنا پڑا کیونکہ اسی وقت کچھ لوگ اسٹریچر لے کر کمرے میں آئے تھے۔

''پلیز!'' اکمل نے ان لوگوں سے کہا ''مجھے بس دو منٹ اور دے دیں..... صرف دو منٹ!'' اس نے میری طرف اشارہ کیا ''میں ان سے بس ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔''

ان لوگوں نے اکمل کی درخواست فوراً مان لی اور اسٹریچر چھوڑ کر کمرے سے چلے گئے۔

میں سوالیہ نظروں سے اکمل کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر اب بڑے گمبھیر تاثرات تھے۔ اس نے چند لمحے رک کر کہا ''میری بیوی شمسہ کی پشت پر، گردن سے ذرا نیچے پدم کا ایک گول نشان تھا۔''

یکایک میرا دل بڑی زور سے اچھلا۔

اکمل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی ''کہا جاتا ہے کہ جس کے جسم پر پدم کا نشان ہو، اس پر دولت کی بارش ہوتی رہتی ہے لیکن میری شمسہ کے معاملے میں یہ روایت غلط ہو گئی۔ اس بدنصیب نے تو دولت دیکھی ہی نہیں البتہ ماہین کی شادی پر میرے اسّی لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ یہی رقم میں نے اس کے نام کی ہے۔ یہ رقم اس کے لیے شاید یوں جمع رہی کہ پدم کا نشان اس کی پشت پر بھی ہے۔ بالکل اسی جگہ جہاں شمسہ کے تھا اور شمسہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نشان موروثی تھا۔ خاندان میں پیدا ہونے والی ہر لڑکی کے جسم پر وہ نشان ضرور پایا گیا۔''

اس وقت میرے جسم کی یہ حالت تھی کہ اگر کاٹو تو لہو نہیں۔

تائید

سیٹھ صاحب لندن کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ ان کی فرمائش تھی کہ انہیں پرانی تاریخی چیزیں اور مقامات بھی دکھائے جائیں۔ گائیڈ ایک روز انہیں تاریخی جنگی جہاز ''وکٹری'' دکھانے لے گیا۔ لارڈ نیلسن نے اس جنگی جہاز کے ذریعے کئی بحری جنگیں جیتی تھیں۔ بحری جہاز کی سیر کراتے ہوئے گائیڈ عرشے پر نصب پیتل کی ایک میز کے پاس رکا اور قدرے غم زدہ لہجے میں بولا ''..... اور سر.....! یہ ہے وہ جگہ جہاں گر کر لارڈ نیلسن نے جان دی تھی۔''

''واقعی..... یہ میز بڑے خطرناک اور بے ہودہ انداز میں بیچ راستے میں لگائی گئی ہے.....'' سیٹھ صاحب میز سے دور ہٹتے ہوئے بولے ''میں خود اس سے ٹکرا کر گرنے لگا تھا۔''

اکمل کہتا رہا ''میں نے ماہین کی پیٹھ پر وہ نشان اس کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر اس وقت دیکھا جب یہ بارش میں بھیگ گئی تھی اور میں نے اس کے کپڑے تبدیل کروائے تھے۔''

میرے ہونٹ کانپنے لگے۔ میں بولنا چاہتی تھی لیکن بول نہیں سکی۔

اسی وقت اسپتال کے لوگ پھر آ گئے۔

میں نے ماہین کو گود میں اٹھا لیا ''اب تم میرے پاس رہو۔ انکل جا رہے ہیں۔''

''آپ کہاں جا رہے ہیں انکل!'' ماہین نے پوچھا۔

''یہ لوگ مجھے علاج کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں لے جا رہے ہیں بیٹا۔'' اکمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہاں بھی ہم آپ کے ساتھ ہی چلیں گے۔'' ماہین نے ٹھنک کر کہا۔

''نہیں بیٹا۔'' اکمل نے کہا ''اس کمرے میں صرف مریض کو لے جاتے ہیں۔''

اکمل اسٹریچر پر لیٹ گیا۔ اس کا اسٹریچر وہاں سے لے جایا جانے لگا۔ میں ماہین کو گود میں لیے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اس وقت میرا دل بھرا جا رہا تھا۔

اکمل نے سر موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک امید تھی ''میں نے آپ کو پدم کی کہانی سنا دی فرزانہ۔ کیا اب آپ مجھ سے کچھ نہیں کہیں گی؟''

میرے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ اکمل بڑی پیار بھری

نظروں سے ماہین کی طرف دیکھنے لگا۔

آپریشن تھیٹر قریب ہی تھا۔

اکمل مضطرب ہوگیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”سچ فرزانہ......؟ مجھے بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے آپ کے پاس؟“

میں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بمشکل میں کہہ سکی ”آپ حقیقت جان گئے اکمل۔“

”ماہین!“ اکمل چیخ پڑا اور اس نے اسٹریچر سے اٹھ کر ماہین کو میری گود سے چھین لیا۔ اسپتال کے لوگ حیرت سے دیکھنے لگے کہ اتنے ”پرسکون“ رہنے والے مریض کو اچانک کیا ہوگیا۔

اکمل اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور ماہین کو بے تحاشا پیار کر رہا تھا۔ ادھر میں بھی بری طرح سسک رہی تھی۔

وہ جذباتی لمحے زیادہ طویل نہیں ہوسکے۔ اسپتال والوں کو جلدی تھی۔ وہ اکمل کو آپریشن تھیٹر میں لے گئے اور ماہین میری گود میں رہ گئی۔

اکمل نے زندگی میں پہلی مرتبہ ماہین کو اس طرح پیار کیا تھا کہ وہ میری گود میں بھونچکا سی تھی۔

ایک نرس میرے قریب آئی اور اس نے فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”اکمل صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ یہ فائل بہت اہم ہے اور آپ اسے کمرے میں ہی چھوڑ آئیں۔“

میں نے اس سے فائل لے لی مگر کوئی جواب نہیں دے سکی اور ماہین کو گود میں لیے ٹہلتی رہی۔ ”انجام“ کا انتظار تو مجھے کرنا ہی تھا۔ جب میں تھک گئی تو ایک جگہ بیٹھ گئی۔ ماہین کو بھی اپنے قریب بٹھالیا۔ بیٹھتے وقت فائل سے ایک لفافہ فرش سے گر گیا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا تو دیکھا کہ اس پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس میں میرے نام اکمل کا ایک خط تھا۔

”فرزانہ......! یہ خط میں بہت مختصر اس لیے لکھ رہا ہوں کہ جب تم یہ خط پڑھوگی' اس سے پہلے میں تمہیں ”پدم“ کی کہانی سنا چکا ہوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم مجھے کیا جواب دوگی لیکن کیونکہ مجھے اپنی زندگی کی امید نہیں اس لیے بس ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ ماہین کے جسم پر ”پدم“ کا نشان دیکھ کر میرے دل نے کہا تھا کہ یہ میری ہی بیٹی ہے لیکن یہ سمجھنا تو میرے لیے مشکل ہی ہے کہ یہ تم تک کیسے پہنچ گئی۔ ذہن میں کچھ شبہات تو ہیں لیکن میں ان کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ بس میرے دماغ نے میرے دل کا ساتھ نہیں دیا اور کہا کہ ”پدم“ کا یہ نشان اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جن کے جسم پر یہ نشان دیکھا جاسکتا ہے لیکن میرا دل مجبور کر رہا تھا کہ میں اجمیری سے رابطہ کروں۔ اجمیری کی وجہ سے یہ ممکن تھا کہ ماہین کا اور میرا ٹیسٹ کروالیا جاتا۔ یہ بات واضح ہوجاتی کہ ماہین میری بیٹی ہے یا نہیں لیکن میرے دماغ نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔ میں نے سوچا کہ ماہین اگر میری ہی بیٹی ہے تو یہ بہت اچھا ہے کہ وہ تمہارے پاس ہے۔ تم سے اچھی ماں اسے کہاں مل سکتی ہے اور اگر ماہین میری بیٹی نہیں ہے تو بھی اسے تمہارے پاس ہی رہنا چاہیے۔ آخر وقت میں تم ہی سے پوچھوں گا کہ حقیقت کیا ہے۔ شاید تم مجھے بتادو' اور اگر میری کوئی بات تمہیں بری لگے تو یہ سمجھ کر معاف کردینا کہ میں ایک بدنصیب شوہر اور ایک بدنصیب باپ ہوں۔

اجمل!“

تحریر پڑھتے ہوئے میرے کئی آنسو اس خط پر ٹپک گئے۔ آس پاس سے گزرنے والوں نے بھی مجھے روتے دیکھا ہوگا لیکن کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اسپتال میں اور خصوصاً آپریشن تھیٹر کے قریب جو لوگ ہوتے ہیں' انہیں روتے ہوئے ہی دیکھا جاتا ہے۔

میں نے خط فائل میں رکھ دیا اور انتظار کرتی رہی کہ کب آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلے۔ میں کبھی ٹہلنے لگتی تھی کبھی بیٹھ جاتی تھی۔ ماہین میرے ساتھ ساتھ تھی۔ وقت اس طرح گزرتا رہا جیسے صدیاں گزرتی ہیں۔ مجھے بالکل احساس نہیں ہوسکا کہ آپریشن تھیٹر کا دروازہ کب کھلا تھا۔ بس یہ یاد ہے کہ باہر آنے والے ایک ڈاکٹر سے میری کچھ بات ہوئی تھی اور میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا تھا۔ اس وقت میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے جمشید ایک بار پھر مر گئے ہوں۔



آتش بغاوت

اچھوتی محبت

آخری مرحلہ

بعد از گناہ

پدم